خواتین ڈائجسٹ

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

اکتوبر 2017

PDF

OCTOBER 2017

بانی و مدیرِ اعلیٰ ــــ محمود ریاض

مدیرہ ــــ شاہدہ خاتون

مدیر ــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ــــ عدنان

اشتہارات ــــ خالدہ جیلانی

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---	7000 روپے

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 15 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ ماہ سے NOV-17 urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہو گا۔ شُکریہ

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

اکتوبر 2017

جلد 45 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ہر لمحے کے ساتھ وقت آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ نہ جانے کب سے وقت کا سفر جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔ آغاز و انجام دونوں ہی نامعلوم۔ کامیاب وہی ہے جس کا آنے والا دن گزرے کل سے بہتر ہو۔ بے شک انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔

نئے ہجری سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ اسلامی ہجری سال کا آغاز محرم الحرام کے مہینے سے ہوتا ہے۔ محرم الحرام نہایت حرمت والا مہینہ ہے جسے دوسرے مہینوں پر کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ یہ ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جو اسلام سے قبل بھی حرمت والے سمجھے جاتے تھے۔ اہل عرب ان مہینوں میں جنگ و جدل نہیں کرتے تھے۔

سن ہجری کا اجراء حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ ہم کون سے دن سے تاریخ لکھنے کا آغاز کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: اس دن سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور شرک کی زمین کو چھوڑا تھا۔ چنانچہ سن ہجری کا آغاز اسی سال سے ہوا۔

ماہِ محرم الحرام اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں بہت سے تاریخی واقعات ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے دو اہم واقعات بھی اسی ماہ میں ہوئے۔ یکم محرم الحرام کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔

دس محرم الحرام کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نورِ چشم حضرت امام حسین اور اہل بیت کی شہادت، اسلامی تاریخ کا وہ المناک باب ہے جس پر آج بھی امتِ مسلمہ کے دل غمگین اور آنکھیں اشک بار ہیں۔

نواسۂ رسول نے اپنی اور اپنے اہل بیت کی جان کا نذرانہ پیش کر کے ثابت کر دیا۔ کہ اہل ایمان خواہ کتنی ہی قلیل تعداد میں کیوں نہ ہوں، ظلم اور جبر کے سامنے خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ وہ اس کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

یہی کربلا کا پیغام ہے۔

سانحۂ ارتحال،

انشا جی کی اہلیہ بیگم شکیلہ انشا اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن

انشا جی کی وفات کے بعد انہیں خاندان میں بزرگ کا درجہ حاصل تھا۔ وقار، صبر و تحمل اور بردباری ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ پُر نہ ہو سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام اہل خانہ کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا ناول ۔ حسن المآب،
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول ۔ آخری وار،
- سادہ عرفان کا مکمل ناول ۔ یار سیاد سدا رہے،
- رابعہ افتخار شیخ کا ناولٹ ۔ موسم سرخ گلابوں کا،
- آمنہ ریاض اور نمرہ احمد کے ناول،
- آسیہ رزاقی، سمیرا حمید، فرح بخاری، عائشہ رباب اور سفینہ عمیر کے افسانے،
- لیجنڈ فنکار سہیل اصغر سے ملاقات،
- باتیں وہاج علی سے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے،

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

گناہ گار کو بد دعا دینا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شرابی آدمی لایا گیا۔ آپ نے فرمایا:
"اسے مارو۔"
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم میں سے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے کوئی اپنے جوتے سے اور کوئی اپنے کپڑے سے مار رہا تھا۔ جب وہ (مار کھا کر) جانے لگا تو لوگوں میں سے کسی نے کہا۔
"اللہ تجھے رسوا کرے۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اس طرح مت کہو' اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ گناہ گار کو بد دعا دینے سے شیطان کی مدد ہوتی ہے کیونکہ شیطان کا مقصد بھی مسلمان کو عنداللہ ذلیل و خوار کرنا ہی ہے' تو جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر لعنت کرتا یا اسے ذلت و رسوائی کی بد دعا دیتا ہے تو گویا وہ شیطان کے مشن ہی کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لیے گناہ گار کو بد دعا نہیں دینی چاہیے' اس کے لیے ہدایت کی دعا کی جائے۔

2۔ اس میں شرابی کو صرف زدوکوب کرنے کا ذکر ہے۔ یہ حد کے مقرر ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے والے پر چالیس کوڑوں کی حد نافذ فرمائی۔ اس لیے راجح مسلک یہی ہے کہ شراب نوشی کی سزا بطور تعزیر نہیں' بطور حد ہے اور وہ ہے چالیس کوڑے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حد کو نافذ کیا۔
البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب شراب نوشی کا رواج کچھ زیادہ ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے چالیس کے بجائے اسی کوڑے اس کی سزا کر دی۔

3۔ علمائے محققین نے کہا ہے کہ حد تو چالیس کوڑے ہی ہے' البتہ بطور تعزیر چالیس کوڑوں یا اس

سے کمو بیش کا حق امام وقت اور قاضی کو حاصل ہے۔
4 ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اضافہ بھی بطور تعزیر ہی ہے ورنہ حد میں کسی کو بھی کمی بیشی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

محکوم پر تہمت لگانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:
"جو شخص اپنے مملوک (غلام' باندی) پر بدکاری کی تہمت لگائے تو قیامت والے دن اس (مالک) پر حد قائم کی جائے گی' مگر یہ کہ وہ (مملوک) ایسا ہی ہو جیسے اس نے کہا (پھر مالک پر حد لاگو نہیں ہوگی۔") (بخاری مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ مالک پر قیامت والے دن حد قذف (زنا کی تہمت لگانے کی سزا) اس لیے قائم کی جائے گی کہ دنیا میں مالک اپنے مملوکین پر ہر طرح کا ظلم کر لیتے ہیں اور ان کی داد رسی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جب بے لاگ انصاف فرمائے گا تو اس مظلوم طبقے کے ساتھ بھی انصاف کا اہتمام ہوگا اور جو مالک دنیا میں سزا سے بچ رہے ہوں گے' انہیں قیامت والے دن سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔
2 ۔ اس میں ان لوگوں کے لیے ترہیب ہے' جو اپنے مالکانہ اختیارات کے گھمنڈ میں اپنے غلاموں اور نوکروں چاکروں پر ظلم کرتے ہیں۔

مردے کو برا کہنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا مت کہو' اس لیے کہ انہوں نے (اچھے یا برے) جو عمل آگے بھیجے' وہ اس کو پہنچ گئے۔" (بخاری)
فائدہ : مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اچھے یا برے جو عمل بھی کیے' اس کے مطابق وہ جزا یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہمیں اب انہیں برا کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کسی بھی فوت شدہ پر سب وشتم نہ کی جائے۔ بالخصوص کسی کا نام لے کر سوائے مصلحت شرعی کے۔

تکلیف پہنچانے سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر کسی قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' انہوں نے یقیناً" بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

کامل مسلمان

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"(کامل) مسلمان وہ ہے' جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے' جو ان چیزوں کو چھوڑ دے' جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے' جس نے کلمہ شہادت پڑھ کر توحید و رسالت محمدیہ کا اقرار کر لیا۔ لیکن کامل مسلمان وہ ہے' جس کا کردار اتنا بلند ہو کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔
2 ۔ مہاجر تو اصل میں وہ ہے' جو اللہ کے لیے اپنے وطن اور خویش و اقارب کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی سے اللہ کے دین پر عمل کر سکے۔ لیکن وہ شخص بھی مہاجر ہے' جو اللہ کے حکم کے مطابق نافرمانی والے کاموں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے معنی ترک کرنے کے ہیں' وطن کو ترک کر دے یا معاصی کو ترک کر دے۔

ایمان

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ جہنم سے دور اور جنت میں داخل کردیا جائے تو چاہیے کہ اس کو موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ اس میں ایمان پر استقامت اور عمل صالح پر مداومت کی تاکید ہے کیونکہ موت کا کچھ پتا نہیں کس وقت آجائے۔ اس لیے انسان کو کسی وقت بھی ایمان کے تقاضوں اور عمل صالح سے غافل نہیں رہنا چاہیے تاکہ اس کی موت ایمان پر آئے۔ اس کا وہی مفہوم ہے جو آیت ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔ (آل عمران 3:102) کا ہے۔

2 ۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے' جیسے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کریں۔

بغض رکھنا' قطع تعلق کرلینا اور ایک دوسرے سے منہ پھیر لینا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "(مومن) مومنوں پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔" (المائدہ۔54)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں' آپس میں مہربان۔" (الفتح۔29)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ' نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' کا مطلب ہے کہ ایسا کام یا بات نہ کرو جس سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو۔ حسد نہ کرو' یعنی کسی مسلمان کو کوئی نعمت اور شرف و فضل حاصل ہو تو اس کے زوال کی آرزو مت کرو۔ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ' یعنی ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو تو سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے اعتراض کرتے ہوئے کنی کترا کر مت نکلو۔ یہ تمام چیزیں ممنوع ہیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پیدا ہوتا ہے' اسی لیے تین دن سے زیادہ ترک تعلق اور بول چال بند رکھنا جائز نہیں ہے۔

صلح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو' سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔

کہا جاتا ہے: ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں' ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: "ہر جمعرات اور سوموار کو اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔"

فائدہ : اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض و عناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

حسد کرنا

حسد کسی صاحب نعمت سے زوال نعمت کی آرزو

کرنے کا نام ہے' وہ نعمت دینی ہو یا دنیوی۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس نعمت پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی۔" (النساء۔54)

حسد سے بچو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"حسد سے بچو' اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"
یا فرمایا: "خشک گھاس کو (کھا جاتی ہے۔")
(ابوداؤد)

ٹوہ لگانے کی ممانعت کسی کے ناپسند کرنے کے باوجود اس کی بات سننے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ٹوہ مت لگاؤ۔" (مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو۔) (الحجرات 12۔)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' انہوں نے یقیناً" بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

بدگمانی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کا حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لیے کوشش کرو' نہ ایک دوسرے سے حسد کرو' نہ باہم بغض رکھو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ۔ اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ' جیسے اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' نہ اس پر ظلم کرے' نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے' نہ اس کو حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے...."
اور اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے....
"آدمی کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون' عزت اور مال حرام ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو' وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔"

بھائی بھائی بن جاؤ

ایک اور روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' باہم بغض نہ رکھو' جاسوسی نہ کرو' عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ' محض دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھا کر مت لگاؤ" اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"
اور ایک روایت میں ہے: "ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ" اور باہم بغض نہ رکھو' نہ باہم حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔"

بول چال بند کرنا

ایک اور روایت میں ہے: "ایک دوسرے سے بول چال بند مت کرو اور تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔"
یہ ساری روایات امام مسلم نے بیان کی ہیں اور ان میں سے اکثر امام بخاری نے بھی روایت کی ہیں۔

فوائد و مسائل:

1۔ بدگمانی سے مراد کسی مسلمان کی بابت ایسا گمان ہے جس کا کوئی ظاہری سبب نہ ہو' اسی طرح وہ خیال ہے جو بغیر کسی دلیل کے دل میں پیدا ہو۔
2۔ کسی سودے کی بولی میں اس لیے اضافہ کرنا تاکہ دوسرے لوگ دھوکا کھا جائیں' اس کا مقصد خریدنا نہ ہو۔ اس کی ممانعت ہے۔
3۔ اس حدیث میں جو ہدایات دی گئی ہیں' ان کا

مقصد مسلمان کی عزت کا تحفظ ہے' بلا وجہ بدگمانی' عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش مسلمان کی عزت کے منافی ہے' اس لیے ان سے روک دیا گیا۔

دوسرا مقصد اخوت اسلامیہ کی پاسداری ہے' اسی لیے ظلم کرنے سے' دست گیری کے وقت بے یارو مددگار چھوڑ دینے سے' حقیر سمجھنے سے اور تکبر کرنے سے روک دیا گیا ہے اور مسلمان کی جان' مال اور عزت کو دوسرے مسلمانوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔ بولی میں اضافے اور سودے پر سودا کرنے کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے بھی بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ٹوہ لگانا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "اگر تو مسلمانوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گا یا قریب ہے کہ تو ان کے اندر فساد پیدا کر دے۔" (یہ حدیث صحیح ہے' اسے امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : جب ایک شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں اور ان کی کمزوریوں کے تعاقب میں لگا رہے گا تو پھر دوسرے لوگ بھی اس کی بابت یہی انداز اختیار کریں گے' اس سے معاشرے میں جو فساد پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے' اس لیے شریعت نے اس سے منع کر دیا ہے۔

بدظنی

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فلاں آدمی ہے' اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا "ہمیں ٹوہ لگا کر عیب تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے' البتہ اگر کوئی کمزوری ہمارے سامنے آئے گی تو ہم اس پر اس کی گرفت کریں گے۔ (یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسے ابوداؤد نے ایسی سند سے روایت کیا ہے' جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل :

1 ۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کا ایک نمونہ ہے' جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً" اسلام کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

2 ۔ محض شبے پر حد یا تعزیر عائد نہیں ہوگی' اس کے لیے واقعی ثبوت ضروری ہے۔

بلا ضرورت مسلمانوں سے بدگمانی کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی کرنے سے بچو' اس لیے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ اہل خیر و صلاح کے بارے میں بدگمانی سے بچنے کی تاکید ہے' اس لیے کہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے۔ علاوہ ازیں شرعی احکام اور سزائیں یقین پر نافذ ہوتی ہیں' محض ظن و تخمین پر نہیں۔

2 ۔ عام حالات میں ہر مسلمان کی بابت اچھا خیال رکھنا ضروری ہے' اِلّا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے برعکس موجود ہو۔

ابتدا کرنے والا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آپس میں گالی دینے والے دو شخص' جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے' اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا' یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب کرے۔" (مسلم)

بیان ایک سائنس دان کا

انشا جی

ابھی میں نے لیکچر ختم کیا ہی تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل اور کھلی ہوئی نوٹ بک تھی۔ اس نے کہا۔

"معاف فرمائیے۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج آپ نے جو تقریر کی ہے۔ اس میں اہم نکتے کیا کیا تھے؟ دراصل میں ابھی ابھی پہنچا ہوں' جب آپ تقریر ختم کرکے میزبانوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔"

"کیا بات ہے؟ آپ کو آنے میں کیسے دیر ہوگئی؟"

"جی۔ وہ ادھر ہاکی کا میچ ہو رہا ہے نا! میں ذرا ادھر دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"آپ کھیلوں کی رپورٹنگ بھی کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں اس قسم کی رپورٹنگ نہیں کرتا۔ ادبی' سیاسی' ثقافتی اور اس قسم کی دوسری سنجیدہ تقریبات کی رپورٹنگ میرے ذمے ہے۔ کانٹے کا کھیل تھا آج ہاکی کا۔ ایک طرف اس میں یتیم خانہ حمایت اسلام کی ٹیم تھی اور اپنے اللہ دتا نے کھیل کا آغاز کیا تھا دوسری طرف۔۔۔ لیکن آپ کی تقریر کا موضوع کیا تھا؟"

"میری تقریر "جدید سائنس کی فتوحات" کے موضوع پر تھی۔"

"سائنس۔ خوب بڑی اچھی چیز ہے سائنس۔"

اس نے فوراً پنسل سے کاپی میں کچھ نوٹ کیا' پھر سر اٹھا کر بولا۔ "معاف فرمائیے۔ فتوحات "ط" سے ہے یا "ت" سے ہے اور آگے چھوٹی "ہ" ہے یا بڑی "ح" ہے حلوے والی؟"

"میں نے بتایا کہ ط اور چھوٹی ہ نہیں ہے۔"

"اچھا۔ اب فرمائیے کہ لیکچر کا مرکزی خیال کیا تھا؟"

"آج میں نے اس مسئلے کو لیا تھا کہ ریڈیائی لہروں کا ایٹمی تشکیلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"ٹھہریے!" اس نے کہا۔ "ریڈیائی کے کیا ہجے ہوتے ہیں۔ ریڈیائی۔۔۔ ریڈیو۔ خیر میں سمجھ گیا۔"

اب اس نے اپنی نوٹ بک بند کرنے کی تیاری کی اور پوچھا۔

"آپ کا پہلے بھی کبھی ہمارے شہر وزیر آباد سے گزر ہوا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ پہلا اتفاق ہے۔"

"یہاں کی چھریوں' قینچیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا کچھ خیال نہیں۔"

"آپ سلطان ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔ کیسا پایا اسے؟"

"اچھا خاصا ہے۔ ذرا مکھیاں زیادہ ہیں۔"

"مکھیاں۔ تو گویا گڑ کی منڈی کو شہر میں نہیں ہونا چاہیے؟"

"اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے یہاں کا نیا مذبح گھر دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا۔"

"بڑا اچھا بنا ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو اچھا ہی ہوگا۔"

اس نے جلدی جلدی اپنی ڈائری میں کچھ قلم بند کیا' پھر بولا۔

"یہاں کی میونسپلٹی کی کارگزاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں تو آج ہی آیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"کیا یہ میونسپل کمیٹیوں والے نالائق نہیں ہوتے؟ کوڑے کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں۔"

"ہاں' اکثر شہروں میں تو نالائق ہی ہوتے ہیں۔ کوڑا

نہ ٹھہلنے کی شکایتیں عام ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے' یہاں چنگی والے لوگوں سے رشوت لیتے ہیں؟"

"مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ کا خیال کیا ہے؟"

"بہت جگہ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' یہاں بھی لیتے ہوں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہے۔"

وہ یہ محاورہ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً" نوٹ بک میں چڑھایا اور بولا۔

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ عام طور پر تو تقریریں کرنے والے خصوصاً" سائنس پر بولنے والے بڑے بور ہوتے ہیں۔ بلکہ کوڑھ مغز۔ اچھا تو خدا حافظ۔ ہاں ایک سوال اور ہے۔ یہ جو نیا ریلوے کا پل بنا ہے۔ اس میں گول مال ہوا ہے۔ سنا ہے' سیمنٹ بہت تھوڑا ڈالا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ بہتر جانتے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "بہت جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ ٹھیکے دار اور افسر ملی بھگت کیا کرتے ہیں۔"

اس نے خوش خوش سلام کیا اور چلتا بنا۔

اگلے روز میری روانگی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے میں نے اخبار خریدا اور کھولا تو سامنے ہی بڑی سی سرخی نظر آئی۔

"گڑ منڈی کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے۔"

"مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش کی رائے۔

وزیر آباد۔"

"آج وزیر آباد کے ٹی ہال میں مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش نے ریڈیو کے موضوع پر تقریر کی اور بتایا کہ ریڈیو کی کیسے حفاظت کرنی چاہیے اور کیسے اس کے سیل بدلتے رہنا چاہیے تاکہ فتوحات حاصل

ہوں۔ پروفیسر مولا بخش نے وزیر آباد کی خوب صورتی کی تعریف کی' لیکن چھری قینچیوں کے بارے میں تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ پروفیسر موصوف نے نئے مذبح خانے کو بھی سراہا' لیکن میونسپل کمیٹی کی مذمت کی' جو کوڑا نہیں اٹھاتی۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ وزیر آباد کے چنگی والے رشوت لیتے ہیں اور ریلوے پل میں سیمنٹ کم ڈالا گیا ہے۔ بلکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے' جو سلطان ہوٹل میں ٹھہرے تھے' مطالبہ کیا ہے کہ شہر سے گڑ کی منڈی کو فوراً" ہٹایا جائے۔ ورنہ۔۔۔"

اس سے آگے میں نہ پڑھ سکا۔ اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا۔

(ابن انشا)

ڈراما سیریل ہری ہری چوڑیاں کا ہیرو

باتیں وہاج علی

شاہین رشید

1 اصلی نام؟

وہاج علی۔

2 پیار کا نام؟

وہاج ہی کہتے ہیں سب۔ کسی نے نام بگاڑا نہیں۔

3 سالگرہ کا دن؟

یکم دسمبر۔

4 کتنی بہاریں دیکھ چکے ہیں؟"

1985ء میں دنیا میں آیا .... حساب آپ خود لگالیں۔"

5 قد/ ستارہ؟"

5فٹ10انچ Sagittarius۔"(قوس)

6 بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"

کوئی بہن بھائی نہیں، میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔

7 تعلیمی قابلیت/ کیا بننا چاہتے تھے؟

NCA سے ماسٹرز ان ملٹی میڈیا۔ صرف ایک بہتر انسان اور ایک بہترین اداکار بننا چاہتا ہوں۔

8 شادی؟"

جی شادی ہو چکی ہے۔ اپنی پسند سے کی اور ماشاء اللہ چھ ماہ کی ایک بیٹی ہے اور ______ امیرہ نام ہے۔

9 شوبز میں آمد؟/ گھر والوں کا رد عمل؟

بس اداکاری کا شوق تھا.... اور اس بات کی خبر سب کو

تھی۔ چنانچہ ایک دن آڈیشن کے لیے کال آگئی۔ آڈیشن دیا۔ سلیکٹ ہو گیا اور گھر والوں کو نہیں بتایا.... کام کرتا رہا' لیکن گھر والوں کو یہی لگتا تھا کہ یہ روزانہ نوکری پہ جاتا ہے اور جب ڈرامے کے آن ایئر کے دن قریب آئے تو ڈرتے ڈرتے والد صاحب کو بتا دیا.... اور وہ میری بات سن کر مسکرا دیے' اور کہنے لگے' میں تمہاری ماں سے پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ صرف اپنی ہی نوکری کر سکتا ہے کسی اور کی نہیں۔

10 "پہلا ڈراما / شہرت؟

عشق عبادت / زویا صالحہ اور "ہری ہری چوڑیاں"۔

11 "پہلی کمائی؟/ کہاں خرچ کی؟

"پہلے پروجیکٹ کا مجھے دو لاکھ اور شاید 20 ہزار ملے تھے۔ جس میں بہت سارے پیسوں کے پودے خرید لیے اور جو پیسے بچ گئے اس سے اگلے پروجیکٹ کی وارڈ روب لے لی۔"

12 شوبز کی بڑی برائی؟

سوشل لائف بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

میں صبح نو بجے تک اٹھ جاتا ہوں۔

14 "اٹھتے ہی دل چاہتا ہے؟

"کہ آج شوٹ کی گاڑی ایک گھنٹہ دیر سے آئے۔

15 دنیا میں کیا چینج لانا چاہتے ہیں؟

"میں تعلیم کو ہر انسان کے لیے لازمی قرار دے دوں گا اور جب ہر انسان پڑھا لکھا ہو گا تو چینج خود ہی آجائے گا۔

16 اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟

اپنی بیگم کو۔

17 اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟

میں ضرورت سے زیادہ "حساس" ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تھوڑا کم ہو جاؤں۔

18 فخر کا کوئی لمحہ؟

ایک دفعہ میرے والد نے میرے ایک ڈرامے کا سین دیکھتے ہوئے کہا کہ "اب میں تمہاری طرف سے بے فکر ہو

گیا ہوں۔ بس زندگی میں ایک بات کا خیال رکھنا۔ "do good and have good" (کر بھلا' ہو بھلا۔)

19 "بچپن کی ایک بری عادت، جو آج بھی قائم ہے؟

رات کو تکیے کا کونہ پکڑے بغیر آج بھی نیند نہیں آتی۔

20 ضدی ہیں؟

بے حد' بے شمار.... بہت ضدی ہوں۔

21 زندگی کا ایک ہی دن ہو تو خدا سے کیا مانگیں گے"؟

زندگی کا ایک اور دن۔

22 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟

تو کوئی مسئلہ نہیں' اٹھ جاتا ہوں آرام سے۔

23 سات دنوں میں پسندیدہ دن؟

منگل۔"

24 "پسندیدہ مہینہ؟

فروری۔

25 "لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟

اچھی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کا خیال رکھتی ہیں اور بری بات یہ ہے کہ بہت ہی رعب کے ساتھ اپنا خیال رکھواتی بھی ہیں۔"

26 کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"
والد کی وفات نے زندگی تبدیل کر دی۔

27 کیا وقت سے پہلے ملا؟
اللہ کا بہت کرم رہا ہے کہ سب کچھ ہی وقت سے پہلے ملا ہے۔

28 غصہ کب آتا ہے/ردِّ عمل؟
جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا' شادی سے پہلے غصہ بہت تیز تھا اور بھرپور ری ایکشن دیتا تھا۔ مگر اب صرف مسکرا دیتا ہوں۔

29 "آپ خوفزدہ رہتے ہیں؟"
نہیں میں کسی بات سے خوفزدہ نہیں رہتا۔

30 آپ اکثر سوچتے ہیں؟
والد کی وفات کے بعد لگتا ہے کہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا' انسان جو سوچتا ہے ویسا اگر نہ ہو تو سوچ کر خود کو پاگل کرنے کا کیا فائدہ' جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو ہی جاتا ہے۔

31 بھوک میں آپ کی کیفیت؟
کچھ نہیں... خاموش رہتا ہوں۔

32 اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟
تو مالدیپ جانا پسند کروں گا۔

33 اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک مل جائے تو کتنا اماؤنٹ لکھیں گے؟"
جتنے میں پاکستان کا قرض اتر جائے۔

34 سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟
کسی کو بھی نہیں۔"

35 ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟
اپنے دل کی بالکل نہ سنیں اور صرف دماغ سے کام لیں ا اگر دماغ کمزور ہے تو والدین کے دماغ سے سوچیں۔

36 جھوٹ کب بولتے ہیں؟
جب بیگم پوچھتی ہیں کہ گھر کب آنا ہے۔ کیونکہ ہم فنکاروں کا کب کام ختم ہو۔ ہمیں خود نہیں پتا ہوتا۔"

37 گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟"
ٹی (Tea) اور ٹی وی T.V۔"

38 کسی کی تعریف میں دو ہی جملے کہتے ہیں کہ؟
"کمال کر دیا آپ نے لیکن حیران نہیں کیا۔

39 شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟
بندے سے زیادہ اللہ سے امید اور اللہ پہ بھروسا ضروری ہے۔"

40 کس فنکارہ کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟
بے ساختہ... "سب کے ساتھ۔"

41 خواہش ہے کہ کسی ایسی فلم میں کام کروں جو؟
نہیں ابھی بالکل ارادہ نہیں ہے۔ ابھی سارا فوکس ٹی وی ڈراموں پر ہے۔"

42 اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتے ہیں؟
اب کچھ نہیں بچتا..." (ہنستے ہوئے)

43 ایک محبت جو بھول نہیں سکتا؟
اس ایک محبت کو میں نے حاصل کر لیا ہے۔

44 "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں؟
اپنے کمرے میں جا کر سونے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔

45 کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟
اپنی فیملی کو... والدہ' بیگم اور اب بیٹی بھی شامل ہو گئی ہے۔"

46 گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟
اپنے بیڈروم میں۔

47 کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟
اب سچی محبت صرف کہانیوں اور فلموں میں ہی پائی جاتی ہے جیسے ویر زارا۔

48 کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟
نہیں جی... اللہ کا بڑا کرم ہے ہم پر۔

49 بی پی (بلڈ پریشر) ہائی ہو جاتا ہے جب؟
نہیں... بڑا صبر و شکر والا بندہ ہوں ہائی بی پی نہیں ہے۔

کرتا۔

50 آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟

کیش کے علاوہ سب کچھ۔

51 نصیحت جو بری لگتی ہے؟

جب لوگ کہتے ہیں کہ اپنے والدین سے محبت کیا کرو' تو... میں سمجھتا ہوں کہ محبت دل میں ہوتی ہے۔ کہنے سے نہیں اور پھر کون ہے جو اپنے والدین سے محبت نہیں کرتا ہو گا۔

52 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا لازمی ہے ورنہ مزہ نہیں آتا؟

"پودینے کی چٹنی۔

53 فیس بک 'انسٹا گرام اور انٹرنیٹ سے آپ کی دلچسپی؟

کسی سے بھی دلچسپی نہیں ہے مجھے۔

54 کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے 'چٹائی پہ 'اپنے بیڈ پہ یا ڈائننگ ٹیبل پہ؟

اپنے بیڈ پہ۔

55 وقت کی پابندی کرتے ہیں؟

بہت زیادہ۔"

56 ایک کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟

بوائلڈ چکن۔"

57 کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتے؟

7 بیٹی کی پیدائش کا دن۔

58 دوسرے ملک میں جا کر کیا بات نوٹ کرتے ہیں؟

ان کا زندگی گزارنے کا طریقہ۔

59 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

گاڑی۔

60 کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟

نہیں بس کھانے سے لگاؤ ہے۔

61 نیک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟

میں ایسا کردار کرنا چاہتا ہوں جو کوئی بھول نہ سکے۔ ہر طرح کے چیلنجنگ رول کرنا چاہتا ہوں۔"

62 ایک کردار جو بہت مقبول ہوا؟"

ایک سوپ چلا تھا "گلہ" اس میں میں نے "سانول کا رول کیا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔

63 "کوئی کردار جو آپ کر کے پچھتائے؟

میں نہیں پچھتاتا... اگر برا بھی ہو جائے تو اس کو بس بھول کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

64 آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

فیوچر پلاننگ نہیں کرتا۔ سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیتا ہوں۔

65 عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟

یوں ہی بہت ضروری ہیں۔"

66 ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟

نہیں خواب بار بار نہیں دیکھتا بلکہ خواہش ہے کہ اپنے والد سے ملوں اور ان کے گلے لگوں اور پھر ان ہی کے پاس رہ جاؤں۔

67 پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟

لاہور فوڈ اسٹریٹ۔

68 آئینہ دیکھ کر سوچتا ہوں؟

اپنے اندر بہتر انسان کو تلاش کرتا ہوں۔

69 شادی میں پسندیدہ رسم؟

مہندی کی رسم۔"

70 شادی میں گفٹ دینا چاہیے یا کیش؟

کیش دینا چاہیے۔"

71 ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟

ناشتہ بیگم کے ہاتھ کا اور کھانا امی کے ہاتھ کا پسند ہے۔

72 بدلہ لیتے ہیں؟

نہیں۔

73 کب فریش محسوس کرتے ہیں؟

جب سین اچھا ہو جاتا ہے۔

74 اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟

دونوں سے سیکھتا ہوں۔

75 دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟

ماں باپ اور پھر اولاد۔

76 لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟

میں جب لوگوں سے ملتا ہوں تو "دعاؤں میں یاد رکھیے" کہتا ہوں اور جب لوگ مجھ سے ملتے ہیں تو سیلفی کی فرمائش کرتے ہیں۔

77 آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟

میرا دل کرتا ہے کہ میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ جنگل میں رہوں۔

78 فلم اور ماڈلنگ کی؟

ابھی تک تو نہیں کی۔

79 آپ کو فوبیا ہے؟

پانی سے ڈر لگتا ہے۔

80 کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟

نہیں یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ انسان خود غرض اور چالاک ہوتا ہے۔

81 بچپن کا ایک کھلونا جو آج بھی آپ کے محفوظ ہے؟

کچھ بھی نہیں ہے.... بس یادیں ہیں۔

82 اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

جی آرام سے۔

83 دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟

دونوں کی سنتا ہوں۔

84 غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟

حد ہے۔

85 بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا ٹائم لگتا ہے؟

لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔

86 سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتے ہیں؟

Amirah کو دیکھ کر سوتا ہوں۔

87 محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟

محنت سے انسان کو خود پہ یقین آتا ہے اور قسمت سے پیسہ ملتا ہے۔

88 تہوار جو آپ کو پسند ہیں؟

بڑی عید (عید الاضحیٰ)۔

89 زندگی کب بری لگتی ہے؟

جب کسی کے لیے کچھ نہیں کر پاتا۔

90 مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟

کبھی اچھے کبھی برے۔

91 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

صرف موبائل لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔

92 پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟

بس دعا کرتا ہوں ابھی تو۔

93 آپ کی اچھی اور بری عادت؟

میں سوشل نہیں ہوں۔ لوگوں سے زیادہ نہیں ملتا' اور اچھی یہی ہے کہ اسی لیے فرق نہیں پڑتا کہ کون کیا کرتا ہے اور کیا کہتا ہے۔

94 شوبز میں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے؟

پڑھ رہا ہوتا۔

95 ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟

اولاد کی تربیت کا وہم۔

96 کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟

کچھ بھی نہیں۔

97 خدا کی حسین تخلیق؟

ماں۔

98 شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟

جب آپ کی پرسنل لائف ڈسٹرب ہو۔

99 آنکھ کھلتے ہی اٹھ جاتے ہیں یا ٹائم لگتا ہے؟

ٹائم لگتا ہے۔

100 اپنا فون نمبر تبدیل کرتے رہتے ہیں؟

نہیں... آج تک نہیں کیا۔

101 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟

تو میں اسے آزمائش سمجھوں گا.... سزا نہیں۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

نادیہ عمر... اوکاڑہ

میرا نام نادیہ عمر ہے۔ عمر سعید کی بیوہ۔ آج بیوہ لکھتے ہوئے میرا دل ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ الفاظ کہنے آسان نہیں ہوتے۔

اس دکھ سے سنبھلنے کے لیے تو ایک پوری زندگی بھی کم ہے لیکن، جب تھوڑی بہت آس پاس کی خبر لی تو مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ عمر کی وفات کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا کچھ کہا جا رہا تھا۔ ایک دو افراد نے فون پر بات کی تو چھوٹتے ہی کہا "کیا عمر نے خودکشی کی ہے؟ کیا عمر اپنی موت کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ کہیں چھپا ہوا ہے؟"

میں ایسی باتیں سن کر حیران رہ گئی۔ کوئی ایسی باتیں کس دل سے کر سکتا ہے۔ دو پھول جیسے بچوں کی موجودگی میں کون پتھر دل باپ ہو گا جو ایسا کرے گا۔ عمر زندگی سے بھرپور تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی بھی زندہ انسان اپنی موت کے بارے میں جھوٹ کیوں بولے گا۔ ایک جوان بیوی، مر کر بھی خود کو بیوہ کہلوانا پسند نہیں کرے گی خواہ وہ مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔ میری یا عمر کی زندگی کوئی فلم یا ڈراما نہیں تھی، جس میں یہ سب فرضی طور پر کر لیا جاتا۔ ہم جیتے جاگتے عام انسان ہیں۔ ہمیں موت سے اتنا ہی خوف آتا ہے جتنا کسی بھی ماں باپ کو آسکتا ہے۔ جو اپنے بچوں کو یتیم کرنا نہیں چاہتا۔ جو بیوی بچوں کو بے سہارا اور اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ عمر نے کسی بھی انسان کے ساتھ کبھی بھی کچھ بھی برا نہیں کیا، پھر ایسی افواہیں پھیلانے والے اس کے ساتھ اتنا برا کیوں کر رہے ہیں؟ اگر وہ میرے دونوں یتیم بچوں کو باپ کے لیے بلکتے ہوئے دیکھ لیں تو شاید انہیں یقین آجائے کہ موت کوئی ایسا پردہ نہیں جس کے پیچھے عمر چھپا ہوا ہے۔

عمر ایک بہت بڑا رائٹر تھا۔ بہت قابل تھا۔ مرنے سے پہلے وہ اپنی تین چار کہانیوں کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھا۔ وہ مجھے ان ناولوں کی کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ ایک ایک سین، ایک ایک جملہ پڑھ پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ ڈراما بھی لکھنا چاہتا تھا اور فلم بھی۔ وہ اس فیلڈ میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔

عمر اپنے ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کی آخری وقت تک ایسی خدمت کی کہ شاید ہی کوئی بیٹا یا بیٹی اتنے پیار سے خدمت کر سکے۔ میری ساس کی وفات کے بعد وہ اس صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ والد کی وفات ہو گئی۔ عمر جتنا خوب صورت تھا، اس کا دل اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھا، یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ وہ اس صدمے سے پریشان رہتا تھا کہ اچانک اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ اپنے بچوں کو اور مجھے ادھورا کر دیا۔

اسے اپنے بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے' اسی لیے وہ سب کو اتنا پیار دے گیا۔ اسے اپنی کتابوں سے بہت پیار تھا۔ ایک ایک کتاب بہت سنبھال کر رکھتا تھا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا لائق تھا کہ بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن زندگی نے مہلت نہیں دی۔

عمر اکثر امتل آپی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ وہ امتل آپی کو بالکل اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔

ڈائجسٹ کی کچھ رائٹرز عمر کو بہت پسند تھیں۔ وہ کہتا تھا' یہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جلد ہی میری کہانی بھی آئے گی۔ عمر نے دو تین بار ڈراما لکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ کچھ ایسا ہو گیا کہ وہ درمیان میں ہی رک گیا۔ پھر بھی وہ کہتا تھا کہ ایک دن میں اپنی مرضی سے بہت اچھا ڈراما لکھوں گا۔

کچھ دن پہلے میری آپی سائرہ رضا سے فون پر بات ہوئی۔ مجھے ان سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ انہوں نے جیسے میری حوصلہ افزائی کی' مجھے تسلی دلاسے دیے۔ اس نے میرے آدھے غم کم کر دیے۔ یہ سارے تعلق جو میرے ساتھ کھڑے ہیں' یہ عمر کے نام سے ہی میرے ساتھ ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لوگ مجھے عمر سعید کے نام سے پہچانتے ہیں۔ وہ عمر کے کام کی اتنی قدر کرتے ہیں۔

ڈائجسٹ کے ساتھ عمر کا جو رشتہ تھا' میں بھی وہ رشتہ نبھانا چاہتی ہوں۔ میں نے پھر سے ڈائجسٹ اٹھا کر پڑھنے شروع کر دیے ہیں اور اسی لیے میں اب خط لکھ رہی ہوں کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ جو چیزیں عمر کو پیاری تھیں' میں بھی ان کے قریب رہوں۔ آپ سب سے یہی کہوں گی کہ عمر کے بچوں کے لیے' جو پانچ اور چھ سال کے ہیں' دعا کریں کہ اللہ انہیں کامیاب کرے۔ اور مجھے ہمت دے کہ میں انہیں پروان چڑھا سکوں۔ ان کی اچھی تربیت کر سکوں۔

ج : پیاری نادیہ! "سفال گر" اور "رقص جنوں" کے خالق عمر سعید کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا آسان نہیں۔ خود ہمارا دل اب تک یقین نہیں کر پایا ہے' ایک خوب صورت انسان جس کا دل بھی بہت خوب صورت تھا۔ اس دنیا سے اتنی جلدی رخصت ہو گیا۔ ابھی تو اسے بہت کچھ لکھنا تھا۔ کتنی کہانیاں ادھوری رہ گئیں۔ وقت اسے تھوڑی سی مہلت اور دیتا تو یقیناً" کئی شاہکار وجود میں آتے۔

آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے آپ کو تخلیقی صلاحیت سے نوازا ہے۔ آپ لکھیں ہمارا ادارہ آپ کے ساتھ ہے۔

فوزیہ فرخ۔۔۔ کراچی

بہت عرصے بعد سمیرا حمید نے سمیرا حمید جیسا ناول لکھا۔ کیا یہ سچی کہانی ہے؟

ج : پیاری فوزیہ! سمیرا حمید کا یہ ناول واقعی ان کے خاص رنگ میں تھا۔ سمیرا حمید تو عام سے موضوع پر بھی لکھیں تو خاص بنا دیتی ہیں۔ یہ تو موضوع بھی منفرد تھا۔

لیکن یہ بتائیں کہ فوزیہ فرخ کب فوزیہ فرخ جیسا لکھیں گی۔ ہلکی ہلکی مزاح کی چاشنی لیے آپ کی تحریریں آج بھی ہمیں یاد ہیں۔ "ٹھہر گیا وہ" جیسا ناول لکھنے والی مصنفہ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ یقین نہیں آتا۔

سائرہ رضا۔۔۔ کراچی

سمیرا حمید کا ناول پڑھنے کے بعد میری عجیب کیفیت ہے۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں کر پا رہی۔ لفظوں میں اس کیفیت کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کی جدوجہد' محنت' کوشش کو جس طرح بیان کیا گیا۔ وہ قابل تعریف ہے۔

ج : بہت شکریہ سائرہ! ناول واقعی دل کو چھو لینے والا تھا۔

قانتہ رابعہ۔۔۔ گوجرہ

سمیرا کو بہت مبارک باد دیجیے گا۔ سمیرا کو اللہ نے قلم کی طاقت اور بھرپور طریقے سے اس کا ابلاغ عطا کیا ہے۔

ج۔ جی قانتہ! یہ واقعی خداداد صلاحیت ہے۔

شبانہ رفیق۔۔۔ رحیم یار خان

تمام افسانے بہت اچھے لگے۔ میرے بدگمان' نیت نالہ' نا' نہ بہت اچھے تھے۔ خالہ تو بہت مزے کا تھا۔ کچھ

اہ پہلے بھی عطیہ خالد نے اس نام سے افسانہ لکھا تھا۔ ناولٹ مژدہ صبح' رزق' بہت اچھے تھے۔ مکمل ناول سمیرا حمید کا رہ نورد شوق بہت اچھا تھا۔ میں بھی آپ کا باورچی خانہ میں لکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز بتا دیں کیسے بھیجوں۔ نمرہ احمد کا حالم بہت زبردست جا رہا ہے۔

ج : پیاری شبانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ باورچی خانہ کے سوالات سلسلے میں شامل ہوتے ہیں۔ آپ ان کے جواب اسی طرح لکھ کر بھجوا دیں جیسے خط بھجوایا ہے۔

ام امامہ۔۔۔ راولا کوٹ آزاد کشمیر

"حالم اور حسن المآب" آج کل دو ناولز ہیں جن کی وجہ سے خواتین کا رسالہ ہر ماہ لیتی ہوں۔ اب میں وہ وجہ لکھنا چاہتی ہوں جس کے لیے میں نے خط لکھا ہے۔

میں آزاد کشمیر راولا کوٹ میں رہتی ہوں۔ مجھے جو ناولز پڑھنے ہوتے ہیں وہ مجھے پہلی بات یہ کہ ملتے نہیں اگر مل جائیں تو بہت مہنگے ملتے ہیں۔

ج : ام امامہ! آپ اس نمبر پر فون کریں۔ وہ تمام ناول جو آپ کو درکار ہیں مناسب قیمت پر مل جائیں گے۔

021-32735021

آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی رائے دی جا سکتی ہے۔

لبینہ شہزاد۔۔۔ ملیر کراچی

اس سے پہلے بھی بہت دل چاہا لکھنے کا مگر ہمت اور موقع نہیں ملا۔ ویسے تو تینوں ڈائجسٹ کرن' شعاع خواتین اچھے ہیں مگر خواتین ڈائجسٹ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میں نے آپ کے اس رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اتنا سیکھا ہے کہ اگر تعریف کرنے لگوں تو شاید پورا خط اسی میں نکل جائے۔ آج جو خط لکھنے پر مجبور ہو گئی یا بس سمجھ لیں صبر نہیں ہوا اور ہمت آ ہی گئی' وہ وجہ سمیرا حمید اور نمرہ احمد کے ناول ہیں۔ اس بار سمیرا حمید جی کے ناول "رہ نورد شوق" اف کتنا اچھا ناول لکھا ہے۔ کمال ہے۔ ان کا طرز تحریر مجھے بہت پسند ہے اور اس کہانی میں "دینا" کا کردار اچھا تھا بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اسی طرح "محبت من محرم" بھی بہت ہی اچھا تھا۔ اور اب نمرہ احمد کیا تعریف کروں ان کی اور کن الفاظ میں کروں الفاظ نہیں اب "حالم" سب سے الگ منفرد شدت سے انتظار رہتا ہے حالم کا۔۔۔ انیلا کرن نے "رزق" بہت اچھا لکھا ہے۔ باقی سارے سلسلے اچھے ہوتے ہیں خاص کر "کرن کرن روشنی"۔

ج : پیاری لبینہ! یہ موقع تو سمجھ میں آتا ہے مگر خط لکھنے کے لیے ہمت؟ دوستوں سے اظہار خیال کرنے میں کیسا تکلف اور جھجک۔ آپ اگر تنقید بھی کریں گی تو ہم ہرگز برا نہیں مانیں گے کیونکہ ہم تنقید سے بھی اصلاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ دعاؤں کے لیے شکر گزار ہیں۔

منیبہ مراد۔۔۔ خانقاہ ڈوگراں

واہ سمیرا حمید۔ آپ کی تعریف میں الفاظ کہاں سے لاؤں۔ افق کا لکھوں یا دینا فضل کریم کا دونوں ہی اتنی ہی معصوم' لگن' ہمت اور محنت کرنے والی۔ ایک نیلا گنبد لاہور کی رہائشی ہو کے بھی اتنی ہی معصوم جتنی گاؤں کی "دینا فضل کریم" اور دھوکا کھایا تو شہر کی رہنے والی افق نے بھی کھایا۔ دونوں ہی کہانیاں بلکہ داستانیں ہمیں کبھی ہار نہ ماننے کا سبق دیتی ہوئی۔ ہمت بندھاتی ہوئی ہیں۔

نادیہ جہانگیر کا افسانہ بہت اچھا لگا۔

"حالم" میں اس دفعہ ہماری ہیروئن کچھ مایوس سی لگی۔ وان فاتح کا حق اور سچ پہ مکالمہ بہت اچھا لگا۔ ہم بھی دونوں الفاظ کو ایک ہی سمجھتے تھے۔

"حسن المآب" ایک شاندار تخلیق۔ صحرا کا خوف ہو یا "تارے" کی ماں کے جذبات" آپ نے خوب بیان کیے۔

ج : پیاری منیبہ! بہت خوب تبصرہ کیا ہے آپ نے جس طرح آپ نے ان کہانیوں کی روح کو سمجھا' وہ قابل تعریف ہے۔ جب ہماری قارئین تک کسی کہانی کا مقصد صحیح طور پر پہنچ جاتا ہے تو ہم اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ بہت شکریہ۔

آمنہ۔۔۔ جڑانوالہ

سب سے پہلے رسالے کی جان "حالم" پڑھا۔ یہ قسط بہت اچھی تھی۔ پھر "دشت جنوں" پڑھا۔ ہائے آمنہ ریاض کہاں پھنسا دیا خوش نصیب کو۔ بے چاری کے ساتھ اتنا برا بھی نہ کریں اور سب ہی لوگ آئے کت کو آیو شمتی کیوں کہتے ہیں؟

"نا سمجھ" میں آخر رومیلہ کو سمجھ آ ہی گئی۔ عطیہ خالد کی خالہ نے تو رسالے کو چار نہیں' آٹھ نہیں' بارہ' سولہ

چاند لگا دیے۔ نیت میں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی نادیہ جہانگیر نے، میرے بدگمان میں بدگمانی ہٹی تو نہ معافی نہ تلافی سیدھا پاؤں دھونے پر لگا دیا۔ حسن المآب اور ..... موسیٰ کا سوال "کیا جہنم صحرا سے بھی بری جگہ ہے" اور جواب میں ہاں سن کر ساکت۔ اللہ جی ہم سب کے گناہ معاف کریں۔ (آمین)

کرن نعمان کی کہانی بس ٹھیک ہی تھی۔ "رزق" انیلا کرن نے بہت اچھا ناولٹ لکھا ماشاء اللہ۔ خوب صورت بننے میں کیسٹر آئل والے طریقے پر عمل کیا۔

اور سمیرا حمید آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ باتیں رمشہ خان سے بھی اچھا تھا۔ فرح کی ٹپس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ جب رسالہ ملا تو عید گزرے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ کہنی سنی میں خوب کہی۔ کرن کرن روشنی اچھا تھا اور آپ خیریت سے ہیں مزے دار۔ میری بیاض سے اچھا سلسلہ تو ہے پر شعر.....

"کچن کے پکوان" گوشت گوشت گوشت ہائے اللہ جی جو بھی رسالہ لیں یہی سامنے آتا ہے۔ بھئی گھر رسالے اندر باہر ہر جگہ گوشت۔ براہ کرم اگلی دفعہ سبزی کی ریسیپی دیجیے گا۔ نفسیاتی الجھنیں اچھا سلسلہ ہے۔ حالم کا مطلب بتادیں۔

ج: پیاری آمنہ! لوگوں کی پروا تو آئے کت نہیں کرتی، آپ بھی نہ کریں۔ لوگوں کا کیا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ مشرقی بیویاں کیسی غلامانہ زندگی گزارتی ہیں تو اگر کہانی میں ہیرو نے ہیروئن کے پاؤں دھلا دیے تو کون سی قیامت آگئی۔ بیاض کے اشعار قارئین بھیجتے ہیں اور ایک آپ ہی نہیں خالدہ کو بھی گلہ ہے۔ بس جی کیا کریں ہم تو مجبور وفا ہیں۔

حالم کا مطلب ہے خواب دیکھنے والا۔

ثناء ذوالفقار..... نورے والی، رحیم یار خان

ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ اس دفعہ کے دونوں ہی انٹرویو نئے لوگوں سے لیے گئے تھے۔ رمشہ خان اور فرح محمد کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا "دشت جنوں" میں خوش نصیب بیچاری کے نصیب اس کا بالکل ساتھ نہیں دے رہے۔ شاہ میر اپنا کھیل بہت چالاکی سے کھیل رہا ہے۔ اوپر سے تایا جان نے بھی فیصلہ سنا دیا ہے۔ "رہ نورد شوق" سمیرا حمید کے الفاظ تو باندھ لیتے ہیں۔ بہت اچھا ناول لکھا سمیرا حمید نے۔ اس ناول کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

"حسن المآب" سائرہ رضا ناول کو بہت اچھی طرح آگے بڑھا رہی ہیں۔ دو اقساط سے ماہ رو کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ "حالم" نمرہ احمد کے دوسرے ناولوں کی طرح ہی ایک انٹرسٹنگ اسٹوری ہے۔ تالیہ کا کردار بہت انٹرسٹنگ ہے۔ ایڈم بے چارا سا ہے "مژدہ صبح" کرن نعمان کی اچھی کوشش تھی۔ افسانے اس دفعہ سارے ہی اچھے تھے۔ "ناسمجھ" نگہت عبداللہ کا افسانہ بہترین تھا۔ "میری بیاض سے" سارے اشعار بہت اچھے تھے لیکن فوزیہ ثمریث، سدرہ بتول اور سیدہ لوبا سجاد کا انتخاب بیسٹ تھا۔ "اعجاز کا رنگ" اور "خامشی کو زباں ملے" یہ دونوں سلسلے کیا ختم ہو گئے ہیں۔

ج: پیاری ثنا! آمنہ ریاض تو جو کریں گی سو کریں گی مگر خوش نصیب کو بھی عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔ ایسے لوگوں سے ہمدردی کرنا حماقت ہے جو آپ کے جذبات سمجھ ہی نہیں سکتے۔ صیام اور ماہ نور جیسے لوگ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہو سکتے خصوصاً" ماہ نور جو شاہ زیب کی ذرا سی توجہ پا کر اتنی پھول گئی کہ اپنی سگی بہن سے بھی بدگمان ہو گئی۔ ماں اور بہن سے زیادہ کوئی کسی کو نہیں جان سکتا۔ خوش نصیب ان کی نظروں کے سامنے ہی پلی بڑھی پھر بھی ماہ نور کو یقین نہیں آ رہا تو وہ بدترین انجام کی مستحق ہے اور خوش نصیب کو بھی اس کی حماقت کی سزا ملنی چاہیے۔

"اعجاز کا رنگ" اور "خامشی کو بیاں ملے" کبھی کبھی صفحات کی کمی کی وجہ سے شامل نہیں ہو پاتے۔ بند نہیں کیے ہیں۔

ثریا فرخ.....

چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کا ذکر ہے۔ یعنی کہ "جب آتش جواں تھا" اور ہمیں کالج کا نیا نیا اسٹوڈنٹ ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو بڑی "توپ" قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ اور امی کے منگوائے ہوئے رسالوں زیب النساء، حور اور اردو ڈائجسٹ وغیرہ پڑھ پڑھ کر لمبی لمبی دوپہریں گزارا کرتے تھے کہ اچانک ایک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ جس نے سارے رسالے بھلا دیے۔ یعنی وہ جسے "خواتین ڈائجسٹ" کہتے ہیں۔ یہ بہترین ڈائجسٹ جس کی اور خوبیوں کے علاوہ اس

کا سائز اضافی خوبی تھا۔ آرام سے ہاتھ میں پکڑ کر لیٹ کر پڑھ لیا جاتا۔ دلچسپ افسانے خوب صورت بننے کے نسخے۔ نفسیاتی الجھنوں کے حل۔۔۔ اور بہت کچھ!

اس وقت کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ خواتین ڈائجسٹ قسم کی چیز عورتوں کو ہضم نہیں ہو سکے گی۔ مگر بھئی یہ تو ماشاءاللہ ۔۔۔ نسلوں کو فیض یاب کر رہی ہے۔

پہلے پاپا۔۔۔ پھر بھائی اور اب شوہر نامدار برسہابرس سے "سبق" یاد کر چکے ہیں کہ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں خواتین ڈائجسٹ لانا ہے۔ مہینے کا سودا بے شک لیٹ ہو جائے۔ شعاع اور خواتین لیٹ نہ ہوں۔۔۔ ورنہ نقص امن کا خطرہ ہو جاتا ہے۔

آپ کے رسالے کی ہر بات بہت اچھی ہے بس ایک بات بہت بری لگتی ہے' وہ یہ کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے' ہفتہ بھر بھی نہیں لگتا۔۔۔ اور بعض دفعہ تو اس سے بھی کم۔۔۔ ایک دفعہ کوئی ناول یا افسانہ شروع کر دیا جائے تو ختم کیے بغیر مزا ہی نہیں آتا۔ کیا یہ تھوڑا سا "صحت مند" نہیں ہو سکتا۔ "حسن المآب" نے تو ہمارا دل جیت لیا۔۔۔ اس ماہ کی قسط بہت جاندار تھی۔ میرا رب جب چاہے جسے چاہے ہدایت دے۔ موسیٰ بھی راہ راست پہ آ رہا ہے۔ اس ماہ دونوں کرنوں (یعنی انیلا کرن اور کرن نعمان) نے رسالے کو جگمگا دیا۔ دونوں ہی افسانے بہت اچھے ہیں۔ سمیرا حمید۔ تسی تے کمال کر دتا ای۔ کیا غضب کا ناول ہے اور کتنا اچھوتا!

نفسیاتی الجھنوں میں ایک بچی کا خط پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی جا رہی ہے۔ اللہ اس کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ اتنے عرصے میں خط کیوں لکھا تو بھئی یوں تو رہا ہیں۔۔۔

لیکن تیرے "خیال" سے غافل نہیں رہا

ج : بہن ثریا فرخ! "دیر لگی آنے میں تم کو' شکر ہے پھر بھی آئے تو" ساتھ میں ایک اضافہ اور کریں گے کہ خوب آئے

آپ کی ہدایت کے مطابق کچھ نہیں کہہ رہے مگر اب آ گئی ہیں تو تواتر سے آیئے گا۔ بہت عمدہ خط۔ بہت عمدہ تبصرہ۔ خواتین ڈائجسٹ کی "صحت" بہت سے عوامل سے مشروط ہے۔ حالات فی الحال اس کی اجازت نہیں دے رہے۔ سو معذرت چاہتے ہیں۔

صائمہ نور۔۔۔ ڈیفنس ویو' کراچی

ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی دل کی کلیاں کھل گئیں کیوں؟ بھئی سمیرا اور کیا؟ "رہ نورد شوق" اس قدر منفرد' ہر جملہ ایک نیا جہاں دکھاتا ہوا' آگہی کے در کھولتا ہوا' ہر عبارت نے دل چھوا۔ یقین کریں ہر جملہ پر اثر' اپنی مثال آپ! جدوجہد کی لازوال داستان۔ جس نے مراد پا کر خود کو امر کر دیا! ایک بار پھر مبارک باد سمیرا آپ کو۔۔۔ ماشاءاللہ۔۔۔ اور ادارے کو بھی اتنی پختہ کار مصنفہ کے شامل ڈائجسٹ ہونے پر! نمرہ احمد تو دل و جان ہیں ہماری اور ان کے ناولز کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے مگر پتا نہیں کیوں اس بار مکمل ہونے تک پڑھنے کے لیے خود کو روک دیا۔ عطیہ خالد کی الٹے نقرے کہنے والی خالہ' تھوڑی چالاک' تھوڑی بے وقوف اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا عطیہ جی! ہمیں اتنا ہنسایا جو آپ نے۔ عطیہ نے ہنسایا تو حاجرہ ریحان نے رلایا جی! آنسو ہی آ گئے۔

آپ شاید یقین نہ کریں چار مہینے سے جس طرح شب و روز بسر ہو رہے ہیں اللہ ہی جانتا ہے۔ سخت مشکل ہے بس

دعائے مغفرت

محترمہ رضیہ جمیل کے بہنوئی فاروق عزیز آفندی طویل علالت کے بعد اس دارفانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

فاروق صاحب کافی عرصہ بیمار رہے۔ بیماری کا یہ دورانیہ انہوں نے بہت صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ ہم محترمہ رضیہ جمیل اور ان کی بہن قریشہ آپا کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم فاروق عزیز صاحب کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اللہ پاک نے ہمت دے رکھی ہے اس بار تو عید پر دل خوب اداس تھا۔ شعاع، خواتین ــــــــــ میں نے سینے سے ایسے لگایا جیسے کسی دیرینہ دوست کو گلے لگاتے ہیں۔ دل کو بہت ڈھارس ملی، سکون ملا۔

ج : پیاری صائمہ! لڑائی میٹھی ہو یا کڑوی۔ لڑائی تو لڑائی ہوتی ہے۔ محبت کے دعوے بھی ہوتے ہیں اور لڑائیوں کی دھمکیاں بھی "خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔"

آپ کہانیاں بھیج دیں مگر تھوڑا انتظار اور صبر بھی کیا کریں کہ ڈاک ماشاء اللہ بہت ہوتی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ آپ کی تمام پریشانیوں کو دور کردے۔ آمین۔

فائزہ منصور عرفان...... اسلام آباد

عمر رفتہ کی سینتیس بہار گزر چکیں اور خواتین سے تعلق چوبیس سال پرانا۔ خطوں کی تعداد تین۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرا خط بھی بوجہ سمیرا حمید (یارم پر تنقید) اب تیسرا خط بھی بوجہ سمیرا حمید اور ان کا لکھا جانے والا شاہکار "رہ نورد شوق" جو الفاظ بھی اس ناول کی تعریف کے لیے ادا ہوں گے کم ہیں۔ کیا ہی کمال، سادہ الفاظ میں ایک شاندار پیغام خاص طور پر ان بچے اور بچیوں کے لیے جو انٹرنیٹ اور واٹس ایپ جیسی خرافات میں پڑ کر یہ بھول چکے ہیں کہ اللہ پاک نے ان کی تخلیق کس مقصد کے لیے کی ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ "رہ نورد شوق" کو پڑھ کر میرے وہی محسوسات تھے جو علامہ اقبال کی نظم "مرد مسلم" پڑھ کر تھے۔ ادارے کی بھی ممنون ہوں جن کے توسط سے ہمیں راہنمائی ملتی رہتی ہے اور مصنفات سے بھی درخواست کروں گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایسے ناول لکھیں جن میں ایسے سبق آموز پیغامات موجود ہوں۔ اس کہانی "رہ نورد شوق" میں جلد بازی کے حوالے سے دیا گیا سبق بھی داد کے لائق ہے۔

قلم کہہ رہا ہے کہ سارا خط "رہ نورد شوق" کے نام ہو مگر ایک وہم بھی دور کرنا چاہوں گی۔ "حسن المآب" اور ابتدائی اقساط سے ہی موسیٰ بی کا کردار ایک نہایت مشہور و معروف (مرحوم) سنگر کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔ اس بار کی قسط میں تو کمال مماثلت تھی۔

ج : پیاری فائزہ! آپ کو سمیرا کی تحریر پسند آئی شکریہ۔ مگر ہم نے پورا پرچا بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا۔ دو چار جملے اس بارے میں بھی لکھ دیتیں تو اچھا لگتا۔ سائرہ رضا کی تحریر میں آپ نے جس سنگر کی مماثلت کا کہا ہے تو یہ کہانی ان کی نہیں ہے۔

فائزہ شاہد...... شہداد پور

خواتین لینا اور پڑھنا تو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ اس کے ساتھ بہت پرانا رشتہ ہے۔ نمرہ جی آپ کے لیے کیا کہیں، لگتا ہے بس۔ آپ کے پاس جادوئی چھڑی ہے "دشت جنون" میں پلیز خوش نصیب کو خوش نصیب ہی رکھنا "حسن المآب" اور ... کیا فنٹاسٹک موڑ آیا ہے لیکن حسنل کو کیا ہو گیا۔ باقی سارے سلسلے بیسٹ لگے لیکن سمیرا حمید کو دیکھ کر چیخ نکلنے لگی۔ واہ سمیرا جی کیا نیا انداز ہے۔ "رزق" بچپن میں اصغری اور اکبری کی کہانی سنتے تھے لیکن نیا انداز، نیا نام خوب لگا۔ خواتین میں ہمیں کام کرنا اور صبر کرنا خوب سکھایا جاتا ہے۔ ہر کہانی منفرد اور سبق آموز پوری طرح پڑھ لینے کے بعد ماڈل کو دیکھا، معصوم چھوٹی مگر ہیوی جیولری بہت اچھی لگی۔ اسی کے ساتھ میری طرف سے پیغام

دوستو! یہ علم و حکمت کا سمندر ہے کتاب
اس کا ایک ایک حرف ہے روشن مثال آفتاب

ج : پیاری فائزہ! پرچے کی تعریف اور پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی شعر نما نصیحت قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

اقرا جٹ...... منچن آباد

ستمبر کے شمارے کا ٹائٹل زبردست لگا۔ کہنی سنی سے کرن کرن روشنی (بہت اچھا سلسلہ ہے) دشت جنوں آمنہ جی خوش نصیب کے ساتھ اتنا برا نہ کریں۔ بہت سیڈ ہو گئے ہیں۔ ہم تو شامیر اف میرا تو دل کرتا ہے اس کی ٹانگیں توڑ دوں۔ "حالم" نمرہ جی ونڈر فل۔ بس اسی اسپیڈ سے لکھتی جائیں۔ مجھے حالم بہت انٹرسٹنگ اسٹوری لگی۔ "حسن المآب" حسنل کا رویہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ "رہ نورد شوق" سپر ایکسیلنٹ۔ سمیرا حمید جی بہت کمال کی تحریر تھی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ "مژدہ صبح" کرن نعمان الگ موضوع پر لکھا اچھا لگا۔ "رزق" اینلا کرن نائس۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

ج : پیاری اقرا! آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ آمنہ

ریاض خوش نصیب کے ساتھ برا تھیں کر رہی ہیں۔ خوش نصیب نے خود اپنے ساتھ برا کیا ہے۔ اپنی سگی بہن کو بھی کوئی بات نہیں بتائی، اکیلے ہی سارے کارنامے انجام دیتی رہی۔ پھر صیام کی ہمدردی میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ کیف کی قربانی دے ڈالی واحد دوست تھا اسے بھی دشمن بنالیا۔ اب ایسی حماقتوں کا نتیجہ تو یہی نکلنا تھا۔

عنبر عتیق الرحمان..... شاہدرہ لاہور

اس مرتبہ بھی خط لکھنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن کچھ تحریروں نے مجبور کر دیا کہ اپنی رائے کا اظہار کیا جائے۔ کرن نعمان کی تحریر میں آغاز، بچوئیشنز، ڈائیلاگ سب کچھ زبردست تھا۔ لیکن یہ بات بہت غیر حقیقی اور بری لگی کہ آفرین نے اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنے بیٹے کو چھوڑ دیا۔ کہانی کا آغاز تو زبردست تھا۔ لیکن غیر فطری اختتام کی وجہ سے اس کا لطف جاتا رہا۔ غیر فطری بات یہ تھی کہ اتنے سالوں کی نفرت چند دن کی خدمت میں بہہ گئی۔ اگر کرن نعمان کو برا لگا ہو تو بے حد معذرت۔ انیلا کرن علی کی تحریر بہت زیادہ پسند آئی۔ مجیلہ کا جٹھانی کو ان کے انداز میں جواب دینا اچھا لگا۔

سمیرا حمید کا ناول زبردست سے بھی آگے کی چیز ہے۔ لفظوں کی جادوگری کی تعریف کرنے کے لیے حقیقتاً "اپنے الفاظ بے مایہ لگتے ہیں۔ جتنا طویل اور پُراثر ان کا ناول ہے اس کی تعریف کا حق صرف اسی صورت ادا ہو سکتا ہے کہ تعریف بھی اتنی ہی طویل، برجستہ اور پُراثر ہو۔

"حسن المآب" کی یہ قسط بہت اچھی لگی "اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر" بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اللہ کرے حسنل بھی اس سفر میں اس کی شریک سفر ہو جائے۔ افسانوں میں خالہ 'سب سے اچھا لگا۔ زبان کی لغزشیں اور منڈی میں بھاؤ تاؤ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ نگہت عبداللہ کے افسانے میں ہیروئن کی بے وقوفی پر حیرت ہوئی ایک ذرا سی بات یاد رہی۔ شوہر کی محبت نظر نہیں آئی۔ نیت اور بدگمان بھی اچھے افسانے تھے۔ "دشت جنوں" میں آئے کت' کے راز سے پردہ اٹھا، تجسس ختم ہوا۔ لیکن خوش نصیب کی پریشانیاں پریشان کر گئیں۔

اداریے کی شروع کی سطریں بہت پسند آئیں۔ اگر ہم یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں تو کبھی بھی کسی بھی طرح کی تکلیف اور آزمائش کے وقت ثابت قدم رہیں گے۔"

"کرن کرن روشنی" نے ہمیشہ کی طرح مفید معلومات سے مستفید کیا۔

انشاء جی کا کالم پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ خاص طور پر ان سطروں نے بہت مزہ دیا" تبلیغی تقریریں اس جذبے سے کرتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے ہم ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔"

فرح محمد سے ملاقات کرکے بہت اچھا لگا۔

ج: پیاری عنبر! مفصل اور جامع تبصرہ کا شکریہ۔

کرن نعمان کی کہانی پر آپ کا اعتراض بجا ہے۔ آفرین نے اپنی محبت کو پانے کے لیے بیٹے کو نہیں چھوڑا، اس کا شوہر ذہنی مریض تھا۔ اس پر تشدد کرتا تھا۔ محبت تو در کنار ایسے شخص سے انسیت بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ ارسلہ کو اس شخص سے جنونی محبت ہے۔ وہ ان دو جنونی لوگوں کی نفرت اور محبت کے درمیان نہیں رہ سکتی تھی۔ بچے کو اس لیے چھوڑا کہ دادی کو بچے کی بہت چاہ تھی۔ اسے پتا تھا کہ اس کا بچہ بہت اچھی طرح پرورش پائے گا۔ جہاں تک چند دن کی خدمت سے سالوں کی نفرت محبت میں بدلنے کا تعلق ہے۔ تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک ہی کیفیت سے تھک جاتا ہے۔ بس عادتاً" اس کو نبھائے جاتا ہے اتنے سالوں میں..... عباد علی خان کی نفرت پر بھی وقت کی گرد جم گئی تھی، حادثے نے اوقات یاد دلائی تو لوٹ آئے۔

مروت دکھانے سے کم ظرف لوگ شیر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کے ساتھ مروت کرکے یا اس کی باتوں کو نظر انداز کرکے ہم بہت سی الجھنوں سے بچ جاتے ہیں۔ کسی کو آئینہ دکھانے یا جواب دینے سے بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ کم از کم ہماری پالیسی تو یہی ہے۔ ویسے اب تک تو اللہ کا کرم رہا ہے کہ زیادہ تر ہمیں اچھے ہی لوگ ملے ہیں۔

زارا ڈوگر..... گوجرانوالہ

خواتین کا ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ سب سے پہلے دشت جنوں پڑھا۔ کہانی نے اسٹارٹ بہت اچھا لیا تھا مگر اب لگ رہا ہے جیسے آمنہ آپی کہانی کو گھسیٹ رہی ہیں اور ایک

بات سمجھ میں نہیں آئی' جب آئے کت عین شادی کے ٹائم گم ہوئی تھی تو بعد میں کہانی میں یہ بھی بتایا تھا کہ جنگل میں ایک دلہن کے لباس پہنے ہوئی لاش ملی تھی جنگل سے' اگر آئے کت ترکش بوائے فرینڈ کے ساتھ گئی تھی تو وہ جنگل میں کون تھا۔ عالم ابھی پڑھا نہیں۔ حسن المآب سائرہ آپی مجھے بہت پسند ہیں کہ ان کی تحریریں بھاری بھرکم الفاظ سے بھری نہیں ہوتیں۔ ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ اور اب سمیرا حمید کے "رہ نورد شوق" اتنا اعلا' اتنا کمال کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ اتنی امید دی انہوں نے۔ اس کہانی کو "اسٹوری آف دی ایئر" کہا جائے تو بجا ہو گا۔ تخلیق کسی بھی مصنف کی ہو' وہ شفاف دل پر اترتی ہے۔ "اف یہ جملہ۔ آسم کہانی تھی۔ رمشا خان اور شیفت فرح سے ملاقات اچھی رہی۔

ج : پیاری زارا! اگر سب کچھ ہم بتا دیں گے تو پھر کہانی میں آپ کیا پڑھیں گی؟ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نبیلہ ساجد..... عارف والا

جیسے ہی خواتین کھولا' دھک سے رہ گئے کیونکہ دشت جنوں غائب تھا اشاعت میں گڑبڑ تھی۔ انٹرویوز ڈبل ڈبل شائع ہوئے تھے۔ ناولز لسٹ میں دشت جنوں تھا مگر پرچے میں غائب۔ لیکن شکر عالم اور حسن المآب موجود تھا۔ تو جناب حسن المآب کے بارے میں تو کیا کہیں۔ سائرہ رضا میری فیورٹ رائٹر ہیں اور کیا کمال کا لکھتی ہیں۔ حسن المآب میں تو دل اش اش کر اٹھتا ہے۔ لکھنے کا بے ساختہ انداز خوب صورت جملے اور موضوع بھی زبردست' جولائی سے ستمبر تک تو اتنا زبردست ناول لکھا کہ میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں تعریف کے لیے۔ اس قسط کو پڑھ کر تو آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حسنل پہ تو بہت غصہ آیا کہ کہاں تو حسنل موسیٰ کو پانے کے لیے تڑپتی تھی اور کہاں اتنی بے حس ہو گئی کہ موسیٰ کے دل کی حالت نہیں سمجھ رہی۔

سمیرا حمید کا "رہ نورد شوق" بھی بہت اچھا ناول تھا سمیرا جی! آپ نے تو شیفت کی بات کی' یہاں تو ہر شعبے میں قابلیت اور ذہانت نہیں دیکھی جاتی' بس پیسہ اور رشوت چلتی ہے۔ شکر ہے کو صبر کا پھل مل گیا۔ ہمارے نام میں محترمہ نور آمنہ درانی کا خط پڑھ کے اچھا لگا کہ وہ اسپیشل بچوں کی سائیکولوجسٹ ہیں میری بچی بھی اسپیشل بچی ہے تو دلچسپی سے ان کا خط پڑھا۔ بہت پیارے بچے ہوتے ہیں یہ۔ اللہ آپ کو اجر دے۔

ج : پیاری نبیلہ! ہمیں قسط وار کہانیاں بہت تاخیر سے ملتی ہیں، جس کی وجہ سے اکثر پرچا تاخیر سے شائع ہوتا ہے۔ آپ اتنی دل گرفتہ نہ ہوں' خواتین کے لیے خط آپ 22 تاریخ تک لکھ سکتی ہیں۔ بعض اوقات بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے کوئی کوئی کاپی غلط سلط ہو جاتی ہے۔ آئندہ ایسا ہو تو بک اسٹال والے سے تبدیل کرا لیں یا پھر ہمیں بھیج دیا کریں۔ آپ اپنا ایڈریس لکھ دیں۔ ہم دوسری کاپی بھجوا دیں گے۔

گل مینا خان اور حسینہ ایچ ایس..... مانسہرہ

ایبٹ آباد سے واپس آتے ہوئے 14 اگست کو جہاں "اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں" کی صدا ہمارے آلہ سماعت سے ٹکرائی تو ہم نے بھائی کی طرف نظر کرم کی (چلو کوئی ایک دن تو ہے جب ہم پاکستانی ایک ہونے کا نعرہ تو لگاتے ہیں) اور بھائی ہماری نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے واقعی ایک ہونے کا ثبوت بھی دے دیا۔ جی ہاں ہمیں بھائی جان کی نظروں سے بچا کر خواتین ڈائجسٹ دلایا۔ ٹائٹل نگاہوں میں جچتے ہی دل میں سرایت کر گیا۔ "کرن کرن روشنی" نے من کے افق پر روشنی بکھیر دی "عالم" نے تو ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ "حسن المآب" شکر ہے موسیٰ کو صحرا سے نجات مل گئی۔ "حسن المآب" نے تو اپنے حصار میں ہمیں بڑی خوب صورتی سے باندھ لیا ہے۔ کیا کہنے جی۔ افسانے سب ہی سبق آموز اور دلکش تھے۔ "میری بیاض سے" "فوزیہ ثمروٹ' فریحہ شبیر اور نگہت غفار کی شاعری قلب میں ٹھاہ کر کے کھب گئی۔ آپ کا باورچی خانہ کی ٹپ مفید ہیں۔

ج : پیاری سی گل مینا! ہم نے آپ کا خط پڑھ لیا اور آپ نے ہماری بات پر یقین کر لیا' ہمارے لیے یہی بہت ہے۔

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔
باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی ہے۔(World's Most Expensive Poisonدنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایک قسم "ل... Readmore

---

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال [illegible] 29... Readmore

---

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

---

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کونٹزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھریوں میں ... Readmore

---
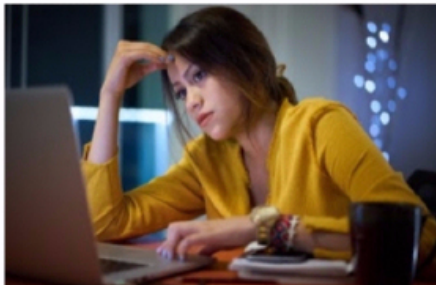
Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

---

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے' مگر وہ انکار کرکے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی' ماموں' معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں' مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کرلیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے' مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں' مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے' اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کردیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کرکے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کردیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقع سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کرکے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر بیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے' وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران' خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فراڈیے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران در حقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر

صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔
شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے' مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔
شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے' یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے' مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔
شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔
بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا' مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا' مگر اردشیر ازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا' مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بد مزاج بنا دیا ہے۔
مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔
خوش نصیب' عرفات ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہو جاتا ہے۔
شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا اور وہ برا حشر کرے گا۔
ماہ نور' شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔

بیسویں قسط

بادلوں اور بارش کی چادر میں چھپی ہوئی وہ رات۔۔۔ ایک مشکل رات تھی۔
اپنے بیٹے کی قسمت کا فیصلہ اپنی مرضی کے بغیر ہوتے دیکھنے کے بعد فضیلہ غصے سے کھولتی ہوئی کمرے میں واپس آ گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اپنے بڑبولے پن سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ ہوا تھا۔۔۔
خوش نصیب۔۔۔ اور وہ بھی بہو کے روپ میں۔۔۔
وہ جتنی پریشان ہوتیں اتنا ہی کم تھا۔ خوش نصیب تو انہیں اپنے مجازی خدا کی بھتیجی کے طور پر بھی برداشت نہ ہوتی تھی کجا کہ اسے اپنی بہو بنا کر ساری زندگی برداشت کرنا۔ شفیق صاحب ابھی تک کمرے میں نہیں آئے تھے۔ (کمرے میں جا کر انہیں زیر عتاب تھوڑی نہ آنا تھا۔۔۔) صرف آدھے گھنٹے پہلے ہونے والے واقعے کسی فلم کی طرح فضیلہ بیگم کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔۔۔
"فضیلہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے بھائی صاحب! اپنوں کے عیب خود ہی ڈھانپے جاتے ہیں اور ویسے بھی جب رشتہ گھر میں موجود ہے تو باہر سے امید لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔"
"لڑکا گھر میں موجود ہے؟ شفیق! تم کس کی بات کر رہے ہو؟"
"ارے بھائی صاحب! اپنے طوطے کی اور کس کی۔۔۔ ہمیں اپنے بیٹے کو بیاہنا نہیں ہے کیا؟ اور پھر گھر کی بچی گھر میں ہی رہ جائے گی، اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو گی۔"

”ہم م م م۔۔۔ بیٹی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق باپ کے بعد ماں کو ہوتا ہے۔ تم بتاؤ روشن! تم کیا چاہتی ہو؟“

”بھائی صاحب! آپ کو جو مناسب لگتا ہے آپ کریں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔“

”ٹھیک ہے شفیق۔۔۔ تمہارا مشورہ اچھا ہے۔ ہمیں خوش نصیب کے لیے شاہ جہاں کا رشتہ قبول ہے۔“

اور بس۔۔۔ یہی آخری فقرہ انی کی طرح ان کے دل میں گڑ گیا تھا اور کسی ہتھوڑے کی طرح ان کے سر پر برس رہا تھا۔ خوش نصیب، بہو بن کر ان کی زندگی کو کس طرح حرام کرے گی، وہ ابھی سے چشم تصور سے دیکھ رہی تھیں۔

”لیفٹ، رائٹ، لیفٹ، رائٹ۔۔۔“

پریڈ کے سے انداز میں کمرے کا طول و عرض ناپتے انہیں ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور سرتاج کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ یہ ایک گھنٹہ بھی انہیں ایک صدی سے کم نہ لگ رہا تھا اور برداشت تھی کہ بس ختم ہوئی جاتی تھی۔ تھک کر وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں تاکہ باہر سے ہی کوئی سن گن لے سکیں۔

اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتیں، دروازہ خود ہی کھلا تھا اور شفیق صاحب پرسکون انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ فضیلہ ٹھٹک کر اسی جگہ پر رک گئیں۔ شفیق صاحب کو دیکھتے ہی ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ پھٹ پڑی تھیں۔

”میں پوچھتی ہوں یہ سب کیا ہے شفیق صاحب؟ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اس بدکردار کو اپنی بہو بنالوں گی۔ کہاں میرا شاہ جہاں اور کہاں وہ خوش نصیب۔۔۔ ذرا جو اس منحوس نے اپنے نام کا اثر لیا ہو۔۔۔“ وہ بولنے پر آئیں تو بولتی ہی چلی گئیں۔

شفیق صاحب بڑے تحمل سے دروازے میں ہی کھڑے ان کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے کو رکیں، شفیق صاحب نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھے۔ ان کا پرسکون انداز، فضیلہ بیگم کو مزید آگ لگا رہا تھا۔

”اب آپ کچھ بولیں گے یا بس میرے صبر کا ہی امتحان لیتے رہیں گے؟“ وہ چڑ کر بولی تھیں۔

”نیک بخت۔۔۔ (اللہ اس جھوٹ پر معاف کرے۔۔۔) تم بولنے دو گی تو ہی کچھ بول پاؤں گا نا۔۔۔“ ان کے اطمینان میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا اور یہی چیز فضیلہ بیگم کے غصے کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ ”آؤ بیٹھو یہاں۔۔۔ سکون سے بیٹھ کر بات کرو جو بھی کرنی ہے۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو لگتا ہے میری زندگی میں کوئی سکون بچا ہے؟ اور اگر رہ بھی گیا ہے تو آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی بھتیجی اسے برقرار رہنے دے گی۔۔۔؟ شفیق صاحب! کیوں دشمن بن رہے ہیں میرے سکون کے۔۔۔“ وہ تن فن کرتی صوفے پر آبیٹھیں۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں خوش نصیب پر اعتراض کیا ہے؟ گھر کی بچی ہے۔۔۔ گھر میں ہی رہ جائے گی۔۔۔ پھر تم اسے جانتی ہو، تمہیں پتا ہے کہ تم اسے کس طرح سدھار سکتی ہو۔۔۔ باہر سے کسی کو بہو بنا کر لاؤ گی تو وہ تمہیں ناکوں چنے چبوائے گی۔۔۔ اور خوش نصیب کی حرکتوں سے سب واقف ہیں۔ اس پر سختی بھی کرو گی تو تمہیں کون پوچھے گا؟“ انہوں نے جیسے کسی بچے کو لالی پاپ دے کر بہلانا چاہا تھا۔

”ارے کمال کرتے ہیں آپ شفیق صاحب! میں کہتی ہوں کہ میرے طوطے میں کمی ہی کیا ہے جو میں ایک بدکردار کو اس کے لیے بیاہ لاؤں۔۔۔“ تنک کر جواب دیا تھا۔

”تم اچھی طرح سے جانتی ہو فضیلہ بیگم! کہ تمہارے بیٹے میں کیا کمی ہے۔۔۔“ شفیق صاحب کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

وہ جیسے اس بے کار بحث سے اکتانے لگے تھے۔
فضیلہ کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئیں پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔ ''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ جانتی ہوں کہ میرا طوطا بڑا معصوم ہے۔۔۔ آج کل کے لڑکوں والی تیزی طراری نہیں ہے میرے بچے میں۔۔۔ ہائے ماں صدقے جائے اپنے لال کے۔۔۔ شفیق صاحب! آپ کس بلا کو میرے بچے کے سر منڈھ رہے ہیں۔۔۔ وہ تو دو دن میں میرے طوطے کو چیر پھاڑ کھائے گی۔۔۔''
فضیلہ بیگم شاہ جہاں کو شاید اصلی طوطا اور خوش نصیب کو جنگلی بلی سمجھ بیٹھی تھیں۔
''تم بتاؤ۔۔۔ کیا تمہاری نظر میں اور کوئی ہے جو تمہارے ''ہیرے جڑے لال'' کو اسی دماغی حالت کے ساتھ قبول کرلے۔۔۔؟''
فضیلہ کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔۔۔
''ہائے ہائے شفیق صاحب! غضب خدا کا۔۔۔ کیسے منہ بھر بھر کر اپنے ہی بیٹے کے بارے میں اول فول بول رہے ہیں۔۔۔ ارے مانا میرا بچہ تھوڑا بے وقوف ہے۔۔۔ آج کل کے لڑکوں کی طرح تیز طرار نہیں ہے۔ بڑا ایبا بچہ ہے میرا۔۔۔ ماں کی بات سنتا اور مانتا ہے۔ مگر آپ لوگوں کو تو میرا بچہ بے وقوف لگتا ہے نا۔۔۔''
شفیق صاحب نے جیسے ضبط کرتے ہوئے گہرا سانس لیا اور پھر سختی سے بولے۔
''فضیلہ بیگم! میری بات غور سے سنو کیونکہ میں یہ بات دوبارہ دہراؤں گا نہیں۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تم اپنے بیٹے کو معصوم کہہ رہی ہو جبکہ تم جانتی ہو کہ یہ معصومیت نہیں ہے، دماغی مسئلہ ہے۔ وہ نارمل لوگوں کی طرح نہیں ہے سو یہ خوش فہمی تو تم اپنے دل سے نکال دو کہ تمہیں اس کے لیے لڑکی آسانی سے مل جائے گی۔ اب آؤ دوسری بات کی طرف۔۔۔ خوش نصیب بدتمیز ہے، بات نہیں سنتی مگر یہ بات تم بھی جانتی ہو فضیلہ! کہ وہ بچی بدکردار نہیں ہے۔ اچھی طرح جانتے ہیں ہم ان بچیوں کو۔۔۔ وہ ایسی نہیں ہیں۔ آج جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کی اصلیت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اس سے ہمیں موقع ملا ہے کہ شاہ جہاں کا مسئلہ حل کرلیا جائے۔۔۔ تم صرف اس بارے میں سوچو۔۔۔ وہ تمہاری بہو بنے گی تو کچھ بھی ہو، تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا پائے گی۔ تمہارا بیٹا تمہاری مٹھی میں ہی رہے گا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر۔۔۔''
شفیق صاحب جو آگے کو ہو کر بیٹھے تھے، ٹانگ پہ ٹانگ رکھتے ہوئے صوفے کی بیک سے کمر ٹکا گئے اور مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔
اس گھر میں ان دونوں بچیوں کا حصہ ہے۔ ماہ نور کی شادی کے بعد شامیر اس جائیداد کا مطالبہ نہیں کرے گا، وہ ویسے بھی واپس جانا چاہتا ہے، باقی بچی خوش نصیب۔۔۔ تو جو کچھ خوش نصیب کے حصے میں آئے گا، وہ اصل میں شاہ جہاں کا ہی ہوگا۔۔۔''
اپنی بات مکمل کرکے شفیق صاحب، فضیلہ بیگم کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھو، میں کتنا دور تک سوچ رہا ہوں۔ ان کی باتوں سے فضیلہ بیگم بھی یک دم متفق نظر آنے لگی تھیں۔ چند لمحے تذبذب کا شکار رہتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں جوڑ توڑ کیا تھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
کچھ ہی لمحوں بعد دونوں میاں بیوی سر جوڑے مستقبل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

☆☆☆

بادلوں اور بارش کی چادر میں چھپی ہوئی وہ رات۔۔۔ ایک مشکل رات تھی۔
اور وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس رات کی صبح ہو جائے لیکن ظاہر ہے یہ بھی اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔

رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ بادلوں نے جیسے خوش نصیب کی آنکھوں سے شرط باندھ لی تھی۔
چلو دیکھتے ہیں کون زیادہ برستا ہے۔۔۔ تم یا ہم۔۔۔
اور پھر وہ ہار گئی۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہونے لگے۔۔۔ اور ہار تو اب ہمیشہ کے لیے اس کا مقدر بنا دی گئی تھی۔
وہ پچھلے تین، چار گھنٹوں سے وہاں بیٹھی موسم کے تیور خود پر جھیل رہی تھی۔ ٹانگیں موڑ کر پیٹ سے لگائے۔۔۔ گھٹنوں کے گرد بازو و لپیٹے۔۔۔ وہ کسی بت کی طرح اپنا زخم زخم وجود سنبھالے، دیوار کے سہارے بیٹھی تھی۔
ماں کے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے اوپر آئی تھی مگر کمرے میں جانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چھت کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی اور خود کو جیسے رات کے اندھیرے میں چھپا لیا تھا۔ اسے نہ چھاجوں چھاج برستی بارش سے خوف آیا تھا نہ ہی ٹھنڈی ہوا اسے اس کے ارادے سے باز رکھ پائی تھی۔ شاید وہ اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی۔ سر تھا کہ کسی پھوڑے کی طرح تکلیف دیتا تھا۔ جسم ایسے محسوس ہوتا تھا کہ سب ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں مگر اس تکلیف کا کیا کرتی جو روح کو پہنچی تھی۔۔۔ اور سب سے زیادہ محسوس بھی ہوتی تھی۔
کچھ دیر پہلے اس نے اپنی ماں اور بہن کو چھت پر دیکھا تھا۔ اس کی ماں کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور ماہ نور نے انہیں کندھوں سے تھام کر سہارا دے رکھا تھا۔ روشن امی نے تو شاید اس کی موجودگی کو وہاں محسوس بھی نہیں کیا تھا لیکن ماہ نور اسے وہاں بیٹھا دیکھ چکی تھی۔ ماں کو کمرے میں بھیجنے کے بعد اس نے مڑ کر خوش نصیب کو دیکھا تھا۔ چند لمحے وہ وہاں کھڑی خوش نصیب کو دیکھتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔
غصہ۔۔۔ نفرت۔۔۔ تکلیف۔۔۔ دکھ۔۔۔
یہ سب جذبے خوش نصیب کے لیے تھے۔ کچھ لمحے خوش نصیب کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے مڑی تھی اور اندر چلی گئی تھی۔ خوش نصیب نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں تھا۔
وہ تو جیسے سب بھول گئی تھی۔۔۔ شامیر۔۔۔ ماہ نور۔۔۔ کیف۔۔۔ سب بھول بیٹھی تھی وہ۔۔۔
اگر کچھ یاد رہا تھا وہ تھا ماں کا ہاتھ۔۔۔ اس ہاتھ میں تھمی ہوئی جوتی، جو ایک تواتر سے اس پر برس رہی تھی۔۔۔
اور صرف ایک لفظ۔۔۔ بدکردار۔۔۔
"کیا میں بدکردار ہوں۔۔۔؟" اذیت کی انتہا پر جیسے اس نے خود سے سوال کیا تھا۔
"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔" اس کے دل نے گواہی دی تھی۔
"پھر۔۔۔ کیوں۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا یہ سب؟" وہ کرلائی تھی۔
مگر جواب نہیں ملا تھا۔۔۔ سناٹا تھا، سکوت تھا۔ دل کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔
"بتاؤ مجھے میری کیا غلطی تھی؟" وہ سسکی۔
خاموشی۔۔۔
"میں بدکردار نہیں ہوں۔۔۔" اس نے جیسے خود کو ہی بتایا تھا پھر وہ سوچنے لگی کہ کیا اس کی زندگی میں کچھ ایسا ہے جو اسے بدکردار کہا جاسکے۔
"میں بدکردار نہیں ہوں۔۔۔ میں نے کبھی کچھ غلط نہیں کیا۔۔۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ میرا دامن بالکل صاف ہے۔۔۔
پھر کیوں میرے اوپر اتنا بڑا الزام لگایا گیا؟ کیوں ان لوگوں نے مجھے اتنا بے اعتبار کردیا؟ کیا چند دن پہلے آیا ہوا وہ انسان ان کے لیے مجھ سے زیادہ قابلِ اعتبار تھا۔۔۔؟"

آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟"
اور اس کیوں کا جواب ہی تو نہیں مل رہا تھا اسے۔
ڈھیر سارے سوالوں میں سے کسی ایک کا جواب بھی اس کے پاس موجود نہیں تھا۔۔۔
بارش کی شدت میں کمی آنے لگی تھی مگر ہوا کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔اس کا جسم بالکل سُن تھا لیکن اس نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔دکھتے ہوئے سر کو ہاتھوں میں تھامے وہ مسلسل اپنی غلطی تلاش کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھی۔
"ہاں ٹھیک ہے کہ میں بدتمیز تھی۔۔۔منہ پھٹ تھی۔۔۔میں نے کبھی کسی کا لحاظ نہیں کیا۔۔۔ہمیشہ ان لوگوں کو تکلیف دینا چاہی۔۔۔اس سب کے باوجود میں بدکردار نہیں ہوں۔۔۔نہ ہی کبھی تھی۔۔۔میرا خاندان، میرے گھر والے۔۔۔یہاں تک کہ میری ماں اور میری بہن جو میری رگ رگ سے واقف تھیں، انہوں نے بھی میرا یقین نہیں کیا۔۔۔
تو پھر میں اب تک کن لوگوں کے لیے سوچ رہی تھی؟ کن لوگوں کی بھلائی چاہتی تھی۔۔۔ان لوگوں کی جنہیں میرے کردار تک پر یقین نہیں ہے۔۔۔
میری ماں۔۔۔جس نے مجھے پیدا کیا، میری پرورش کی، میری تربیت کی۔۔۔آج اس کے لیے اس کی اپنی تربیت ہی ایک سوالیہ نشان بن گئی۔۔۔
میری بہن۔۔۔جسے بچانے کے لیے میں نے اپنی ذات تک کی پرواہ نہ کی اور اس نے ایک بار بھی مجھ سے سچائی جاننے کی کوشش نہیں کی اور منہ پھیر لیا۔۔۔
اور پھر یہ باقی سب لوگ۔۔۔صیام، کیف، منہا۔۔۔یا پھر میرے نام نہاد بزرگ۔۔۔کوئی بھی میرا اپنا نہیں بنا۔

تو جب یہ لوگ ہی میرے اپنے نہیں بنے تو میں اب تک کیوں ان کے لیے شامیر کے سامنے کھڑی رہی؟
کیوں میں نے اپنی پرواہ نہیں کی اور صرف ان کے بارے میں سوچا۔۔۔؟
اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی جیسے اپنے سوالوں کے جواب اپنی ذات سے نہ ملنے پر وہی سوال اب ہر ذات کے مالک سے کر رہی ہو۔
"آپ تو سب جانتے ہیں نا اللہ۔۔۔آپ تو جانتے ہیں نا کہ میں ان سب کے معاملے میں کس قدر مخلص تھی اور آپ نے دیکھا نا کہ میرے خلوص کے بدلے میں مجھے کس طرح ذلیل کیا گیا ہے۔۔۔اور آپ یہ بھی کہتے ہیں نا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور مال کا بدلہ مال ہے۔۔۔تو بس میرے اللہ اب اس ذلت کے بعد مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں۔۔۔میری بلا سے شامیر صیام کو نقصان پہنچائے یا ماہ نور سے شادی کرلے۔۔۔میرا اب ان سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔
مجھے بس اب اپنے بارے میں سوچنا ہے۔۔۔مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔۔۔مجھے اب کبھی ان کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا۔۔۔آج میری ماں نے جس طرح مجھے بے اعتبار کیا ہے۔۔۔میرا خود سے عہد ہے کہ میں اب بھی ان سے وہ اعتبار واپس نہیں مانگوں گی۔۔۔میں یہاں سے کہیں بہت دور چلی جاؤں گی۔۔۔بس آپ میرا ساتھ دینا اللہ۔۔۔اب صرف آپ کا ساتھ ہی چاہیے ہے مجھے۔۔۔"
بے آواز بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں موند لی۔
بارش ایک بار پھر سے زور پکڑ رہی تھی۔وقفے وقفے سے چمکتی ہوئی بجلی اور گرجتے بادل کسی بھی کمزور دل انسان کو ڈرانے کے لیے کافی تھے مگر خوش نصیب کو فی الوقت ہوش ہی کہاں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سر جھکائے کمرے کی طرف چل پڑی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا اور ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی گیلری میں چلی گئی تھی اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

پوری چھت تیز دھوپ سے زرد ہو رہی تھی۔ داہنی ہاتھ والی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے کبوتروں کے بند ڈربے ہری ترپال سے ڈھانپے گئے تھے لیکن کسی نہ کسی ڈربے میں کوئی کبوتر ذرا سا بولتا تو اس کی آواز کسی بھولی بسری یاد کی طرح محسوس ہوتی۔

ماہ نور نانی کو ناشتہ کروانے کے بعد پانی پلا رہی تھی جب گیلری کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا تھا اور خوش نصیب وہاں سے نکلی تھی۔ ایک بھی نظر ان لوگوں پر ڈالے بغیر وہ سر جھکائے کمرے سے باہر کی طرف چل پڑی تھی۔

روشن امی نے دیکھا، اس کے چہرے پر جا بجا نیل پڑے تھے۔ دائیں آنکھ کے نیچے جیسے جوتی کے تلوے کا ڈیزائن چھپا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ بھی قدرے سوج گیا تھا۔ مسلی ہوئی قمیص اور الجھے ہوئے بال۔۔۔ چہرے سے وہ اپنے بالوں سے زیادہ الجھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اب خوش نصیب پر غصہ اپنی جگہ لیکن تھی تو اپنی ہی اولاد نا۔۔۔ اس کی حالت اور حالت بھی وہ جو خود ان کے ہی ہاتھوں بنی تھی، ایک لمحے کے لیے ان کا دل دکھا گئی تھی۔

آج تک انہوں نے اپنی اولاد کو ہلکے ہاتھوں سے بھی نہیں مارا تھا کجا کہ سارے گھر کے سامنے اسے جوتے سے مارنا۔۔۔ مگر یہ دکھ صرف چند لمحوں کے لیے ہی دل میں گھر کر سکا تھا۔

انہیں یک دم خوش نصیب کی رات والی حرکت یاد آئی تھی اور اس کی تکلیف کا خیال اگلے ہی لمحے دل و دماغ سے محو ہو گیا تھا۔ ہمدردی کی جگہ پھر سے غصے نے لے لی تھی۔ انہیں یاد آ گیا تھا کہ ان کی ناہنجار اولاد نے کس طرح کل رات سب کے سامنے انہیں بے عزت کیا تھا۔۔۔ کس طرح ان کی تربیت کو کھوٹ زدہ کر ڈالا تھا۔

انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ماہ نور کا رشتہ شامیر سے جڑنے کے بعد کس قدر ضروری تھا کہ وہ فاطمہ اور شامیر کا دل خوش نصیب اور اپنی طرف سے صاف کرتیں۔ بہر حال یہ ماہ نور کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے ضروری تھا اور وہ یقیناً اپنی ایک بیٹی کی غلطیوں کی سزا دوسری بیٹی کو دلوانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں خوش نصیب کو کل رات اس کے بارے میں کیے گئے فیصلے سے بھی آگاہ کرنا تھا۔

ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھیں اور خوش نصیب کو، جو کہ دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی، پکارا۔

''خوش نصیب۔۔۔!'' ان کا لہجہ اور آواز کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھی۔

اور خوش نصیب نے جیسے سن کر بھی ان کی آواز نہ سنی تھی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں محو آگے بڑھتی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے سے باہر نکلتی، انہوں نے پھر سے اسے پکارا تھا اور اس بار آواز پہلے سے بلند تھی۔

''خوش نصیب۔۔۔! ادھر آؤ۔۔۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔۔۔''

خوش نصیب اب کی بار جیسے ان کی بات سن اور سمجھ پائی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رکی تھی اور گردن کو موڑ کر ماں کی طرف دیکھا تھا مگر پلٹنے یا ان کی طرف آنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''اوہ میرے خدایا۔۔۔'' روشن امی جیسے ایک لمحے کو دہل سی گئی تھیں۔

اتنی ویرانی تھی اس کی آنکھوں میں۔۔۔ جیسے کوئی لاش۔۔۔

ماہ نور کی نظریں بھی بہن پر جمی تھیں لیکن اس کی حالت دیکھ کر بھی ماہ نور کی آنکھوں میں کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ ایک مخصوص قسم کی نفرت تھی جو پچھلے کچھ دنوں سے خوش نصیب کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتی تھی اور کل

رات سے اس نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔
جھرجھری لیتے ہوئے جیسے انہوں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ اپنے لہجے کو سخت کرتے ہوئے انہوں نے پھر کہا تھا۔ "یہاں آ کر بیٹھو۔۔۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"
خوش نصیب ایک لفظ بھی بولے بغیر پلٹی تھی اور ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ماں کے برابر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی منہ سے ایک بھی لفظ کہا تھا۔ بس سوالیہ نگاہیں ماں پر جمی ہوئی تھیں۔ انداز ایسا کہ ماں بات کریں اور وہ وہاں سے رسی تڑوا کر بھاگ جائے۔
"کل رات جو کچھ بھی ہوا۔۔۔" روشن امی نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بولیں۔۔۔ "تم اس بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟"
اللہ ہی جانے کہ یہ بات منہ سے کیوں نکلی ورنہ آدھے گھنٹے پہلے تک تو وہ سوچ بیٹھی تھیں کہ خوش نصیب سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔
دوسری طرف خوش نصیب کے چہرے پر ان کے سوال سے ایک مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔ سسکتی ہوئی، اذیت زدہ مسکراہٹ۔
"آپ کو اب یہ سوال پوچھنے کا خیال کیوں آیا ہے؟" وہ طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔
روشن امی نے جواب نہیں دیا۔
"خیر۔۔۔ آپ لوگوں نے ہی تو بتایا تھا مجھے بھی کہ میں رات شامیر کے کمرے میں تھی اور وہاں اس دودھ سے دھلے فرشتے کو بہکا رہی تھی۔ کمال ہے امی! اتنی جلدی بھول گئیں آپ یہ بات۔۔۔ آپ نے ہی تو اس بات پر حق کی مہر ثبت کی تھی۔۔۔ وہ بھی اپنی جوتی سے۔۔۔" وہ جیسے اپنے نہیں کسی اور کے بارے میں بول رہی تھی۔
"میں نے یہ سب بکواس کرنے کے لیے تمہیں نہیں بلایا۔۔۔" وہ جھنجلائیں۔
"کمال ہے۔۔۔ میں چپ کھڑی تھی تب بھی آپ خوش نہیں تھیں۔۔۔ اب سچ بول رہی ہوں تو آپ کو بکواس لگ رہی ہے۔۔۔ خیر آپ اس بات کو چھوڑ دیں۔۔۔ وہ بات کریں جس کے لیے آپ نے میرے جیسی بدکردار لڑکی کا نام اپنی زبان سے ادا کیا ہے۔۔۔" اس نے نہایت سرد لہجے میں جواب دیا تھا۔
وہ حیران رہ گئی تھیں۔ یہ وہ خوش نصیب نہیں تھی۔۔۔ وہ غصے اور ناراضی میں بھی کبھی بدلحاظ نہیں ہوئی تھی لیکن آج۔
دوسری طرف ماہ نور اس کی بدتمیزی پر کھول کر رہ گئی۔ نانی کے پاس سے اٹھ کر وہ ماں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔
"خوش نصیب! تمیز سے بات کرو۔۔۔ مت بھولو کہ تم اپنی ماں سے بات کر۔۔۔"
"اونہوں۔۔۔" خوش نصیب نے ہاتھ اٹھا کر ماہ نور کو چپ کروایا تھا۔ "تم اس معاملے سے دور رہو ماہ نور۔۔۔! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ یہ میری ماں ہیں تو تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میرے اور میری ماں کے معاملہ میں اپنی ٹانگ اڑاؤ۔۔۔" ناک چڑھا کر خوش نصیب نے نہایت نخوت سے ماہ نور کو ناک آؤٹ کیا تھا۔
ماہ نور اس کے انداز اور لہجے پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اتنی بدتمیزی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، روشن امی نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے چپ کروا دیا تھا۔
"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ جس قدر خاک تم میرے سر میں ڈال چکی ہو، اس کے بعد ہونا تو یہی چاہیے کہ میں تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں۔۔۔ مگر کیا کروں، میری بھی مجبوری ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو رات ہی تمہیں زندہ دفنا دیتی۔" روشن امی نے سختی سے کہا تھا۔
اور خوش نصیب سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔ "آپ نے ابھی بھی کوئی کسر تو نہیں چھوڑی مجھے دفنانے میں۔۔۔ مگر چلیں چھوڑیں۔۔۔ آپ بتائیں، اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔"

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی پھیلائی ہوئی گندگی خود ہی سمیٹو۔ تم آج بلکہ ابھی میرے ساتھ جاؤ گی اور شامیر اور اس کی ماں سے اپنے کیے کی معافی مانگو گی۔ میں ماہ نور کا رشتہ شامیر سے طے کر چکی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ تمہارے کیے کی سزا میری بیٹی کو بھگتنی پڑے۔۔۔''

''میری بیٹی'' کے الفاظ پر خوش نصیب کی آنکھوں میں سائے سے لہرا گئے تھے۔۔۔ ایک لمحے کے لیے دل نے چاہا کہ پوچھ لے کہ اگر یہ بیٹی ہے تو مجھے کہاں سے اٹھایا تھا۔ لیکن جب وہ بولی تو الفاظ بالکل مختلف تھے۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ اور کچھ؟''

خوش نصیب اتنی آسانی سے معافی مانگنے پر راضی ہو جائے گی، یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔ انہیں تو لگا تھا کہ خوش نصیب کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے ایک لمبی بحث کرنا پڑے گی اور کہیں نہ کہیں وہ سوچ چکی تھیں، کہ انہیں جتنی بھی سختی کرنا پڑے گی، وہ کریں گی مگر خوش نصیب نے تو ایسا کوئی موقع ہی نہیں آنے دیا۔ فوری طور پر ہی وہ راضی ہو گئی تھی معافی مانگنے کے لیے۔۔۔

''تم معافی مانگو گی؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، مانگ لوں گی معافی۔۔۔ اور کوئی حکم؟'' بیزار لہجہ۔۔۔ ''بلکہ اٹھیں، ابھی چلتے ہیں۔ آپ کا شوق بھی پورا ہو جائے۔''

پیچھے کھڑی ماں اور بہن کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ خود مڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر ماں کو دیکھا تھا۔

''تم پہلے منہ ہاتھ دھو کر اپنا حلیہ درست کر لو۔'' اس کے آسانی سے مان جانے پر روشن امی کے لہجے کی سختی بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی حالت کا بھی احساس تھا۔ اس حالت میں وہ اسے سب کے سامنے نہیں لے جانا چاہتی تھیں۔

''ہاہاہا۔۔۔ کمال ہے امی۔۔۔ سب کے سامنے یہ حلیہ بنا سکتی ہیں میرا مگر اب سب کے سامنے لے جاتے ہوئے آپ کو شرم آ رہی ہے۔۔۔ مگر مجھے شرم نہیں آ رہی اس حلیے سے بھی۔۔۔ آ جائیں اب۔۔۔ یہ نہ ہو کہ کہیں آپ کی بیٹی کے سسرال والوں کو معافی دیر سے مانگے جانے پر بھی اعتراض ہو۔''

روشن امی نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا پھر خوش نصیب کے رویے کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ چل پڑی تھیں۔

☆☆☆

فضل ہاؤس کی نچلی منزل میں اس وقت ناشتہ کیا جا رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا سو ناشتہ بھی معمول سے کچھ لیٹ کیا جا رہا تھا۔ تایا ابا، تائی امی، کیف، فہمینہ، شامیر اور فاطمہ۔۔۔ سب وہاں موجود تھے جس وقت روشن امی، خوش نصیب کو لے کر وہاں آئی تھیں۔

''اسلام وعلیکم۔۔۔'' روشن امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا۔

اور ان دونوں کو وہاں دیکھ کر سب ایسے خاموش ہو گئے تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو حالانکہ ان لوگوں کے آنے سے پہلے وہ لوگ آپس میں بات چیت کر رہے تھے اور صابر صاحب، کیف سے اس کی جاب اور پوسٹنگ کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر اب وہاں پن ڈراپ سائلنس تھا۔ صابر تایا نے خوش نصیب کو دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا تھا، کچھ ایسا ہی رویہ تائی امی نے بھی دکھایا تھا۔ کیف خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھک گیا تھا، انداز ایسا تھا جیسے اس نے خوش نصیب کو دیکھا ہی نہ ہو اور فہمینہ کی آنکھوں میں تاسف نے جگہ لے لی تھی۔ اس خاموشی کو محسوس کر کے روشن امی بھی ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی تھیں۔

سب سے پہلے فاطمہ ہوش میں آئی تھیں اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

"ارے روشن آؤ آؤ۔۔۔ابھی تم لوگوں کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے ہم۔۔۔" انہوں نے خوش نصیب کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔
اس سے پہلے کہ روشن امی کوئی جواب دیتیں، خوش نصیب آگے بڑھی تھی اور فاطمہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے بغور ان کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے مشینی انداز میں ان کے سامنے ہاتھ باندھ لیے تھے اور سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔
"میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔۔۔"
فاطمہ اس کی بات پر حیران رہ گئی تھیں پھر ایک دم اس کے بندھے ہاتھوں کا خیال آیا تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھولنے کی کوشش کی تھی۔
"یہ کیا کر رہی ہو آپ بیٹا۔۔۔! ایسے مت کرو۔۔۔ ہم لوگ تم سے خفا نہیں ہیں۔ غلطیاں بچوں سے ہی ہوتی ہیں۔"
"نہیں پلیز۔۔۔ آپ مجھے بات پوری کر لینے دیں۔ میں آپ سے اور آپ کے بیٹے سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ آپ کے بیٹے کو سب کے سامنے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ شامیر ایک بہت نیک اور بہترین انسان ہے جو میرے بار بار بھٹکانے پر بھی نہیں بھٹکا اور میری بہن کے ساتھ مخلص رہا۔" اس کا لہجہ بتدریج طنزیہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ روشن امی کا دماغ اس کی طنزیہ باتوں سے بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھیں اور خوش نصیب کے برابر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہیں ہر حال میں اس معاملہ کو ختم کروانا تھا۔
"فاطمہ! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی غلطی ہے، اسے معافی مانگ لینے دو۔۔۔ اور اسے معاف کر دو۔ اس نے جو کیا، وہ بہت غلط تھا لیکن اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ اور شامیر اسے معاف کر کے بڑے پن کا ثبوت دیں۔ اس کی غلطی بہت بڑی سہی مگر آپ لوگ اسے معاف کر دیں۔" ان کے لہجے میں افسوس ہی افسوس تھا۔
"بالکل فاطمہ آنٹی! میری غلطی بہت بڑی ہے۔۔۔ آپ اس "بہت بڑی غلطی" کے لیے مجھے معاف کر دیں پلیز۔۔۔ آپ معاف کر دیں گی تو باقی لوگ بھی مجھے معاف کر دیں گے۔ بلکہ مجھے تو شامیر سے بھی معافی مانگنی ہے۔"
وہ ان کو چھوڑ کر تیزی سے شامیر کی طرف بڑھی تھی۔

دور کرسی پر بیٹھے کیف نے اس کے الفاظ کو بغور سنا تھا اور پھر اس کی باتوں پر کڑھ کر رہ گیا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، تو اس کی ظاہری حالت نے ایک لمحے کے لیے اسے سُن کر دیا تھا۔ خوش نصیب کی تکلیف کو شدت سے محسوس کیا تھا اس نے۔۔۔ مگر اس کے لفظوں نے اس تکلیف پر ٹھنڈا پانی پھینک دیا تھا۔ وہ کڑھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جو کل ساری رات خود کو مناتا رہا تھا کہ خوش نصیب کچھ غلط نہیں کر سکتی اور وہ بے قصور ہے، خوش نصیب کے معافی مانگنے پر اس سوچ کی بھی خود ہی موت ہو گئی تھی۔ اس کا دماغ ہر سوچ سے خالی ہو گیا تھا۔
"خوش نصیب بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے۔۔۔؟" اس نے جیسے خود سے پوچھا تھا۔ لمحوں میں ہی دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔
خوش نصیب تیزی سے شامیر کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں شامیر کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ پھر اس نے پہلے کے سے انداز میں شامیر کے سامنے بھی ہاتھ جوڑ لیے تھے۔
"مجھے معاف کر دو شامیر۔۔۔"
شامیر کو ذرا بھی امید نہیں تھی کہ خوش نصیب اس قدر آسانی سے ہار مان لے گی۔ ایک لمحے کے لیے وہ خود بھی خوش نصیب کے رویے پر گڑبڑا گیا تھا جبکہ خوش نصیب نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

"میں نے بڑی زیادتی کردی تمہارے ساتھ۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ہمیشہ سے ماہ نور کو پسند کرتے تھے، میں نے تمہیں بہکانے کی کوشش کی۔۔۔ تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔۔۔اور تو اور تم پر تعویذ بھی کروائے۔۔۔ شکر ہے صیام نے تمہیں بچالیا۔۔۔ خیر شامیر اتم نے بھی تو غلط کیا نا۔۔۔ تم کتنی آسانی سے صیام سے منگنی پر راضی ہو گئے تھے۔ وہ تو میں نے بچالیا تمہیں۔۔۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔۔۔ اب پلیز تم مجھے میری تمام غلطیوں کے لیے معاف کردو۔۔۔ دیکھو، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں۔۔۔ پلیز معاف کردو مجھے۔۔۔" وہ جو بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

دوسری طرف شامیر جو شروعات میں اس اچانک حملہ سے بوکھلا گیا تھا، اب دل ہی دل میں جواب سوچ چکا تھا۔ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے وہ دو قدم آگے بڑھا تھا اور پھر چہرے پر مسکراہٹ لیے اس نے ہاتھ خوش نصیب کے سر پر رکھ دیا تھا۔۔۔ جب خوش نصیب خود سب کے سامنے اسے اچھا ثابت کر رہی تھی تو پھر کچھ مزید اچھا بن کر دکھانے میں کیا برائی تھی۔

"خوش نصیب! تم مجھ سے معافی مت مانگو۔۔۔ میرے لیے تم میری بہن کی طرح ہو۔۔۔" اس نے بڑے آرام سے ایک قابلِ احترام رشتے کا سہارا لیا تھا۔ "میں تمہیں ہمیشہ سے یہی تو سمجھاتا آرہا ہوں کہ جو کچھ تم محسوس کرتی ہو، وہ محبت نہیں ہے، صرف انسیت ہے۔۔۔ اور انسیت تو ہم بہت سے لوگوں سے محسوس کرتے ہیں۔۔۔ ایسی ہی انسیت کیف بھی تمہارے لیے محسوس کرتا ہوگا۔۔۔" اس نے جیسے باتوں ہی باتوں میں اس کا مذاق اڑایا تھا۔

"اور یقیناً باقی گھر والے بھی۔۔۔ تم معافی نہیں مانگو کیونکہ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ بہنیں معافی مانگتی اچھی نہیں لگتیں۔۔۔"

پھر وہ صابر تایا کی طرف مڑا تھا۔

"انکل! خوش نصیب کو اس کی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ میں آپ سے ریکویسٹ کرتا ہوں کہ آپ سب بھی اس کی غلطی کو معاف کردیں۔ اور جو کچھ کل ہوا ہے، اس کو بھلا کر آگے بڑھیں۔۔۔" وہ آگے بڑھ کر تایا کے برابر جا کھڑا ہوا تھا۔ "میری خاطر انکل۔۔۔ میرے کہنے پر ہی سہی مگر آپ خوش نصیب کو معاف کردیں۔۔۔"

صابر صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر ہنکارا بھر کر جیسے رضامندی دے دی تھی۔ شامیر مسکرا دیا تھا۔

"مام۔۔۔! آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو اس ٹائم کچھ بولنا چاہیے۔۔۔" وہ شرارت سے ماں کی طرف مڑا تھا۔

فاطمہ بھی اس کے انداز پر مسکرا دی تھیں۔ "صابر بھائی، روشن۔۔۔ اب جب معاملات سیدھے ہو ہی رہے ہیں۔۔۔ تو کیا ہی اچھا ہو کہ اس وقت ہم بچوں کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس کرلیں۔ شامیر، ماہ نور کو اپنے ساتھ ہی باہر لے جانا چاہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اپنی بہو کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں۔۔۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو ہم اگلے ہفتے ہی ان دونوں کی شادی کردیتے ہیں۔"

"فاطمہ! اتنی جلدی تیاری کیسے ہوگی۔۔۔ تم خود سوچو۔۔۔ میں نے تو ماہ نور کے لیے کچھ تیار بھی نہیں کیا۔"

"روشن! کسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔ ماہ نور کو میں بہو نہیں بیٹی بنا کر لے جا رہی ہوں۔ ہم اسے اپنے ساتھ صرف تین کپڑوں میں بیاہ کے جائیں گے۔ جب ہم نے جہیز لینا ہی نہیں ہے تو پھر مزید تیاری پر کیا وقت لگے گا۔ میرے شامیر میں اتنی صلاحیت ہے کہ اپنی بیوی کی ہر ضرورت کو اپنے بل بوتے پر پورا کرسکے۔ تم بالکل پریشان نہ ہو۔۔۔" اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے صابر صاحب کی طرف دیکھا تھا۔ "بھائی صاحب! آپ ہی سمجھائیں روشن کو۔۔۔"

"میرے خیال سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے بھابھی۔۔۔ ایک دن رخصت تو کرنا ہی ہے بچی کو۔۔۔ پھر جلدی ہو یا دیر سے، کچھ فرق نہیں پڑتا۔" صابر چچا نے بھی اپنا ووٹ فاطمہ کے حق میں دے دیا تو مزید بحث کی

کوئی گنجائش ہی نہ بچی۔۔۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔
فاطمہ کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔۔۔ ''تو بس پھر طے ہے۔۔۔ آج توار ہے، اگلے جمعہ کو مہندی کر لیتے ہیں۔ ہفتہ کی بارات اور اتوار کا ولیمہ۔۔۔ تیاریوں کے لیے دس بارہ دن بھی مل جائیں گے۔ آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب۔۔۔''
''ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا آپ لوگ چاہیں۔۔۔'' انہوں نے مسکرا کر اجازت دے دی۔
''مگر مجھے ایک اعتراض ہے۔۔۔'' شامیر یک دم سنجیدگی سے بولا تھا۔
سب نے حیرانی سے شامیر کی طرف دیکھا تھا مگر بولی صرف اس کی ماں تھیں۔
''یہ کیا کہہ رہے ہو شامیر۔۔۔ کیسا اعتراض؟'' ان کے لہجے میں حیرانی تھی۔
وہ شرارت سے بولا۔ ''میں یہ کہہ رہا ہوں ماما! کہ کل رات صرف میرا اور ماہ نور کا ہی تو رشتہ طے نہیں ہوا تھا۔۔۔ پھر آپ لوگ صرف ہماری شادی کی تاریخ طے کر رہے ہیں؟''
''کیا مطلب۔۔۔؟'' روشن امی کا چہرہ اس کی اعتراض والی بات پر ہی فق ہو گیا تھا۔۔۔ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں انہوں نے وضاحت چاہی تھی۔
''میرا مطلب تھا آنٹی کہ جب میری اور ماہ نور کی شادی ہو۔ رہی ہے تو پھر ساتھ ہی باقی لوگوں کو آزادی کیوں دی جائے۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ کیف، صیام اور شاہ جہاں بھائی، خوش نصیب کو بھی بھگتا لیں آپ لوگ۔۔۔''
خوش نصیب کو محسوس ہوا کہ اس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مڑ کر ماں کو دیکھا تھا۔
''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا مطلب؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تھا۔
''ارے آنٹی آپ نے اسے ابھی تک بتایا نہیں؟'' شامیر نے دل بھر کر حیران ہونے کا ڈراما کیا تھا۔
''نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔'' روشن امی ہکلا گئی تھیں۔
''ارے آنٹی! کمال ہے۔۔۔ خوش نصیب کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ لیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔ اور ابھی تک اسے پتا ہی نہیں ہے۔۔۔ خوش نصیب! کل سب لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ میری اور ماہ نور کے ساتھ ہی تمہاری اور شاہ جہاں بھائی کی بھی منگنی کر دی جائے۔۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
خوش نصیب کے سر پر تو جیسے کمرے کی چھت آ گری تھی۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔
دوسری طرف شامیر اب صابر تایا کی طرف مڑ گیا تھا اور انہیں اپنی کہی ہوئی بات پر راضی کر رہا تھا۔

☆☆☆

''سنو۔'' اس نے پکارا تو وہ رک کر پلٹی اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں نا'' وہ جھجکتے ہوئے بولا تھا۔
''کیا؟''
معاویہ نے اس کا خوبصورت چہرہ دیکھا اپنے اندر ہمت جمع کی اور بولا۔
''میرے خوابوں میں آنے والی پری کا چہرہ اسی دن بدل گیا تھا.. جس دن میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا۔۔۔ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اب اس پری کا چہرہ کتنا خوبصورت دکھائی دینے لگا ہے؟'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
منفرا کچھ بھی کچھ نہیں۔ الجھ البتہ زیادہ گئی تھی۔

''میں۔۔۔میں سمجھی نہیں؟''
معاویہ ایسے ہی مسکراتا ہوا چند قدم چلتا اس کے قریب آیا اور نرمی سے بولا۔
''میں نے لائف آفٹر ڈیتھ پر ریسرچ کرتے اپنی زندگی کے آٹھ سال برباد کیے ہیں۔۔۔اگلے آٹھ سال۔۔۔بلکہ اٹھارہ سال۔۔۔نہیں۔میں نے غلط کہہ دیا۔۔۔''
وہ بار بار رک رہا تھا۔الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے وہ اپنی بے بسی پر ہنستا تھا لیکن وہ ہمت ہارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔
''۔۔۔میں اپنی زندگی کے اگلے تمام سال۔۔۔تمہارے ساتھ زندہ انسانوں پر ریسرچ کرتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔''
اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے منفرا کا گلابی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔
''میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری محبت میں دیوانہ ہو چکا ہوں۔۔۔لیکن اس بات کا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں ساری زندگی تم سے محبت کروں گا۔۔۔دنیا کی نظروں میں' میں ایک کامیاب انسان ہوں۔۔۔میرے پاس دولت ہے، وجاہت ہے۔رتبہ ہے۔۔۔محبت نہیں ہے۔۔۔تم۔۔۔مجھ سے محبت کرو گی منفرا؟''
سوچتے سوچتے منفرا بڑی پیاری سی ہلکی ہنس دی تھی۔
نیویارک سٹی پر اس روز بہت خوبصورت رات اتری تھی۔۔۔روشنیوں سے بھری ہوئی۔۔۔جگمگ کرتی ہوئی۔۔۔جس میں کالے رنگ سے زیادہ سنہری رنگ بھرا تھا۔۔۔اس نے کالے رنگ کی اس خوبصورتی کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔۔۔مونٹوک میں بھی نہیں جہاں سے اسے عشق تھا۔۔۔خدا ہی جانے کہ یہ سنہری پن نیویارک سٹی کی راتوں میں اب بھر دیا تھا یا منفرا اسے اب محسوس کرنے کے قابل ہوئی تھی۔
وہ کہاں جانتی تھی کہ یہ سنہری پن رنگوں میں نہیں دل میں بھرتا ہے۔جب محبت دل کے دریچے میں داخل ہو کر اسے سونے کا بنا دیتی ہے تو یہ سنہری پن ہر چیز میں محسوس ہوتا ہے اور پھر جب آپ کو معلوم ہو کہ جسے آپ چاہتے ہیں، وہ بھی آپ کی محبت میں مبتلا ہے تو دل خود بخود ایک سنہری تال پر ناچنے لگتا ہے۔
منفرا تقریباً ایک گھنٹے پہلے کھڑکی سے سامنے پڑے سنگل صوفے پر آ کر بیٹھی تھی۔ارادہ تو ایک کتاب پڑھنے کا تھا، لیکن رات کے سنہرے پن کو کھوجتے کھوجتے اسے مونٹوک یاد آیا تھا، مونٹوک کا سمندر یاد آیا تھا، سمندر کے کنارے اترتی شام یاد آئی تھی اور پھر اسے وہ یاد آیا تھا جو کہ اسے بھولتا ہی نہ تھا۔جو آج کل اس کی ہر سوچ پر قابض تھا۔
اسے معاویہ یاد آیا تھا اور اس سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد آئی تھی۔
''میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری محبت میں دیوانہ ہو چکا ہوں۔۔۔لیکن اس بات کا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں ساری زندگی تم سے محبت کروں گا۔۔۔دنیا کی نظروں میں میں ایک کامیاب انسان ہوں۔۔۔میرے پاس دولت ہے، وجاہت ہے۔رتبہ ہے۔۔۔محبت نہیں ہے۔۔۔تم۔۔۔مجھ سے محبت کرو گی منفرا؟''
اس نے معاویہ کے کہے الفاظ دہرائے تھے اور کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔
کسی کو چاہنے کا احساس بلاشبہ انمول ہوتا ہے لیکن چاہے جانے کا احساس انسان کو ہواؤں میں اڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
وہ بھی جب سے مونٹوک سے واپس آئی تھی، ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔اس کا دل و دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ہنسی تھی کہ لبوں کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی۔دل میں ایسا سکون طاری تھا، جیسا سکون معاویہ نے پانی کی گہرائیوں میں محسوس کیا تھا۔کبھی وہ سوچتی تھی کہ یہ کوئی خواب تو نہیں۔۔۔بس وہ چاہتی تھی کہ اگر یہ خواب ہے تو بھی یہ خواب

فی بی جب بھی اسے دیکھتی تھی تو دل ہی دل میں اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا مانگتی تھی۔ وہ اپنی دوست کے لیے بہت خوش تھی۔ اسی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے اس نے منفرا اور معاویہ کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اور کیونکہ اسے شک تھا کہ معاویہ کبھی بھی اس کے انوائٹ کرنے پر نہیں آئے گا، اس لیے اس نے منفرا کی ذمہ داری لگائی تھی کہ وہ معاویہ کو اس ڈنر کے لیے راضی کرے۔ وہ معاویہ کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اس کے ماں باپ اس رشتے کے لیے راضی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے والد کو یہاں بلالے تاکہ وہ اس کے پیرنٹس سے باضابطہ طور پر ان کے رشتے کی بات کرسکیں۔

اس نے نظر ادھر ادھر دوڑا کر اپنا موبائل تلاش کیا تھا۔ موبائل بیڈ پر پڑا تھا۔ اس نے اٹھ کر موبائل اٹھایا اور معاویہ کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ چوکھٹ سے ٹیک لگائے وہ کال اٹھائے جانے کی منتظر تھی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ دو تین بار بیل ہونے کے بعد اسے معاویہ کی خوابیدہ آواز سنائی دی تھی۔

''ہیلو پری۔۔۔ کیسی ہو؟''

''ہائے۔۔۔ پری؟ کیا بول رہے ہو تم؟'' وہ ہنس دی تھی اس لقب پر۔

''ہاں نا پری۔۔۔ میرے خوابوں والی پری۔۔۔ ابھی اسی سے ملاقات کررہا تھا۔۔۔ ڈنر پلان کررہے تھے ہم۔۔۔ اس نے کہا، اچھا میں تمہیں کال پر ٹائم بتاتی ہوں اور تم نے کال کرلی۔''

''ہاہاہاہا۔۔۔ اچھا تو تم ڈھکے چھپے لفظوں میں ڈنر پر انوائٹ کررہے ہو؟''

اس نے معاویہ کو چڑانے کی کوشش کی تھی مگر معاویہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔۔۔

''ڈھکے چھپے لفظوں میں۔۔۔'' اس نے حیرت زدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔ ''ارے بھئی، میں تو صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ میں خواب میں تمہارے ساتھ ڈنر پلان کررہا تھا۔۔۔ اور عقل مند وہی ہوتے ہیں جو خوابوں میں رہنے کے بجائے انہیں حقیقت بنادیں۔۔۔ جیسے میں نے اپنے خوابوں والی پری کو اپنے لیے حقیقت میں ڈھونڈ لیا ہے۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

اس کی بات نے منفرا کو مسکرانے پر مجبور کردیا تھا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔ ٹھیک ہے حقیقت بناتے ہیں خواب کو۔۔۔ ڈنر پر چلتے ہیں کل مگر یہ ڈنر فی بی کی طرف سے ہوگا۔۔۔''

''یہ فی بی کہاں سے آگئی اس ڈنر میں؟''

''وہ تمہیں اور مجھے ڈنر پر انوائٹ کرنا چاہتی ہے۔۔۔ ہمارے ریلیشن کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے۔۔۔'' اس نے کچھ جھجک کر آخری الفاظ ادا کیے تھے۔

''میں خواب میں ایک رومینٹک ڈنر پر جارہا تھا منفرا۔۔۔! جہاں تم تھیں، میں تھا۔۔۔ مگر یقین کرو، فی بی نہیں تھی۔۔۔'' وہ بے بسی سے بولا تھا۔

منفرا ہنس دی۔ ''اس بار فی بی کو بھی اس رومینٹک ڈنر کا پارٹ بنالیتے ہیں۔'' وہ چڑا رہی تھی اسے۔ ''ویسے بھی وہ ہم دونوں سے زیادہ خوش ہے ہمارے لیے۔ اور انکار کرکے میں اسے خفا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔۔۔''

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔۔۔ چلے جائیں گے اس ''رومینٹک ڈنر'' پر۔۔۔'' وہ بے بس سے لہجے میں بولا تو منفرا ہنس دی۔ ''اچھا بتاؤ تم کیا کررہی ہو؟''

''میں۔۔۔ میں رات کو کھوج رہی ہوں۔۔۔ پتا لگانے کی کوشش کررہی ہوں کہ اس رات میں اتنا سنہری پن کہاں سے آگیا ہے۔۔۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"رات۔۔۔اب رات رہی کہاں ہے منفرا۔۔۔اب تو دن ہے۔۔۔ چمکتا ہوا دن جس نے میری زندگی کی تمام سیاہی کو نگل لیا ہے۔" وہ اتنا پرسکون بول رہا تھا کہ یہ سکون منفرا کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔
معلوم نہیں کس خیال کے تحت وہ پوچھ بیٹھی تھی۔ "معاویہ۔۔۔! تم ٹھیک ہو نا؟"
"میں اتنا ٹھیک ہوں جتنا آج سے پہلے کبھی نہیں تھا۔۔۔ میں اتنا سکون محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ جتنا آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔۔۔ میں اپنے سارے دکھ۔۔۔ اپنی ساری پریشانیاں۔۔۔ اپنے سارے خدشات ۔۔۔ اسی سمندر کی تہہ میں چھوڑ آیا ہوں منفرا۔۔۔! جہاں میں نے تمہیں پالیا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار صحیح فیصلہ کیا تھا۔۔۔ مجھے بہت پہلے یہ سب کر لینا چاہیے تھا۔"
وہ بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔
"مجھے بتاؤ منفرا! میں کیا کروں۔۔۔ میں خود کو بڑا بے بس پاتا ہوں۔۔۔ لیکن یہ بے بسی مجھے اتنا سکون دیتی ہے کہ میں اس کیفیت سے نکلنا بھی نہیں چاہتا۔۔۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے تمہارا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ ۔۔۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں تو میرا ذہن تمہارے خیالات سے نکل نہیں پاتا۔۔۔ تم نے مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔"
۔۔۔ اس نے محبت بھرے انداز میں شکوہ کیا تھا۔
منفرا اس کے لفظوں میں اس طرح کھوئی تھی کہ جواباً۔ کچھ بولنا بھی بھول گئی تھی۔۔۔ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی جب خاموشی ہی اس قدر خوبصورت تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔
"منفرا! چلو شادی کر لیتے ہیں۔۔۔"
اور منفرا اس مطالبے پر مسکرا دی تھی۔
"اس کام کے لیے تمہیں اپنے بابا سے بات کرنی ہوگی۔۔۔ انہیں بلاؤ معاویہ! تا کہ وہ مام ڈیڈ سے بات کر لیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔ میں بلالوں گا انہیں۔۔۔ میرے لیے اب انتظار ممکن نہیں۔۔۔ کیا تم نے آنٹی انکل کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہے؟" وہ منفرا سے پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں خدشہ در آیا تھا۔
"ہاں۔۔۔ نیویارک آنے سے پہلے میں نے ممی کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ آج ان کی کال آئی تھی۔ انہوں نے ڈیڈ سے بات کر لی ہے اور۔۔۔ اور وہ لوگ خوش ہیں۔۔۔" منفرا نے اسے بتایا تو اس کی آواز بھی مسکراتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے منفرا۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔۔۔" معاویہ جیسے جھوم اٹھا تھا۔
منفرا کی کال آنے سے پہلے وہ سو رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک دم اتنا سکون بھر گیا تھا کہ اسے سونے کے لیے اب مزید دوائیوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اب دوائیوں کے بغیر بھی بہت سکون کی نیند سونے لگا تھا۔
اور آج تو وہ خوش بھی بہت تھا۔ اس نے بہت عرصے بعد خواب میں وسامہ کو دیکھا تھا۔
اس نے دیکھا تھا کہ وسامہ فلک بوس کے باغ میں کرسی پر بیٹھا ہے اور کچھ لکھ رہا ہے۔ وہ وہاں اکیلا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور معاویہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ وہ خواب میں بھی اتنا خوش اور پرسکون لگ رہا تھا کہ وہ سکون معاویہ کے دل میں اتر آیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔۔۔ وہ خوش ہے معاویہ کے لیے اور وہ خوش ہے معاویہ کے آگے بڑھ جانے کے فیصلے سے۔۔۔
اس کی آنکھ منفرا کی کال سے کھلی تھی جس نے اس موڈ کو کچھ مزید خوش گوار کر دیا تھا۔ منفرا کے والدین اس رشتے پر راضی تھے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ منفرا کے ساتھ ڈنر کا پلان فائنل کرنے کے بعد اس نے منفرا

کو اللہ حافظ کہا تھا اور فوراً ہی اردشیرازی کو کال ملالی تھی۔
"ہیلو بابا۔۔۔" کال ریسیو کرلی گئی تھی۔
"معاویہ۔۔۔! کیسے ہو تم؟ سب خیریت ہے؟" وہ اس کے کال کرنے پر یقیناً حیران ہوئے تھے کیونکہ عموماً انہیں ہی معاویہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کال کرنی پڑتی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور سب خیریت ہے۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟"
اردشیرازی نے حیرانی سے اپنے سیل فون کو گھورا تھا۔ ان کا بیٹا ایک لمبے عرصے بعد ان کی خیریت پوچھ رہا تھا۔
"میں بھی ٹھیک ہوں۔ میں تمہیں آج کال کرنے ہی والا تھا۔ دو تین دن میں شاید میں نیویارک آؤں۔۔۔ ذرا فرصت ہو تو مل لینا مجھ سے۔۔۔" آخر میں ان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔
"فرصت ہی فرصت ہے۔۔۔ آپ یہاں میرے اپارٹمنٹ میں ہی رکیے گا۔ اور اگر آپ کچھ زیادہ وقت نکال سکیں تو یہ اور بھی اچھا رہے گا۔"
"کیا بات ہے معاویہ؟ بہت خوش لگ رہے ہو۔۔۔ اور یہ باپ کی یاد کب سے ستانے لگی تمہیں کہ اسے رکنے کی دعوت دے رہے ہو؟" وہ خوشگوار حیرت کا شکار تھے سو زیادہ دیر اپنے لہجے کو معمول کے مطابق سنجیدہ نہیں رکھ پائے تھے۔
"خوش تو میں ہوں بابا۔۔۔" معاویہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"وہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔۔۔ خوشی کی وجہ بتاؤ۔۔۔"
"بابا۔۔۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"
اردشیرازی کو جھٹکا لگا تھا۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ معاویہ خوش ہے لیکن اس کی خوشی کے پیچھے کوئی ایسی وجہ ہوگی، یہ انہوں نے نہیں سوچا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ سال سے اسے شادی کے لیے راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ نہیں مانتا تھا اور آج وہ کال پر ایک دم انہیں بتا رہا تھا کہ وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بے حد خوش ہوئے تھے اس خبر سے۔۔۔
"آر یو سیریس معاویہ؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔
"یس بابا۔۔۔ آئی ایم سیریس۔۔۔ اتنا سیریس میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔۔۔" اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔
"دیٹس گریٹ۔۔۔ اب ذرا اس کے بارے میں بھی بتا دو جس نے تم سے یہ عقل مندانہ فیصلہ کروایا ہے۔۔۔"
معاویہ ہنس دیا۔۔۔
"منفرا نام ہے اس کا۔۔۔"
"اچھا نام ہے۔۔۔ امید ہے اپنے نام کی طرح وہ خود بھی منفرد ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اس بار تم نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔۔۔"
معاویہ کے چہرے سے ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔
"میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔۔۔ آپ آئیں گے تو مل لیجیے گا اس سے۔۔۔ یہاں نیویارک میں ہی ہوتی ہے وہ اپنی اسٹڈیز کے سلسلے میں۔۔۔ اس کے پیرنٹس مونٹوک میں ہیں۔۔۔ بیک گراؤنڈ پاکستانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار آپ کو میرا فیصلہ پسند آئے گا۔"
"ہممممم۔۔۔" اردشیرازی نے ہنکارا بھرا۔ "اچھی بات ہے معاویہ! میں خوش ہوں تمہارے فیصلے سے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے صرف اس لڑکی سے ملوانا چاہتے ہو؟"

"نہیں بابا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ تھرو پراپر چینل ہو۔۔۔ آپ نیو یارک آئیں۔۔۔ منفرا سے ملیں۔۔۔ پھر مونٹوک جا کر اس کے پیرنٹس سے اس رشتے کی بات کر لیں۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی جلد از جلد ہو جائے۔۔۔"

اور وہ مسکرا دیے تھے۔ "ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہو گا مگر۔۔۔ میری ایک شرط ہے معاویہ۔۔۔"

"کیسی شرط۔۔۔؟" وہ خفگی سے بولا تھا۔ اسے لگا جیسے اردشیر ازی اس رشتے کی مخالفت کرنے والے ہیں مگر انہوں نے بالکل مختلف بات کی تھی۔

"یہ شادی وہاں ہی ہو گی جہاں یہ سارا معاملہ ختم ہوا تھا۔۔۔ تمہاری شادی فلک بوس میں ہو گی۔۔۔ اور اس کے بعد تم خود اپنی نگرانی میں فلک بوس کو ایک عالیشان ہوٹل میں تبدیل کرواؤ گے۔ کہو منظور ہے؟" ان کے لہجے سے قطعیت نمایاں تھی۔

معاویہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا پھر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا!۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔۔۔ آپ نیو یارک کب آئیں گے۔۔۔؟"

"بہت جلد۔۔۔ جیسے ہی کچھ کنفرم ہوتا ہے میں تمہیں انفارم کر دوں گا۔۔۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔"

بات پوری کر کے اس نے کال بند کر دی تھی اور بیڈ پر جا کر چت لیٹ گیا تھا۔ فلک بوس سے اس کی اور وسامہ کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں مگر ان میں اب بہت سی تکلیف دہ یادیں بھی شامل تھیں۔

"وسامہ سے وابستہ اچھی یادیں تو ہمیشہ میرے دل میں رہیں گی۔۔۔ مگر باقی کی تکلیف دہ یادوں کو اب دل سے نکالنا ضروری ہے۔۔۔ اور ان یادوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فلک بوس کو اپنی زندگی سے نکال دیا جائے۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ بابا جو کر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔" با آواز بلند بولتے ہوئے اس نے جیسے خود کو یقین دلایا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پھر سے کوئی نمبر ملا رہے تھے۔ اب کی بار وہ انہیں کال کر رہا تھا جن کا اس خوشی پر اس کے بعد سب سے زیادہ حق تھا۔ وہ اپنے ماموں یعنی وسامہ کے والد کا نمبر ڈائل کر رہا تھا تاکہ انہیں بھی اس خوشی میں شامل کر سکے۔

★ ★ ★

کیا آپ نے کبھی خود کو بے بس محسوس کیا ہے؟

کیا آپ کبھی زندگی میں ایسی مصیبت کا شکار ہوئے ہیں جہاں آپ کے پاس اس مصیبت سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو؟

کیا آپ نے کبھی اپنی زندگی میں اپنوں کو بیگانہ بنتے دیکھا ہے؟

کیا کبھی آپ نے خود کو کسی اندھے کنویں میں پھنسا ہوا محسوس کیا ہے؟

کیا کبھی آپ کو لگا کہ آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آپ کو ریل کی پٹڑی پر لٹا دیا گیا ہو اور کہا جائے کہ ریل گاڑی تمہارے اوپر سے ضرور گزرے گی اور تمہیں ریل گاڑی گزرنے کے باوجود بس ہنستے رہنا ہے؟

"نہیں۔۔۔؟"

"اچھا تو کیا آپ نے کبھی ایسا کوئی انسان بھی نہیں دیکھا جو اس کیفیت کا شکار ہو؟

"اگر نہیں دیکھا تو ایک نظر بیڈ کی پائنتی پر بیٹھی آنسو بہاتی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیجیے۔۔۔

جی ہاں۔۔۔ وہ خوش نصیب ہے۔۔۔ جس کا نصیب شاید اس کے نام سے بالکل مختلف لکھا گیا تھا۔

اگر آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ خوش نصیب کو بیچ میں باندھ کر ریل گاڑی کے آگے لٹا دیا گیا تھا اور مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہنستی رہو اور خود کو ختم کر دو کسی شکوے کے بغیر۔۔۔
اس نے ماں کے سامنے آواز بلند کی تھی مگر اسے دھتکار دیا گیا تھا۔ ماں کے بعد صرف ایک ہی انسان تھا جس کے پاس جا کر وہ آنسو بہا لیتی تھی سو اس وقت بھی وہ عرفات ماموں کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ دل میں ابھرتے ہوئے تمام شکوے، تمام شکایات، تمام گلے وہ ان کے سامنے بیٹھی بیان کرتی چلی گئی تھی۔
عرفات ماموں کی حالت بتدریج سنبھل رہی تھی۔ وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اٹھ کر بیٹھتے تھے اور آہستہ آہستہ بات کر پاتے تھے مگر پھر بھی ابھی ان کی حالت مکمل طور پر سنبھلی نہیں تھی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اداس نظروں سے خوش نصیب کو دیکھ رہے تھے۔ کل رات ہونے والے ہنگامے کے بارے میں انہیں شیرو سے پتا چلا تھا جو خود بھی مکمل تفصیل سے بے خبر تھا چنانچہ انہوں نے کیف کو بلا بھیجا تھا۔ کیف نے بڑی مشکل سے انہیں تمام بات سے مطلع کیا تھا اور وہ یہ بات سن کر بھی حیران رہ گئے تھے کہ خوش نصیب نے یہ سب کیا ہے۔ ساری بات کو سنتے ہوئے وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتے رہے تھے۔ انہیں اس بات پر ذرا سا بھی یقین نہیں آیا تھا حتیٰ کہ کیف نے چڑ کر انہیں خوش نصیب کے معافی مانگنے کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔
تمام بات جاننے کے بعد انہوں شیرو کو بھیج کر خوش نصیب کو بلایا تھا مگر خوش نصیب اس کے ساتھ نہیں آئی تھی بلکہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال گئی تھی۔ دوبارہ بھیجنے پر اس نے بعد میں آنے کا بولا تھا اور بالآخر شام میں وہ وہاں آ گئی تھی۔
چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ عرفات ماموں کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی تھی اور بات کا آغاز کیا تھا۔
"السلام وعلیکم ماموں۔۔۔! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ ماشاءاللہ آج تو کافی بہتر لگ رہے ہیں۔"
"وعلیکم السلام۔۔۔"
سلام کے جواب کے سوا انہوں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بغور خوش نصیب کو دیکھ رہے تھے جیسے اس کی آنکھوں سے ہی سب جان لینے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جب چند لمحوں تک انہوں نے اپنی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تو خوش نصیب نے ہی سٹپٹا کر سر جھکا لیا۔ وہ بالکل نہیں چاہتی تھی کہ عرفات کو کچھ بھی پتا چلے۔ اسے یاد تھا کہ کیف نے کس قدر سختی سے منع کیا تھا کہ ماموں کو کسی قسم کی ٹینشن نہیں دینی ہے۔ بس وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی مگر چپ رہنے سے کیا ہو جانا تھا۔ آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہو رہا تھا۔ اس پانی کو باہر آنے سے روکنے کے لیے اس نے پھر سے بات کا آغاز کیا۔
"آپ نے مجھے بلایا تھا ماموں۔۔۔ سوری میں اس ٹائم آ نہیں سکی۔۔۔ سب خیریت تھی؟"
"یہ تو تم بتاؤ خوش نصیب! سب خیریت ہے؟"
"جی ماموں۔۔۔! سب خیریت ہے۔۔۔" اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا تھا۔
"اچھا۔۔۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "ذرا یہ بات سر اٹھا کر کہو تا کہ مجھے یقین آ جائے۔۔۔"
خوش نصیب نے بے چارگی سے سر اٹھایا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں آنکھوں میں جمع پانی اس کی چہرے پر بہہ رہا تھا۔ عرفات ماموں افسردگی سے اس کو روتا ہوا دیکھتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے شیرو کو مخاطب کیا تھا۔
"جاؤ شیرو۔۔۔! دو کپ اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔۔۔"
"اچھا جی۔۔۔" شیرو تو خود وہاں سے بھاگ نکلنے کے چکر میں تھا۔ غصیلی سی خوش نصیب باجی کو ایسے روتے دیکھ کر اسے خود رونا آنے لگا تھا سو اس نے سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔
"خوش نصیب۔۔۔! بچے چپ ہو جاؤ۔۔۔" عرفات ماموں نرمی سے بولے تھے۔ "مجھے بتاؤ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں ماموں۔۔۔آپ کو بتا ہی دیا ہو گا سب نے۔۔۔کہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں۔۔۔میں بد کردار ہوں، بے غیرت ہوں۔۔۔ابھی تک نہیں بتایا کسی نے؟ چلیں میں بتاتی ہوں۔۔۔میں معصوم شامیر کو بہکا رہی تھی کہ وہ میری بہن کو چھوڑ دے اور مجھے اپنا لے۔۔۔اس قدر اچھا لگنے لگا تھا وہ مجھے کہ میں آدھی رات کو اس کے کمرے میں گئی تھی تاکہ اسے بہکا سکوں کہ وہ ماہ نور کے بجائے مجھے اپنائے۔۔۔اور۔۔۔"

"خوش نصیب۔۔۔!بس کرو۔۔۔"

"کیوں ماموں؟ آپ کو بھی میرے کرتوت سن کر شرم آ رہی ہے کہ میں اسے کیسی لڑکی سمجھتا تھا اور یہ اصل میں کیا نکلی ہے۔۔۔"خوش نصیب خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔

"میں جانتا ہوں خوش نصیب! یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔اگر مجھے ان سب باتوں پر یقین ہوتا تو میں تمہیں یہاں بلاتا ہی کیوں؟ تم مجھے وہ سب بتاؤ جو سچ ہے؟ اور یہ شاہ جہاں کا کیا چکر ہے؟ کیا یہ سب تم سے پوچھ کر کیا جا رہا ہے؟"

خوش نصیب کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔"آپ کو لگتا ہے ماموں کہ مجھ سے پوچھ کر یہ سب کیا جا رہا ہے۔۔۔مجھے تو بس بتا دیا گیا ہے کہ اس دن تم سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے ہم لوگ۔۔۔اور آپ جانتے ہیں، اس فیصلے میں میری ماں بھی برابر کی شریک ہے۔۔۔اس نے خود شاہ جہاں بھائی کو میرے لیے پسند کیا ہے۔۔۔"وہ پھر سے رو دی تھی۔

"تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا کل رات؟"

اور پھر خوش نصیب انہیں سب بتاتی چلی گئی تھی۔۔۔

صیام کا اسے ماہ نور اور شامیر کے بارے میں بتانا۔۔۔

اس کا شامیر کے کمرے میں جانا۔۔۔

شامیر کا اس سے ایسے بات کرنا جیسے خوش نصیب کسی غلط ارادے سے وہاں آئی تھی۔۔۔

تایا کی وہاں موجودگی۔۔۔ان کا خوش نصیب کو گالیاں دینا۔۔۔

ماں کا اس پر ہاتھ اٹھانا۔۔۔اور پھر صبح اس سے معافی منگوانا۔۔۔

"ماموں! میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اب ان میں سے کسی کی پروا نہیں کروں گی۔۔۔جیسے میری ماں اور بہن نے مجھے قصوروار ٹھہرایا ہے۔۔۔جس طرح کیف جو میرا دوست ہونے کا دعوا کرتا تھا مجھ سے لاپروا ہوا ہے۔۔۔میں بھی ان سب کو ایسے ہی ان کے حال پر چھوڑ دوں گی۔۔۔مگر دیکھیں نا ان لوگوں نے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔۔۔میرا گناہ کیا اتنا بڑا ہے کہ میری شادی شاہ جہاں بھائی سے کر دی جائے۔۔۔کیا میں زندگی میں کبھی بھی کچھ اچھا ڈیزرو نہیں کرتی ہوں۔"

وہ روئے چلی جا رہی تھی اور عرفات ماموں بیچارگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔وہ نہ تو اس حال میں اس کی کوئی مدد کر سکتے تھے نہ اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتے تھے۔

جبکہ کمرے کے باہر کھڑا کیف عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔اس کی کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔۔۔جب بھی کل رات اور آج صبح کے بارے میں سوچتا تھا تو خوش نصیب ہی غلط دکھائی دیتی تھی مگر جو کچھ وہ عرفات ماموں کو بتا رہی تھی، اس سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ خوش نصیب کو بڑی چالاکی سے اس مسئلے میں پھنسایا گیا تھا۔وہ یہاں ماموں سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرنے آیا تھا۔شامیر نے ابو کے سامنے صیام اور اس کی شادی کا جو شوشا چھوڑ دیا تھا، اس سے وہ بہت پریشان تھا۔صیام سے شادی کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ساری عمر کے لیے ایک عذاب اپنے سر لینے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔۔۔پھر ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس نے خوش نصیب کو ہی

اپنے لائف پارٹنر کے طور پر سوچا تھا تو اتنی جلدی اس بات کو بھولنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہ صیام والے مسئلے میں بھی اسے خوش نصیب نے ہی پھنسایا تھا۔۔۔
"خوش نصیب! تمہیں اللہ ہی پوچھے۔۔۔" وہ بڑبڑایا تھا۔ ایک ہی منٹ میں وہ بھول گیا تھا کہ خوش نصیب اندر بیٹھی رو رہی ہے یا کس مسئلے کا شکار ہے۔ "خود ہی سلجھاؤ اپنے مسئلے۔۔۔" وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے واپس چلا گیا۔
اگر اندر کمرے میں واپس آئیں تو عرفات ماموں سخت فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔
"تم نے اپنی ماں کو سب بتایا ہے خوش نصیب؟ وہ شامیر والی بات پر یقین نہ بھی کریں مگر شاہ جہاں سے شادی والی بات پر تو تم انہیں اپنا اعتراض بتا ہی سکتی ہو؟"
"میں نے کی تھی بات ان سے۔۔۔"
"اچھا پھر کیا کہا انہوں نے؟" ان کی آنکھوں سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔
خوش نصیب نے تھکے ہوئے لہجے میں انہیں بتانا شروع کیا تھا۔

★ ★ ★

"خوش نصیب! کل سب لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ میری اور ماہ نور کے ساتھ ہی تمہاری اور شاہ جہاں بھائی کی بھی منگنی کر دی جائے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
خوش نصیب کے سر پر تو جیسے کمرے کی چھت آ گری تھی۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا کہ شامیر اس کے بارے میں نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اب کوئی اور دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے مگر خوش نصیب کو اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا ہوا طنز اور کمینگی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے مڑ کر حیرت بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو حیرت تھی اس نے روشن امی کو بھی نظر چرانے پر مجبور کر دیا۔
شامیر اب صابر تایا کی طرف مڑ گیا تھا اور انہیں اپنی کہی ہوئی بات پر راضی کر رہا تھا جبکہ خوش نصیب کو لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر بھی مزید یہاں رکی تو دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دے گی۔۔۔
رات کو اپنے آپ سے کیے ہوئے تمام وعدے ریت کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل گئے تھے۔ اس کے تمام عزائم، صرف اپنے بارے میں سوچنے کا خیال۔۔۔ سب کچھ اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ سب اس کے لیے برا سوچ سکتے تھے۔۔۔ مگر روشن امی۔۔۔
وہ کیسے اس کے بارے میں ایسا فیصلہ کر سکتی تھیں؟ کیا انہیں ایک بار بھی خوش نصیب کا خیال نہیں آیا۔۔۔
اپنے ذہن کو اس سے زیادہ ماؤف اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔
وہ مزید ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر وہاں سے باہر نکل آئی تھی۔ اور جب تک وہ کمرے سے باہر پہنچی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ اپنی ہتھیلیوں سے چہرے کو رگڑتے ہوئے اس نے تیزی سے صحن کو عبور کیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سیڑھیوں تک پہنچتی، وہ کسی سے ٹکرا گئی تھی۔۔۔
وہ کیف تھا۔۔۔ جو اسے روتا دیکھ کر خود بھی رونے والا ہو گیا تھا۔ سارا غصہ اور شک ایک طرف، محبوبہ کے آنسو ایک طرف۔۔۔
"خوش نصیب۔۔۔!" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔
لیکن سامنے کسی ناول کی ہیروئن تو کھڑی نہیں تھی کہ اس تصادم پر آدھا گھنٹہ وہاں ہی کھڑی ہو کر ہیرو کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی یا اور نہیں تو ہیرو کی بانہوں میں جھول کر بے ہوش ہی ہو جاتی۔۔۔
لیکن نہیں جی۔۔۔ سامنے تو کھڑی تھی خوش نصیب عرف چھل پیری۔۔۔ اور اللہ کیف کے حال پر رحم کرے کہ وہ

اس سے ٹکرایا بھی اس وقت تھا جب خوش نصیب سچ میں دکھ اور تکلیف کا شکار تھی۔۔۔ بس ہماری ہیروئن نے کسی بھی ناول کی ہیروئن کو کاپی کرنے کے بجائے ٹارزن کو کاپی کرنا مناسب سمجھا۔

دونوں ہاتھ کیف کے سینے پر رکھ کر اس نے پوری طاقت سے کیف کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ کیف بھی خود کو اس حملے سے بچا نہیں سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

''خدا غارت کرے تم سب کو۔۔۔'' وہ حلق کے بل چیخی تھی اور پھر اتنی ہی تیزی سے زینہ عبور کر گئی تھی۔

جبکہ۔ کیف بیچارہ جو گرتے گرتے بچا تھا، دانت پیس کر غرایا تھا۔

''خوش نصیب کی بچی۔۔۔''

کمرے میں پہنچنے کے بعد وہ کرسی پر ڈھے سی گئی تھی۔

کمرہ اس وقت بالکل خالی تھا۔ ماہ نور شاید نانی کو اپنے ساتھ نیچے لے گئی تھی۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد خوش نصیب نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اتنا شاک تو اسے تب بھی نہیں لگا تھا جب روشن امی نے اس کی بات سنے بغیر اس پر ہاتھ اٹھایا تھا اور اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ مقصد دروازے کو اندر سے بند کر لینا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اس طرح ٹوٹی پھوٹی حالت میں دیکھے۔

وہ دروازے کے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ روشن امی اندر داخل ہوئی تھیں اور پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ یقیناً وہ خوش نصیب سے دوٹوک بات کرنے کے لیے آئی تھیں۔ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ وہ سامنے چارپائی پر جا بیٹھی تھیں۔ آنکھوں میں گہری سوچ کا عکس لیے وہ بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھیں۔

خوش نصیب کی نظریں ماں پر جمی تھیں پر اس نے کچھ بھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں کتنے ہی اندیشے، کتنے ہی خوف ظاہر کر رہی تھیں۔

''جیسا کہ شامیر نے تمہیں بتا دیا ہے خوش نصیب! تمہارا رشتہ شاہ جہاں کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ تمہیں خود یہ سب بتاؤں مگر خیر۔۔۔ تمہیں یہ سب شامیر سے ہی پتا چلنا تھا۔ شامیر کی خواہش ہے کہ تمہاری شادی بھی اس کی اور ماہ نور کی شادی کے ساتھ ہی ہو۔۔۔'' وہ سانس لینے کو رکی تھیں۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟'' خوش نصیب کی آواز غصے کی شدت سے لرز رہی تھی۔

''میرا نہیں خیال کہ اس میں کوئی قباحت ہے۔۔۔''

خوش نصیب کو جھٹکا لگا تھا کہ بات سن کر۔۔۔ یعنی ان کی نظر میں اس رشتے میں کوئی قباحت ہی نہیں ہے۔ مگر ماں کی پوری بات سن کر اندازہ ہوا کہ انہوں نے اس کی بات کو اتنی بھی اہمیت نہیں تھی کہ اس کا جواب ہی دے دیتیں۔

''میرا نہیں خیال کہ اس میں کوئی قباحت ہے۔۔۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے۔ تم دونوں کی شادی ایک ساتھ ہو جائے گی تو میرے سر سے بھی بوجھ اتر جائے گا۔ ماں باپ کے لیے یہ بڑا سکون کا مقام ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرض سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔۔۔ میں۔۔۔''

''تو آپ کے خیال میں اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے اپنی اولاد کو کسی آدھے پاگل انسان کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے؟'' خوش نصیب ان کی بات کاٹ کر بدتمیزی سے چلائی تھی۔

''تمیز سے بات کرو خوش نصیب۔۔۔'' روشن امی نے اسے سختی سے ٹوکا۔ ''دن بہ دن تمہاری بدتمیزی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اول تو تم شاہ جہاں کی معصومیت کو پاگل پن نہیں کہہ سکتیں، دوسرا یہ کہ وہ کم از کم تم سے زیادہ ہی عقل

مند ہے۔"

"آپ فی الحال تمیز کی بات کو چھوڑ دیں امی۔۔۔ مجھے بس یہ بتائیں کہ کیا سوچ کر آپ نے شاہ جہاں کو میرے لیے چنا ہے؟ کیا اتنی نفرت کرتی ہیں مجھ سے کہ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے کسی کے بھی حوالے کر سکتی ہیں۔ آخر کیوں امی؟ آپ اپنے فرض کو پورا کرنے کے چکر میں میری زندگی تباہ کر دینا چاہتی ہیں۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے ہی رونے لگی تھی۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے ایسے ہی اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔"

"کیوں کیا برائی ہے شاہ جہاں میں؟ صرف یہ کہ وہ معصوم ہے۔۔۔ اس لیے میں تمہارے لیے اس کے رشتہ سے انکار کر دیتی؟"

"آپ کی نظر میں اس میں کوئی برائی نہیں ہے؟ تو پھر یہی رشتہ آپ نے ماہ نور کے لیے کیوں نہیں پسند کر لیا۔۔۔ مگر نہیں، وہ تو آپ کی پیاری اولاد ہے۔ اس کے لیے آپ ایسا کیوں سوچیں گی۔۔۔ بلکہ مجھے تو۔۔۔"

"یہی بات خوش نصیب۔۔۔" انہوں نے سخت غصے سے اس کی بات کاٹی تھی۔ "بالکل یہی بات۔۔۔ تم سے برداشت نہیں ہو رہا کہ ماہ نور کے حصے میں کچھ بہتر کیوں آ گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس حد تک گر جاؤ گی کہ اپنی سگی بہن کے لیے اس طرح سے سوچو گی۔ اس کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہو گی۔"

ان کا غصہ آسمان پر جا پہنچا تھا جبکہ خوش نصیب اس الزام پر سُن ہو گئی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی۔۔۔ میں بس یہ کہہ رہی ہوں۔۔۔"

"تم جو بھی کہہ رہی ہو۔۔۔ اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اپنی بات کو اپنے تک ہی رکھو۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ تمہاری شادی شاہ جہاں سے ہوگی اور اسی تاریخ کو ہوگی جو ہم طے کریں گے۔"

"آپ لوگ یہ نہیں کر سکتے۔۔۔ آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتیں۔۔۔"

"میں یہی کروں گی خوش نصیب۔۔۔ اور تمہیں میری بات ماننی ہی ہوگی۔" ان کے لہجے میں نرمی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔

"امی۔۔۔! یہ مت کریں پلیز۔۔۔" خوش نصیب کرلائی تھی۔ منتوں کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

"میری ایک بات کان کھول کر سن لو خوش نصیب۔۔۔!" روشن امی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ "چاہے تم کچھ بھی کہو یا جو بھی کرو۔۔۔ تمہاری شادی اگلے ہفتے ہوگی اور شاہ جہاں سے ہی ہوگی۔۔۔ میں اس معاملہ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ تمہیں جتنا رونا ہے یہاں بیٹھ کر رو لو۔۔۔ کیونکہ اس کے بعد میں تمہیں کسی کے سامنے یا اکیلے میں بھی واویلا کرتے نہ دیکھوں۔۔۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ خوش نصیب اپنی جگہ پر ہی پتھر بنی کھڑی تھی۔

"ایک بات اور۔۔۔ خوش نصیب! جو کچھ تم کر چکی ہو۔۔۔ اس کے بعد اگر تم اس آس میں ہو کہ تمہارے لیے آسمان سے کوئی شہزادہ اترے گا یا میں تمہیں اپنے سر پر بٹھا کر رکھوں گی۔۔۔ تو یہ امید بالکل چھوڑ دو۔ تم جیسی لڑکیاں یا تو تمام عمر ماں باپ کے سر پر بیٹھ کر ان کا خون چوستی رہتی ہیں یا پھر انہیں بیاہ کر ان سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے۔

مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں۔۔۔ اپنی ممتا سے مجبور ہوں۔۔۔ نہ ہی میں اتنی بہادر ہوں کہ تمہاری شان میں پڑھے جانے والے قصیدے سنوں۔۔۔ اس لیے مہربانی کرو اور مجھ پر رحم کھاؤ۔۔۔ پہلے ہی زندگی میں مشکلات کم نہیں ہیں جو تم انہیں بڑھانے پر تلی ہوئی ہو۔ میں دوبارہ دہرا رہی ہوں خوش نصیب! تمہاری شادی اگلے ہفتے ہوگی اور شاہ جہاں سے ہی ہوگی۔۔۔"

اپنی بات پوری کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی تھیں اور خوش نصیب کمرے میں تنہا رہ گئی تھی

خوش نصیب جو کچھ تم کر چکی ہو۔۔۔ اس کے بعد اگر تم اس آس پر ہو کہ تمہارے لیے آسمان سے کوئی شہزادہ اترے گا یا میں تمہیں اپنے سر پر بٹھا کر رکھوں گی۔۔۔ تو یہ امید بالکل چھوڑ دو۔ تم جیسی لڑکیاں یا تو تمام عمر ماں باپ کے سر پر بیٹھ کر ان کا خون چوستی رہتی ہیں یا پھر انہیں بیاہ کر ان سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے۔۔۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں۔۔۔ اپنی ممتا سے مجبور ہوں۔۔۔ نہ ہی میں اتنی بہادر ہوں کہ تمہاری شان میں پڑھے جانے والے قصیدے سنوں۔۔۔ اس لیے مہربانی کرو اور مجھ پر رحم کھاؤ۔۔۔ پہلے ہی زندگی میں مشکلات کم نہیں ہیں جو تم انہیں بڑھانے پر تلی ہوئی ہو۔ میں دوبارہ دہرا رہی ہوں خوش نصیب! تمہاری شادی اگلے ہفتے ہوگی اور شاہ جہاں سے ہی ہوگی۔۔۔"

اس نے ماں کے الفاظ من و عن عرفات ماموں کے سامنے دہرا دیے تھے۔ جیسے یہ الفاظ اس کے دل پر نقش تھے۔ اپنی بات پوری کر کے وہ ایسے خاموش ہو گئی تھی جیسے بولنا ہی نہ جانتی ہو۔ وہ ظاہری طور پر عرفات ماموں کے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کا دل و دماغ ابھی تک اس سیلن زدہ کمرے میں ہی تھا جہاں اس کی ماں نے اس کی قسمت کا فیصلہ سنایا تھا۔

"خوش نصیب۔۔۔!" عرفات ماموں نے پکارا۔

وہ چونک کر حال میں واپس آئی تھی۔ اس کا چہرہ ابھی بھی آنسو سے بھیگا ہوا تھا اور اسے خود بھی شاید اس بات کا احساس نہیں تھا۔

"کیا میری غلطی اتنی بڑی ہے ماموں! کہ یہ لوگ میرے ساتھ یہ سب کر رہے ہیں۔۔۔ آپ کو بھی میری بات پر یقین نہیں ہے نا۔۔۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انسانوں پر سچائی ثابت کر سکوں مگر اللہ تو سب جانتا ہے نا۔۔۔ پھر وہ کیوں نہیں مجھے اس مشکل سے نکال لیتا۔ بچپن سے امی نے سکھایا ہے کہ اگر آپ صحیح ہو تو اللہ آپ کی مدد ضرور کرے گا تو ماموں اللہ میری مدد کیوں نہیں کر رہا۔۔۔" وہ سر جھکائے کسی معصوم بچی کی طرح سوال کر رہی تھی۔

افسوس یہ تھا کہ ان کے پاس اسے تسلی دینے کے سوا کوئی حل بھی موجود نہیں تھا اور اس کا مسئلہ اتنا بڑا تھا کہ فقط تسلیوں سے کام نہیں چل سکتا تھا۔

"خوش نصیب! اگر تم سچی ہو تو اللہ پر پورا بھروسا رکھو۔۔۔ وہ ہمیں کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔۔۔ تم بس یقین قائم رکھو۔ کیونکہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ اللہ سے امید رکھتا ہے۔ ابھی تم جاؤ میرے بچے۔۔۔ آرام کرو۔۔۔ اور ہاں کیف کو ذرا میرے پاس بھیجو۔۔۔"

خوش نصیب نے تھکے تھکے انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے ماموں۔۔۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ اللہ حافظ۔۔۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

واپس جانے کے بجائے اس نے پہلے کچن میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کی امید کے عین مطابق شیرو وہاں ہی تھا۔

"شیرو۔۔۔! بات سنو۔۔۔" اس نے پکارا تھا۔

"جی باجی۔۔۔"

"ایک کام تو کر دو میرا۔۔۔"

شیرو منہ سے کچھ کہنے کے بجائے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

"کیف بھائی کے پاس جاؤ اور اس سے کہہ کر آؤ کہ ماموں اسے بلا رہے ہیں۔۔۔" اس نے کہا تھا پھر کچھ سوچ کر مزید بولی تھی۔ "مجھے کچھ کام ہے۔۔۔ میں خود نہیں جا سکتی۔۔۔" خواہ مخواہ کی صفائی دی تھی اس نے۔۔۔

شیرو نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور باہر کی طرف بھاگ گیا۔۔۔
خوش نصیب بھی سستی سے قدم اٹھاتے ہوئے باہر کی طرف چل پڑی تھی۔

☆☆☆

"اچھا جی۔۔۔تو آج کی تازہ ترین خبر یہ ہے کہ شامیر بھائی، ماہ نور کو کل مارکیٹ لے کر جائیں گے شادی کا جوڑا لینے کے لیے۔۔۔۔" منہا نے خبریں سنانے کے انداز میں بتایا تھا۔
جس وقت خوش نصیب، عرفات ماموں کے پاس بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی تھی، اس وقت گھر کی باقی لڑکیاں سوائے ماہ نور کے، منہا کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گفتگو تازہ ترین ٹاپک پر ہی ہو رہی تھی یعنی شامیر اور ماہ نور کی شادی۔۔۔ یہ لوگ ابھی تک اس بات سے بے خبر تھیں کہ ان دونوں کے ساتھ ہی گھر کی ینگ پارٹی کے چار مزید ارکان کو بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
بڑی منتیں کر کے منہا بی بی کو چائے بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ چائے تو لے کر آئی ہی تھی۔۔ ساتھ ہی آج کی تازہ خبر بھی لے آئی تھی۔
"تمہیں کس نے بتایا۔۔۔؟" صیام کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔
"میں نے خود سنا ہے اپنے ان کانوں سے۔۔۔" فخریہ جواب دیا گیا۔
"ممکن ہی نہیں ہے کہ تایا ابا اجازت دیں۔۔۔" صیام نے ماننے سے ہی انکار کر دیا۔
"مجھے تو کیف سے بات کی بھی اجازت نہیں ہے اور یہ جائیں گے شاپنگ پر۔۔۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا جو کہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔
"ممکن ہے محترمہ۔۔۔ اب تو اس گھر میں سب ممکن ہے۔۔۔ میں نے خود سنا ہے۔۔۔ فاطمہ آنٹی نے خود اجازت لی ہے تایا ابا سے۔۔۔ کہ شامیر بھائی ماہ نور کو ساتھ لے جا کر برائیڈل ڈریس لینا چاہتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ تایا ابا نے بڑی خوش دلی سے انہیں اجازت دے بھی دی ہے۔" منہا نے صیام کا مزید خون جلایا تھا۔
اب کی بار فہمینہ کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ "ابا اتنی آسانی سے مان گئے؟" حیرت زدہ سوال تھا۔
"ہاں جی۔۔۔ بڑی آسانی سے مان گئے۔۔۔" منہا نے مزے سے کہا تھا۔
"بڑی زیادتی ہے بھئی۔۔۔ مجھے اور کیف کو تو بات تک کی اجازت نہیں ہے۔۔۔ کیف بیچارہ تایا ابا کے ڈر سے مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔" صیام نے چبھتی ہوئی نظریں فہمینہ پر ڈالی تھیں جیسے وہ بھی اس معاملے میں قصوروار ہے۔
جب کہ چائے کا گھونٹ بھرتی فہمینہ کو اس کی بات پر اس بری طرح ہنسی آئی تھی کہ چائے ناک کے راستے باہر آ گئی تھی۔۔۔ کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا بے چاری کا۔۔۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ اگر صیام کو پتا چل جائے کہ کیف ابا کے ڈر سے نہیں بلکہ اس سے جان چھڑانے کو ادھر ادھر ہو جاتا ہے تو یہ کیا کرے گی۔۔۔
منہا نے کمر پر تین چار زوردار دھموکے رسید کیے، پانی پلایا پھر کہیں جا کر کھانسی کو کچھ آرام آیا۔ اس دوران صیام سکون بھرے انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھی رہی تھی اور فہمینہ کو گھورنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ اس کی کھانسی کو ذرا سا سکون ملا تو اسے صیام کی نظروں کا اندازہ ہوا۔۔۔
چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر وہ بے چارگی سے بولی۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں بھلا اس بارے میں۔۔۔" پھر وہاں سے کھسک لینے کو ہی مناسب سمجھتے ہوئے بولی۔ "میں ذرا اپنا حلیہ درست کر کے آتی ہوں۔"
منہا نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن مزید کوئی بھی بات سنے، وہ وہاں سے رفو چکر ہو گئی تھی۔

''تم بھی حد کرتی ہو صیام۔۔۔'' منہا نے چڑ کر کہا تھا۔
''لو اب میں نے کیا کر دیا ہے۔۔۔'' وہ تنک کر بولی تھی۔
''تم ذرا تمیز سے بات نہیں کر سکتیں دوسروں سے۔۔۔ اب بھلا تم اور کیف بھائی نارمل بات چیت نہیں کرتے اس میں فہمینہ کا کیا قصور تھا جو تم اسے باتیں سنا رہی تھیں۔۔۔ بندہ کوئی خیال ہی کر لیتا ہے، تمہاری ہونے والی نند ہے وہ۔۔۔''
''اوہو۔۔۔ ایک تو تم سب میرے پیچھے ہی پڑے رہا کرو۔۔۔ جسے دیکھو، مجھے ہی لیکچر دے رہا ہے۔۔۔'' صیام بھی غصے سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔
کیف کا یقیناً آج برا دن چل رہا تھا کیونکہ صیام کو کمرے سے باہر آتے ہی وہ دکھائی دے گیا تھا اور وہ تیر کی طرح اس کے سر پر جا پہنچی تھی۔
''کیسے ہو کیف؟'' بڑی لگاوٹ سے پوچھا گیا تھا۔
''کیسا نظر آ رہا ہوں۔۔۔'' آگے سے اکتایا ہوا جواب آیا تھا۔
''تم تو ہمیشہ ہی اچھے نظر آتے ہو۔۔۔'' عادت کے عین مطابق سوچے سمجھے بغیر جواب دیا گیا تھا۔
کیف نے سر اٹھایا اور پھر اسے گھور کر دیکھا۔ ''کوئی کام ہے؟''
''کیوں؟ کیا تم سے میں بات صرف کام کے وقت ہی کر سکتی ہوں؟''
''کرنا تو تمہیں یہی چاہیے۔۔۔'' وہ حد درجہ اکتایا بیٹھا تھا، اوپر سے صیام کا لگاوٹ بھرا انداز مزید غصہ دلا رہا تھا۔ ''اب بول بھی چکو کہ کیوں آئی ہو؟''
''تمہیں پتا ہے کل شامیر اور ماہ نور شاپنگ پر جا رہے ہیں؟''
''تو جا رہے ہوں گے۔۔۔ میں کیا کروں؟''
''تم تایا ابا سے اجازت لو نا۔۔۔ ہم دونوں بھی کہیں گھومنے چلتے ہیں۔۔۔''
''تمہارا دماغ سیٹ ہے؟'' کیف جھٹکے سے ہی اکھڑ گیا۔ ''کن خوابوں میں ہو تم؟ یہ ناولز پڑھ کر اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر جو تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے نا۔۔۔ چچی کو کہو اس کا علاج کروائیں۔۔۔ اگلی بار ایسی کسی فضول اور

بے ہودہ فرمائش کو لے کر میرے پاس آئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔۔۔ بے وقوف۔۔۔''
اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر وہ گھر سے ہی باہر نکل گیا تھا۔
اب سچ تو یہ تھا کہ سارا غصہ خوش نصیب کی صبح والی حرکت پر تھا۔ پھر کچھ دیر پہلے ہی اماں نے اسے تایا ابا کے شادی والے فیصلے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا تو جب صیام نے آ کر ایک ''معصوم سی خواہش'' کا اظہار کیا تو اس نے اپنا سارا غصہ اسی پر نکال دیا تھا۔
کیف تو گھر سے باہر چلا گیا مگر صیام اپنی بے عزتی پر وہاں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کیف کا سر ہی پھاڑ ڈالے۔۔۔ ایک طرف خوش نصیب کے ذریعے اس کی قسمت کھوٹی کروا کر خود سے منگنی کروالی اوپر سے اتنی بے عزتی کر کے چلا گیا تھا۔ صیام بی بی کا غصہ لحہ بالحہ بڑھ رہا تھا۔
''ٹھیک ہے کیف۔۔۔ دیکھنا میں تم سے کیسا بدلہ لیتی ہوں اس انسلٹ کا۔۔۔ ساری عمر مجھے یاد کر کر کے رونے پر مجبور نہ کیا تو میرا نام بھی صیام نہیں۔۔۔'' ایک نئے عزم کے ساتھ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
سیانے کہتے ہیں کہ غصے کو ہمیشہ قابو میں رکھو۔۔۔ غصے میں کوئی فیصلہ نہ کرو کیونکہ غصے میں کیے ہوئے فیصلے تمہیں ضرور ہی ذلیل و خوار کرواتے ہیں۔

مگر افسوس۔۔۔صد افسوس۔۔۔ صیام نے آج تک اپنی ماں کی نہیں سنی تھی، سیانوں کی بات تو پھر کہیں بعد میں آتی ہے۔
جس وقت کیف اسے باتیں سنا کر گھر سے نکلا تھا، اس کے چند منٹوں بعد ہی شامیر گھر میں داخل ہوا تھا۔ بھرپور ترنگ کے ساتھ سیٹی بجاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا، جب اس نے برآمدے میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر صیام کو بیٹھے دیکھا تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا، جو اس نے صیام کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔
صیام جو فی الحال صرف کیف سے بدلہ لینے کے طریقے سوچ رہی تھی، شامیر کے ہاتھ ہلاتے ہی سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے مگر وہ یہ جانتی نہیں تھی کہ آج کا دن اس کے لیے کتنا برا ثابت ہونے والا ہے۔
وہ اٹھ کر تیزی سے شامیر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شامیر نے جو اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہاں ہی رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔
"ہیلو۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟" وہ پاس آ کر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ اب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔
شامیر نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔ "میں۔۔۔ میں تو بہت خوش ہوں۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔ میں جانتا ہوں، تم بھی خوش ہو گی۔۔۔"
"میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں شامیر۔۔۔؟" اس نے کچھ ایسے افسوس بھرے انداز میں کہا کہ شامیر بھی اس کی طرف پریشان ہو کر دیکھنے لگا۔
"شامیر۔۔۔ میں کل سے آپ کی باتوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔۔۔ اور میں نے محسوس کیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ کیف مجھے پسند نہیں کرتا اور جب وہ مجھے پسند نہیں کرتا تو میں اس سے شادی کیوں کروں۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اسے پسند نہیں کرتی۔۔۔ بلکہ۔۔۔"
"ہاں ہاں بولو صیام۔۔۔ بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔؟"
وہ دونوں چلتے ہوئے کچن کے پاس پہنچ گئے تھے۔ شامیر اس سے بات کرتے کرتے وہاں ہی رک گیا تھا۔ اب وہ ایسے کھڑے تھے کہ ان کے پیچھے کچن کی کھڑکی تھی۔
"شامیر۔۔۔ آپ نے مجھے جو کچھ بھی کہا تھا، میں نے سنجیدگی سے اس پر غور کیا ہے۔۔۔ آپ خوش نصیب سے بدلہ لے چکے ہیں۔۔۔ آپ نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا ہے۔۔۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ۔۔۔ آپ ماہ نور کے بجائے اسے ہی اپنائیں جسے آپ پسند کرتے ہیں۔۔۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی تھی۔ بہرحال اپنے منہ سے ایسی بات کہنا آسان نہیں تھا۔
"کیا مطلب صیام؟ کیا بول رہی ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔ کون سا بدلہ؟ اور کسے اپناؤں؟ جسے پسند کرتا ہوں اسی کو تو اپنا رہا ہوں۔۔۔" اس کے چہرے پر اتنی حیرت تھی کہ ایک لمحے کو تو صیام کو بھی محسوس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہی ہے۔۔۔
"آپ کل شام کہہ رہے تھے نا۔۔۔ صحن میں بیٹھ کر ہم نے بات کی تھی؟ یاد آیا۔۔۔"
"کیا بول رہی ہو صیام۔۔۔ میں تو کل تم سے ملا تک نہیں۔۔۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے۔۔۔"
وہ دھڑلے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ صیام کو اپنے پیروں تلے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جبکہ کچن میں موجود ماہ نور کھڑکی سے کچھ مزید قریب ہو گئی تھی۔
"کیا بول رہے ہیں شامیر آپ۔۔۔ یہاں صحن میں ہم نے بات کی تھی۔۔۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ مجھے

پسند کرتے ہیں اور یہ کہ خوش نصیب آپ کو تنگ کر رہی ہے کیونکہ وہ خود آپ میں انٹرسٹڈ ہے۔۔۔آپ نے کہا تھا نا کہ آپ خوش نصیب کو۔۔۔"

اندر کھڑی ماہ نور نے ایک ایک لفظ بغور سنا تھا۔

"یار تم اسب پاگل ہو گیا؟" وہ غصے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلایا تھا۔"پہلے خوش نصیب اور اب تم۔۔۔سب میرے پیچھے کیوں پڑی ہو؟ آخر مسئلہ کیا ہے تم سب کا؟ کیوں آخر تم لوگ نہیں چاہتے کہ میں ماہ نور کو اپنی زندگی میں شامل کروں؟ پہلے اس نے رات کو ایک ڈرامہ کری ایٹ کیا اور اب تم۔۔۔اور میں تمہیں کیوں کہوں گا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں جب کہ ایسا کچھ ہے ہی نہیں۔۔۔میری بات سنو۔۔۔تم لوگ دور رہو مجھ سے۔۔۔میں نے تم سے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔اس لیے مجھ پر الزام لگانا بند کرو۔۔۔میں ماہ نور سے محبت کرتا ہوں اور اسی کو اپنا لائف پارٹنر بناؤں گا۔۔۔سو پلیز جسٹ سٹے آوے فرام می۔۔۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

صیام کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔وہ شاک کی سی کیفیت میں پلٹ گئی تھی جبکہ کچن میں کھڑی ماہ نور کو اپنی قسمت پر ناز محسوس ہوا تھا۔۔۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے معاویہ نے اسے اور فی بی کو ان کے ہاسٹل سے پک کر لیا تھا۔

آفیشلی ایک کپل کے طور پر یہ ان کا پہلا ڈنر تھا، اس لیے منفرا نے اس ڈنر کے لیے تیار ہونے میں کافی وقت صرف کیا تھا۔

اس نے اپنے کپڑوں سے لے کر اپنے لپ اسٹک کے کلر تک کو خوب ہی سوچ سمجھ کر منتخب کیا تھا۔اس سے پہلے اسے اپنی تیاری کی کبھی اتنی فکر ہوئی بھی نہیں تھی۔بنیادی طور پر وہ ایک اپنے آپ میں گم رہنے والی بندی تھی جسے اس بات سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ اس کے حلیے کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، مگر اس ایک انسان کے اس کی زندگی میں شامل ہو جانے سے وہ بدل گئی تھی۔اب دل چاہتا تھا کہ کم از کم وہ اس ایک انسان کو ہمیشہ اچھی ہی لگے۔

یہ اور بات کہ اس وجہ سے فی بی کو اسے تنگ کرنے کا خوب ہی موقع ملا تھا۔اس کی تیاری کے دوران وہ اس پر تسلسل جملے کستی رہی تھی۔منفرا بظاہر اس کے جملوں پر اسے ٹوکتی اور جھڑکتی رہی تھی مگر دل ہی دل میں اس نے خوب ہی اس چھیڑ چھاڑ کو انجوائے کیا تھا۔معاویہ کے نام پر کی جانے والی یہ چھیڑ چھاڑ اسے مزہ دے رہی تھی مگر فی بی کے سامنے اس بات کا اظہار اسے مزید شہہ دے دیتا۔بس منفرا بھی پکی سی شکل بنائے، اسے مکمل نظر انداز کیے شیشے کے سامنے کھڑی تھی اور کانوں میں ٹاپس پہن رہی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے شیشے میں خود کو غور سے دیکھا تھا۔

اور شیشے نے گواہی دی تھی کہ وہ خوبصورت لگ رہی ہے۔

مگر کیا کرتی کہ اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ فی بی کی طرف گھوم گئی تھی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔فی بی شرارت سے کھلکھلا کر ہنسی تو نہ چاہتے ہوئے بھی منفرا مسکرا دی تھی۔اسی وقت اس کے سیل فون پر معاویہ کی کال آئی تھی۔وہ باہر کھڑا ان دونوں کا منتظر تھا۔منفرا نے جلدی جلدی جوتے پہنے، اپنا کلچ اٹھایا اور دونوں باہر کی طرف چل دیں۔

معاویہ نے سامنے سے آتی ہوئی منفرا کو دیکھا تھا۔وہ جو گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، ایک دم سیدھا ہو گیا۔اسے اپنے اردگرد موجود تمام چیزیں ہوا میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔اس کے اردگرد کچھ موجود نہیں تھا یا

شاید وہ کچھ اور دیکھنے سے قاصر تھا، اگر کچھ پردہ بصارت پر ابھر رہا تھا تو وہ سامنے سے آتی ہوئی منفرا تھی۔
وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔ بہت خوبصورت۔۔۔ اتنی خوبصورت کہ وہ مبہوت نگاہوں سے اسے دیکھتا چلا گیا تھا۔
منفرا نے دور سے اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا اور کوئی شک نہیں کہ کہ وہ اس کی نگاہوں سے کنفیوز ہو رہی تھی۔
''آہم آہم۔۔۔ ہیلو معاویہ۔۔۔'' فی بی نے جو معاویہ کو بت بنے دیکھا تو فوراً ہی شرارت سے اسے پکار بیٹھی۔
معاویہ چونکا تھا۔ سب چیزیں اپنی جگہ پر یک دم واپس آگئی تھیں اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہا تھا تو وہ جھینپ گیا تھا۔
''ہائے۔۔۔'' جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا گیا تھا۔
''اگر تم میری دوست کو اچھی طرح دیکھ چکے ہو تو کیا اب ہم چل سکتے ہیں؟'' فی بی نے پھر شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔
''ہاں چلو، چلتے ہیں۔۔۔'' وہ مسکرایا تھا۔
فی بی بھی مسکراتی ہوئی غڑاپ سے کار میں گھس گئی تھی جبکہ منفرا کے لیے گاڑی کا فرنٹ ڈور معاویہ نے خود کھولا تھا۔۔۔
''اچھی لگ رہی ہو۔۔۔ اِن فیکٹ، بہت زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔۔۔''
اس سے پہلے کہ منفرا گاڑی میں بیٹھتی، معاویہ نے اسے بتا دیا تھا۔ منفرا کے چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔
''تھینک یو۔۔۔'' وہ بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی تھی۔
معاویہ نے اس کے بیٹھتے ہی دروازہ بند کیا تھا اور تیزی سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔
''کدھر جانا ہے؟'' اس نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے فی بی سے پوچھا تھا۔
فی بی نے اسے جگہ بتا دی تھی اور وہ لوگ ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔
بلاشبہ یہ معاویہ اور منفرا کی زندگی کے یادگار دنوں میں سے ایک دن تھا۔ یہ شام ہمیشہ ان کی اچھی یادوں کی ڈائری میں رہنے والی تھی۔ معاویہ کی سنجیدہ سی مسکراہٹ، منفرا کا جھجکنا اور فی بی کی چھیڑ چھاڑ۔۔۔ سب نے مل کر ایک شام کو بہترین بنا دیا تھا۔

فی بی نے منفرا کے بعد معاویہ کو بھی خوب ستایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ محبت نے معاویہ کے رنگ ڈھنگ بدل دیے ہیں اور یہ اس کی دوست کا اثر ہے کہ سڑیل سا معاویہ ہنسنا سیکھ گیا ہے۔ وہ مسلسل معاویہ کو یہ کہہ کر چڑاتی رہی تھی کہ وہ پارک میں جاگنگ کرنے نہیں بلکہ منفرا کے لیے آتا تھا اور یقیناً وہ ایک لمبے عرصے سے منفرا کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ منفرا کے ساتھ ساتھ معاویہ بھی ان سب کمنٹس کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسی دوران معاویہ نے منفرا کو یہ بھی بتایا تھا کہ دو دن بعد اردشیر ازی نیویارک آرہے ہیں اور وہ جلد از جلد اس کے پیرنٹس سے ملنا چاہتے ہیں۔
یہ بات بتاتے ہوئے منفرا سے زیادہ معاویہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ اپنی زندگی کے پچھلے آٹھ سال اس نے وقت میں پیچھے کی طرف سفر کیا تھا۔ وہ مزید وقت اپنے ماضی میں رہ کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اب آگے بڑھنا تھا۔ زندگی کو جینا تھا اور خوش رہنا سیکھنا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ منفرا کے ساتھ وہ یہ سب باآسانی سیکھ سکتا تھا۔
اور رہی منفرا تو وہ معاویہ کی سنگت میں خوش تھی۔۔۔ بے حد خوش۔۔۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

آسیہ رزاقی
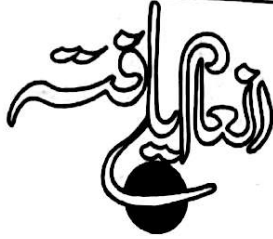
"سب رو رہے ہیں۔" فاران نے مڑ کر پیچھے بیٹھے ہوئے ناظرین کو مطلع کیا۔

غزل پُر درد تھی۔ مغنیہ کی آواز پُرسوز، غم ناک دھیمے سر، شاعر کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے، مگر... رونے والے حالات نہ تھے۔

"بے وقوف۔" چچا سالم نے سگار دانتوں سے کچلا۔ "رو نہیں رہے، سو رہے ہیں۔"

وہ سب ٹی وی کے سامنے بیٹھے انہماک سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ موسیقی کا پروگرام۔ آج اختر کی تقریر والا فنکشن دکھایا جانے والا تھا۔ یونیورسٹی میں تقریری مقابلہ تھا۔ اختر کو فرسٹ پرائز ایک ٹرافی کی شکل میں ملا تھا۔ اسے آج نشر ہونا تھا۔ اس فنکشن میں ابھی دیر تھی۔ ٹی وی پر موسیقی کا پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ اسٹوڈیو میں بہت سے ناظرین بیٹھے تھے۔ اب کیمرہ لوگوں سے ہٹ کر گلوکارہ کی طرف جا چکا تھا۔ اس لیے فوری طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ لوگ سو رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد گلوکارہ کی پُراثر آواز اور دلکش موسیقی میں محو ہو کر سب بھول ہی گئے کہ کیا مقدمہ درپیش تھا۔ اب کیمرہ پھر حاضرین کی جانب آیا۔

"دیکھو... دیکھو۔" فاران جوش میں آواز پر قابو نہ رکھ سکا۔ "وہ رو رہے ہیں۔" اس کی آواز بلکہ لہجے میں یقین تھا۔ فخر تھا۔ اپنی باریک بینی پر۔ کیا زیرک نگاہیں تھیں۔ واہ۔

"صاف اونگھ رہے ہیں...." شبنم نے نکتہ اعتراض پیش کیا۔ "اس گول منہ والی کو دیکھو۔ سو رہی ہے۔"

"خیر۔ اب اتنا بھی بور پروگرام نہیں ہے۔" اختر نے قدرے برا مان کر کہا۔ اصل میں دل میں تو وہ خود کو سمجھانا چاہ رہا تھا۔ ورنہ شک اسے بھی تھا کہ روتے ہوئے نہیں بھئی، بسورتے ہوئے۔ بادی النظر میں۔ کچھ بے کل سے نظر آنے والے لوگ۔ شاید نظر کا دھوکا ہو۔ وہ واقعی رو نہیں۔ سو رہے ہوں۔ کیا تعجب۔

"ارے تو ان بے چاروں کو جانے کہاں کہاں سے تو لا کر بٹھا دیا ہے۔" شبنم نے سب کو متوجہ کیا۔ "وہ کونے والی لڑکی دیکھی تھی؟ اب کیمرہ ادھر آئے تو دیکھنا۔ صاف لگتا ہے اسے کچن میں سے کام کرتے ہوئے اٹھا کر یہاں لا بٹھایا ہے کہ لو بی بی۔ تم تو پروگرام دیکھو۔ کباب پھر بعد میں بناتی رہنا اور وہ بڑے بڑے بندوں والی... توبہ! سونے کے لیے اچھی جگہ ملی۔ اے سی والی۔"

"بس۔ شروع ہو گئی حماقت۔" چچا سالم سگار سے نبرد آزما تھے۔ جو ہمیشہ ان کے منہ میں رہتا تھا۔ بولتے ہوئے، ہنستے ہوئے، ڈانٹتے ہوئے، ہر وقت حتیٰ کہ وہ اسے منہ میں لیے لیے ہی سو بھی جاتے۔ شبنم کو اعتراض تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے وہ اسے منہ سے کیوں نکالتے ہیں۔ اسے بھی کیوں نہیں کھا لیتے تو جواب ملتا کہ ایک میان میں دو تلواریں بیک وقت نہیں سما سکتیں۔

"واقعی چچا! اس کے کپڑے یقیناً "میلے بھی ہوں گے۔ بغیر استری کے تو نظر ہی آ رہے ہیں۔ شاید فوری نوٹس پر آنا پڑا ہے بے چاری کو۔ لگتا تو ایسا ہی ہے بلکہ یقیناً" کچن سے اٹھ کر ہی اسٹوڈیو میں آ گئی ہے۔"

سلمیٰ نے بھی شبنم کے موقف کی تائید کی۔

"تم لوگ بس کپڑوں پر ہی نظر رکھنا۔ نہ جانے لڑکیوں کی نظر اتنی محدود کیوں ہوتی ہے۔" فاران چڑ گیا۔

وہ بہت شوق سے ٹی وی پر نظریں اور سماعت کا استعمال کر رہا تھا۔ اسے دوران پروگرام مسلسل بولنے، تجزیے اور اعتراض کرنے سے سخت الجھن ہوتی تھی۔

"کپڑے ہی نظر آتے ہیں سب سے پہلے۔" شبنم نے صفائی پیش کی۔

"نان سینس۔ یہ رجبی تانگے والے کی ماں کیا کر رہی ہے یہاں؟" چچا سالم چلائے۔ سگار ان کے منہ سے نکل کر گود میں گرا۔ (مارے حیرت کے) ٹی وی کی اسکرین پر ایک بھاری بھرکم خاتون اسٹیج پر نظر آئیں۔

"یہ رجبی تانگے والے کی ماں نہیں ہے۔" اختر نے دانت پیس کر غصے کو قابو میں کیا۔ "یہ ہمارے ملک کی بہت مشہور گلوکارہ ہے۔ ایک تو آپ لوگ ناواقف..... اف۔ لباس دیکھا ہے؟ کتنا شان دار ہے۔ مشہور ہے کہ بے حد نفیس مزاج ہیں۔ لباس کے معاملے میں بے حد منفرد۔ ان سے زیادہ قیمتی اور

ڈیسنٹ لباس کوئی گلوکارہ کیا اداکارہ بھی نہیں پہنتی۔"
"پھر وہی کپڑے۔ یعنی لباس۔" فاران کی مایوسی بڑھ گئی۔ "یہ سب کو کپڑاس کیوں ہو گیا ہے۔"
"کیونکہ..." شبنم پھر بولی۔ "ہمارا ملک کپڑاس کے بحران میں مبتلا ہے۔"
"سنو سنو! دیکھو۔ اب یہ کوئی کمال دکھانے والی ہے۔" چچا سالم مائک کے سامنے کھڑی گلوکارہ کے لہراتے ہاتھ، میچی ہوئی آنکھوں اور کھلے ہوئے منہ کو دیکھ کر شبہ میں مبتلا ہوئے کہ وہ کوئی کرتب دکھانے والی ہے۔
"جی نہیں۔ یہ صرف گا رہی ہے۔ ایکشن کے ساتھ۔" اختر پھر خفگی سے بولا۔
"ایکشن؟ اس طرح؟" چچا سالم نے باری باری سب کو دیکھا اور چپ ہو گئے۔
چچا سالم آج پہلی بار ٹی وی کو بغور دیکھ رہے تھے۔ یعنی کوئی پروگرام شروع سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ ورنہ ان کی دلچسپی صرف خبروں میں تھی اِسی لیے وہ بار بار حیران ہو رہے تھے۔
رجبی تانگے والے کا قصہ یہ تھا کہ وہ ان ہی کے محلے میں رہتا تھا۔ کئی سال پہلے اس کا تانگہ لڑکیوں کو اسکول لے جانے کے لیے بک کرایا تھا۔ اب تو اس کے پاس رکشہ تھا، مگر کہلاتا وہ عرف عام میں 'تانگے والا' رجبی تانگے والا۔ چچا سالم کو وہ مشہور گلوکارہ (بقول اختر) رجبی تانگے والے کی ماں سے مشابہ لگی۔
آج تو وہ اپنے بھتیجے اختر کے اصرار پر اس کی 'تقریر' انعام یافتہ تقریر سننے اور دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ باقی گھر والوں کو بھی ٹی وی سے ڈرامے دیکھنے کی حد تک دلچسپی تھی یا جب کسی کا پسندیدہ کوئی خاص پروگرام آرہا ہو۔ وہ آکر ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا۔ گھر کے دو حصے تھے، مگر ٹی وی ایک ہی تھا۔
بڑے بھائی عالم جہاں زیب کی معمولی سی جاب تھی۔ انہوں نے ایک دکان بھی کرائے پر لے لی تھی۔ جسے ملازم ہی چلاتے تھے اور جو عموماً" نقصان میں رہتی تھی۔ اختر کو ٹائم ملتا تو جا کر دیکھ بھال کر لیتا۔ رجسٹر چیک کرتا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد... بہتر حالات کی خوش آئند امیدیں، توقعات، خدائے بزرگ و برتر پر پختہ یقین نے اسے قناعت کا عادی بنا دیا تھا۔
چچا سالم ریٹائرڈ میجر تھے۔ من موجی، بے فکر، مطالعے کا شوق تھا۔ شبنم ان کی بیٹی، بہت قابل، ذہین اور خوش مزاج تھی۔ بیگم سالم، روزی آنٹی بھی خوش مزاج تھیں۔ ان کی اپنی جٹھانی بیگم عالم سے بہت دوستی تھی۔ بیگم عالم اپنے میاں کا سوئٹر بنا رہی تھیں۔ کبھی کبھی ٹی وی پر نظر ڈال لیتی تھیں۔ انہیں بھی اختر کی تقریر سننے کا اشتیاق کھینچ لایا تھا۔ بیگم عالم نے سلائیاں چلاتے ہوئے ٹی وی پر نظر ڈال کر بیگم سالم سے کہا۔
"اس گلوکارہ نے جو زیور پہنا ہوا ہے۔ وہ نورتن کا ہے یا کسی ایک رنگ کے نگوں کا، گلوبند بہت ہی خوب صورت لگ رہا ہے۔"
"کچھ پتا نہیں چلتا۔" آنٹی روزی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی میں یہی تو خرابی ہے۔ رنگوں کا معلوم کرنا دشوار۔"
"میرا خیال ہے نورتن کا ہے۔" بیگم عالم نے الٹے ہاتھ کی سلائی سیدھے ہاتھ میں لے کر از سرِ نو بنائی شروع کی۔ "سلمیٰ، تم کل شفیق کی بیوی سے پوچھ کر آنا۔ ان کے ہاں رنگین ٹی وی ہے۔ وہ ہر پروگرام دیکھتی ہے۔"
"جی اچھا امی!" سلمیٰ فرماں بردار بھی بہت تھی علاوہ سلیقہ شعار ہونے کے۔
"بہت ہی پیارا لگ رہا ہے۔" بیگم عالم کی نظریں اب پھر ٹی وی کی طرف تھیں۔
"میں سوچ رہی تھی۔ اختر کی دلہن کے لیے پہلے سے ایک سیٹ بنوا کر رکھ لوں۔ یہ ڈیزائن اچھا لگ رہا ہے۔" ان کی نظریں گلوکارہ پر جمی ہوئی تھیں۔ سلائیوں پر ہاتھ رکھا رہا۔ وہ سوچ میں گم تھیں۔
"ہوں۔ ٹھیک رہے گا۔"

"کیا یہ اب ڈانس بھی کرے گی؟" چچا سالم کے منہ سے سگار پھر گود میں جا گرا' مارے تعجب کے۔ "لو گاتے ہوئے ڈانس کی پوزیشن۔۔۔ نئی ترکیب۔"

"جی نہیں۔ یہ آداب بجا لا رہی ہے۔" اختر نے کلاسیکل جملہ ادا کیا اور داد دی (خود کو۔)

"کیا بجا رہی ہے؟ ساز تو نظر نہیں آرہا۔" چچا سالم کی حیرت جوں کی توں۔

"ہائے ہائے بھابھی! آپ نے پچھلے ہفتے کا پروگرام نہیں دیکھا۔" بیگم سالم نے بیگم عالم کو مخاطب کیا۔ "اس میں فاختہ بیگم نے جو سیٹ پہنا ہوا تھا۔ ہائے ہائے۔ میں کیا بتاؤں؟" انہوں نے چٹخارا سا لیا۔ "اتنا حسین' ایسا خوب صورت کہ کیا کہوں جانے کم بختوں کے پاس اتنا زیور آتا کہاں سے ہے اور بھئی کون سا چھپر پھاڑ کر پیسہ برستا ہے کہ ہر روز نئے سے نیا لباس۔ ایک سے ایک قیمتی زیور۔"

"امی! فاختہ نہیں۔ فاخرہ۔" شبنم کی سرگوشی۔

"جی وہ شکریہ ادا کر رہی ہے پسندیدگی کا۔" فاران نے الجھ کر چچا سالم کی حیرت رفع کرنا چاہی۔

"کون سی پسندیدگی؟ میں نے کیوں نہیں دیکھی۔" وہ پھر حیران ہوئے۔

"یعنی اس کی گائیکی کو سب نے پسند کیا۔ تالیاں بجائیں۔ اس کا شکریہ۔"

"کس نے پسند کیا۔ ان سوئے ہوئے لوگوں نے؟ بھائی کمال ہے۔"

چچا سالم کا سگار تیزی سے پوزیشن بدل رہا تھا۔ دائیں پھر بائیں۔ ٹی وی کی اسکرین پر ہال میں اونگھتے اور سوتے ہوئے اور بقول فاران روتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر وہ شدومد سے سگار ہلانے لگے۔ کبھی دائیں' کبھی بائیں۔ ایک نئی گلوکارہ اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ مسکرا مسکرا کر' مٹک مٹک کر گانے لگی۔

"سخت نکما کیمرہ مین ہے۔" اختر نے جھلا کر کہا۔

"بجائے گلوکارہ کا کلوز اپ لینے کے ساڑی پر بنی تتلیاں دکھا رہا ہے۔ چچا ذرا سنیے۔ کتنا اچھا گا رہی ہے۔" اختر کو یہ گلوکارہ بہت پسند تھی۔

"مگر۔۔۔ یہ اس قدر منہ کیوں بگاڑ رہی ہے۔ کبھی مسکراتی ہے' کبھی بسورتی ہے۔ یوں لگتا ہے اسے چیونٹی کاٹ رہی ہے یا مچھر۔۔۔"

"ایکشن۔ چچا ایکشن۔ الفاظ کے مطابق تاثرات کا اظہار۔ لیجے۔ اب کلوز اپ۔ دیکھیے۔ کمال چیز ہے۔" اختر جوش میں آگیا۔

"لیکن۔۔۔ اس کے ہونٹ تو الفاظ کا ساتھ دیتے نظر نہیں آرہے۔ لو منہ بعد میں کھلا۔ آواز پہلے آگئی۔ یہ کیا کمال ہے۔" چچا سالم الجھ گئے۔ "کمال سا کمال؟ واہ بھئی۔"

"دراصل یہ گانا پلے بیک ہو رہا ہے۔ یعنی آواز۔۔۔ یعنی گانا۔ ریکارڈڈ ہے۔ یہ صرف کھڑی گانے کی اداکاری کر رہی ہے۔" اختر کو شرمندگی ہوئی۔ چچا کو سمجھاتے ہوئے خود کو سمجھانے لگا۔ "یعنی بظاہر منہ ہلا رہی ہے۔"

"یہ کہو کہ جگالی کر رہی ہے۔" چچا سالم نے اختر کو سمجھایا۔

"اسی لیے وہ کلوز اپ نہیں دکھا رہے تھے۔" فاران معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

"الو کا پٹھا۔" اختر نے بھنا کر ٹی وی بند کر دیا۔ گالی اس کیمرہ مین کے لیے تھی جو اب پھر سے ساڑھی کی تتلیاں دکھا رہا تھا۔

"بند کیوں کر دیا؟" سلمیٰ منمنائی۔ "میں ڈیزائن دیکھ رہی تھی۔ اتنی پیاری تتلیاں۔"

"ہاں تاکہ پھر مجھ سے ستارے لانے کا کہو۔ جس کا شیڈ ساری مارکیٹ میں نہ ملے۔"

"برخوردار ستارے آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ کمندیں ڈالنی پڑتی ہیں عقل و دانش کی۔" چچا سالم دور کی کوڑی لائے۔

"بھئی' بند کیوں کر دیا۔" فاران نے احتجاجاً" آواز بلند کی۔ "تتلیاں بھی اچھی خاصی تھیں۔ آواز تو آہی رہی تھی گلوکارہ کی۔" فاران اور سلمیٰ کی ہم نوائی نہ

کرے۔ (مشہور تھا۔)

"ہمیں تو چہرے سے غرض ہے۔" اختر نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔ "آواز سننی ہے تو ریڈیو کھول لیا کرو۔"

"چینل بدل دو۔" سلمیٰ نے رائے دی۔ شبنم نے تعمیل کی۔ دوسرے چینل پر بھی موسیقی کا پروگرام آرہا تھا۔

"یہ تو... کوئی دھارمک پوجاپاٹ کا پروگرام ہو رہا ہے۔" چچا سالم نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔ پذیرائی نہ ملی۔

"جی نہیں۔ موسیقی کا پروگرام ہے۔ یہ گانے والی جو مائک لیے کھڑی ہے۔ وہاں کی سب سے مقبول گلوکارہ ہے۔" اختر نے معلومات وسیع ہونے کا دعوا کیا۔

"اس کی آواز کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ آہا۔" فاران سرہلانے لگا۔ (سردھننے لگا۔ عرف عام میں)

"چچا! آپ بھی تو ایک زمانے میں ان کے گیت شوق سے سنا کرتے تھے۔" فاران نے چچا کو یاد دلایا۔

"ارے... تو... یہ "وہ" ہے؟" مارے حیرت کے سگار کے تمباکو کا ڈبہ ان کے ہاتھ سے پھسلا۔

"میں تو یہی سمجھا کہ پوجاپاٹ کا دھارمک... یعنی کہ مذہبی سین ہے۔"

"سفید ساڑھی میں بالکل دیوداسی لگ رہی ہے۔" بیگم عالم نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

(ایک لحاظ سے دیور کے خیال کی تصدیق کی)۔ یوں جیسے وہ دیوداسیوں کو دیکھ چکی ہوں۔

"کوئی زیور نہیں پہنا۔ سادہ سفید ساڑھی، پکی دیہاتن لگ رہی ہے۔" آنٹی روزی مشہور و مقبول مغنیہ کے حلیے سے مایوس ہوئیں۔ "کاش فاختہ بیگم کو دیکھ لیتی۔ تو..."

"امی! فاختہ نہیں، فاخرہ بیگم۔" شبنم نے دوبارہ تصحیح کی۔ یعنی ماں کے منہ میں لقمہ دیا۔ "توبہ۔ ایک تو... امی کو کسی کا نام یاد نہیں رہتا۔ کبھی کبھی تو اختر کو دختر بھی کہہ دیتی ہیں اور ابا جان۔ لمبی بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ کون سی دختر۔ کس کی دختر۔"

سلمیٰ نے منہ آنچل میں چھپا کر ہنسی روکی اور توجہ دوسری سمت مبذول کی۔ "بے چاری، گلوکارہ۔ اس کے پاس اچھے کپڑے نہیں ہوں گے۔ نہیں تو کیوں نہ پہن کر آتی۔ ٹی وی کیمروں کے سامنے تو سب بھڑک دار لباس پہن کر آتے ہیں، تیز... شوخ رنگ... یہاں تک کہ وسیم اکرم اور انور مقصود صاحب بھی سرخ سی شرٹ میں بیربہوٹی بن کر..."

"اف!! سنو۔ سنتے نہیں ہو تم لوگ۔" فاران نے ٹوکا۔ "ہاہ۔ کیا آواز ہے۔ کیا سُر ہیں؟"

"ہمارے ملک کی چار گانے والیوں کے معاوضے کو ملالیں تو اس سے بھی زیادہ معاوضہ لیتی ہے۔ لباس بھی ہوتے ہیں، زیورات بھی۔ دولت گھر کی لونڈی ہے۔" اختر، سلمیٰ کی بات کا جواب اپنی معلومات کے مطابق دے کر مطمئن تھا۔

"تو، پہننے کی تمیز، سلیقہ نہیں۔" آنٹی روزی نے بدمزگی سے منہ بنایا۔ "کاش یہ فاختہ بیگم کو..."

"یہ۔ تم آنکھیں بند کرکے جھومنے کیوں لگے؟ کیا حال آرہا ہے۔" شبنم نے اختر کو ٹوکا۔

"حال، ماضی، مستقبل، سب کچھ۔" اختر نے کہا۔

"مجھے اس کی آواز پسند ہے۔ چہرہ نہیں۔"

"تو... اگر چہرہ نہ ہوتا تو آواز کہاں سے آتی؟" فاران چڑ گیا۔

وہ بڑے شوق سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ ایک ایک لفظ۔ ایک ایک سین۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی کو نظرانداز نہ کرو۔ ہر شخص کی بات سنو۔ ہر منظر پر غور کرو۔ معلومات کا خزانہ ملے گا اور یہاں؟ اتنے اچھے پروگرام کا بیڑا غرق کر رہے ہیں سب۔ پھر پھر بولے جاتے ہیں۔ سننے نہیں دیتے۔

"بھئی۔ پھر ہم ریڈیو ہی سنا کرتے۔ چہرہ دیکھنا ضروری تو نہیں۔" شبنم اختر کو جھومتے دیکھ کر ہنسی۔

"تو... پھر تم... ریڈیو ہی سنو۔" فاران بھنا کر اٹھا۔ ٹی وی بند کرکے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"ارے ظالم! یہ کیا کرادیا۔" چچا سالم کراہے۔

"کیسا سماں بندھا ہوا تھا۔"

"آپ کو علم ہے ناکہ وہ ایک غیر ملکی گلوکارہ ہے۔ اس کو دیکھنا اس کو سننا خلاف قانون اور خلاف اخلاق بھی ہے۔ آئین کی رو سے۔" فاران نے نکتہ اعتراض پیش کیا۔

"ہائیں!! تم آئین کی دُم پر کیسے پہنچے برخوردار۔ قانون کی الف ب کی تم کو خبر نہیں۔ قانون پڑھنا شروع تو کرو۔" چچا سالم کو فاران کی خودسری پسند نہ آئی۔ ٹی وی بند کرنے والی۔

"میں نے آئین کی "رو" کہا تھا۔ اور قانون شروع کیوں کروں۔ ختم کر چکا ہوں۔ میں وکیل ہوں۔ ڈگری یافتہ وکیل۔" فاران اکڑ کر بولا۔

"لاحول ولا۔ تم وکیل ہو۔ خدائی فوجدار تو نہیں۔ اخلاق تو تمہیں چھو کر نہیں گزرا۔" اختر بھڑک گیا۔ اسے بھی گلوکارہ کی گائیکی پسند آرہی تھی۔

"چینل بدل دو۔ ہم اپنے ملک کا پروگرام ہی دیکھ لیں گے۔ کہیں اختر بھائی کی تقریر نہ نکل جائے۔" سلمیٰ گھبرائی کہ کہیں دونوں پھر نہ جھگڑنے لگیں۔ حسب عادت بحسب معمول۔

شبنم نے تعمیل میں دیر نہ لگائی۔ وہاں اب کوئی انگلش پروگرام بلکہ فلم شروع ہو چکی تھی۔ سنسنی خیز میوزک رات کی تاریکی سب سے پہلے پستول کی نال نظر آئی چمکتی ہوئی۔ سب آنکھیں کھولے محو ہو گئے۔ جاسوسی فلم تھی۔ اب وہ آدمی نظر آیا۔ جس نے پستول بڑی مشاقی سے پکڑی ہوئی تھی۔ آدمی پستول تانے۔ چوکنا۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ کمرے کی تلاشی شروع کی۔ کیمرہ اس سے ہٹ کر پیچھے ہوا۔ اب اس آدمی کے پیچھے دروازے کے قریب دوسرا شخص تھا۔ دبے قدموں اس آدمی کے علم میں آئے بغیر خود کو چھپاتا ہوا۔ پستول والے شخص کے پیچھے آرہا تھا۔ اس نئے آدمی کے ہاتھ میں لمبا سا چھرا تھا۔ کھلا خنجر۔ خون جمادینے والا میوزک۔ بھیانک سروں والا آرکسٹرا۔

مدھم مدھم دہشت سے بھرپور میوزک۔ آگے والا شخص الماری کھول کر تلاشی میں مصروف۔ یہ ادھر پھینکا۔ وہ ادھر۔ کپڑے یہاں' جوتے وہاں۔ ڈبے خالی کیے۔ ایک گٹھڑی باندھی۔ کامیابی کے جوش میں لاپروا... مصروف۔ خنجر والا اور آگے آیا۔ میز کی آڑ لیتا ہوا۔ کھلا خنجر ہاتھ میں۔ چھپا چھپا۔ پستول والا بے خبر۔ ناظرین دم سادھے ہوئے...

"توبہ۔ اب یہ چھرا مارے گا بے چارے کو۔" بیگم عالم کی چیخ نکل گئی۔

"بند کرو۔ بند کرو خدارا۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔" انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"پلیز چچی! سب دیکھ رہے ہیں۔" شبنم منمنائی۔

"پلیز امی۔ آپ نہ دیکھیں مگر... ہمیں دیکھنے دیں۔" سکھی چڑچڑائی۔

"میں یہ... خون خرابے والا سین نہیں دیکھ سکتی۔" بیگم عالم نے منہ بھی چھپالیا ہاتھوں سے۔

"ہاں اور اس نے جو ڈاکا ڈالا۔ کمرے کا بیڑا غرق کیا۔ چیزیں پھینکیں۔ کوئی ادھر تو کوئی کدھر۔ سجے سجائے کمرے کا حشر نشر کردیا۔ وہ تو شوق سے دیکھتی رہیں امی آپ۔ یہ تو منافقت ہے کہ جی اپنی مرضی کا دیکھنا ہے۔"

اختر کو غصہ آرہا تھا۔ ایک تو اس کی فرمائش پر بلکہ اصرار پر سب ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ اس کی دھماکے دار انعامی تقریر دیکھنے سننے کے لیے۔ اور... اسے ہی ہر جگہ وضاحتیں دینی پڑ رہی تھیں۔ حالانکہ اس کا تمام مناظر سے۔ ٹی وی کے کیمرہ مین کی نالائقی سے۔ ٹی وی کی کمزور پالیسی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

"اُف اختر۔ تم ہی چپ ہو جاؤ یار۔" فاران گھگھیایا۔

"میں تو چپ ہی تھا۔" اختر نے صفائی دی۔ "مگر باقی سب کو پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ بولے جاتے ہیں۔ نہ خود دیکھیں نہ دیکھنے دیں۔ دوسروں کا خیال کوئی نہیں کرتا۔"

"افوہ بھئی۔ چپ بھی ہو جاؤ۔" فاران کی برداشت جواب دے گئی۔ اختر پر آنکھیں نکالنے لگا۔

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے آخر۔"

نیا سین ابھی شروع ہوا تھا' مگر کوئی دیکھنے بھی دے۔ فاران اختر کے کہنے پر آیا تھا۔ اور... اس کی کوئی سنتا نہ تھا۔

"کیا مطلب ہے؟" اختر غرایا۔ "اب تم لڑو گے مجھ سے؟ ٹی وی بند کردوں گا۔" ساتھ ہی دھونس جمائی۔

"تم۔ تم کون ہوتے ہو بند کرنے والے۔" فاران اڑ گیا۔

"میں؟ میں مالک ہوں اس کا۔ میں ہی خرید کر لایا تھا۔" اختر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ایسے دس ٹی وی خرید سکتا ہوں۔" فاران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مگر خریدا نہیں ایک بھی۔ ٹٹ پونجیے وکیل۔ باتیں ہی باتیں۔"

"بس چپ ہو جاؤ۔ بہت ضبط کر رہا ہوں میں..." فاران کو توہین کے احساس نے مزید تپا دیا۔

"یہ نہ بھولو... میں تمہارا ہونے والا بہنوئی ہوں۔" فاران نے آگاہ کیا اور یہ سچ تھا بھی۔

"ہونہہ۔ ہونے والا بہنوئی۔ جو ہونے والی سسرال میں مستقل پڑا رہتا ہے۔" اختر کے لہجے کی حقارت نے فاران کو غیظ و غضب کی بھٹی میں جھونک دیا۔ ویسے... عرف عام میں تھا یہ بھی سچ۔

"میں۔ میں..." فاران شدت غضب سے کانپنے لگا۔ ٹی وی اسکرین پر اب پھر پرانا سین آرہا تھا۔ ڈاکو مطمئن انداز میں ایک ٹن کھول کر کوئی مشروب پی رہا تھا۔ خنجر بردار ایک بیڈ کے پیچھے چھپا ہوا نگران تھا۔ کب موقع ملے۔ ہاں موقع کی تلاش تھی اسے پھر وہ جھکے جھکے بیٹھے بیٹھے آگے کھسکا۔ ڈاکو پینے میں مست تھا۔ چچا سالم کان بند کیے' آنکھیں اسکرین پر گاڑے دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

شبنم کبھی اختر کو' کبھی غصے میں سرخ سرخ فاران کو'

کبھی ٹی وی کو دیکھ رہی تھی۔ بیگم عالم سراسیمہ تھیں۔ سلمٰی دہشت زدہ۔

"میں۔۔ میں۔۔ سلمٰی سے شادی نہیں کروں گا۔ بس۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

"بس؟ بس تم یہ ہی کرسکتے ہو۔ چھچھورے نکمے انسان۔ موقع دیکھا اور۔۔۔ اچھا نہ کرو۔ میری بہن کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ تم روٹھے۔ ہم چھوٹے۔"

فاران دانت پیس کر پیر پٹخ کر اختر کی طرف بڑھا۔ اختر مکا تانے فاران کی طرف۔ اسکرین پر خنجر بردار اور آگے اور آگے بڑھا۔ بیگم عالم کی چیخ دل ہلانے والی تھی اختر کا رویہ دیکھ کر۔ ادھر شبنم کی چیخ ایک چنگھاڑ تھی۔

"ارے۔ ارے۔ یہ تو ٹریلر تھا۔ کل آنے والی فلم کا۔"

کسی دوسرے پروگرام کا اعلان ہو رہا تھا۔ اختر کی بند مٹھی کھل گئی۔ بیگم عالم نے غشی کے عالم میں صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ فاران کے بگڑے نقوش درست ہو گئے۔

"یہ۔۔۔ ٹی وی۔۔۔ اسے کل ہی واپس کردو۔" فاران نے اختر سے کہا اور شرمسار نظریں سلمٰی پر مرکوز کردیں جہاں 'دنیا جہاں کی بے بسی' مایوسی اور صدمے کی کیفیت تھی۔

"واپس کیوں؟ میں آج ہی خرید لوں گا اسے۔" چچا سالم نے اعلان کیا۔ حالات حاضرہ سے بے خبر۔ وہ اب بھی ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

جب بیڈ روم میں بستر پر گری۔ سلمٰی 'منہ اوندھائے پڑی رو رہی تھی۔ بیگم عالم کو شبنم اس کے پاس چھوڑ کر خود برآمدے میں ستون تھرتے ہوئے فاران سے تیز لہجے میں جواب طلبی کررہی تھی۔ کسی اعلا عدالت میں کھڑے ملزم سے جیسے کوئی مشہور و معروف وکیل جرح کرتا ہے۔ فاران عدالت میں ہی کھڑا تھا۔ اخلاق کی عدالت میں اور بیگم سالم 'میاں کو ٹی وی کے سامنے بیٹھا چھوڑ کر جگ بھر کر گلوکوز کے گلاس تیار کررہی تھیں۔ مسز عالم کے لیے سلمٰی اور فاران کے لیے' اور غصے میں آگ بگولہ اختر کے لیے جو پچھتاووں کے ساتھ گھر سے نکل گیا تھا اور سنسان سڑک پر ٹھوکر مارتا ہوا خود سے جواب طلب کررہا تھا۔

"یہ کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟ میں اتنا بے قابو کیوں ہوا؟"

فاران نے پوچھا تھا۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ ہاں تو مسٹر اختر جواب دیں۔ آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" کیوں برداشت جواب دے گئی اسی طرح۔ اسی عالم میں تو انسان بے قابو ہو کر قتل جیسا قبیح فعل کر گزرتا ہے۔ ہم کیوں ضبط کھو رہے ہیں۔ رشتہ' محبت' مروت' احساس کہاں سوجاتا ہے۔ ہم اپنے رویے سے اپنے لوگوں کو زخمی کیوں کردیتے ہیں۔ کیا ہم منافق ہیں۔ کہنے کے لیے جو الفاظ ہیں 'وہ رویے میں کیوں نہیں۔ کہاں جاکر دم سادھ لیتے ہیں وہ جذبات جن کا ہم پرچار کرتے ہیں۔

جب آنٹی روزی گلوکوز کے گلاس سلمٰی اور بیگم عالم کو دے رہی تھیں اور شبنم فاران کو سمجھا رہی تھی۔ بڑی بہن کی طرح۔ بڑے ماہر وکیل کی طرح دلیلیں دے کر۔

گنگناتا ہوا خانساماں لاؤنج میں آیا۔ صوفے پر سوتے ہوئے چچا سالم کو دیکھ کر مسکرایا اور کھلے ٹی وی پر اختر کو پہچانے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس نے ٹی وی بند کیا اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔

"میں تینوں سمجھاواں کی؟"

اختر کی ضابطہ اخلاق' مروت و رواداری پر مبنی پر مغز تقریر۔۔۔ کوئی دیکھ سکا۔ نہ سن سکا۔ وہ انعام یافتہ تقریر۔۔۔

(مسائل سے بہادری اور ضبط کی طاقت سے نبٹا جاسکتا ہے۔ اختر کو حل سوجھ گیا تھا۔ مگر کب؟)

سنعیہ عمیر

بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کے چند سال بعد بچپن کی یادیں آزاد ہو کر میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ جیسے الماری صاف کرتے ہوئے کوئی یادگار البم ہاتھ لگ جاتا ہے اور اچھے وقتوں کے مناظر پھر سے ہمارے اردگرد بکھر جاتے ہیں' ویسے ہی میں بھی سارا دن پرانے قصوں کا سرے سے سرا جوڑنے لگی تھی۔

تقسیم سے پہلے کے برصغیر میں ہمارا آبائی گھر جالندھر میں تھا۔ گلی کے شروع میں مسجد تھی جس کے آنگن میں املی کا درخت تھا۔ یوں مسجد کا نام املی والی مسجد پڑ گیا اور ہمارے گھر کی ڈاک کے پتے میں مستقلاً" املی والی مسجد کی گلی شامل ہو گیا۔ اب یاد کرتی ہو تو لگتا ہے صحن بہت بڑا تھا جہاں درجن بھر بچے تمام دن کھیلتے اور جگہ ختم ہونے کو نہ آتی۔ مگر عقل کہتی ہے کہ گھر کا صحن اس لیے بڑا معلوم ہوتا تھا کہ صحن سے کئی رستے نکلتے تھے۔

ایک پیچھے والے دالان کو جاتا تھا۔ دوسرا پچھلے صحن سے ملتا تھا جس میں ابا کے چچا رہتے تھے۔ اس رستے پر دروازہ لگا کر انہوں نے اپنا حصہ الگ کر رکھا تھا اور ان کا دروازہ بھی دوسری گلی میں نکلتا تھا۔ تیسرا رستہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔ جہاں ہماری دلچسپی کا مرکز ابو کے پھوپھا زاد بھائی شبیر کا کمرا تھا جو بمبئی سے میم بیاہ کر لائے تھے۔ میم کا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ میری نگاہوں نے تو یہی کہانیاں دیکھی تھیں لیکن وہ گھر اور بھی بے شمار قصوں کا شاہد تھا۔

جن میں سے ایک قصہ میری پھپھو ساجدہ کا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دور ہی ایسا تھا جب وقت میں بہت برکت تھی پھر بھی لوگ عجلت میں رہتے تھے۔ یہاں باپ نے سنا کہ بیٹی سیانی ہوئی تو کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر اٹھ جاتا اور اسی وقت مناسب رشتہ ڈھونڈ کر بات پکی کر آتا۔ پھر آ کر باقی روٹی حلق سے اتارتا۔ پندرھواں لگتے ہی پھوپھو ساجدہ کا بیاہ ہو گیا۔ دادا جی نے بیٹی رخصت کی تو ویسی ہی ننھی سی بہو بیاہ کر لے آئے۔

اب جو گڑیا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے اس زمانے میں لڑکیاں اپنے ہی بال بچے پال رہی ہوتی تھیں۔ پھپھو ساجدہ کے بھی اوپر تلے تین بچے ہو گئے۔ لیکن صورت ویسی ہی اجلی اور بھولی رہی۔ تیسری بیٹی نے تو ابھی پاؤں پاؤں چلنا شروع ہی کیا تھا کہ باپ کا سایہ چھن گیا۔

کچھ عرصے سسرال میں جتن کاٹ کر واپس میکے کے اسی آنگن میں ہجرت کر آئیں جہاں سے کبھی دھوم دھام سے بیاہ کر گئی تھیں تو شان ہی الگ تھی۔ لے جانے والوں کا سر خوشی سے تنا تھا تو بیاہنے والے جدائی میں روتے تھے۔

اب حال یوں تھا کہ سسرال والوں نے گویا دھکا دیا کہ مفت خوروں سے جان چھوٹی اور میکے میں ان کی شکل دیکھ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ شوہر مرا تھا لیکن ان کی اور بچوں کی سانسیں بھی چلتی تھی اور بھوک بھی لگتی تھی۔ بھاوج نے ان کو دور کا الگ تھلک کمرا دیا تھا تاکہ کچن میں جائیں تو ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر کر جائیں۔ لیکن وہ صابر ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی عورت تھیں اس لیے لب سیے بچوں پر جان نچھاور کرتی صبر سے دن کاٹنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

ایک روز کسی ضروری کام کے لیے باپ کے کمرے کے باہر پہنچیں تو گھبراہٹ کے مارے دل یوں اچھلنے لگا جیسے حلق پھاڑ کر نکل جائے گا۔ باپ سے محبت ایک طرف پر ان سے لاڈ کا رشتہ کبھی رہا ہی نہیں تھا جو حق سے فرمائش کرتیں۔ کتنی دیر باہر کھڑے کھڑے حقے کی گڑگڑ سنتی رہیں پھر ہمت کر کے اندر داخل ہوئیں۔

"ابا جی! بچوں کے لیے کوئی استاد رکھوا دیتے تو مہربانی ہوتی۔ بنا باپ کے بچے ہیں۔ توجہ نہ ملی تو بگڑ جائیں گے۔" اب بھی بیٹی نے کہاں زبان کھولی تھی یہ تو ایک ماں تھی جو التجا کرنے آئی تھی۔

"اسکول میں داخلہ کروا تو رکھا ہے۔" ابا جی نے حقہ ہونٹوں سے لگا کر ایسے زور سے گڑگڑایا جیسے بجھتے کوئلوں میں نئی چنگاری بھڑک اٹھی ہو۔

"باپ کی موت کے بعد جو حالات دیکھے ہیں اس سے کند ذہن ہو گیا ہے۔ اسے دگنی توجہ چاہیے۔" ان کا سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔

"دگنی توجہ یعنی دگنا خرچا بیٹی! میرے سامنے بھی تو پالنے اور بیاہنے والوں کی بھیڑ لگی ہے۔" وہ کوفت سے بولے۔

"جانتی ہوں ابا جی۔" انہوں نے پلّو سے سونے کی چوڑیاں نکال کر حقے کے پاس رکھ دیں۔ "آپ بس کسی قابل استاد کا انتظام کر دیں۔"

ابا نے پہلے ان چمکتی چوڑیوں کو دیکھا جو چند سال پہلے وہ خود ہی تو چاہ سے بنوا کر لائے تھے۔ پھر بیٹی کی صورت تاکی۔ جس پر اب کوئی جوت نہ دکھتی تھی تو آہ بھر کر رہ گئے۔ پہلے ہتھیلی میں چوڑیاں واپس تھمائیں پھر سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں کرتا ہوں انتظام۔" اور یہ کہہ کر نظریں چرا لیں۔

اباجی قول کے پکے نکلے۔ تین دن بعد ہی بہت اچھے استاد کو لے آئے جو اپنے نام کی طرح ہی نفیس تھا۔ وہ بہت توجہ سے بچوں کو پڑھانے لگا۔ نفیس برآمدے میں کرسی ڈالے بچوں کو پڑھا رہا ہوتا تو ساجدہ دروازے کی اوٹ سے جھانکتی رہتیں۔ پہلے وہ اس ڈر سے جھانکتی تھیں کہ کہیں وہ بچے پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ پھر جب دیکھا کہ وہ تحمل سے بار بار ایک ہی بات دہراتا ہے۔ جب تک بچوں کو ذہن نشین نہ ہو جائے تو ساجدہ کو اس عمل میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

وہ بچوں کو کامیاب انسان بنانے کے سپنے سجائے بنا پلک جھپکے، دروازے کے پیچھے چھپی لاڈ سے انہیں پڑھتے دیکھتیں۔ کبھی گھر والوں کی نظر بچا کر شکر کا شربت بنا کر نفیس کو بھجواتیں کبھی بیسن کا میٹھا بنتا تو اپنا حصہ سنبھال کر نفیس کے لیے رکھ لیتیں۔ اور اس طرح بنا ہم کلام ہوئے ہی اس کی توجہ کا شکریہ ادا کرتیں۔

ان کا تو کل سرمایہ ان کے بچے ہی تھے۔ وہ سنور رہے تھے تو ان کو اپنے شب و روز سنورتے نظر آرہے تھے۔ پھر بچوں کی ہی خاطر نفیس سے بات چیت ہونے لگی۔ وہ بتاتا کہ بچے کون سے سبق میں کمزور ہیں اور کہاں توجہ چاہیے۔ ساجدہ محنتی تھیں۔ روٹی ڈالتیں تو بچے کو ساتھ بٹھا لیتیں اور ہجے یاد کرواتی رہتیں۔ پھر کپڑے دھونے لگتیں تو دوسرے کو پاس لے بیٹھتیں۔ دو دن بعد ہی ہفتوں سے پھنسا سبق بچوں نے روانی سے سنایا۔ تو نفیس نے اپنے کندھے کے اوپر دروازے کی طرف آواز لگائی۔

"بھئی ماں سکھائے گی تو کیوں نہیں آئے گا۔ ان کے تو ہاتھ کی مٹھائی کھالو تو ہفتہ بھر منہ میں رس گھلا رہتا ہے۔" نفیس بنا جھانکے مخاطب ہوا تو دروازے کی اوٹ سے دیکھتی ساجدہ ڈر کے پیچھے دیوار سے یوں چمٹ گئیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

پہلے شرمندگی سے دوپٹا منہ پر کر لیا پھر کچھ دیر بعد اس ہی دوپٹے میں منہ دیے مسکرانے لگیں۔ اگلے روز وہ پھر دروازے کی اوٹ میں کھڑی بچوں کو پڑھتا اور نفیس کو پڑھاتا دیکھتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

ان کی ننھی بیٹی بھی اب تین سال کی ہو گئی تھی اور ماں کے پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ ساجدہ نے اپنے جہیز کا رنگین غرارہ نکالا جو اب انہوں نے کہاں پہننا تھا اور کاٹ کر اس میں روئی بھری۔ پھر گڑیا کی شکل میں سی دیا۔ کالے دھاگے سے کڑھائی کر کے گڑیا کی لمبی پلکوں والی آنکھیں بنائیں اور سرخ دھاگے سے لب ایسے پروئے کہ گمان ہوتا گڑیا ہر پل مسکرا رہی ہے۔

بچی تو گڑیا لے کر اتنی خوش ہوئی کہ ساجدہ نے اس کی بلائیں لیں۔ پھر ریٹھا اٹھا لائیں اور اس پر سوت کس کر لپیٹنے لگیں اور لپیٹتی گئیں جب تک وہ گیند کی شکل نہ اختیار کر گیا۔ جب وہ گیند انہوں نے بڑے بیٹے کو تھمائی تو بیٹے نے وہیں فرش پر دے ماری۔

"دیکھا! یہ تو اچھلتی تک نہیں۔" بچے کا منہ پھول گیا۔

"ارے زمین پہ نہیں اچھلتی پر ہوا میں تو اچھلتی ہے۔" ساجدہ گیند اٹھا کر اچھال کر دکھانے لگیں۔

"آج کل تو سب کے پاس گیند بلا ہے۔" اس نے مبالغے سے کام لیا۔ گیند بلا ابھی کھاتے پیتے گھروں میں ہی آیا تھا۔

"میرے پاس تو ہاکی تک نہیں۔" بچہ تھا بھلا خواہشیں کیسے نہ ہوں۔

"گیند بلا لے لیا تو پڑھے گا کب' ابھی تو پڑھنے کے دن ہیں۔ خبردار جو وقت ضائع کرنے کا سوچا۔" اپنے تئیں انہوں نے کھلونے کو فضول چیز قرار دے کر بچے کا دل برا کر دیا تھا۔ پر ماں تھیں بیٹے کے منہ پر خوشی دیکھنے کے لیے ایک بار پھر اباجی کے سامنے جھولی پھیلانے پہنچ گئیں۔

"میں دو سال کا تھا۔ جب اپنے باپ کے ساتھ بازار گیا تو ایک لٹو دیکھا اور کہا کہ وہ دلوا دو۔ اسی وقت میرے ابا نے ایک زوردار تھپڑ مجھے مارا کہ آئندہ مت مانگنا۔

وہ دن اور آج کا دن' ایک فرمائش تک نہیں کی میں نے۔"

بات بھی سچ تھی۔ اس وقت بچوں کی خواہشات پوری کرنا بری تربیت کرنا سمجھا جاتا تھا۔ ساجدہ کے دل میں آیا پر بول نہ سکیں کہ کوئی تو وجہ ہے کہ ساٹھ سال کے ہو کر بھی آپ کو اٹھاون سال پرانا لٹو یاد ہے۔ کچھ خواہشیں ماری جائیں تو دل بھی مر جاتا ہے۔ پر کہہ نہ سکیں اور بھاوج کا رخ کیا۔

سب کے ہی ہاتھ محدود تھے۔ یہ تو بھاوج فراخدلی سے اپنے بچوں کے پرانے کپڑے کتابیں اسے تھما دیتی تھیں تو ان کی بہت مدد ہو جاتی تھی۔ اب گیند بلے کے لیے پیسے مانگنا تو ایسا تھا جیسے جائیداد میں حصہ مانگ لیا ہو۔ وہاں سے بھی وہ ناامید لوٹیں تو ماں کی گود میں رو پڑیں۔

"اچھا اچھا دلوا دوں گی۔ کچھ خرچے ہیں۔ کچھ مرمت ہے۔ وہ کروا لوں' پھر دلوا دوں گی۔" ماں نے وعدہ تو کر لیا مگر پورا کرنے کے بجائے ٹالتی رہیں۔ مرمت ہوئی تو عید کے خرچے آ گئے اور گیند بلے کے پیسے نہ نکلے پھر بھی انہوں نے ہار نہ مانی اور بلے سے ٹکرائی گیند کی مانند کبھی بھاوج کے پاس جاتیں تو کبھی ماں کے پاس اور ہر بار جھوٹی امید لیے واپس آتیں۔

اس رات بچوں کے سونے کے بعد انہوں نے صندوق سے پھر سونے کی چوڑیاں نکال کر دیکھیں اور سوچا انہیں اب پہننا نہیں تو سنبھالنا کیوں۔ پھر دوپٹے میں منہ دیے آنسو بہا کر سو گئیں۔

اگلی صبح وہ دیر سے اٹھیں۔ بھابھی امید سے تھیں تو کچن کی ساری ذمہ داری ان پر ہی تھی۔ کھانا پکا کر جب فارغ ہوئیں تب تک نفیس کے جانے کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ عادتاً" دروازے کے پیچھے سے جھانکنے لگیں۔

"بہت خوب برخوردار! تم نے تو بہت اچھا سبق یاد کیا۔ اب یقیناً" امتحان میں اچھے نمبر لاؤ گے۔" نفیس نے کاپی پر شاباش لکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں نے تمہاری محنت دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار تمہیں انعام ضرور ملے گا۔" ساتھ ہی اس نے خاکی کاغذ پھاڑ کر گیند بلا نکالا۔

بچے خوشی سے یوں اچھلے کہ منظر دیدنی تھا۔ کہاں استاد بیٹھا ہو تو سر نہ ہلاتے تھے' کہاں شکریہ ادا کیا اور ناچتے ہوئے گیند بلا لے کر کھیلنے کو دوڑے۔

یہ منظر دیکھتے دیکھتے ساجدہ یوں کھوئیں کہ خبر نہ ہوئی کہ کب دروازے کا پٹ کھل گیا۔ نفیس جانے کے لیے اٹھا تو غیر ارادی طور پر پیچھے دیکھا پھر وہیں جم گیا۔ ساجدہ آنکھوں کے پانی پر بند باندھے کھڑی تھیں۔ معصوم اور بھولی' پھر نفیس کچھ کہے بنا پلٹ گیا مگر ساجدہ نے اس کی آنکھیں پڑھ لی تھیں۔

نفیس ساری ہمت مجتمع کر کے سیدھا ابا جی کی دکان پر گیا تھا اور ساجدہ کا ہاتھ مانگا تھا۔

"میری بیوی چند برس ہوئے فوت ہو گئی۔ میرے دو بچے اپنی دادی کے پاس لاہور میں ہیں۔ میں روزگار کے لیے یہاں ہوتا ہوں۔ اگر اپنا گھر بنا لوں تو ہم ایک خاندان کی طرح رہیں گے۔ میں اس کے بچوں کو اپناؤں گا' بدلے میں صرف یہ توقع ہے کہ وہ بھی میرے بچوں کو ماں کا پیار دے۔"

اس ایک رشتے میں ان کے سو مسائل کا حل تھا۔ مگر ان تمام مصلحتوں پر بھاری یہ ایک اندیشہ تھا کہ نفیس کا ان کے گھر سال بھر آنا جانا رہا تھا' دنیا چشم زدن میں ساجدہ اور اس کے رشتے کو مشکوک کر دیتی۔ اپنی عزت پر ایک بھی حرف نہ آ جائے اس لیے انہوں نے سنگ دلی سے فیصلہ کیا۔ ادھر بیٹھے بیٹھے ہی نفیس کو انکار کر دیا۔ پھر گھر جا کر بیوی کو سب ماجرا کہہ سنایا۔ جب ساجدہ کو پتا لگا تو ماں کے سامنے سینہ کوبی کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"یعنی اماں آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ اگر قسمت خوشی کا در کھولے گی بھی تو بھی آپ لوگ اسے اندر نہ آنے دو گے۔ میرے بچوں کو باپ مل جائے گا۔ میں بھی خوشی کے دو پل دیکھ لوں گی۔" وہ ہر لحاظ بھلا بیٹھی تھیں۔

"تیرے دشمن نہیں ہیں ہم ساجدہ! تیرا گھر بسنے کی صورت نکالتے ہیں کوئی لیکن ایسے لڑکے سے نہیں

جس کے آگے پیچھے کا پتا نہ ہو۔ نفیس سے بیاہ کر ہم تیری جگ ہنسائی نہیں ہونے دیں گے۔" ماں نے ان کا پلو دوبارہ سر پر جمایا جو سر پیٹنے سے سرک رہا تھا۔

"دنیا ہنسے گی نہیں تو ترس کھائے گی، کچھ نہ کرے گی تو تماشا دیکھے گی۔ مجھے دنیا نے چھت دی۔ نہ روٹی۔ میرے بچوں کو وہ شفقت نہیں دے گی۔ کل کو کوئی اور رشتہ آیا تو کیا ضمانت ہے کہ وہ میرے بچوں کو باپ کا پیار دے گا۔ اس کو دیکھا ہے میں نے۔ صرف اچھا استاد نہیں، اسے بچوں سے لگاؤ بھی ہے۔" وہ ماں کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔

"تیرے ابا کہتے تھے پر میں نہیں مانی کہ تیری اپنی نظر میں کھوٹ ہے۔ پر اب مجھے بھی شک گزرنے لگا ہے۔"

ساجدہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور زارو قطار رونے لگیں۔

وہ ماں تھیں اس لیے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ اپنے بچوں کے حقوق کی وکالت کرتی رہیں۔ مگر ان کی ہر التجا میں سب نے نفیس کے لیے لگاؤ ہی دیکھا اور ان کے ہر بین میں نفیس سے ان کی محبت کی تڑپ نظر آئی۔ ہر حربہ آزما کر جب کوئی رستہ نہ ملا تو وہ چپ کر کے بیٹھ گئیں۔ فرق بس یہ آیا تھا کہ اب ان کا صبر اٹھ گیا تھا۔ نصیب نے اگر جھٹکا لگایا تھا تو روشنی کرنے والا بھی بھیج دیا تھا۔

یہ تو اپنے تھے جو ظالم بن گئے تھے۔ نہ کھل کر آسرا دیتے تھے نہ آسرا دینے والے کا ہاتھ تھامنے دیتے تھے۔

✡ ✡ ✡

یہ اس کے چند دن بعد کی ہی بات ہے کہ ابا کے پھوپھی زاد شبیر بمبئی سے واپس لوٹے اور ایسی شاندار واپسی ہوئی کہ سب کے منہ کھلے رہ گئے۔ دو سال ہوئے تھے جب اپنی بیوی منظورہ اور بیٹے کو چھوڑ کر نوکری کے لیے بمبئی گئے تھے۔ بمبئی تو ان دنوں چھوٹا انگلستان تھا۔ ایک طرف بیل گاڑیاں چل رہی ہوتیں تو دوسری طرف چمچماتی موٹر گاڑیاں دوڑتیں۔ وہ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے انگریز سرکار کا اہم ٹھکانہ بھی تھا۔

ناؤمی بہت کم عمری میں برٹش ملٹری میں بھرتی ہو گئی تھی۔ جس طرح ملکہ کا راج کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح ناؤمی کی زندگی بھی اپنی سرحدوں سے دور ہوتی گئی۔ حتی کہ وہ بمبئی آ گئی۔ بمبئی کا دیسی ولایتی ملا جلا ماحول اس کو بھا گیا پھر اس ماحول میں ایک تمیزدار با ادب مسلمان آدمی ملا جو اس کا احترام بھی کرتا اور اس کی ضروریات کا خیال بھی رکھتا۔ اس نے دس سال کی عمر سے اپنا آپ خود سنبھالا تھا۔ اس کو مشرقی مردوں کا عورت کو ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھنے کے انداز میں کشش محسوس ہونے لگی۔ پھر جان پہچان محبت میں بدل کر شادی میں ڈھل گئی۔

شبیر نے خط لکھ کر منظورہ کو ساری بات بتا دی تھی پر منظورہ نے کسی سے ذکر نہ کیا۔ اس لیے بنی ٹھنی میم کو گھر آتا دیکھ کر سب کا چونکنا فطری تھا۔ سالوں سے انگریزوں کی حکومت تھی یہ شادی کوئی انہونی نہیں تھی۔ لیکن جس طرح خوش اخلاقی سے ناؤمی اس گھر میں رہنے لگی وہ سب کو معجزے سے کم نہیں لگتا تھا۔

ہم تو خود اس گھر سے بے زار ہو جاتے تھے۔ جہاں کمرے پر کمرا چڑھا تھا۔ جس کو جگہ کی تنگی لگتی، نقشے کا لحاظ کیے بغیر ایک کمرا ڈال لیتا۔ اوپر کے دو کمرے سالوں سے مرمت کے منتظر رہ رہ کر آخر کباڑ خانے بن چکے تھے۔ جن میں ضرورت کی کوئی چیز لینے اگر جانا ہی پڑ جاتا تو دروازہ کھلتے ہی چوہے استقبال کو آ جاتے تھے۔ ہم سوچتے تھے ان بھرے کمروں کی صفائی اگر ہو تو کیسے ہو۔ اور وہ خوشبودار صابن اور بوتلوں میں بند شیمپو لگانے والی ناؤمی بہت آرام سے وہاں رہتی۔

ناؤمی کو بھی کئی باتیں تعجب میں مبتلا کرتیں مگر اپنی ٹھنڈی میٹھی طبیعت کے باعث منہ سے کچھ نہ کہتی۔ اس نے آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ ننھی ننھی لڑکیاں کس طرح ہر سال بچہ پیدا کر رہی ہیں۔ جب پہلا بچہ سال کا

ہوتا اور دانت نکالنے لگتا تو اگلا بچہ آجاتا۔
سائیں پہلے اور دوسرے میں جتیں کبھی پہلے کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑتیں تو کبھی دوسرے کو۔ بچے پیدا کرنا جتنا عام تھا' بچوں کا فوت ہو جانا بھی اتنا ہی معمول تھا۔
ناؤمی نے سب عورتوں کے حال سے سبق سیکھا۔ اس کی پہلی بیٹی میری کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ناؤمی نے کمرے میں چھت سے جھولنے والا پنکھا لگوایا۔ بجلی تو ہوتی نہ تھی۔ چھت کے ساتھ جھولا لگا کر اس پر ایک موٹی چادر ڈال دیتے تھے اور نیچے بیٹھا کوئی شخص رسی سے جھولے کو کھینچتا رہتا اور چادر ہل ہل کر ہوا دیتی رہتی۔ بچی کے پیدا ہوتے ہی ایک نوکرانی بھی رکھ لی جو بچی کا پنکھا جھلاتی رہتی۔
وقت میں بڑی برکت تھی۔ سائیں ہانڈی روٹی سے فارغ ہوتیں تو خود بچوں کے کپڑے سیتیں۔ ناؤمی بھی بچی کے لاڈ اٹھاتی مگر سینا پرونا نہیں جانتی تھی اس لیے ایک دن ساجدہ پھپھو کے پاس آگئی۔ ساجدہ کے ہاتھ میں کمال کی صفائی تھی۔ گھر کے اکثر لوگ ان سے بچوں کے کپڑے سلواتے یا سویٹر بنوا لیتے۔ ان کی دل آزاری نہ ہو اس لیے نقد کے بجائے ان سے پوچھ لیتے کہ کوئی سودا سلف چاہیے ہو تو بتا دیں۔ ساجدہ بھی ضرورت کی چیزوں میں اجرت وصول کر لیتیں۔
ناؤمی کو اس گھر میں رہتے نصف سال سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اکثر سامنا ہوتا مگر اکیلے میں ملنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ گھر کی اکثر عورتیں اسے لادین سمجھتی تھیں اور زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔
"یہ منی کا فراک ہے۔ میں نے پھول کاڑھے تھے۔ ایسا ہی بنا دوں؟" ساجدہ نے نمونہ دکھا کر پوچھا۔
"بہت اچھا۔" ناؤمی نے سرہلا کر اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔
"ایک بات پوچھوں' آپ کو اپنے گھر والے یاد نہیں آتے؟"
ناؤمی نے یاد کیا کہ کس طرح سالوں سے ان سے کرسمس ہالیڈے کا رشتہ رہ گیا تھا۔ بے حد محبت ہونے کے باوجود ان کی دوری اسے کاٹتی نہیں تھی۔ جب سال میں ایک بار چکر لگاتی تھی تو اسے خوشی بھی بے حد ہوتی تھی۔ ناؤمی کی اردو کمزور تھی اس لیے بچوں کی طرح ادھورے جملوں میں دل کا حال کہہ سنایا۔
"آپ یہاں خوش ہیں؟" اور وہ سوال جو روز اول سے سب کے دل میں تھا کہ اتنا شاندار ملک اور پھر اتنا ماڈرن شہر بمبئی بھی چھوڑ کر یہ میم ان کے سادہ سے گھر میں کیسے آگئی۔ ساجدہ نے پوچھ ہی لیا۔
"بہت خوش۔" ناؤمی نے پہلے ساجدہ کی ٹھوڑی کو چھوا پھر کہا۔ دو لفظوں میں وہ جواب نہ تھا جو اس نے دو چمکتی نگاہوں سے دیا تھا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں نہ سمجھ سکیں لیکن ساجدہ جان گئی تھیں۔ ناؤمی کو شبیر سے محبت ملی تھی اور سائبان بھی یہی اس کی خوشی کا راز تھا۔
"ہمارے خاندان میں پسند کی شادی کا رواج نہیں۔" ساجدہ نے تاسف سے ہتھیلیاں مسلیں۔
"کیوں نہیں' شبیر نے کی تو ہے۔" ناؤمی نے ہنس کر ساجدہ کو یاد کروایا تو ساجدہ کا بچا کھچا صبر بھی دم توڑ گیا۔
ساجدہ نے دو دن میں فراک سی لیا اور تیسرے دن اپنے بیٹے کو پیغام دے کر نفیس کے پاس بھیجا۔ کچھ شادیاں ایسے بھی ہوتی ہیں جیسے جنازے اٹھ رہے ہوں اور ساجدہ کے نکاح میں بھی فرق نہ تھا۔ انہوں نے دو ٹوک کہہ دیا تھا کہ وہ نکاح نفیس سے کریں گی چاہے اس گھر میں ہو ورنہ وہ مجبوراً "دہلیز پار کر جائیں گی۔
اپنے ابا کے لیے وہ اسی دن مر گئیں اور نکاح کا دن آنے تک اماں روز جھولی اٹھا اٹھا کر نفیس کو کوسنے دیتیں جس نے بیٹی کو ورغلا کر اس عمر میں ان کے سر میں خاک جھونکی تھی۔
نکاح پر سب کی ناپسندیدگی اتنی اٹل تھی کہ ساجدہ جان گئی تھیں یہ ان کا اس گھر میں آخری دن ہے۔ پھر

بھی قبول ہے کہ کر اپنے بچے ساتھ لیے اور نفیس کے ساتھ بیاہ کر لاہور چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

جب میں نے ہوش سنبھالا تب سے مجھے ناؤی میں مجھے خاص دلچسپی رہتی تھی۔ میں صبح اس کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ وہ لوہے کی سلاخ گرم کر کے ایک ایک لٹ اس پر لپیٹ کر بالوں کو گھونگھریالا کرتی۔ پھر ملٹری کا لمبا سا خاکی فراک پہنتی۔ اس کو لینے ملٹری کی وین آیا کرتی تھی۔ جس کی آمد سے گلی میں ہمارے گھر کی پہچان بڑھ گئی تھی۔ شروع میں سوکنوں میں کوئی جھگڑا ہوا بھی ہو گا تو مجھے خبر نہیں۔ میں نے بچپن سے یہی دیکھا کہ ناؤی کما کر خرچہ منظورہ کی ہتھیلی پر رکھتی۔ بدلے میں چولہا چوکی اور اس کے بچوں کو منظورہ سنبھالتی۔ ناؤی اتنی نرم خو تھی کہ کبھی ہمیں بھی نہ جھڑکا تھا کہ کیوں میرے کمرے میں منڈلاتے ہو۔ ہم اس کی بیٹی میری اور بیٹے مارک سے جی بھر کر کھیلتے۔

پھر بھی کچھ فرق ہوتے ہیں جو دلوں کی محبت سے بھی پار نہیں ہوتے۔ کچھ تیسرے بچے کے آنے سے ذمہ داریاں بانٹنے کی نیت تھی اور کچھ بچوں کی اچھی تربیت کا خیال تھا جو ناؤی نے بڑے دونوں بچوں کو ایبٹ آباد بورڈنگ اسکول بھیج دیا۔

تیسری بیٹی فلورا جھولے میں لیٹی رہتی تو گڑیا لگتی۔ ہمارا دل کرتا اٹھا کر چومیں تو ناؤی پیار سے منع کر دیتی کہ مجھے نوکری کرنی ہے۔ اس کو گود کی عادت نہ ڈالو۔

میری جب اسکول سے چھٹیوں میں آئی تو بالکل انگریز بن گئی تھی۔ نہ اس کی زبان پلے پڑتی نہ انداز۔ میرا دل بہت اداس ہوا کہ اچھی بھلی میری سہیلی پرائی ہو گئی۔ اتنے میں اوپر کی منزل سے ایک چوہا بھاگتا ہوا آیا تو میری نے ریٹ ریٹ (RAT) کا شور مچا دیا۔ یہ لفظ مجھے آتا تھا۔ وہ ڈر سے اچھلنے لگی تو میں خوشی سے چھلانگیں لگانے لگی اور ہماری پھر سے دوستی ہو گئی۔

ان ہی دنوں دادا ابو کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس کے بعد پاکستان کی تحریک زور پکڑ گئی۔ اب تو ہر جگہ جھنڈا بھی نظر آ جاتا تھا اور نعرے منہ پر چڑھتے تھے۔ یہ نعرے ناؤی کے کانوں تک بھی پہنچے۔

"برٹش سے آزادی سمجھ میں آتی ہے۔ پر ہندوؤں سے کیوں جدا ہونے پر بضد ہو؟"

دور سے دیکھنے والوں کو یہی لگتا تھا کہ جیسے ہر شہر کے اپنے رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں ویسے ہی ہندو مسلم دو شہروں کے باشندے ہیں۔ یہ تو جب شبیر چچا سمجھانے بیٹھے تو اس کی سمجھ میں آیا کہ ہندو مسلم کی تو دنیا ہی الگ ہے۔

جیسے جیسے اس پر دو قومی نظریہ واضح ہونے لگا۔ ویسے ویسے اپنے عقائد اور مسلمانوں کے مذہب کی یکسانیت بھی پتا لگنے لگی۔ جیسے وہ کچھ سال پہلے اس مذہب کے پیروکار کی محبت میں کھنچی چلی آئی تھی۔ اس طرح اس بار اس مذہب کا جب اسے گھیر آ گیا۔ اس نے جلد اسلام قبول کر لیا پر لوگ نہ مانتے۔ کہتے انگریزی نام بے دین انداز یہ کیسی مسلمان ہے۔ ویسے ہی انگریزوں سے نفرت کا دور چل رہا تھا گو پر سے ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر مسلمان ثابت کرنے پر تلا تھا اور ناؤی نے اس مقابلے میں حصہ ہی نہیں لیا تو کسی کو اس کے تبدیلی مذہب پر یقین نہ آیا۔

قیام پاکستان سے سال بھر پہلے کی بات ہے۔ بڑے تایا کسی حادثے میں فوت ہو گئے۔ ہمارا صحن تعزیت کرنے والوں سے ایسا بھرا جیسے مسلم لیگی جلسہ ہو۔ میں گلی میں کھڑی تھی تو دیکھا تانگے پر کاسنی غرارے والی ایک عورت آ رہی ہے۔ جس نے کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ مجھے تو لگا میرے ابا ہی زنانہ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ وہ عورت بالکل اباجی کی ہم شکل تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دادی کی طرف بڑھی اور گلے مل کر زار و قطار رونے لگی۔ یہ ساجدہ پھپھو تھیں۔ جو سالوں بعد بھائی کے غم میں چلی آئی تھیں۔ غم دل کو نرم کر دیتا ہے اور نرم دل لوگ

معاف کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک دوسرے کو معاف کر دیا۔ کچھ دن رہ کر جب ساجدہ جانے لگیں تو ماں سے چمٹ کر بولیں۔

"اماں اب معاف کر ہی دیا ہے تو میرے گھر ضرور آنا۔"

"تو توانی ہے مگر وہ گھر اس نفیس کا ہے، جس کی مجھے شکل بھی ناگوار ہے۔ اس کی دہلیز پار نہ کروں گی۔"

وہ شوہر جس نے ان کے سارے غم دھو دیے تھے۔ اس کے لیے ماں کے منہ سے ناپسندیدگی کا اظہار سن کر ساجدہ دل مسوس کر رہ گئیں۔

جذبۂ آزادی زور پکڑ گیا۔ جالندھر میں سب تسلی سے بیٹھے تھے کہ یہاں تو مسلمان اکثریت ہے، یہ تو پاکستان کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم بھی منتظر تھے کہ ڈاک کے پتے میں املی والی مسجد کی گلی کے ساتھ پاکستان لفظ کا اضافہ کب ہوتا ہے۔ پر آزادی کا اعلان ہوا تو سب حیران رہ گئے۔ جالندھر نقشے میں نہیں آیا تھا۔ فسادات کی خبر ملی تو بھرا گھر چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ کہاں میں سوچتی تھی کہ آسمان سے جن بھی اتر کر ہمارا یہ بھرا ہوا آبائی گھر خالی نہیں کر سکتے کہاں وہ پل بھر میں خالی ہوا کہ موت کا سناٹا چھا گیا۔

لاہور میں سب کے بہت رشتہ دار تھے۔ ہر کوئی اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر آ کر ٹھہرا۔ دادی کچھ روز ہمارے ساتھ رہیں پھر پھپھو ساجدہ انہیں اپنے گھر لے گئیں۔ وہاں سے واپس آئیں تو دادی کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ نفیس کی تعریفوں میں قلابے ملانے لگیں۔ پھپھو ساجدہ اور نفیس کی دو بیٹیاں اور ہو گئی تھیں۔

"نفیس تو بے حد سمجھ دار ہے۔ بچیوں کی خوب تربیت کی ہے۔"

قصہ یہاں سے شروع ہوا اور ختم ہونے کا نام نہ لے۔ ہم نے کھانا رکھا تو دادی پھر شروع ہو گئیں۔

"نفیس تو پھل مجھے خود کاٹ کر دیتا تھا۔ اسے پھل کی بہت پہچان ہے۔" یہ قصہ کافی دیر بعد تھما تو چائے کا دور چلا۔

"نفیس کی بہوئیں شام کو بازار سے بہت مزے دار چائے منگواتی ہیں۔ بہت خوشبودار ہوتی ہے۔" یہ بہوئیں نفیس کی پہلی بیگم کی تھیں پر انہوں نے ہمیشہ ساجدہ کو ہی ساس کے روپ میں دیکھا تھا اس ناتے دادی کی بھی خوب خدمت کی۔

کہاں جس داماد کی صورت ناپسند تھی وہاں آج ہر درد میں اس کی تجویز کردہ دوائی کھانے لگیں۔

جب سب کو ٹھکانے مل گئے اور حالات بہتر ہوئے تو ہم ایک روز ناؤمی کے گھر گئے۔ اس کی ملٹری کی نوکری ختم ہو گئی تھی۔ اب کسی انگریزی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اجلے شلوار قمیص میں اور بھی باوقار لگنے لگی تھی۔ اطوار تو پہلے ہی وہ تھے جن کے دین میں درس ملتے تھے۔ اب انداز بھی مشرقی ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں فریج نہیں ہوتے تھے۔ مہمانوں کی بہترین خاطرداری یہ ہوتی تھی کہ اسی وقت ملازم کو بازار بھیج کر ٹھنڈی بوتل منگائی جاتی تھی۔ ناؤمی نے بوتلیں منگوا کر ہمیں عزت بخشی۔ بوتل کے گلے میں گولی سی پھنسی ہوتی تھی اس لیے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کے پینی پڑتی۔ ہم خوب خوش ہو کر لوٹے۔ کچھ — عرصے میں ہی خاندان والوں کو بھی یقین آ گیا۔

میں نے کسی دوسرے کے منہ سے سنا کہ ناؤمی اب مسلمان ہو گئی ہے تو دل میں سوچا اللہ تو ایک توحید کے اقرار پر مان لیتا ہے کہ بندہ راہ راست پر آ گیا ہے۔ ہم انسان جب تک لباس اور اطوار اپنے تابع نہ دیکھ لیں مانتے نہیں۔ جو بھی ہو نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ہجرت سب کو راس آ گئی۔

سارا عرفان

یار سیر دا سدا ہووے

سورج کی پہلی پہلی کرنوں نے صبح کے ستارے کی جوت کو مدھم کر دیا تھا۔ چڑیاں‘ فاختائیں‘ کوئل‘ کوے اپنی اپنی بولیاں بولتے‘ اپنے اپنے حصے کا رزق چگنے نکل آئے تھے۔ مسجد کے اسپیکر سے بچوں کے کلمے یاد کرنے کی آتی آوازوں میں مدھانیوں کی گرڑ گرڑ کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

فلک شیر بھی چوبارے سے چھوٹی چارپائی نکال‘ منڈیر کے ساتھ بچھا کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد بکھری کتابوں میں گھرا‘ حساب کے سوال حل کرتے کرتے اس کی منتظر نگاہیں منڈیر کی جالی میں سے صحن میں جھانکنا بالکل نہیں بھول رہی تھیں۔ صحن کا منظر واضح تھا۔ بڑی بھابھی مدھانی کی گردن کے گرد لپٹے پٹے کو دونوں ہاتھوں سے باری باری کھینچتی لسی بنا رہی تھیں۔ اور نکی بھابھی صحن میں پانی کا ترونکا (چھڑکاؤ) کرنے کے بعد جھاڑو دے رہی تھیں۔ مٹی کی خوشبو سے پورا صحن مہک اٹھا تھا اور بے بے برگد کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر لیٹی جانے کن خیالوں میں کھوئی تھیں۔

”لسی بن گئی پابھی....؟“ منتظر نگاہوں کا انتظار تمام ہوا۔ دیوار کے اوپر سے نمودار ہونے والا چہرہ اور آواز فلک شیر کی ساری دنیا پر چھا گئی۔ حساب کے سوال بھی گئے تیل لینے۔

”نئیں بانو! ابھی تھوڑی دیر لگے گی۔“ مڑ کر بانو کو جواب دیتی وڈی پابھی زیادہ تیزی سے پٹہ کھینچنے لگی۔

مکمل ناول

کنیز بانو المعروف بانو۔۔۔ صاف سیدھی مانگ کے اوپر سلیقے سے لیا گیا دوپٹا گول چہرہ گھنی پلکوں میں گھری بادامی آنکھیں چھوٹی سی ناک میں چمکتی ستارے جیسی لونگ۔ چھوٹے سے دہانے میں چمکتے موتیوں سے دانت گلابی مائل ہونٹ چھوٹی سی ٹھوڑی۔۔۔ شفاف سنہری رنگت والی بانو ہمیشہ سے ان کی پروین تھی۔

"تیری قمیص مکمل ہوگئی بانو؟" پچھلے دنوں بانو ایک قمیص پر تارکشی کا گلا بنا رہی تھی۔ نکی پابھی نے اچانک یاد آنے پر پوچھا۔

"ابھی کہاں پابھی۔ اب وہ امتحانوں کے بعد ہی مکمل ہوگی۔" کن اکھیوں سے منڈیر کی جالیوں سے جھانکتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایں۔۔۔ کیسے امتحان؟" وڈی کے ہاتھ ڈھیلے پڑے۔

"میٹرک کے۔"

"لے دس۔ لفظ کوئی پڑھتے تو دیکھا نہیں کبھی تجھے۔ امتحان سواہ دے گی۔" نکی نے کوڑا بالٹی میں ڈالتے طنز کیا۔

"میرے ماسٹر جی کو یقین ہے کہ میں پاس ہو جاؤں گی۔" اپنی کہنی دیوار پہ ٹکاتی مضبوط لہجے میں بولی۔

"ماسٹر کلیم کے پاس پڑھنے جاتی ہے؟" وڈی مدھانی روک کے پوچھنے لگی۔

"نہیں وڈی بھابھی۔ پڑھتی تو خود ہی ہوں۔ ان کی دعائیں لیتی ہوں بس۔" مسکراتے ہوئے بولی۔ منڈیر پار "ماسٹر جی" کی آنکھیں بھی مسکرائیں۔

"شیرو! ادھر رڑکا پی لے ویر۔" وڈی نے تانبے کے لمبوترے گلاس میں جھاگ والی لسی ڈال کر شیرو کو آواز دی اور شیرو تو جیسے اسی انتظار میں تھا۔

"آیا پابھی۔" کہتے ہی وہ دو سیڑھیاں ایک چھلانگ میں اترنے لگا۔ بھیگی مسوں اور شہد رنگ بالوں والا لمبا دھڑنگ شیرو اس گھر کا راج دلارا تھا۔

"اور خیر ہے بے۔۔۔ سب خیراں۔" شیرو کو نظرانداز کرنے کی کوشش میں بے بے پر دھیان جاتے ہی بانو کو حال چال پوچھنا یاد آگیا۔

"ستے خیراں دھیے۔۔۔ وڈیے! ایک گلاس مجھے بھی دے دے۔" شیرو کے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر بے بے بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"لگتا ہے بے بے نے "ٹھر" کے مرنا ہے۔ جی ابھی لائی بے بے جی۔" زہر خند بڑبڑاہٹ کے بعد جب بولی تو لگا زبان خالص شہد میں ڈبو کے نکالی ہے۔

"فریبن۔۔۔" نلکے پہ ہاتھ دھوتی نکی بھی بڑبڑائی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ تاثرات سے سمجھ جاتیں کہ دوسری کیا سوچ رہی ہے۔

"لسی لے جا بانو!" مکھن کا پیڑا کٹوری میں رکھتی وڈی نے دیوار سے چپکی بانو کو آواز دی جو نکی کو تارکشی کا طریقہ سمجھا رہی تھی۔ "جی اچھا۔" کہتی دیوار چھوڑ دی۔ نجانے کہاں سے کالا کلوٹا کوا آکے مکھن کے کٹورے میں ٹھونگا مار گیا۔

"پرے مر۔" کوے کو صلواتیں سناتی وڈی پابھی نے کٹورا ڈھک دیا۔

☆ ☆ ☆

بے بے اپنے زمانوں کی بھلی مانس عورت تھی۔ ساس اور شوہر نے زندگی بھر اتنی بار "بے وقوف زنانی" کہا کہ بے بے کو بھی اپنے بے وقوف ہونے کا یقین ہوگیا۔ ساس بیگم کو پوتے ہی چاہئیں تھے۔ خدا نے اوپر نیچے دو پوتے دیے تو ساس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ پھر خدا نے لڑکی کیا دی۔۔۔ آگئی بے بے کی شامت۔۔۔ وہ کرموں جلی دو سال بعد ہی چل بسی۔۔۔ بے بے کو یقین تھا وہ خسرے سے نہیں بلکہ دادی کے کوسنوں سے مری ہے اور پھر سب سے چھوٹا لاڈلا فلک شیر۔

بے بے خود تو شکل کی پوری تھیں بلکین بچے انتہائی خوب صورت تھے۔ دیکھنے والوں کی رائے کے مطابق بچے باپ پر گئے تھے۔ پر بے بے نے کبھی یہ نہ مانا۔ بے بے کے خیال میں بچوں میں یہ حسن سورۃ یوسف کی تلاوت کا فیض تھا۔ جو وہ بچے کے کوکھ میں آتے ہی

پڑھنا شروع کرتیں اور نو ماہ بلاناغہ تلاوت کرتی رہتیں۔

بے بے کی زندگی تب آسان ہوئی جب ساس صاحبہ نے کوچ کیا‘ لیکن اس آسانی کو ابھی دو سال ہی گزرے کہ بے بے بیوہ ہوگئیں۔

سفیر اور وزیر جوان ہو چکے تھے۔ ڈیرہ زمین بخوبی سنبھال لی تو بے بے کو ان کے بیاہ کی فکر ہونے لگی۔ کسی "سیانی" نے مشورہ دیا کہ دونوں بہوئیں ایک گھر سے لانا۔ دونوں بہنیں ہوں گی تو بھائی بھی ساتھ رہ لیں گے۔ یوں اس عمل کے نتیجے میں ذکیہ خاتون اور رقیہ خاتون بہوئیں بن کر آگئیں‘ لیکن بے بے یہاں بھی اپنے بھول پن میں مار کھا گئیں۔ وہ تھیں تو دونوں ایک ماں باپ کی اولادیں‘ لیکن طبیعت میں ایسا شرکا تھا کہ کیا ہی کوئی مثال ہوگی۔ باتیں کرتے کرتے لڑائی اور لڑتے لڑتے ایک دوسرے کی گتیں (چوٹیاں) پکڑ لینا تو معمول کی بات تھی۔

شروع شروع میں تو بے بے ہکا بکا دیکھتی جاتیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد بیچ بچاؤ کرانے کی ناکام کوشش کی۔

—— لیکن اب بے بے یوں نظرانداز کردیتیں‘ گویا یہ اتنی ہی معمولی بات ہو جتنی مرغی کا کٹ کٹاک کا راگ الاپنے کے بعد انڈا دینا۔ اب بے بے کو بس اپنے فلک شیر کی فکر تھی۔ شیرو اس کا جیلا پتر تھا۔ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے... یہی بے بے کی خواہش تھی۔

✡ ✡ ✡

اور بے بے کا جیلا پتر مئی کی تپتی دوپہر میں چھت پر کھڑا سیٹیاں بجا رہا تھا۔ ایک بار‘ دوسری بار‘ تیسری بار... مخصوص سیٹی‘ لیکن بے سود... اب چوتھی بار انتہائی غصے سے بجائی۔ غصے کی وجہ سے ردھم بھی تھوڑا خراب ہوگیا۔ وہ جو جان بوجھ کر نظرانداز کررہی تھی۔ منہ بناتی چارپائی سے اٹھی۔ جوتا پہن کر اماں کو دیکھا۔ گہری نیند میں سوتا دیکھ کر سکھ کا سانس لیا اور دوپٹا اوڑھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"ماسٹری کا بھوت چڑھا ہوگا شکر دوپہر میں۔"

اندھیرے سے دھوپ میں آنے کی وجہ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ اپنے دوپٹے کو آنکھوں پر رکھتی سا بجھی منڈیر کے ساتھ ٹیک لگا کر مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہے؟" منہ بنا کر پوچھا۔

"کب سے بلا رہا ہوں کیا تکلیف تھی؟" منڈیر کے پار عین اس کے مقابل ٹیک لگا کر بیٹھا شیرو جلا بھنا تھا دونوں ایک دوسرے کو صاف سن سکتے تھے۔

"آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ منمنائی۔

"یہ سونے کے نہیں پڑھنے کے دن ہیں اور یہ سمری لکھی ہے تم نے؟" ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو کھول لیا۔ "ایک بھی لفظ کی اسپیلنگ ٹھیک نہیں ہے اور ہر لفظ کے آخر میں ایس لگانا فرض کیوں سمجھتی ہو؟" اب وہ اس کو اس کی غلطیاں بتا رہا تھا۔

"تم مجھے ڈانٹ رہے ہو شیرو؟" روہانسی ہو کر بولی۔

"ہاں ڈانٹ رہا ہوں‘ ایسا ہی رہا تو فیل ہوجاؤ گی۔"

"تو ہوجانے دو فیل۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا‘ انگریزی میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی۔" دوپٹے سے چہرے سے پسینہ رگڑ کر صاف کرتی وہ ہتھیار ڈال رہی تھی۔

"کیسے نہیں آتی سمجھ میں‘ اتنے مشکل ناڑے‘ پراندے بنالیتی ہو... سویٹر دیکھ کے ڈیزائن اتار لیتی ہو... کپڑے پر ہر طرح کے کیڑے مکوڑے کاڑھ لیتی ہو‘ لیکن انگریزی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ اور بھی تیز لہجے میں بولا۔

"وہ سب تو آسان ہی بہت ہے۔" تیزی سے بولی۔

"وہ اس لیے آسان ہے کیونکہ تم توجہ سے سیکھتی ہو۔ دل لگا کر کرتی ہو‘ انگریزی میں تم دل نہیں لگاتیں... چلو دل نہ لگاؤ رٹا تو لگا سکتی ہو ناں؟ رٹ لو یہ ساری سمریاں۔ تمہیں پاس ہونا ہے بانو! سن لو میری بات۔" پسینے سے تربتر "ماسٹر صاحب" نے کئی بار کہی ہوئی بات زیادہ زور دے کر کہی اور منڈیر پر رجسٹر رکھ کر سیڑھیاں اتر گئے۔

بانو اور شیرو بچپن سے ایک دوسرے کے سہیلیاں بھی تھے اور ایک دوسرے کے بیلی بھی تھے۔ پرائمری تک تو کلاس بھی ایک تھی۔ چھٹی کلاس سے لڑکے لڑکیاں الگ بیٹھتے تھے۔ لڑکیوں کی جماعت صرف آٹھویں تک تھی' نویں دسویں میں صرف لڑکے تھے۔ اسکول کے حساب سے بانو کی تعلیم "مکمل" ہو گئی تو وہ گھرداری سیکھنے میں مشغول ہو گئی' لیکن دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کی کمی محسوس کرتے۔ جیسے ہی شیرو اسکول سے گھر آتا بانو پھدکتی پہنچ جاتی ان کے گھر۔

"چھوٹی نہیں ہے اب تو' جو شیرو شیرو کرتی پھرتی ہے۔ ٹانگیں توڑ دوں گی تیری' سمجھ لے اچھی طرح۔" اماں نے خوب کان کھینچے۔

شیرو کو شاید خود بخود ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا جو وہ بھی سب کے سامنے بات کرنے سے کترانے لگا۔ ابھی سال بھر ہی گزرا تھا کہ شیرو کو احساس ہوا کہ بانو کو بھی میٹرک کرنا چاہیے۔ بس پھر کیا تھا۔ جہاں وہ ملتی اس پر میٹرک کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے لگتا۔

"مجھے بڑا استانی لگنا ہے۔۔۔؟" وہ منمناتی۔ "تو پڑھ لے نا۔۔۔ مجھے نہیں پڑھنا۔" وہ بڑبڑاتی۔ "مجھے حساب نہیں آتا۔" وہ جھنجلاتی۔ "انگریزی تو اوپر سے گزر جاتی ہے۔"

بانو کے سارے بہانے ہوا میں اڑاتا وہ اس کے لیے کتابیں لے آیا تھا۔ حساب کے سوال اور دوسرے مضامین کے سوال و جواب تو وہ شیرو کی کاپیوں سے لے لیتی' لیکن انگریزی میں آ کے اٹک جاتی۔ اس کا حل شیرو نے یہ نکالا کہ اپنی ایمان داری سے وہ زبانی لکھ کر رجسٹر منڈیر پر رکھ جایا کرے گی اور شیرو چیک کر کے اس کی غلطیاں نکال دیا کرے گا' لیکن غلطیاں ہی غلطیاں دیکھ کر شیرو چڑ جاتا۔

بچپن کی دوستی بنا کہے عمر کے ساتھ ساتھ نئے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ دونوں اپنی جگہ اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ سب کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔ بنا کسی کوشش کے۔۔۔ بچپن کے چمن سے ایک ساتھ تتلیاں پکڑتے پکڑتے وہ محبت کے جگنو کو مٹھی میں کرنے کی خواہش کرنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

وڈی وزیر احمد کی گھر والی اور نکی سفیر احمد کی گھر والی تھی۔ دونوں کی چار چار اولادیں تھیں۔ وڈی کی دو کاکیاں گڈی اور شانو اور دو کاکے منا اور بچھا تھے۔ جب کہ نکی کی تین کاکیاں نازو' چھمی اور میما تھیں اور منتوں مرادوں سے حاصل کیا گیا ایک کاکا۔ باقی سب کے تو اصلی نام نجانے ماؤں کو بھی یاد تھے یا نہیں۔ البتہ منتوں مرادوں والے کاکے کو اس کی ماں وکیل احمد ہی کہہ کر پکارتی تھی۔ وڈی اکثر کہتی۔

"ہاں۔۔۔ پیو اور تائے نے تو وزیری' سفیری کر لی۔ اب وکالت رہ گئی تھی۔ وہ یہ کرلے گا۔" اس کی ہنسی کے جواب میں نکی اور زور سے "میرا وکیل احمد" کہتی' لیکن جب وکیل احمد بولنے لائق ہوا تو سیٹی جیسی آواز سن کر محلے کے بچوں نے سیٹی ہی کہنا شروع کر دیا۔ سیٹی وکیل احمد پہ اتنا رچا کہ گھر والے بھی سیٹی کہنے لگے۔ سوائے نکی کے' نکی جتنا اسے کوٹ کوٹ کے دیسی گھی میں چوریاں کھلاتی۔ وہ اتنا ہی ڈھانچہ بنتا جاتا۔ چڑچڑا تو حد سے سوا تھا۔ ہر روز کسی نہ کسی سے مار کھا کے آجاتا اور نکی ہر روز بازو چڑھائے کسی نہ کسی سے لڑنے نکل پڑتی۔ اس دن بھی روتا سسکتا گھر آیا۔ ماں سارے کام چھوڑ چھاڑ بھاگی۔

"کیا ہوا میرا پتر؟" لیکن پتر کے منہ سے ہچکیوں میں صرف "گڈی گڈی" ہی نکل رہا تھا۔ سمجھ گئی کہ گڈی نے کچھ کیا ہے۔ بس کیا تھا جیسے ہی گڈی دروازے سے اندر داخل ہوئی' اس کی کلائی پکڑ کے زور زور کے دھموکے اس کی کمر میں جمائے۔ وڈی نے جب گڈی کی چیخیں سنیں تو رسوئی سے باہر بھاگی۔ باہر کا منظر جان لیوا تھا۔ پھونکنی ادھر ہی پھینک کر بھاگ کر نکی کی چوٹی پکڑ لی۔ نکی نے بھی گڈی کی کلائی چھوڑ کر وڈی کا گاٹا پکڑ لیا۔۔۔ پھر جو ہوا سارے محلے نے دیکھا۔ برآمدے میں

بچھی چارپائی پر لیٹی بے بے نے صحن کے منظر پر نظر ڈالی' کب سے تنگ کرتی مکھی کو ناک سے اڑایا۔
کروٹ بدلی اور دوپٹے کا پلو سر پر رکھ کر سوتی بن گئیں
فلک شیر امتحانوں سے فارغ ہو کر بھی فارغ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے ماسٹر کلیم اللہ کے گھر پر ٹیوشن پڑھنے آنے والے چھوٹے بچوں کو پڑھانے چلا جاتا۔
وزیر اور سفیر اسے زمینوں پر نہ جانے دیتے۔
"یہ ہاتھ کدالیں چلانے کے لیے نہیں' قلم پکڑنے کے لیے بنے ہیں۔" وہ پیار سے اپنے چھوٹے بھائی کو کہتے۔

وڈی اور نکی کے جتنے مرضی دنگل ہوں... بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ اپنی بے بے کی صلح جو طبیعت کا اثر تینوں میں تھا۔ اس لیے ان کا رشتہ بھی مثالی تھا'

ایک بار وڈی نے الگ ہونے کی بات کی تھی۔ وزیر احمد نے اس کی وہ چھینٹی لگائی کہ دوبارہ کبھی الگ ہانڈی بنانے کا بھی نام نہ لیا' لیکن اندر ہی اندر دونوں بہنوں کا الگ ہونے پہ پورا اتفاق تھا۔ انہیں بس بے بے کی آنکھیں بند ہونے کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

اور بے بے تو اور ہی اینٹھیں۔ جب ایک دوپہر کو شیرو ہاتھ میں جلیبیوں کا شاپر پکڑے بھاگا بھاگا آیا اور بے بے سے لپٹ گیا۔
"میں پاس ہو گیا بے بے... فرسٹ ڈویژن میں..." بے بے خوشی کے اظہار میں کبھی شیرو کا ماتھا چومتیں' کبھی ہاتھ اور مرتے دم تک یہی کہتی اور رٹتی رہیں کہ "میرا شیرو پوری ڈویژن میں فرسٹ آیا ہے۔"
پادھوں کو بھی جلیبیاں کھلا کر وہ باقی کی جلیبیاں پڑوسیوں کے گھر لے گیا۔
"کہاں ہو چاچی! باہر تو آؤ بانو!" ڈیوڑھی سے ہی ان کو آوازیں دیتا صحن میں جا پہنچا۔ دونوں ہی آگے پیچھے کمرے سے نکل آئیں۔
"منہ میٹھا کرو چاچی! بانو پاس ہو گئی۔" چاچی کو جلیبی کھلاتے بانو کو دیکھتے ہوئے خوشی سے بولا۔

"صحیح بتانا شیرو! مذاق نہ کرنا۔" بانو کو اس کی مسکراہٹ مذاق اڑاتی محسوس ہوئی۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا۔
"لے میں کیوں کرنے لگا مذاق؟ ٹھیک ہے مر مر کے ہوئی ہے' لیکن پاس تو ہو گئی ہے۔ یہ لے جلیبیاں کھا۔" بچی کچی جلیبیاں اسے تھماتے ہوئے بولا۔
"سچی؟ میں پاس ہو گئی اماں!" بے یقینی سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اماں سے لپٹ گئی۔
"میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ میری دھی بڑی لیق (لائق) ہے۔" اماں کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تھے۔ گویا بیٹی نے گولڈ میڈل جیت لیا ہو۔
"کاکا! تیرا کیا بنا؟ فیل تو نہیں ہو گیا۔" فخر سے پھولی چاچی کو اس کا بھی خیال آگیا۔
"میں بھی پاس ہو گیا چاچی..." بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولا۔ بانو ممنون سی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"پاس ہو گئی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم گیارہویں جماعت کی بھی کتابیں لا دو۔ میں نے تو سنا ہے آگے انگریزی اور بھی مشکل ہے۔ مجھے نہیں پڑھنا۔" منڈیر کے ساتھ ٹیک لگائے مخصوص جگہ پر بیٹھی وہ کہہ رہی تھی۔ عقب سے آتی اس کی آواز سن کر وہ مسکرا اٹھا۔
"ویسے بانو! تمہارا انگریزی کا پرچہ پاس کرنے پہ تو میں ابھی تک حیران ہوں' کیسے کیا تم نے؟" وہ حیران سا مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا... وہ بھی مسکرائی۔
"اس میں بھی میرے ماسٹر جی کا کمال ہے۔ انہوں نے کہا' بانو! طوطے کی طرح رٹ لو' بس میں نے رٹ لیا۔"
"رٹو طوطی..." وہ کھل کر ہنسا۔ پرندے سورج کے تعاقب میں اڑتے جا رہے تھے۔
"شاید اب میں شہر کے کالج میں داخلہ لے لوں اور ہاسٹل میں رہوں۔" ڈوبتے سورج کو آنکھوں میں

اتار تا سر دیوار کے ساتھ ٹیکتا وہ بولا۔

"اچھا۔" وہ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد آواز میں بشاشت بھر کے بولی۔

"چل اچھا ہے۔ شہر سے کچھ منگوانے کے لیے اب چاچے رفیع کی منتیں نہیں کرنی پڑیں گی۔ تو لا دیا کرے گا۔ ہے ناں؟"

"ہاں جب آؤں گا... لے آیا کروں گا' جو بھی کہے گی۔"

"تو نے میرے لیے میٹرک کیا ہے ناں؟" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔

"اوہیں ..." وہ ترنت بولی اور تصحیح کی۔

"تمہارے لیے نہیں بلکہ تمہاری وجہ سے کیا۔ تم اپنے دونوں ہاتھ دھو کے پیچھے جو پڑ گئے تھے۔" لہجہ شرارتی ہوا۔

"ہاں' میں نے تو جیسے پستول تمہاری کنپٹی پہ رکھ دی تھی ناں۔" وہ بھی تیز لہجے میں بولا۔

"تقریباً۔" ہونٹ کا کونہ دبا کر بولی۔

"چلو تمہارا بھلا ہی ہوا ہے ناں۔" روٹھا روٹھا بولا۔

"کیسا بھلا؟ الٹا نقصان ہوا' دو تین قمیصیں تو بنا ہی لیتی اور اماں کا سویٹر بھی بنانا تھا۔ اون خجل خراب ہو رہی ہے۔ پابھی نے کب سے پراندہ بنانے کا کہہ رکھا ہے' سب رہ گیا۔" سنجیدگی سے کہتی اسے جلا گئی۔

"چلو اب بناتی رہنا ساری عمر پراندے اور سویٹر۔" بانو کی ایک کاپی اور ایک رجسٹر اس کے پاس تھا' وہ اس کے سر پر پھینکتا' کپڑے جھاڑتا ہوا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

"میرا سر توڑ دیا' شیرو کے بچے۔" وہ کراہتی ہوئی رجسٹر سنبھالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وزیر احمد اور سفیر احمد تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگے۔ خاندان برادری میں کیا پورے گاؤں میں کسی لڑکے نے میٹرک میں اتنے نمبر نہ لیے تھے۔ ان کی نظر میں تو شیرو ابھی سے افسر بن گیا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے کالج میں اس کا داخلہ ہوا تو دونوں بھائیوں نے بخوشی تمام اخراجات ادا کیے۔ بے بے کے لیے شیرو سے دور رہنا مشکل تو تھا' لیکن اس کی افسری کے لیے وہ یہ جدائی بھی برداشت کرنے کو تیار تھیں۔ دونوں پابھیاں بھی بہت خوش تھیں اور شیرو کی کامیابی پہ بانو بھلا کیسے خوش نہ ہوتی؟ اور پھر وہ جب بھی شہر سے آتا اس کی فرمائش کردہ چیزوں جیسے ریشم کی گچھیاں' شیشے' موتی ستاروں کے علاوہ کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لاتا' دو سال کیسے گزر گئے پتا بھی نہ چلا۔

بانو نے سلائی مشین چلانے میں بھی مہارت حاصل کر لی اور شیرو نے ایف اے پاس کر لیا۔ وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔

"بی" تو بی میں "ایف" سے پہلے آتا ہے پھر "بی اے" "ایف اے" سے بڑا کیسے ہو گیا؟" حم حم منہ میں ڈلے وہ شیرو سے پوچھنے لگی۔

"تو پاگل ہے بانو"۔ وہ ہنسنے لگا۔ تھوڑی خجل سی ہو کر وہ بھی ہنسنے لگی۔ دونوں نے ہنستے ہنستے سر منڈیر پر ٹیک دیے۔ محبت کے جگنو کہیں آس پاس اڑنے لگے۔ ان کی ہم راز منڈیر نے دونوں کے سر تھپتھپائے۔

☼ ☼ ☼

اب کی بار ایسا سوکھا جاڑا پڑا کہ بے بے شیرو کی افسری کا خواب آنکھوں میں لیے خود ہی چل بسیں تینوں بھائیوں پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور شیرو کی تو جیسے دنیا ہی اجڑ گئی۔ جتنے دن شیرو گاؤں میں رہا' بانو اس کی دل جوئی کی اپنی سی کوشش کرتی رہی' لیکن وہ ماں کا غم تھا۔ وقت کی دھول میں اٹ ضرور جاتا' لیکن ختم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ماں کے آخری دیدار کو آنکھوں میں بسائے شیرو پھر شہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

چار چھ مہینوں کے بعد حالات معمول پر آ گئے'

لیکن پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے وڈی کی حرکتیں معمول کے مطابق نہیں تھیں۔ نکی نے اپنی چنی چنی آنکھوں کے باوجود وڈی کی حرکات کے غیر معمولی پن کو بھانپ لیا۔

"ہائے میری کمر گئی" کہتی چادر کی بکل مارتی اور "حکیم صاحب کے پاس جارہی ہوں" کہتی نکل کھڑی ہوتی اور جب واپس آتی تو اسی بکل کے نیچے کچھ گٹھڑی نما دبا ہوتا اور سیدھی اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ نکی کے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں سو آج جب وڈی نکلی تو نازو کو پیچھے دوڑایا۔

"جا دیکھ ماسی کہاں جاتی ہے تیری" مگر تھوڑی ہی دیر بعد نازو روتی دھوتی اپنی کمر پہ وڈی کی چپل کا چھاپا لیے ان ہی قدموں واپس لوٹ آئی۔ نکی کو تو مانو آگ ہی لگ گئی۔

"کیوں مارا میری پھول سی بچی کو؟" جیسے ہی وڈی پٹی کا ڈھکن بند کر کے پلٹی۔ نکی تھانے داروں کی طرح اکڑ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"جب جاسوس پکڑے جاتے ہیں تو ان کی ایسے ہی چھترول ہوتی ہے۔ چل پرے ہٹ" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسے ہٹا کر باہر چارپائی پہ آبیٹھی۔ نکی تھوڑا سا کھسیا گئی۔

"جاسوس کون؟ وہ بے چاری تو کہہ رہی تھی ماسی کے ساتھ جانا ہے۔" نکی نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

"نی نکھیے! یہ فراڈیاں اسے لگایا کر جو تجھے جانتا نہ ہو۔ میں تیری ماں جائی ہوں۔ تیرا دماغ بھی پڑھ لیتی ہوں۔" یقین سے کہا۔

"ہاں ماں جائی ہے میری لیکن لچھن تیرے شریکوں والے ہیں۔ نہ دس کیہڑا حکیم ہے، جو تجھے بھر بھر شاپر دوائیاں دیتا ہے وہ بھی پٹی کے ڈھڈ (پیٹ) میں ڈالنے کے لیے۔" اب کہ نکی نے بھی کھل کر بات کی۔

"پہلے میری نیت تھی کہ آج تجھے کھل کر ساری بات بتاؤں گی، لیکن یہ جو تو نے حرکت کی ہے نا' نازو سے جاسوسی کروانے والی اب بتاتی ہے میری جوتی۔"

تھوڑا سا جزبز ہونے کے بعد وڈی بولی۔

"رکھ سانبھ کے اپنی بات بھی اور لمبیے منہ والی جوتی بھی۔ آپے پا وزیر آکے پوچھ لے گا۔ "حکیم صاحب" کا پتا" اپنے تئیں اس نے دھمکی دی تھی لیکن چارپائی پر پھسکڑا مار کے بیٹھی وڈی نے ایسا قہقہہ لگایا گویا کہہ رہی ہو "میری بلا سے۔" اب تو نکی کے دماغ کی سوئیاں پیٹ کے مروڑوں میں تبدیل ہو گئیں اور پھر شام تک وہ وڈی کے ترلے منتیں کر کے' واسطے ڈال کے' پاؤں پڑ کے وہ راز اگلوا چکی تھی اور اب دونوں بازو سر پہ رکھے رو رہی تھیں۔

وزیر احمد دو چار دنوں میں سعودیہ جارہا تھا۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں اور نکی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ رونا پیٹنا تو اس کا بنتا تھا اور اس کے رونے پیٹنے کو دیکھ دیکھ کر وڈی زور زور سے سورۃ فلق کا ورد کرنے لگی اور ایسا سانس کھینچ کر پھونک مارتی کہ بھبھوڑے بھی ہاتھ

جوڑنے لگے "کہ باجی ہمارا کیا قصور۔"
"نی وڈیے! تو تو غیروں سے بھی بڑھ کر نکلی۔" نکی کی دہائیاں جاری و ساری تھیں۔
"نی ایسا کون سا چورن پھانک لیا تھا کہ اتنی بڑی بات تو نے ہضم کرلی۔ دوسروں کی کوئی بات تو جب تک تو نشر نہ کرلے تیرا ساہ بھی نہیں نکلتا اور اتنی بڑی بات چھپالی۔"
"حاسدوں کے حسد سے بچاتا رہا۔" وڈی آسمان کو دیکھ بڑبڑائی۔
رات کو جیسے ہی سفیر احمد سونے کے لیے کمرے میں آیا۔ روتی بسورتی شکل لیے چارپائی سے اٹھ گئی۔ شام سے ہی سر باندھے لیٹ گئی تھی۔ وڈی نے ہی سب کو کھانا دیا۔ سفیر احمد کے چارپائی پر لیٹتے ہی اس کی پائنتی کے ساتھ آبیٹھی۔
"باوزیر' باوزیر کہتے تمہاری زبان نہیں تھکتی۔ میری تو کوئی بات کبھی تم نے نہ سنی نہ سمجھی۔ اب جو چھپٹر تمہارے بھائی نے تمہیں ماری ہے نا۔ کیا منہ دکھاؤ گے دنیا کو۔" آواز دبا کے طعنہ دیا۔
اس نے آنکھوں پہ رکھا بازو ہٹایا اور غور سے اس کی شکل دیکھی۔
"یہ آدھی رات کو کون سا جن آگیا ہے تجھ پہ؟" حیرت سے بولا۔
"باوزیر سعودیہ جارہا ہے۔" اپنی طرف سے اس نے بم پھوڑا۔
"تو؟ اس میں دیدے پھاڑنے کی کیا بات ہے؟" وہ مزید حیران ہوا۔
"تجھے پتا تھا؟" اپنے ہی پھوڑے ہوئے بم کی زد میں گھر کر بولی۔
"پتا تھا کیا مطلب؟ با نے میرے اور شیرو کے مشورے کے بعد ہی کاغذ جمع کروائے تھے۔ تو بتا' تو کیوں بھوتنی بنے آدھی رات کو مجھے ڈرا رہی ہے۔" نیم اندھیرے میں اس کی ابلی ہوئی آنکھیں اور کھلا منہ عجیب تاثر دے رہا تھا۔
"تو سب کو پتا تھا۔ ایک میں ہی غیر ہوں۔" کوئی دکھ جیسا دکھ تھا۔
"تجھے نہیں پتا تھا؟"
"تو نے بتایا مجھے؟" الٹا سفیر احمد پر برس پڑی۔
"ہم بھائیوں میں ہر روز سو باتیں ہوتی ہیں۔ کیا تھکا ہارا گھر آکر میں پہلے میڈم جی کے حضور رپورٹ پیش کروں پھر کمر سیدھی کروں؟ سارا دن تم دونوں ساتھ ہوتی ہو۔ وڈی نے بھی نہیں بتایا تجھے۔" جمائی روکتے ہوئے پہلے ڈانٹا پھر ذرا تحمل سے پوچھا۔
"یہی تو دکھ ہے۔ اس نے بھی نہیں بتایا۔" وہ ڈھے سی گئی۔
"چل کوئی نئیں۔ تجھے پتا بھی ہوتا تو کیا کرلیتی۔ بڑا تو نے فارم بھر کے دینا تھا۔ انگوٹھا چھاپ نہ ہو تو۔" مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔
"ہاں ہاں اڑالو مذاق۔ میں تو بے وقوف ہوں نا' ایک تم سیانے' ایک تمہاری پابھی۔" اور بھل بھل رونے لگی اپنی ناقدری پر۔
"یہ ریکارڈ باہر جاکے چلالے۔ مجھے سونا ہے۔" دوبارہ بازو آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔
"ہاں سب سوجاؤ۔ اپنے تو نصیب ہی سوئے ہوئے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی کلموہی ایسی متھے لگی ہے۔ لگتا ہے مرتے دم تک اس ڈائن سے جان نہیں چھوٹنے والی۔" پھر وڈی کو کوسنے لگی۔
"چپ کرتی ہے یا میں کراؤں۔" سفیر احمد کی سوئی سوئی دھمکی کے ساتھ ہی آواز تو بند ہوگئی' لیکن ہونٹ ابھی بھی ہل رہے تھے۔ دل کا ساڑ تو نکالنا تھا۔
اگلی صبح بھی منہ پھولا ہوا تھا۔ وڈی نے دو ایک بار بات کرنے کی کوشش کی' لیکن اس نے سنی ان سنی کردی۔
"پہلے ہی تیرا کھایا پیا تیرے منہ کو لگتا ہے اوپر سے پھلائے بیٹھی ہے۔ بالکل اودانہ لگ رہی ہے۔" مکھن کا پیڑا اس کے پراٹھے پر رکھتے ہوئے وڈی نے چھیڑا۔
"چل بس کرناں' جان وی دے۔" غلطی وڈی کی تھی اس لیے صلح میں بھی پہل کرنی تھی۔ دو تین اور

ایسی ہی کوششوں کے بعد نکی نے بات کرنا شروع کر دی تھی۔

شام تک شیرو بھی آ گیا تھا۔ لمب دھڑنگ بھیگی مسوں والا لڑکا اب بھرے بھرے جسم کے ساتھ حسین نوجوان بن گیا تھا۔ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ پابھیاں ماشاءاللہ کہہ کر منہ پھیر لیتیں۔

"شیرو، ویر صبح امامہ کو لے آنا، کہہ رہی تھی کہ پا سے ملنا ہے۔" رات کا کھانا کھاتے وڈی نے اچانک ہی شیرو سے کہا۔

"ہیں؟ یہ امامہ کون ہے؟" سب نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ وزیر احمد نے سب کی آنکھوں میں ابھرتے سوال کو زبان دی۔

"اللہ رکھے اپنی کلثوم اور کون؟" نکی نے محبت سے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیتے ان کی مشکل آسان کی۔

"کلثوم سے امامہ کب بن گئی ہے؟" یہ سفیر احمد تھے۔

"ہمارے پیرو مرشد نے امامہ نام رکھا ہے اس کا' ان کے مطابق کلثوم نام بہت بھاری ہے اس پہ۔ بے چاری دو دفعہ میٹرک میں فیل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اتنی لائق فائق ہے۔" وڈی کے بتانے پہ سب نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"صرف نام ہی نہیں وہ خود بھی کافی بھاری بھرکم ہے۔ اس کا حل کیا بتایا ہے پیر صاحب نے۔" وزیر احمد کے شگوفے پہ شیرو کو اچھو لگ گیا۔ فوراً" دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"اللہ رکھے کھاتے پیتے گھر سے ہے۔ بابل کے گھر چار پانچ بھینسوں کا دودھ آتا ہے۔ کھلا کھاتا پیتا ہے۔" نکی تو آگ بگولہ ہو گئی۔

"چپ کر جا نکیے! ایویں نظر لگ جائے گی۔ حسد کی نظر تو پتھر پھاڑ ہوتی ہے۔" یہ وڈی تھی۔ میکے کی بات پہ ان کا ایکا قابل دید ہوتا۔

"فکر نہ کرو ڈیے۔ ماشاءاللہ کہہ دیا تھا دل میں۔" نکی نے تسلی دی۔

"مفیر ٹھیک اے۔" وڈی کی تسلی ہو گئی۔

شیرو' کلو کی چپکو عادت کے باوجود اسے بخوشی لانے کے لیے تیار تھا۔ کیونکہ وہ پابھیوں کے کسی کام (اور خاص کر کام ان کے میکے سے متعلقہ ہو تو) سے انکار کر کے ان کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی پابھیوں سے بانو کی بات کرے گا اور نوکری ملتے ہی بانو کو دلہن بنا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

بانو سے یاد آیا' وہ اس بار بانو کے لیے کچھ لایا تھا۔ فوراً" اپنے کمرے میں آیا۔ بستہ نما بیگ میں سے وہ متاع نکالی۔ اخبار کے ٹکڑے میں سفید اور سنہری موتیوں سے مزین دو کنگن محبت سے ہاتھوں میں پکڑ لیے تصور کی کھڑکی میں بانو کا سراپا ابھر آیا۔

کوئل کی کوک سے مشابہ سیٹی کی آواز پہ بانو کا دل زور سے دھڑکا' اپنی سانسوں کا گلا گھونٹ کے اس نے ساری توجہ سننے کی حس پر دی' ابا کے رعب دار خراٹے' افضال کے طویل خراٹے اور شکیل کے مناسب اور کم آواز والے خراٹے سن کر تینوں کے سو جانے کا یقین کر کے اٹھی۔ بڑے دونوں بھائی آج کل ڈیرے پر سوتے تھے۔ چارپائی سے اٹھنے سے پہلے داہنی طرف کی اماں کی چارپائی پر نظر ڈالنا نہیں بھولی تھی۔ اماں کے منہ سے برآمد ہوتی پھونکوں سے اماں کے بھی گہری نیند میں ہونے کا اطمینان ہو گیا تو دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"کیسے ہو شیرو؟ ماسٹری کیسی جا رہی ہے تمہاری؟" منڈیر کے ساتھ بیٹھ کر ٹیک لگاتے ہی بولی۔ کالج کے بعد اس کے ٹیوشن پڑھانے کو ماسٹری کہتی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں' سنا ہے تم بھی ماسٹرنی بن گئی ہو۔" مسکراتے ہوئے بولا۔ دونوں کنگن اپنی انگلیوں میں لیے گھما رہا تھا۔

"ہیں؟ مخبر بدلو اپنا' غلط خبریں دے رہا ہے۔" سر منڈیر کے ساتھ ٹکا کر آسمان کے دامن میں جگر جگر کرتے پورے چاند کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"مخبر ٹھیک ہے میرا' تمہاری اطلاع کے لیے عرض

ہے کہ شہر میں درزی کو ماسٹر کہتے ہیں۔ اس حساب سے تم ماسٹنی ہوئیں۔" چھیڑتے ہوئے بولا۔

"مذاق کر رہے ہو ناں؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"تیرا میرا مذاق ہے؟" مزید ہنستے ہوئے بولا۔

"یہی کہنے کے لیے بلایا تھا؟ میں جاؤں؟" غصہ تو ناک پہ دھرا تھا۔

"ارے ارے، رکیے ماسٹنی جی! دیکھیں، آپ کے لیے کیا لایا ہوں؟" کہتے ہوئے ہاتھ اونچا کر کے کنگن منڈیر پر رکھ دیے۔ اس نے بھی اسی انداز میں ہاتھ اونچا کر کے منڈیر سے کنگن اٹھالیے۔

"ہائے شیرو! کتنے سوہنے کنگن ہیں۔ موتیوں کی چمک تو دیکھو اور بالکل مجھے پورے ہیں۔" فوراً کلائیوں میں ڈالے تو خوشی پور پور سے چھلکنے لگی۔ پھر یک دم چپ ہوگئی۔ بے دلی سے کنگن اتار دیے۔

"کیا ہوا؟" اس کی خاموشی شیرو نے بھی محسوس کرلی تھی۔

"یہ میں تجھ سے نہیں لے سکتی شیرو! تو ایسی چیزیں نہ لایا کر، بس کھانے پینے والی چیزیں لایا کر۔" کنگن اتار کر دوبارہ منڈیر پر رکھ دیے۔

"پر کیوں بانو؟" وہ واپس لینے میں متامل تھا۔

"اماں میری وینی توڑ دے گی۔" اسے اماں کے ٹانگیں توڑنے والے عزائم یاد آگئے۔

"لیکن میں یہ تیرے لیے لایا تھا تو اماں سے چھپا کے رکھ لینا۔"

"توبہ توبہ، اماں سونگھ کے ہر چیز ڈھونڈ لیتی ہے۔ تو واپس لے لے۔" وہ ڈر رہی تھی۔ وہ چپ ہوگیا۔ کچھ بھی نہ بولا۔

"اچھا ابھی میری امانت سمجھ کے رکھ لے۔ بعد میں لے لوں گی۔" شیرو کی ناراضی کا خیال آتے ہی پھر بول پڑی۔

"بعد میں کب؟" نروٹھے لہجے میں بولا۔

"جب وقت آئے گا۔"

"اور وقت کب آئے گا؟" آنے والے وقت کا سوچ کر ہی نروٹھا پن مسکراہٹ میں بدل گیا تھا۔ وہ یک دم ہی جھینپ گئی۔

"میں چلتی ہوں۔" مسکراہٹ کی معنی خیزی سمجھ کے جھٹ سے بولی۔ شیرو نے منڈیر سے کنگن اٹھالیے۔

"ہم لاہور میں رہیں گے بانو! تجھے پتا ہے، شہر بہت خوب صورت ہے۔" اقرار کے لمحے دونوں کے بیچ کی منڈیر پر آٹکے تھے اور محبت کے جگنو چاند کی روشنی کو مات دینے لگے۔ بانو آنکھیں بند کیے لفظ لفظ محسوس کرنے لگی۔

"یہ لمبی کالی چمکتی سڑکیں، اونچی اونچی عمارتیں، رنگ برنگ پھولوں سے بھرے باغ، بڑے بڑے بازار۔" وہ اسے جیسے شہر کی سیر کرانے لگا۔

"تو نے مینار پاکستان دیکھا شیرو۔" ہمیشہ سوچتی تھی اب شیرو آئے گا تو پوچھوں گی۔ لیکن ہر بار بھول جاتی۔

"دیکھا؟ میں اوپر بھی چڑھا ہوں۔" کنگن اپنی انگلیوں میں گھماتا بولا۔

"وہ تو بہت اونچا ہے۔ تجھے ڈر نہیں لگا تھا۔" بچوں کی طرح پوچھنے لگی۔

"ڈر کیسا۔ مزہ آیا تھا۔" وہ بھی بچوں کی طرح بتانے لگا۔

"میں تو کبھی نہ چڑھوں، مجھے تو ویسے بھی اونچائی سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے جیسے ہاتھ کھڑے کردیے۔

"تم میرا ہاتھ پکڑ لینا۔" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ شرارت سے بولا۔

"چل ہٹ، بے شرم۔" یہ کہتے ہی وہ بھاگ کر سیڑھیاں اتر گئی۔ کئی جگنو اس کے پیچھے بھاگے۔

"جھلی!" شیرو نے سرگوشی کی۔ پورا چاند اور منڈیر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اقرار کے لمحے رقص کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

وزیر احمد باہر کیا گیا، وڈی کے تو رنگ ڈھنگ بدل گئے۔ روز رگڑ رگڑ کے ایڑیاں صاف کرنے لگی۔ اپنے

اور بچوں کے سروں میں صدیوں سے آباد جوؤں کی نسلیں ختم کرنے پر تل گئی میلی کچیلی ناک کی لونگ اور سونے کی بالیوں کو ہلدی ملے پانی میں ڈبو ڈبو کے چمکالیا۔ نکی مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تو بے نیازی سے کہتی۔

"جانے کب بلاوا آجائے' بندہ اپنی تیاری تو پوری رکھے"اور نکی کلس جاتی۔

"تو کیوں دل چھوٹا کرتی ہے نکی'اب سب کے نصیب میں سب کچھ نہیں ہوتاناں" مدبرانہ انداز میں دل جوئی کرتی۔

"تیری بلا میں کیوں کرنے لگی دل چھوٹا۔اللہ سلامت رکھے میرے سر کے سائیں کو۔" وہ بھی اپنے تڑپتے دل کو دانتوں تلے دبا کے یوں بولتی گویا اسے تو پتا ہی نہیں کہ جلنا کڑھنا کس بلا کا نام ہے۔

لیکن محض چند ماہ کے بعد ہی وڈی کی شیخیاں شرمندگی میں اور نکی کی جلن کڑھن' ٹھٹھوں میں تبدیل ہوگئی عمرے کے ویزے پہ (جس کی مقررہ تاریخ بھی گزرے دو ماہ ہوگئے تھے) مزدوری کرتا وزیر احمد پکڑا گیا اور واپس بھیج دیا گیا۔ نکی کو تو جیسے کوئی چٹکلہ ہاتھ لگ گیا ہو'اپنی ناک کی لونگ کو ہاتھ میں لیے دبی دبی ہنسی کے ساتھ وڈی سے پوچھتی۔

"وڈیے تیری لونگ کتنی چمک رہی ہے۔میری بھی چمکادے۔"

کبھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کے صاف کرتی وڈی کو آواز دیتی۔(مسکراہٹ دبا کے)

"چھلیے ذرا دیکھنا اچھی طرح صاف ہوئیں کہ نہیں؟"

کچھ دن تو وڈی نے برداشت کیا' لیکن پھر اپنا آپ دکھانا پڑا اور پھر محلے والے جو اس دفعہ کئی مہینوں سے اس تفریح سے محروم تھے۔ان کی کئی مہینوں کی تشنگی دور ہوگئی۔

دونوں بھائی البتہ خوش تھے۔وزیر احمد کے بغیر سفیر احمد کے لیے زمینداری سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اور دوسری طرف زرخیز زمین کی گوڈیاں کرنے والے وزیر احمد کے لیے پتھر توڑنا بے حد مشکل تھا۔ بہرحال باہر کا بھوت اترا اور دونوں بھائی پھر سے دل لگا کر زمینوں پر کام کرنے لگے۔

شیرو کی پڑھائی بھی جاری و ساری تھی۔اس نے ہر کتاب میں بانو کی یاد سنبھال رکھی تھی' جب وہ یاد زیادہ ستاتی تو کسی چکور کی طرح اڑ کر گاؤں پہنچ جاتا' پھر وہی کوئل کی کوک کا سندیسہ' پھر وہی معمول کی باتوں سے اقرار کے لمحے کشید کرتے دو نفوس' پھر وہی منڈیر' وہی جگنو۔ بانو کے ہاتھ کی پکی کوئی چیز کھاتا اور دنیا کے میلے میں واپس لوٹ آتا' لیکن اس دفعہ ان کی داستان کا کیدو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وصل کے خوابوں کو چکنا چور کرنے ہجر کے لمحے بازو چڑھائے کھڑے تھے۔

آج شام اس کی واپسی تھی بانو چھوٹی سی چنگیر میں رومال سے کچھ ڈھکا ہوا لیے اندر آئی تو دونوں بہنیں ایک ہی چارپائی پہ بیٹھی کسی مشترکہ دشمن کی غیبت میں مشغول تھیں۔ان دونوں کو دیکھ کر بانو کا حلق کڑوا ہوا۔ابھی تو اسے شیرو کی صحن سے ہی آواز آرہی تھی' لیکن اب وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"آجا بانو!کیا لے کر آئی ہے۔رک کیوں گئی؟" وڈی کی نظر پڑی تو اس کے رکتے قدم آگے بڑھے۔

"وہ شیرو کدھر ہے پابھی؟" رک رک کر شیرو کا پوچھا۔ نظریں ابھی بھی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

"کیا کام پڑ گیا شیرو سے؟" اب کہ نکی بھی متوجہ ہوئی۔

"یہ بیسنی روٹی لائی تھی شیرو کے لیے۔" نہ چاہتے ہوئے بتایا۔

"چھ چھا تو ہمیں بھی چکھادے۔ہمیں حکیم نے منع تو نہیں کی بیسنی روٹی۔" وڈی نے قہقہہ لگاتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کر روٹی اس کے ہاتھ سے پکڑلی بلکہ چھین لی'ابھی دونوں بہنوں نے ایک ایک ہی نوالہ توڑا تھا کہ شیرو آگیا۔

"کیا لائی ہو بانو۔" بانو کا چہرہ یک دم روشن ہوا۔وڈی کی زیرک نگاہ سے یہ روشنی چھپ نہ سکی'پھر جس طرح شیرو نے روٹی ان کے سامنے سے اٹھائی اور جس طرح وہ مزے لے لے کر کھانے لگا اور بانو کے چہرے

پر آتے جاتے رنگ۔ وڈی کھٹک گئی۔

"نی نکیے! تو نے کچھ غور کیا۔" ان دونوں کے جاتے ہی وڈی بھنویں بھینچ کر نکی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں وڈیے مجھے ایک بار پہلے بھی شک ہوا تھا' لیکن میں نے جانے دیا کہ کوئی نئیں بچپنے کی دوستی ہے لیکن آج تو رنگ ڈھنگ ہی اور تھے۔" نکی نے بھی اظہار کیا۔

"آنکھوں میں کاجل کی دھاریاں اور بلیوں پر بلاوجہ کی قلقاریاں یہ بچپنے کی دوستی میں نہیں ہوتا نکیے" وڈی کسی گہری سوچ میں تھی۔

"اگر شیرو نے اپنے منہ سے بانو کا نام لے دیا تو کلّو کا کیا ہوگا وڈیے؟" نکی نے وڈی کی سوچ کو زبان دے دی۔

کلثوم لمامہ سے پھر کلّو بن گئی تھی۔ کیونکہ میٹرک میں تیسری بار بھی فیل ہو چکی تھی۔ اس کی اماں نے نہ صرف پیرو مرشد کو ان کے آستانے پہ جا کے لعن طعن کی بلکہ انہیں اپنی مریدی سے بھی عاق کر دیا۔ اب اماں نے زیادہ پہنچے ہوئے پیر صاحب کی مریدی اختیار کی تھی اور ان زیادہ پہنچے ہوئے پیر صاحب کے مطابق کلّو کو ایک انتہائی آوارہ جن چمٹ چکا تھا جو اس کو گھر میں بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ اس کا علاج یہی تھا کہ کوئی مناسب بر ڈھونڈ کر اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ اب شیرو سے زیادہ مناسب بر انہیں کہاں ملے گا" لیکن بانو اور شیرو کے انداز دونوں بہنوں کو کھٹکنے لگے۔

"فکر نہ کر نکیے! کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا۔" وڈی کا شیطانی دماغ پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔

"نکیے! امتیاز کی شادی ہو گئی ہے کہ نہیں؟" اگلی صبح بچوں کے اسکول جاتے ہی وہ نکی کے پاس آ بیٹھی۔ شاید رات بھر اپنے سوچے ہوئے منصوبے پر عمل کے لیے پوچھ رہی تھی۔ امتیاز ان کا ممیرا بھائی تھا۔

"نام نہ لے اس کا' جب سے ماں نے میرا رشتہ لینے سے انکار کیا ہے' میں تو اس بنڈ کی ہوا کو منہ نہیں لگاتی' اس کی شادی کی خبر رکھوں گی' ہونہہ۔" نکی تو کڑک آواز میں بولتی جلنے لگی۔

"لے! اتنی پرانی بات تجھے ابھی تک یاد ہے؟" وڈی نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"یاد؟ دل پہ لکھی ہے میرے 'کتنا سوہنا گھبرو جوان تھا امتیاز۔ میں نے پورے سو نفل پڑھے تھے۔ وہ بھی شکر دوپہر میں تپتی زمین پر کھڑے ہو کر۔ اس امتیاز کے لیے' پر حق ہا۔' کوئی پرانی بات یاد کر کے نکی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"چل' تو اپنا ساڑھ نکال لے۔ شکر کر تیرا وہاں نہیں ہوا۔ جتنی ماں کہتی تھی۔ تیرا ایک دن بھی گزارا مشکل تھا۔ وہ تو اللہ بخشے ہماری بے بے ہی کوئی نیک روح تھی۔" وڈی نے بے بے کا نام لیتے ہی آنکھوں میں محبت سمو لی۔

"اچھا۔ اس نیک روح کو سکھ کا ساہ تو ایک نہیں لینے دیا تو نے" نکی کے ساڑھ والی بات دل کو لگی تھی۔ سو فوراً حساب برابر کیا۔

"ہاں اور تو نے تو جیسے پھولوں کی سیج پہ بٹھا رکھا تھا بے بے کو۔" وڈی کہاں ادھار رکھتی تھی۔ نکی جز بز ہوئی پھر کھسیا کر بولی۔

"تم یہاں بیٹھی مجھ سے لڑتی رہو۔ ادھر شیرو' بانو سے بیاہ رچا کر لے اڑے گا۔"

"جب تک میرے ساہ میں ساہ ہے' ایسا میں ہونے نہیں دوں گی۔" پرعزم لہجے میں بولتی وڈی اٹھی اور کمرے سے بڑی چادر لے کر اوڑھنے لگی۔

"بڑی دیر ہو گئی ہے ماں سے ملے ہوئے۔" مسکراتے ہوئے مکاری سے بولی۔

"ہمم' میرا بھی سلام کہنا وڈیے۔" نکی کا انداز بھی ویسا ہی تھا۔

"ہاں میرے بالکوں کو کچھ کھلا پلا دینا' یہ نہ ہو میرے آنے تک نمانے بھوکے پیاسے پھرتے رہیں۔" تیز آواز میں بولتی صحن میں آ گئی۔

"ہر کسی کو اپنے جیسا نہ سمجھا کر وڈیے۔" نکی بھی ترنت بولی۔

"کاش ہوتی تو میرے جیسی عقل ہا۔" وڈی بڑبڑاتی بیرونی دروازہ پار کر گئی۔

"پتا نہیں کیا من کرکے گئی ہے۔" نکی اس کی بڑبڑاہٹ کو کوستے پھر امتیاز کو سوچنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اور ماسی تو جیسے اسی خبر کے انتظار میں جی رہی تھی۔ اپنے چالیس سالہ "لڑکے" کے لیے کم عمر خوب صورت اور کنوارا رشتہ سن کر وہ وڈی کا منہ چوم لینے کو بھی تیار تھی۔ امتیاز چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تو تھا ہی، بے حد وجیہہ مرد بھی تھا۔ اوپر سے دو مربعہ زمین کا تن تنہا وارث جب تک شادی کی عمر تھی۔ ماسی کی آنکھ میں کوئی جچتی ہی نہ تھی اور اب جب لڑکیاں پسند آجائیں تو لڑکے کی عمر راہ میں حائل ہو جاتی۔

ایک غریب گھر کی خوب صورت نوجوان لڑکی کا رشتہ، کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ ماسی تو فوراً" ساتھ چلنے کو تیار تھی، لیکن وڈی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ پہلے وہ خود لڑکی کی ماں سے بات کرلے اور لڑکی کی ماں کو تو جیسے کوٹھے جتنی لڑکی خوابوں میں آکے ڈرایا کرتی تھی۔ خود ساری عمر غربت دیکھی تھی۔ سو ہر ماں کی طرح یہ خواہش تھی کہ اکلوتی بیٹی ہے، غربت کی چکی میں نہ پسے، لیکن یہ بھی خدشہ تھا کہ غریب کے گھر غریب ہی آیا کرتے ہیں۔

جب تک بانو کے بھائی چھوٹے تھے، اس کا ابا لوگوں کی زمینوں پر کام کرکے گندم اور چاول لے آتا تھا، لیکن جب سے لڑکے جوان ہوئے تھے۔ انہوں نے زمین ٹھیکے پر لے کے فصلیں اگانا شروع کیں تو تھوڑے حالات بہتر ہونے کی امید ہوئی، لیکن ایسی تو بالکل امید نہ تھی کہ دو مربعوں کے مالک کا رشتہ آجائے گا۔ بانو کی اماں کو بانو کی خوش نصیبی پر کوئی شک نہ رہا تھا۔

"عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا' مرد تو ہمیشہ جوان ہوتا ہے۔" دل کو یہ دلیل دیتی بانو کی اماں بے حد خوش تھی، لیکن وڈی کو فوراً" ہی ہاں کہنے کے بجائے اس نے "بانو کے ابا سے بات کرکے بتاؤں گی" کہہ کر اپنی خوشی چھپائی۔

بیٹیوں والوں کا بھرم بھی کانچ جیسا ہوتا ہے، سنبھال کر رکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

بانو ان سے تھوڑی ہی دور چولہے پہ ہانڈی چڑھا رہی تھی۔ ان دونوں کی ساری کھسر پھسر تو نہ سن پائی' لیکن کھسر پھسر کا لب لباب سمجھ گئی تھی۔ دل اپنی انگلیوں کی پوروں میں دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ آگ کی لو قابو سے باہر ہونے لگی۔ کبھی اتنی تیز کے ہانڈی جلنے لگتی اور جب وہ آگ تھوڑی باہر کھینچتی تو چولہا جیسے سرد ہو جاتا۔ کتنا نمک مرچ ڈالا؟ ہلدی ڈالی بھی کہ نہیں؟ اسے کچھ یاد نہیں تھا بس جیسے تیسے چولہے سے ہانڈی اتاری۔ لکڑیاں تھوڑی باہر کھینچ کر چٹے سے کوئلوں کو ہلایا جلایا۔ کن اکھیوں سے دیکھا' پابھی جا چکی تھی اور اماں ہلکا ہلکا مسکرا رہی تھی۔

"پابھی کیا بات کر رہی تھی اماں؟" جھٹ سے اماں کے سامنے بیٹھ کر پوچھا۔

"تیرے مطلب کی نہیں ہے۔" اماں نے ٹالتے ہوئے اٹھنا چاہا۔

"میرے رشتے کی بات کر رہی تھی نا؟" جس بات کو کرتے اماں کو لاج آرہی تھی۔ بیٹی کے منہ سے وہ بات سن کر اماں ٹھٹکی پھر سوچا آج کل کے پڑھے لکھے بچوں کے لیے یہ سب معیوب نہیں ہے تو چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑے۔

"ہاں' میری دھی بڑے نصیبوں والی ہے۔ بہت اچھا رشتہ ہے۔" اماں نے خوشی سے مغلوب ہو کر بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔

"انکار کردے اماں۔" اماں کی خوشی سے نظر چراتے وہ بولی۔ اماں کے ماتھے پہ بل ابھرے، لیکن چند ثانیوں بعد ہی اس کے انکار کو اس کی شرم پر محمول کرکے بل غائب ہوگئے۔

"بیٹیاں ساری عمر بابل کے گھر کہاں رہتی ہیں؟ اگلے گھر تو جانا ہی پڑتا ہے پتر۔" اماں محبت سے سمجھانے لگی۔ "یہی ریت ہے۔"

وہ کیا کرے؟ شیرو کے بارے میں بتائے کہ نہیں؟ وہ سوچ رہی تھی۔ اگر نہیں بتائے گی تو اماں پابھی کو ہاں کردے گی اور اگر بتا دے گی تو؟ نجانے کیا ہوگا؟ وہ

کشمکش میں گھری خود کو تسلی دیتی اماں کو دیکھ رہی تھی۔
شیرو بچپن سے اماں ابا کے سامنے تھا۔ پڑھا لکھا تھا پھر اماں کو پسند بھی بہت تھا۔ اسے لگا اماں اُس رشتے کے مقابلے میں شیرو کو منتخب کرے گی۔ سو فیصلہ ہوگیا۔
"اماں!" اس نے یک لخت اماں کو روکا۔ لہجہ حتمی، آواز پست۔
"مجھے شیرو سے شادی کرنی ہے۔" جیسے دل پہ دھرا ایک بھاری پتھر سرکلیا۔
"ہیں؟ کی بکواس کیتی؟" اماں کا چہرہ لال ہوگیا۔ بھنویں تن گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔
"اماں! شیرو بھی۔"
"گدی سے زبان کھینچ لوں گی۔ اندر کوٹھڑی میں چل، میں آتی ہوں۔" اماں نے شیرنی کی طرح آواز دیا کے ایسے کہا کہ بانو کے حواس مختل ہوگئے۔ وہ ڈرتی ڈرتی اٹھی اور بڑے کمرے سے متصل کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اماں ادھر ادھر دیکھتی ڈیوڑھی میں بنے غسل خانے سے کپڑے دھونے والا ڈنڈا لیے کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔
"ہاں! اب بول۔" اماں جارحانہ انداز میں ڈنڈا پکڑ کے اس کے عین سامنے کھڑی ہوگئی۔
اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ تھوک نگل کے حلق تر کرنے کی ناکام کوشش کی۔
"گونگی ہوگئی ہے اب بول۔" اماں نے ڈنڈے والا ہاتھ نچایا۔
"اماں وہ میں اور شیرو۔" ابھی اتنا ہی بول پائی تھی کہ اماں نے ڈنڈا پوری قوت سے ٹخنوں سے ذرا اوپر دے مارا۔ اک ٹیس سی اٹھی۔
"اماں! میری بات سنو پوری۔" حیرت سے اماں کا یہ روپ دیکھا۔
"بول میں سن رہی ہوں۔" ڈنڈا پھر مارنے کی پوزیشن میں لاتے اماں بولی۔
"مجھے شیرو سے شادی کرنی ہے۔ بچپن سے۔" ٹھیک اسی جگہ زیادہ قوت سے ایک اور ڈنڈا لگا۔ بات پھر کاٹ دی گئی۔
"شیرو بھی مجھے۔" تیسری کوشش پہ تیسرا ڈنڈا۔
"بس۔ بہت بول چکی تو۔ اب میری سن۔" اب کہ اماں نے بانو کی چوٹی پکڑلی۔
"اب اگر شیرو کا نام تیری زبان پہ آیا تو تجھے چھاوے کے خود زہر پھانک لوں گی اور اسے صرف ڈراوا نہ سمجھیں۔" جوڑوں کے درد سے ہر وقت ہائے ہائے کرتی اماں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ بانو حیران تھی۔ اس کی آنکھیں آخری حد تک کھلی اور زبان گنگ رہ گئی۔
اماں بول رہی تھی۔ "سر چٹا ہوگیا میرا، پر تیرا ابا جب بھی بولتا ہے۔ ایک منٹ میں دو کوڑی کا کردیتا ہے۔" پوری قوت سے اس کے سر کو جھٹکا دیتے اماں بولی۔
"عمر گزر گئی اپنی ماں کی اڑائی ککھ دھوتے۔ اب تو نئی ککھ میرے سر میں ڈالنے کے منصوبے بنا رہی ہے منحوس۔" اماں کی طاقت کی وجہ وہ پرانا دکھ تھا جسے نبھاتے نبھاتے اماں بوڑھی ہوئی تھی۔
بانو کی نانی اپنی جوانی میں بہت اتھری تھی۔ اپنے ہی گاؤں کے غلام نبی سے محبت کر بیٹھی۔ محبت تو وہ بھی کرتا تھا، لیکن ڈرپوک بھی تھا۔ نانی کہہ کہہ کر تھک گئی، لیکن غلام نبی میں اپنی ماں سے بات کرنے کی ہمت پیدا نہ ہوسکی۔ ادھر نانی کا رشتہ کہیں اور طے ہونے جا رہا تھا۔ نانی کے غصے نے جوش مارا اور وہ غلام نبی کے گھر پہنچ گئی۔ "ابھی رشتہ مانگو ورنہ اس کیکر سے لٹک کر پھاہ لے لوں گی اور الزام آئے گا تم پر۔" غلام نبی کی بے بے اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ وہ کر بھی سکتی ہے۔ اس طرح غلام نبی، بانو کا نانا ہوا، لیکن یہ کہانی سات گاؤں میں مشہور ہوئی اور آج تک لوگ مزے لے لے کر سناتے تھے۔ ابا کا بھی جب دل کرتا اماں کو لاتوں کے ساتھ ساتھ یہ طعنہ بھی مارتا۔
اب کہ بانو کچھ نہیں بولی۔ اس کے دل میں موجود شیرو کی محبت کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح ایک کونے میں دبک کے بیٹھ گئی۔ ایک بپھری ہوئی ماں کی دہشت

اس معصوم محبت پہ حاوی ہو گئی' اماں دروازہ بند کر کے باہر نکلی تو کوٹھڑی میں اندھیرا ہو گیا' ویسا ہی اندھیرا بانو کے دل میں بھی ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ماہ بعد بانو کے بڑے بھائی کی شادی اپنی پھوپھی کے گھر طے تھی۔ ساتھ ہی بانو کی بھی طے کر دی گئی' بانو کے دل کی دنیا الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ بانو کو سارے کام بھول گئے تھے۔ کروشیا الجھ الجھ جاتا۔ کوئی ٹانکا سیدھا نہ رہا سویٹر بناتے ہوئے ڈیزائن میں فرق آنے لگا شیرو سے محبت کیا چھوڑی' وہ پھوہڑ ہو گئی۔ شیرو کی محبت ہی تو اس کا سلیقہ تھا۔ تنگ آکر دل پکار اٹھا۔

"شیرو تو کیوں اتنی دور ہے۔ آجاؤ شیرو۔ کیا میرے دل کی کوک تجھ تک نہیں پہنچتی۔ جیسے تیری کوک پہ میں بھاگی آتی تھی میری کوک پہ تو بھی بھاگ کر آجا۔"

اسی منڈیر سے ٹیک لگائے وہ شیرو کو پکار رہی تھی۔

اور شیرو' اپنی سلطنت کے اجڑنے سے بے خبر بادشاہ کی طرح کسی اور ہی سرخوشی میں مگن امتحان دے رہا تھا۔ امتحان ختم ہوتے ہی اسے پابھیوں سے بانو کی بات کرنی تھی اور پھر نوکری لگتے ہی شادی' اسی سرخوشی میں گھرا' منصوبے بناتا وہ گاؤں آگیا جہاں ایک دھماکا اس کا منتظر تھا۔

"کل بانو کا نکاح ہے۔"

کوئی فلک بوس عمارت یک لخت اس کے سر پر آگری تھی۔ اس کی خواہشیں لہولہان ہو گئیں۔ خواب لیرو لیر۔ محبت کرچی کرچی اور دل نیل و نیل' کتنی ہی دیر سماعت پہ یقین ہی نہ آیا۔ اس یقین کے لیے اسے بانو سے ملنا تھا' لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ اس کے گلے کی بلبل بھی کوک کوک کر تھک گئی۔ دو چار بار ان کے گھر بھی گیا۔ نجانے کہاں چھپی بیٹھی تھی۔ شادی پہ دودھ کی ذمہ داری باؤ زبیر نے لے لی تھی۔

شیرو دودھ کا گھڑا ان کی رسوئی میں رکھ کر جیسے ہی پلٹا پیلے جوڑے میں' صندل کی خوشبو میں بسی وہ سامنے تھی۔ ایک لمحہ تھا جب دونوں کی نظریں ٹکرائیں' اگلے ہی لمحے دونوں چرا گئے۔

"اوپر آؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔ نہ آئیں تو ہر چیز کی ذمہ دار تم ہو گی۔" آواز دبا کے دھمکی والے انداز میں کہتا نکل گیا۔

بانو کا دل جیسے بہلنے میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد سب سے نظر بچا کے وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ منڈیر کے ساتھ کھڑا شیرو اس کے سامنے تھا۔ وہ بھی اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ کتنے ہی عرصے بعد وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے۔ آمنے سامنے اس نے دیکھا شیرو ملگجے بالوں اور خالی آنکھوں کے ساتھ کتنا مضمحل لگ رہا تھا۔ پلکوں پہ سفر کی دھول ابھی بھی جمی تھی۔ اتنا میلا تو وہ کبھی نہیں رہا۔ وہ نظر چرا گئی اور نظر چرا تی اس مایوں کی دلہن کو شیرو کسی لٹے پٹے عاشق کی طرح بس دیکھتا جا رہا تھا۔

آج اسے کسی کے دیکھ لینے کا ڈر نہ تھا۔ پیلے جوڑے اور خوشبو میں بسی بانو اسے زہر لگ رہی تھی۔ اس کی لال آنکھیں اس کے سنگھار کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے چاند چہرے پہ چمکتی لونگ جو کبھی شیرو کو ستارے جیسی لگتی تھی آج چنگاری کی طرح جلا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے سراپے سے ہٹ کر ہاتھوں کی مہندی اور لال چوڑیوں پر آکے ٹھہر گئیں۔

"بانو۔" طویل خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ہاری ہوئی آواز میں۔

"کیا مجھے اپنے منہ سے بتانا تھا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔" محبت کے نام پہ کچھ زور سے ٹوٹا تھا اس کے لہجے میں' بانو کو اپنی ریڑھ کی ہڈی سے کڑک کی آواز آئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔

"کیا مجھے بھی یہ بتانا پڑے گا شیرو' کہ میں نے بہت کوشش کی تھی۔" بہت دیر بعد بولی تو آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"تم کوشش؟" وہ استہزائیہ ہنسا پھر اک جنون سا اس پر حاوی ہوا۔

"یہ کوشش کی ہے تم نے۔ یہ کوشش' یہ کوشش۔"

لال چوڑیوں والا اس کا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے منڈیر پر مارتا ساری چوڑیاں توڑنے لگا۔ تکلیف محسوس کیے بنا کسی پتھر کی مورت کی طرح اسے اپنی چوڑیاں ٹوٹتے دیکھتی رہی اپنا ہاتھ پکڑنے پہ "چل ہٹ بے شرم" بھی نہ کہہ سکی۔ اب وہ دوسرا ہاتھ پکڑے وہ چوڑیاں بھی توڑنے لگا، چھن چھن کی آواز سارے میں پھیل گئی۔

"یہ نہیں ٹوٹیں گی شیرو! یہ چاندی کی ہیں۔" بانو کی آواز پہ رکا۔ غور سے ان سرمئی رنگ کی چوڑیوں کو دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ہیجان تھوڑا کم ہوا۔ وہ اس کا سارا سنگھار دھول کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی بانو کسی اور کے نام کی مہندی لگائے بیٹھی تھی۔ درد کیوں نہ ہوتا؟

"لیکن میرا دل کانچ کا تھا بانو وہ ٹوٹ گیا۔" ڈھے سا گیا۔

"ہمارے بیچ اگر کچھ تھا تو دل میں قبر بنا کے اس میں دفن کر دو شیرو! میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"مجھے بھی کہیں دفنا دیتیں۔"

بانو شیرو کو چھوڑ چکی تھی، لیکن شیرو سے بانو نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اب وہ لال چوڑیوں کی جگہ اس کی کلائی پر ابھرتی لہو کی بوندوں کو پشیمانی میں گھرا دیکھ رہا تھا۔ یک دم سر اٹھایا۔

"بانو بھاگ چلتے ہیں۔" پرعزم نگاہوں سے بانو کی آنکھوں میں دیکھا۔

"لاہور بہت بڑا ہے کوئی ہمیں نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ چلو بانو۔" حوصلہ دیتی، ہمت بندھاتی فیصلہ کن نظروں سے بانو کی لال آنکھوں میں جھانکا جو بالکل بے تاثر تھیں، خاموش تھیں۔ وہ اس کے جواب کا منتظر ہوا۔ اردگرد پھیلا سکوت بھی اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کے لب ہلے۔

"کل نکاح میں ضرور آنا شیرو!"

وہ شیرو کی حد سے نکل چکی تھی اور شیرو جو ابھی تک اسی کے مدار میں چکر لگا رہا تھا۔ یک دم ٹھہر گیا، وہ اس کا فیصلہ جان گیا تھا۔

"اور تجھے لگتا ہے کہ میں آؤں گا۔" آواز پاتال سے آئی۔

"اگر مجھے ایسا لگتا تو کبھی نہ کہتی۔" یقین سے پر لہجہ تھا۔ وہ چند گھڑیاں فرصت سے اسے دیکھتا رہا۔ آخری بار دیکھنے جیسا دیکھنا۔ بانو کی آنکھیں خشک تھیں، لیکن ناک کی لونگ رو رہی تھی۔ آسمان کا چاند رو رہا تھا۔ منڈیر رو رہی تھی اور شیرو رو رہا تھا۔

شیرو نے چپکے سے اپنی جیب میں سے وہ دو کنگن نکالے منڈیر پر رکھے اور اسی خاموشی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ محبت کے جگنو بھی بانو کی دنیا میں اندھیرا کر کے شیرو کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر گئے۔ چاند نے بادلوں کی اوٹ میں چہرہ چھپا لیا، منڈیر خفا خفا سی لگنے لگی۔

بانو نے وہ کنگن اٹھائے، دو گھڑی محبت سے دیکھا اور چھت کی عقبی منڈیر سے غور سے میدان کے پار اندھیرے میں ڈوبے قبرستان کو دیکھا اور پوری قوت سے وہ کنگن قبرستان کی طرف اچھال دیے۔ وہی ان کی بہترین جگہ تھی۔ گال پر لڑھکتا آنسو بے دردی سے رگڑ کر صاف کیا اور سیڑھیاں اتر گئی۔ بانو نئی زندگی میں قدم رکھنے کو بالکل تیار تھی۔

☆ ☆ ☆

اگر بانو نہ بھی کہتی، شیرو پھر بھی اس کے نکاح میں شامل ہوتا۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ بچپن کے ساتھی تھے۔ شیرو کی غیر موجودگی سے لوگ کئی کہانیاں تراش لیتے۔ شیرو کو بانو کی عزت اپنی محبت سے کہیں زیادہ پیاری تھی۔ نکاح کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے شیرو اپنے ضبط کی آخری حد پر کھڑا تھا۔ رخصتی تک رکنے کا یارا نہ تھا بستہ کندھے پہ ڈالتا اس منڈیر کو آخری سلام کرتا گاؤں سے نکل گیا۔

روتے کرلاتے دل کو سنبھالنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ بانو کا غم اس کے روز و شب کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ آ گیا تھا۔ اس نے بی اے پاس کر لیا تھا۔ اب اسے ہاسٹل خالی کرنا تھا لیکن وارڈن سے اچھی

سلام دعا کے باعث اس کو نوکری ملنے تک رہنے کی مہلت مل گئی۔

سرکاری نوکری کے لیے درخواست دی تو امتحان کی تاریخ بھی جلد ہی آگئی' لیکن کیا کرے جب بھی کتاب کھولتا بانو کی یاد دھم سے صفحوں پر پھسکڑا مار کے بیٹھ جاتی۔ ان کتابوں میں تو بانو بستی تھی' وہ کیسے پڑھے؟ اس کا شمار ان طالب علموں میں ہوتا تھا جن کی کامیابی میں ذہانت سے زیادہ محنت کا ہاتھ ہوتا' بانو کے غم نے ادھ موا کر دیا تھا۔ محنت کیا کرتا۔ نتیجہ وہی ہوا۔ وہ فیل ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار شیرو کسی امتحان میں فیل ہوا تھا۔ دوسری بار شاید محبت کے امتحان میں بھی وہ فیل ہوگیا تھا۔

دن بھر شہر میں آوارہ پھرتا رہتا اور شام کو کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیتا۔ کبھی نہر کنارے' کبھی منٹو پارک' کبھی شاہی قلعہ۔ کبھی پہروں شاہی مسجد کے ٹھنڈے برآمدوں میں لیٹا رہتا۔ وہ مجنوں سا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن تو نہر کے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ عرصہ ہوا تھا فرصت سے آئینہ دیکھے۔ بڑھی ہوئی داڑھی' ملگجے بال' زرد رنگ۔ اسے خود سے گھن آنے لگی۔

اس نے زندگی کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ حجام کی دکان قریب ہی مل گئی اور وہیں زندگی نے دو قدم اور بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ وہاں اسے اپنے کالج کا ایک دوست مل گیا۔ اس کا ماموں ان ہی کے کالج میں کلرک تھا۔ اس کا ماموں دو سال کے لیے ملک سے باہر جا رہا تھا۔ سو اس کو اپنی جگہ کام کرنے کے لیے کسی کی ضرورت تھی' وہ اپنی آدھی تنخواہ اسے دے گا اور شیرو کو کیا چاہیے تھا۔ "فوراً" سے بھی پہلے یہ آفر قبول کی۔ جب وہ حجامت کروا کے باہر نکلا تو زندگی اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

اپنی پھرتی کے سبب جلد ہی وہ کام سیکھ گیا... بلکہ وہاں بیٹھے دوسرے بزرگ کلرک بھی اپنے حصے کا کام اسے دے دیتے اور وہ خوشی اور تندہی سے انجام دیتا۔ اسے بانو کی یاد سے بھاگنے کے لیے خود کو مصروف رکھنا تھا' لیکن کالج کا وقت ختم ہوتے ہی وہ پھر اسی عذاب میں گھر جاتا۔ کسی مہربان دوست نے آگے پڑھنے کا مشورہ دیا تو جھٹ سے اس پر عمل درآمد کیا۔ ایم اے کی کتابیں بھی دوست نے ہی لادیں۔ جن کتابوں میں بانو بستی تھی وہ کتابیں تو کب سے کباڑیے کو دے آیا تھا۔ وہی ان کی جگہ تھی۔

دن بھر کالج' پھر پڑھائی اور بچوں کو ٹیوشن دینے میں خود کو کھپا لیا اور جب بستر پر لیٹتا تو نیند بانو کی یاد سے پہلے آجاتی۔ زندگی سہل لگنے لگی' لیکن بانو کو فراموش کرنے کی کوشش میں وہ اپنے پیاروں کو بھی بھولے بیٹھا تھا۔ اس بات کا احساس اسے بھائی سفیر کی چٹھی دیکھ کر ہوا۔ وارڈن نے کسی لڑکے ہاتھ چٹھی بھیجی تھی۔ دو ماہ ہو چلے تھے جب وہ وارڈن کے توسط سے ملنے والے ایک کرائے کے مکان میں دو لڑکوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یا سفیر کا خط ہاسٹل کے پتے پر ہی آیا تھا۔ جس میں اس کی بابت فکرمندی کا اظہار اور جلد گاؤں آنے کی تاکید تھی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو احساس ہوا کہ چھ ماہ سے وہ گاؤں نہیں گیا۔ دل میں ملال سا ابھرا۔ دل کو ڈپٹ کر کل ہی ہفتہ وار چھٹی پر گاؤں جانے کی تیاری کرلی۔ گھر والوں کے لیے بہ مطابق جیب تحفے تحائف بھی لیے۔ عارضی ہی سہی پر نوکری اور پڑھائی کا بہانہ چل گیا اور بھائیوں نے اتنی دیر پلٹ کر نہ دیکھنے کو مصروفیت پر محمول کرتے ہوئے معاف کر دیا۔

بھابھیوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دنیا کی ہر چیز اس کے سامنے لاکر رکھ دیں۔ بچے اس کی گود میں' کندھوں پہ چڑھے پیار کا اظہار کر رہے تھے وہ اپنی جگہ شرمندہ سا ہوا۔ اس ایک محبت کے پیچھے اتنی محبتوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ چھت وہی تھی' کمرہ وہی تھا' وہ منڈیر وہی تھی' لیکن کسی چیز میں مزا نہیں تھا۔ ہر چیز بے رنگ' بے باس تھی' اس کا دل پھر ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا۔

اگلی صبح ہی بستہ کندھے پہ ڈال کر اس آسیب کدے سے بھاگ گیا۔ جانے سے پہلے بھابھیوں نے شادی کا ذکر چھیڑا تو لگا دل کو کسی نے جلتے چمٹے سے الٹ پلٹ کیا ہو۔

"نئیں پابھی! جب تک پکی نوکری نہ لگے۔ میں ایسے کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔" شادی کو بڑے آرام سے جھنجھٹ کہہ کر ان دونوں کو ٹال گیا تھا۔

اس کی اجڑی بکھری حالت تو پہلے ہی بھابھیاں بھانپ گئی تھیں۔ اب بس اس کے سنبھلنے سے پہلے پہلے اسے اس جھنجھٹ میں ڈالنے کی منصوبہ سازی کرنا تھی۔ اس کے دل کے فریم سے بانو کی فوٹو اتار کے کلو کی فوٹو فکس کرنی تھی۔

جو بقول وڈی کہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

✡ ✡ ✡

اور پھر وہ باقاعدگی سے ہر مہینے گاؤں آنے لگا۔ بھابھیاں ویسے ہی خاطر مدارت کرتیں۔ بھائی ویسے ہی قربان ہو ہو جاتے۔ البتہ بھائی تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے شیرو؟ تو اتنا اداس کیوں ہے؟"

لیکن وہ ہر بار ان کی تشویش کو ٹال جاتا۔ وہ اس دل کا کیا کرتا جس کے پاس خوش ہونے کی کوئی ایک وجہ بھی نہیں تھی۔

"اس کی شادی کر دو، پھر دیکھو، کیسے بھاگتی ہیں اداسیاں" نکی نے جیسے تے کی بات کی۔ جسے حسب سابق شیرو ہوا میں اڑا گیا۔ لیکن کب تک ٹالتا؟ ایک دن دونوں بہنیں دائیں بائیں اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔

"بے بے کی بات آج بھی میرے سینے پر لکھی ہے۔" وڈی نے آنکھوں میں جہاں بھر کا درد سمو کر بات شروع کی۔

"دنیا سے منہ موڑتے وقت بے بے نے مجھے کہا تھا کہ وڈیے! تو ہی اب شیرو کی ماں ہے۔ اسے اولاد کی طرح بیاہنا۔" درد کے ساتھ آنسو بھی آنکھوں کی سطح پر ابھر آئے۔

"پر تو پلہ ہی نہیں پکڑاتا۔ شیرو تو ہاں کر۔ دیکھنا کیسی چاند سی دلہن ڈھونڈ کر لاؤں گی تیرے لیے۔" کسی چالاک شکاری کی طرح جال پھینکا، لیکن وہ ان جالا کیوں سے بے خبر ان کے خلوص پہ دل کو پگھلتا محسوس کر رہا تھا۔

"کوئی شہر میں ہے تو پھر بھی بتا دے۔ ہم وہاں چلے جائیں گے۔" نکی نے اپنا شک نکالنے کے لیے بول تو دیا، لیکن پھر دل ہی دل میں ڈرنے بھی لگی۔ کہیں کوئی شہر والی ہی نہ ہو۔

"نئیں پابھی! کوئی نہیں ہے۔" ان کے خدشات کو اس ایک جملے نے اپنی موت آپ مار دیا۔ دونوں بہنوں نے آسودہ مسکراہٹ اچھالی۔

"تو پھر ویرا! ہاں کر دے۔"

"ٹھیک ہے پابھی! جو آپ کی مرضی، لیکن ابھی صرف رشتہ پکا کریں۔ شادی میں نوکری ملنے کے بعد ہی کروں گا۔" کبوتر جال میں پھنس گیا تھا۔

"ہاں ہاں۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی ہوگا۔" وڈی کی مسکراہٹ و کٹری کا نشان بناتی محسوس ہو رہی تھی۔

"شیرو! ویسے اماں نے کلو کے لیے بھی مجھ سے بات کی تھی۔" وڈی پھر چالاک شکاری کی طرح اس کی طرف بڑھی۔ اب اسے حلال کرنے کا منصوبہ تھا۔

"پر اگر تجھے منظور نہیں تو میں منع کر دوں گی۔" جملہ مکمل کیا۔ نکی نے ظالم گھوری وڈی کی طرف اچھالی۔ وڈی مطمئن نظر آئی۔

"جہاں آپ لوگوں کی مرضی۔ وہیں میری مرضی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"

جب بانو نہیں تو کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ چاہے کلو ہی کیوں نہ ہو اور پھر آنا" فانا" رشتہ پکا ہوا اور انگوٹھی بدل کی رسم بھی ہو گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ منگنی بانو کے درد کے لیے ٹانک ثابت ہو، لیکن وہ غلط تھا۔ انگوٹھی پہن کر تو درد اور شدید ہوا تھا۔ گھبرا کر وہ پھر اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگ گیا۔

کلو نے شیرو کے نام کی انگوٹھی کیا پہنی اسے تو جیسے

لائسنس مل گیا۔ وہ جب بھی گاؤں جاتا یا تو وہ پہلے سے وہاں موجود ہوتی یا پھر اگلے دن آجاتی۔ اس کی موجودگی میں اسے گھبراہٹ ہونے لگتی۔ کبھی کبھی اسے کلو پہ ترس آتا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اپنی منگیتر کو دیکھ کر لوگوں کے دل میں جو تار بجتے ہیں' اس کے وہ تار کب کے زنگ آلود ہو چکے تھے۔ بلکہ اسے اپنی منگیتر کو دیکھ کر دکھ ہوتا۔ بانو اور شدت سے یاد آتی۔

کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے وہ وہاں سے بھاگ جاتا بھاگتے بھاگتے جب تھک کر رکتا تو وہیں کھڑا ہوتا جہاں سے بھاگنا شروع کیا تھا۔ وہ خود کو ایک دائرے میں قید محسوس کرنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل بانو کے روگ کا جوگ لے چکا تھا اور آج اس کے ہجر کا.... اس سے بچھڑے ایک سال پورا ہوا اور ابھی نہ جانے کتنے موسم اسی ہجر میں بیتنے تھے۔ دل بہت بے چین ہوا تو گاؤں جانے کی ٹھان لی اور پھر رستے میں اس نے بانو کو دیکھا۔

ہاں پورے ایک سال بعد اس نے بانو کو دیکھا۔ تانگہ دھول اڑاتا کچی سڑک پر گاؤں کی طرف رواں دواں تھا شیرو تانگے کے عقبی حصے پر بیٹھا ناک اور منہ رومال میں چھپائے دھول سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاؤں کی طرف سے آتے ایک تانگے نے ان کو کراس کیا۔ اس تانگے کی عقبی سیٹ پر بانو بیٹھی تھی۔ شیرو پہچان گیا کہ یہ بانو ہے' لیکن وہ بے یقین تھا کہ یہ بانو ہی ہے۔

آج سے ٹھیک ایک سال پہلے والی بانو اور تانگے میں بیٹھی سیاہ چادر میں لپٹی بانو میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔ صندل اور مہندی کی خوشبو میں بسی بانو کا وجود اس رات دہکتا ہوا انگارہ لگ رہا تھا اور آج اس کا وجود جل جل کر بجھی ہوئی راکھ کی طرح ہلکا اور بے مول لگا۔ شیرو نے دیکھا اس کی ناک میں لونگ بھی نہیں تھی۔ عام حالات میں بھی بانو بجی سنوری رہتی تھی' لیکن آج وہ سہاگن تھی' لیکن پھر بھی اتنی بے رنگ کیوں؟ شیرو کا دل جیسے پہاڑ کی چوٹی سے گرا۔ وہ کتنی ہی دیر بانو کو دیکھتا رہا جو اس کے دیکھنے سے بے خبر کسی گہری سوچ میں گم دھول میں دھول لگ رہی تھی۔ حتی کہ اس کا وجود ایک سیاہ نقطے میں تبدیل ہو گیا وہ سیدھی' لمبی اور کچی سڑک جس کو گھوڑوں کی ٹاپوں نے دھول مٹی کر دیا تھا۔ ان کی زندگیوں کا استعارہ تھی۔ گھر کے دروازے تک پہنچتے شیرو کا غم دگنا ہو چکا تھا۔ محبوب کو کسی اور کے پہلو میں خوش دیکھیں تو دکھ ہوتا ہے' لیکن اگر محبوب کو ناخوش دیکھیں تو اور دکھ ہوتا ہے۔ شیرو اپنا دکھ بھول کے بانو کے لیے فکر مند ہو گیا۔

"بانو خوش تو ہے نا پا بھی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وڈی پا بھی سے پوچھا۔ وہ ذرا سا ٹھٹکی پھر مضبوط انداز میں بولی۔

"خوش؟ عیش کر رہی ہے۔ کھلا پیسہ' کھلا کھانا پینا' دو دو کام والیاں رکھی ہیں اس کی ساس نے۔ کیا کمی ہے اور تو اور ابھی امتیاز نے نواں نکور ٹریکٹر لیا ہے وہ بھی نقد و نقد اور کیا چاہیے۔" اس کی تسلی کروائی۔ وہ بالکل مطمئن نہیں ہوا' مگر خاموش ہو گیا۔

بانو کی فکر ہجر کے دکھ پر غالب آ گئی۔ دو تین بار اس نے چاچی سے بھی بات کرنے کی کوشش کی' لیکن وہ اس کو دیکھ کر ایسے رخ موڑ لیتی جیسے شیرو اجنبی اور نامحرم ہو اور چاچی ایک پردہ دار دوشیزہ اور اس سب سے بڑھ کر کلو کے ناقابل برداشت انداز' ہاتھ میں چائے کے دو کپ اٹھائے بے دھڑک اور بے جھجک اس کے کمرے میں آجاتی۔ خواہ مخواہ اپنی پسند ناپسند بتانے لگتی۔ کبھی بھونڈے انداز میں شعر سناتی اپنی قابلیت ثابت کرتی۔ شیرو کو کوفت ہونے لگی۔ اسے پھر بھاگنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ جواب تو دور کی بات مجھے دیکھتا تک نہیں۔" یہ کلو تھی تینوں بہنیں اس وقت باورچی خانے میں تھیں۔ وڈی نے آٹا گوندھ کر رکھا تھا۔ نکی ساگ کو گھوٹا لگا رہی تھی اور کلو اپنے دل کی دکھی کتھا

سنا رہی تھی۔
"برا نہ منانا کلو! جس طرح تو کاجل کے نام پر آنکھیں اوپر نیچے سے کالی کر لیتی ہے۔ میں تیری سگی بہن ہو کے تیری طرف دیکھتے ہی ڈر جاتی ہوں۔ وہ تو پھر نمانا شہری لڑکا ہے۔" وڈی نے ایسے کہا کہ نکی کی ہنسی نکل گئی۔ کلو ٹھیک ٹھاک برا مان گئی۔
"وندیاں بڑی نکل رہی ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس پہ شادی کے لیے زور ڈالو۔" کلو اپنی جگہ پہ صحیح تھی۔
"لے، وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہے جو زور ڈالنے پہ سہرا باندھ کے کھڑا ہو جائے گا۔ دہاد ہاد و تین بار کہا تو ہے۔" نکی گھونٹا لگا چکی تو بولی۔
"کہنے سے کیا ہو گا، مجھے تو لگتا ہے۔ تم لوگوں کی اپنی نیت نہیں ہے۔ جلتی ہو مجھ سے دونوں۔" کلو نروٹھے پن سے بولی۔
"لے اور سن نکیے، ہم اس سے جلتے ہیں؟" وڈی پیڑھی پر سیدھی ہوئی۔
"ہم جلتے ہیں تجھ سے اسی لیے تو صرف شک پڑنے پر ہی ہم نے راتوں رات بانو کا رشتہ کروایا امتیاز سے 'پانی تک نہیں پیا تب تک۔" وڈی اپنا کارنامہ بتاتے ہوئے ذرا کی ذرا ٹیڑھی ہوئی۔
"تو کیا فائدہ ہوا؟ مجھے تو لگتا ہے بانو ابھی تک اس کے دل میں ہے۔" کلو تنک کر بولی۔
"ہاں تو، تجھ میں بھی تو کوئی گن ہوتا۔ دو گز کی تو زبان ہے تیری، تجھ سے تو بانو ہی اچھی تھی۔ عزت تو کرتی ہماری۔" یہ نکی بولی اور پھر چند اور جملوں کے بعد باورچی خانہ میدان جنگ بن چکا تھا۔
لفظوں کے تیر تینوں طرف سے چلائے جا رہے تھے یہ جانے بغیر کہ رسوئی کے دروازے کے پار شیرو ان کی ساری باتیں سن چکا تھا۔ راتوں رات رشتہ کروانے والی بات اس کے دل میں تیر کی طرح گڑ گئی۔
بھابھیوں کے خلوص کے بوجھ تلے خود کو دبتا ہوا محسوس کرتا شیرو جھٹکوں کی زد میں تھا۔
وہ خلوص نہیں مفاد تھا۔ یہ سوچ اس کا دل چیرے دے رہی تھی، بے بے کے بعد خود کو شیرو کی ماں کہنے والی وڈی اپنے مقام سے ایسے گری کہ شیرو کو نفرت بھی اس احساس کے اظہار کے لیے چھوٹا لفظ محسوس ہونے لگا، اندر سے اٹھنے والے آگ کے شعلوں میں اس کا وجود جلنے لگا، ہجر کی آگ کے ساتھ ساتھ اپنوں کے دھوکے کی آگ نے شیرو کو بھسم کر دیا۔
اب اسے کبھی گاؤں نہیں آنا تھا، کبھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

کلرکی اور پڑھائی میں خود کو کھپا لینے کے باوجود فراغت کے کسی لمحے میں آنکھیں بند کرتا تو سیاہ چادر میں لپٹا وہ زردی مائل سپید چہرہ اور اس پہ بادامی ساخت کی خالی آنکھیں، پتلیوں کی سیاہی پہ ابھر آتیں اور اس کی سوچ کے صحرا میں کئی ملال ہائے ہائے کرنے لگتے، دو چار سال اور گزرتے تو وہ بانو کی جدائی کو نصیب سمجھ کر شاید کلو کے ساتھ خوش حال زندگی گزارنے کے لیے خود کو آمادہ کر لیتا، مگر اب یہ ملال عمر بھر رہنے والا تھا کہ بانو اس کا نصیب ہو سکتی تھی اگر وہ کم از کم اپنے بھائیوں پہ دل کا راز آشکار کر دیتا، لیکن اب صرف ایک "کاش" تھا، جس نے عمر بھر اسے تڑپانا تھا۔
اور جہاں تک کلو کا تعلق تھا تو اس سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو شیرو طے کر بیٹھا تھا کہ اسے اب کبھی گاؤں نہیں جانا۔ اس بے فاؤں اور دھوکہ بازوں کے دیس سے دل اچاٹ ہو گیا تھا، اس نے اپنے کانچ کے ٹوٹے دل پر پتھر کا خول چڑھا لیا تھا۔ پاسفیر کی دو چٹھیاں آئیں، لیکن وہ پتھر کا خول پھر بھی نہ چٹخا۔ بس مختصراً "اپنی خیریت لکھ کر جوابی چٹھی بھیج دی، لیکن وہ بے بے کا بیٹا تھا پتھر کا خول خود ہی تڑخ گیا جب ایم اے کا امتحان پاس کرتے ہی سرکاری نوکری کا امتحان بھی پاس کر لیا اور سیکرٹریٹ میں سولہویں گریڈ کی پکی نوکری لگ گئی۔
وہ جانتا تھا کہ اس روئے زمین پر اگر کوئی اس کی خوشی میں خوش ہو گا تو وہ اس کے بھائی ہیں، مبارک باد کی چٹھی ملنے کے اگلے روز ہی پاوزیر مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے، صافہ سر پر رکھے اس کے سامنے تھا، وہ ہلکتی

ہی دیر بھائی سے لپٹا رہا۔ اس کے لب خاموش تھے، لیکن اس کا دل بھائی کے سینے سے سر پٹخ پٹخ کر اپنی کتھا سنانے لگا۔

"کیا بات ہے شیرو؟ تو ناراض ہے ہم سے؟" اس کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پا وزیر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں پا! میں تجھ سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔ تو لیٹ جا پا میں آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

وزیر احمد چت لیٹ کر گھوں گھوں کرتے پنکھے کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹھنڈی ٹھار کالی بوتل تھی۔

"سادا پانی پلا دیتا۔ میں کوئی مہمان ہوں؟" بوتل پکڑتے ہوئے پا وزیر نے تکلفاً کہا۔

"تو میرے لیے کسی مہمان سے بڑھ کر ہے پا۔" کرسی گھسیٹ کر وزیر احمد کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے بولا محبت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

"کتنی دیر سے تو پنڈ نہیں آیا۔ سال بھر ہو گیا ہے۔ کسی سے ناراض ہے؟"

"ناراض نہیں ہوں بس مصروف ہوں۔" نظر چراتا ہوا بولا۔

"شیرو! تو ایسا تو نہیں تھا پتر، ہنستا کھیلتا شیرو کہاں چھپا دیا ہے؟ کیا غم ہے تجھے۔ مجھے بھی نہیں بتائے گا۔" اتنی محبت پہ شیرو کا دل بھر آیا۔ پہلے سوچا۔ ہر بات بھائی کو بتا دے' اپنا دل ہلکا کر لے' لیکن پھر رک گیا۔ جذبات میں کہی کسی بات میں آکے اس کے بھائیوں کے گھر خراب ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنی زبان کو روک لیا۔

"وہ بچپنا تھا پا! اب بڑا ہو گیا ہوں۔ افسر ہو گیا ہوں۔ اب اچھلتا کودتا اچھا لگوں گا؟" بات کو مزاحیہ انداز میں کہتا اپنے جذبات کا گلا گھونٹ گیا۔ پا وزیر پر کتنی دیر محبت سے دیکھتا رہا۔

"یہ لے' عید آنے والی ہے اپنے لیے نیا سوٹ سلوا لینا اس عید پر گھر ضرور آنا شیرو۔" چند نوٹ اس کے ہاتھ پہ رکھتا وزیر احمد التجا کرتا بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پیسے ہیں میرے پاس۔" پیسے پکڑنے میں متامل ہوتا بولا۔

"جانتا ہوں بڑا افسر بن گیا ہے تو۔ بڑے پیسے ہیں تیرے پاس۔ پر تو میرا پتر ہے اور یہ تیری عیدی ہے۔" وزیر احمد نے اس مان سے کہا کہ وہ پیسے پکڑ کے پھر اس کے گلے لگ گیا۔

پر نم آنکھوں نے آنسوؤں کا گھونٹ بھرا اور وزیر احمد رخصت ہوا' بے بے کا بیٹا عید پہ گاؤں جانے کے لیے خود کو آمادہ پا رہا تھا۔ خول ٹوٹ چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

"حضرات چاند نظر آ گیا ہے' کل صبح ساڑھے سات بجے عید الفطر کی نماز ادا کی جائے گی' ان شاء اللہ۔"

گاؤں کی دونوں مسجدوں سے آتی آوازیں شیرو نے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی سن لی تھیں' گلاب کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے گاؤں میں پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک غیر معمولی ہلچل تھی جو سارے ماحول کو منور کر رہی تھی۔ لوگوں کو اعتکاف سے اٹھایا جا رہا تھا۔ گلیوں میں بچے پھولوں کے ہار ہاتھ میں پکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ شیرو مسرور سا ہو گیا۔

شیرو گھر پہنچا تو بیرونی دروازہ کھلا تھا' لیکن گھر میں کوئی نہیں تھا۔ خالی صحن سے گزر کر وہ حیران سا برآمدے میں جا کھڑا ہوا کہ اچانک بیرونی دروازے میں سیٹی کا کیم سخیم وجود ظاہر ہوا۔ برآمدے میں کھڑے شیرو کو دیکھ کر وہ الٹے قدم واپس بھاگا۔

"چاچا۔ آ گیا۔ چاچا آ گیا" سیٹی کی سیٹی جیسی آواز دور تک سنی جا سکتی تھی۔ شیرو مسکرا اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہد کی مکھیوں کی طرح سب ایک ایک کر کے جمع ہونے لگے۔

محلے میں دو چار خواتین اعتکاف میں بیٹھی تھیں۔ سب ان کی طرف تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھائی بھی مسجد سے آ گئے۔ اس کو دیکھ کر گلاب کی طرح کھل اٹھے

بھابھیاں باورچی خانے میں گھس گئیں۔ شیرو کے لیے تازہ روٹیاں اور گرماگرم سالن لیے اس کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں، لیکن شیرو ان کے التفات کی حقیقت جان چکا تھا۔ اس لیے پہلے کی طرح ان کا مشکور نہیں تھا بلکہ لیے دیے انداز میں ان کی کہی بات کا جواب دے رہا تھا۔ دونوں نے یہ بات شدت سے محسوس کی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں پہلے تشویش کا اظہار کیا اور پھر ایک دوسرے کو تسلی دی۔ اب کہ تو شیرو کو کنوارا واپس نہیں جانے دینا تھا۔ اپنے مصمم ارادے کو ایک گرہ اور دے کر مطمئن ہو گئیں۔

وڈی چاول نکال کر صاف کرنے لگی، صبح کے لیے کھیر ابھی سے بنا کر رکھنی تھی۔ نکی بچوں کو سلانے چل دی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر نماز عید کے بعد شیرو کی عید، عید نہ رہی، چاچا عنایت اس سے اگلی صف میں بیٹھا تھا۔ خطبے کے دوران شیرو نے دو چار بار دیکھا، چاچا سارا وقت سر نیہوڑائے، مضمحل سا بیٹھا رہا۔ وہ اتنے سالوں سے جس چاچا عنایت کو جانتا تھا وہ اتنا خاموش تو کبھی نہ تھا۔ عید پہ ہمیشہ چاچا ہشاش بشاش ہوتا، لیکن آج کچھ تھا جو شیرو کے دل میں تیر سا گڑ گیا۔ بانو کے چاروں بھائی بھی عید گاہ میں نظر آئے، لیکن وہ دعا سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔ البتہ چاچا عنایت کچھ لوگوں سے عید ملا۔ اسی طرح جھکے سر اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ اور جلد ہی وہ بھی نکل گیا۔

"چاچے عنایت کو کیا ہوا ہے یار۔" عید گاہ سے نکلتے ہوئے پاوزیر سے پوچھا اور خبر جان لیوا تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لوگوں سے آگے نکل آیا۔ کلف لگے کپڑوں کی کھڑکھڑ، اس کے کانوں میں دھڑکتے دل کی دھڑ دھڑ میں مدغم ہو رہی تھی۔ فروری کی سرد صبح میں بھی پسینہ کمر پہ بہتا محسوس ہونے لگا، تنفس کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے چار گنا زیادہ تھی، زمین ـــــ قدموں کے نیچے نہیں بلکہ اس میں خود کو دھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ حلق میں ڈھول سی اٹک گئی تھی۔

وہ بانو کے دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔

صدیوں صحرا میں بھٹکتے مسافر کی طرح۔ دستک کے لیے دروازے پر ہاتھ رکھا جو دباؤ سے خود ہی کھل گیا۔ عید بھی اس گھر کی چوکھٹ کے باہر رک گئی تھی اور اس گھر کے صحن میں صف ماتم بچھی تھی۔ جس پہ پتھر کی مورت بنی بانو بیٹھی تھی اور دھیرے دھیرے سسکتی اس کی ماں۔ یا باورچی خانے سے برتنوں کی کھٹو پٹر کی آواز آرہی تھی۔ شاید پا شکور کی بیوی تھی۔ وہ ڈیوڑھی میں کھڑا سیاہ چادر میں بکل مارے بیٹھی بانو کا دکھ اپنے دل میں اترتا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ کھڑاک کی آواز نے دونوں ماں بیٹی کو متوجہ کیا۔ جیسے کوئی چلہ کاٹتا شخص اچانک کسی کی آمد پہ چونکے اور زہریلی نظروں سے آنے والے کو دیکھے۔

بانو کا دیکھنا ایسا ہی تھا شیرو کو کھڑا دیکھ کر وہ جھٹکے سے اٹھی اور بھاگ کر کمرے کے دروازے میں گم ہو گئی۔ شیرو کے تنفس کی رفتار معمول سے ابھی بھی زیادہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا چاچی کے پاس آکے بیٹھ گیا آج چاچی کسی پردہ دار دوشیزہ کی طرح نہیں بلکہ ایک دکھ کے سمندر میں غوطے کھاتی ماں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہو گیا چاچی؟" کسی سوکھے کنویں سے آواز نکلی۔

"بس پتر! میری بانو کے نصیب۔" بوڑھی آواز میں درد جیسا درد تھا۔

☼ ☼ ☼

بانو دلہن بن کر امتیاز علی کے گھر کیا گئی، وہ کنیز بانو بن گئی شروع کے چند دن تو بانو کے ساتھ ایسا سلوک ہوا جیسے وہ کوہ قاف کے دیس سے آئی ہوئی کوئی پری ہو۔ ساس صاحبہ ہر آنے جانے والے کے سامنے سینہ پھلا کر پیش کرتیں۔

"دیکھو میری بہو۔ سارے پنڈ میں اتنی سوہنی بہو کسی کی بھی نہیں ہے۔" اور آنے والیاں کبھی بانو کا صبیح چہرہ دیکھتیں، کبھی ناک کی لونگ، کبھی بات کرتے چمکتے دانت دیکھتیں اور کبھی مہندی سے سجے گورے گورے ہاتھ، رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات ساس صاحبہ کو ہواؤں میں اڑانے لگتے۔

بیاہی نندیں فخر سے اپنی سسرالی رشتہ داروں کو اپنی بھابھی سے ملواتیں اور کنواری نندیں اپنی سہیلیوں کے سامنے اکڑ اکڑ کے بیٹھتیں۔ اگر بانو اس پریڈ سے دو ہفتوں میں ہی اکتا گئی تھی تو ساس جی بھی چند دنوں میں بے زار ہو گئیں۔ اب کنیز بانو صرف کنیز رہ گئی تھی اور اس کے ساتھ سلوک بھی کنیزوں جیسا ہونے لگا۔

کبھی ہانڈی کا سواد زبان پہ نہ چڑھتا اور کبھی روٹی کی گولائی معیار کے مطابق نہ ہوتی۔ اگر کبھی کسی بات کے جواب میں "میرا یہ مطلب نہیں تھا" کہہ دیتی تو بے دید، بدلحاظ، لمبی زبان والی کہلائی جاتی اور اگر خاموش رہتی تو گھنی، میسنی، ڈھیٹ کے خطاب سے نوازا جاتا۔ شروع شروع میں نندیں آتیں تو وہ مسکرا کر خوش دلی سے ان کا استقبال کرتی۔ ایک دن بڑی نند بولی۔

"دیکھو بی بی... ہمارے شوہروں کے سامنے دندیاں نہ نکالا کرو۔ غیر مرد کے سامنے آنے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔" اور جب طور طریقے سیکھے تو ساس صاحبہ بولیں۔

"میری بیٹیوں کو دیکھ کر تو جیسے تمہارے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، مجال ہے جو کبھی ہنس بول لو۔ داماد کیا سوچیں گے۔" بانو ان کے سانچے میں خود کو ڈھالتے ڈھالتے بے ڈھب ہو چکی تھی۔

شروع کے دنوں میں سجتی سنورتی تھی۔ ایک دن ساس نے کہا۔ "میری جوان کنواری بیٹیاں ہیں۔ ان کے سامنے یہ سولہ سنگھار کر کے ان کا دل خراب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لچھن ہمارے ہاں شریف لڑکیوں کے نہیں ہوتے۔" اس دن کے بعد سے اس کی آنکھوں میں کبھی کاجل نہ دیکھا گیا اور جہاں تک سر کے سائیں کا تعلق تھا تو اس سے تعلق ہی بہت بے نام تھا۔ بانو جان ہی نہیں سکی کہ وہ اسے کیا کہہ کر مخاطب کرے، صبح کا گیا شام کو گھر آتا۔

"دیکھو اماں کے ساتھ نہ الجھا کرو۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی شکایت کرتی، سرتاج صاحب خود شروع ہو جاتے۔

"میں ان کے ساتھ نہیں الجھی، میں تو..."

"تم نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ صفائیاں دیتی رہ جاتی۔

"تو کیا وہ جھوٹ بول رہی ہیں؟" غصہ چہرے کے نقوش میں اتر آتا۔

"میں نے ایسا نہیں کہا۔"

"مطلب تو یہی ہوا ناں۔" وہ چپ رہتی۔

"دیکھو اگر ایسا ہی رہا تو رات بھی ڈیرے پر ہی گزار لیا کروں گا۔" اور وہ دبک کے بستر کے کنارے لگ جاتی اور پھر سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ جب چند ماہ تک کوئی خوش خبری نہ ملی۔

"سکینہ کے لڑکے کی جنج میرے امتیاز کی جنج سے دو دن بعد چڑھی تھی اور اس کی بہو کو چوتھا لگا ہے اور یہاں خالی خولی بوتھی (شکل)۔" ساس رنجیدہ ہوئی۔

"اماں بڑا شوق تھا نہ تجھے، سوہنی بہو لاؤں گی گوری چٹی، لے اب دیکھ اسے۔" یہ اس کی کنواری شریف لڑکی کی زبان تھی۔

دو چار مہینے اور گزرے تو بانو کو حکیم صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ حکیم صاحب نے نبض ٹٹولی اور کچھ پڑیاں ساس کے ہاتھ میں تھمادیں اور اگلے مہینے پھر آنے کا کہا اور اگلے مہینے نبض ٹٹولنے کے بعد حکیم صاحب نے ساس کے سر پر بم پھوڑا۔

"تمہاری بہو کے کبھی اولاد نہیں ہوگی۔ یہ بانجھ ہے۔" بانو کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اک یہی تو امید تھی، اولاد ہو گی تو اس کی حیثیت کو بھی تسلیم کر لیا جائے گا، لیکن حکیم صاحب نے وہ امید بھی

توڑدی۔ وہ ڈھے سی گئی۔

"میں امتیاز کا دوجا ویاہ کروں گی۔" کچھ دن ماتم گزاری کے بعد ساس نے اپنا فیصلہ سنایا اور یہ بھی کہ کنیز خود اپنے ہاتھوں سے امتیاز کا بیاہ کرے گی۔ ادھ موئی کنیز کے اندر کی بانو اس فیصلے پر جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ میں آپ کا ہر ظلم برداشت کرنے کو تیار ہوں' لیکن سوتن کا عذاب نہیں جھیلوں گی۔" وہ پہلی بار دلیری سے بولی تھی۔ پہلے تو ساس ٹھٹکی پھر چپکے بیٹھے امتیاز کو دیکھا اور پھر غضب ناک ہوتے ہوئے بولی۔

"تو پھر وہ دروازہ ہے۔ دفع ہو جا۔ دوجا ویاہ تو میں کروں گی اپنے پتر کا عزت راس ہی نہیں تجھے۔"

زخمی نظروں سے امتیاز کو دیکھا جو آج ابھی تک ڈیرے پر نہیں گیا تھا۔ وہ اسی خاموشی سے اٹھا اور گھر کی دہلیز پار کر گیا۔ بانو تن تنہا کھڑی رہ گئی۔

اور پھر پورے محلے نے دیکھا۔ ساس اور نندوں نے کیسے دھکے دے کر گھر سے اسے نکال باہر کیا۔ اسے دلیری مہنگی پڑ گئی تھی۔ سوتن کے کرب سے گزرنے سے بہتر ہے باقی کی زندگی بابل کے گھر گزار دی جائے اور یہی سوچ کر وہ تانگے پہ بیٹھی اور سیدھی اماں کے گھر جا پہنچی۔

"جن پیروں یہ آئی ہے' ان ہی پیروں مڑ جا بانو کیوں پیو کی پگ رولنے آ گئی ہے۔" سگی اماں کا ردعمل اور بھی نرالا تھا۔

"پر اماں۔" دکھ کی دلدل میں خود کو دھنستا محسوس کرتی بانو نے دہائی دی۔

"میرے ہاتھوں کو دیکھ بانو! جا چلی جا۔" اماں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ کئی مثالیں ہیں جن میں عورتیں اپنے ہاتھوں سے اپنے سہاگ کو بیاہتی ہیں۔ اولاد کی خاطر کرنا پڑتا ہے۔ امتیاز اکلوتا پتر ہے اپنے ماں پیو کا تو ضد نہ کر۔ جانتی ہوں اوکھا سودا ہے۔ پر تجھے کرنا پڑے گا بانو' ورنہ شریکا جینے نہیں دے گا۔"

اماں کو اپنی لاڈلی بیٹی سے زیادہ شریکے کی فکر تھی برادری کیا کہے گی۔ یہ پریشانی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اماں کی بوڑھی آنکھوں میں التجا کی تحریر پڑھتی رہی۔

"پانی پی لوں اماں؟" دھیرے سے بولی۔ اماں فوراً پانی کا گلاس بھر لائیں۔

"شکر کر تیری بھرجائی میکے گئی ہے۔" اماں کو اپنی بیٹی کی عزت نفس سے زیادہ اپنی جھوٹی عزت پیاری تھی۔

بانو نے اسٹیل کا گلاس منہ کو لگا لیا۔ ایسے پانی پیا جیسے صدیوں سے پیاسے انسان کو صحرا میں تازہ پانی کا کنواں مل جائے۔ اماں گلاس پکڑ کے کھڑی ہو گئیں۔ بانو نے بابل کے آنگن کو فرصت سے دیکھا۔ اس کے وسط میں لگے لیموں کے پودے اس کے اپنے ہاتھ کے لگے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے موتیا اور چنبیلی کے پودے بھی بانو نے ہی لگائے تھے۔ یہ پودے اس کے تھے' لیکن یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ یہ پودے تو اس گھر میں رہ سکتے تھے' لیکن بانو کا حق یہاں سے اٹھ چکا تھا۔ بانو نے اپنے دل کے قبرستان میں ایک قبر اور کھودی اور انا' عزت نفس اور خودداری جیسے تمام احساسات اس میں دفن کر کے چوکھٹ پار کر گئی۔

جب آئی تھی تب ظہر کی اذان ہو رہی تھی اور اب جب جا رہی تھی تب لوگ عصر پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے اور وہ سیاہ چادر میں لپٹی تانگے پر بیٹھی اپنی زندگی کی شام ہوتی دیکھ رہی تھی۔ اس ایک سال نے بانو کی جھولی میں صرف دکھ ڈالے تھے۔ وہ سارے دکھ اپنے پلو میں باندھ کر پھر اسی چوکھٹ پر جا پہنچی۔ جہاں سے دھتکاری گئی تھی۔

"اماں جیسا آپ کہیں میں ویسا ہی کروں گی۔"

امتیاز کی اماں کا سینہ اور چوڑا ہو گیا اور کمال مہربانی سے بانو کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اور یوں ایک سال بعد پھر سے امتیاز علی کے لیے دلہن کی ڈھنڈیا شروع ہو چکی تھی۔

اب جس شخص کو پہلی بار کوئی رشتہ نہیں مل رہا تھا' دوسری بار ملنا تو ناممکن کے قریب قریب لگنے لگا۔ اماں

کی شرط ہوتی کہ لڑکی کنواری ہو۔ لیکن کہاں سے ملے اکتالیس سال کے بڈھے کے لیے کنواری لڑکی۔ پھر اکبر نائی کے پرزور مشورے کے بعد اماں کنواری لڑکی کی شرط سے ذرا سا ہٹیں لیکن کم عمر کی شرط ہنوز برقرار تھی۔ کئی رشتے آئے، گئی گئے، لیکن بات نہ بنی۔ آٹھ مہینے اور گزر گئے۔ بالآخر ایک رشتہ طے پا گیا۔

لڑکی کم عمر تھی، شادی کے چوتھے مہینے ہی شوہر کا انتقال ہو گیا اور دو ماہ بعد حمل بھی ضائع ہو گیا، لیکن ان کی شرط تھی کہ امتیاز علی اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے۔ ماں بہنوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا البتہ امتیاز علی بانو کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

بانو نے کسی نہ کسی حد تک اپنی وفاشعاری اور محبت سے امتیاز کے دل میں جگہ بنالی تھی، لیکن وہ اتنی ہی جگہ بنا پائی تھی کہ امتیاز محض دو ماہ بعد ہی اماں کی بات مان کر بانو کو اپنی زندگی سے بے دخل کر چکا تھا اور بانو ہمیشہ کے لیے بابل کے آنگن میں آگئی۔

اب اماں لاکھ ہاتھ جوڑتیں بانو نے نہیں جانا تھا۔ بانو نہیں جاسکتی تھی اب کہ اماں نے ہاتھ نہیں جوڑے بس روتی رہیں اور بانو بانو تو روئی بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

شیرو کی سمجھ سے باہر تھا وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ بانو کی شادی کی خبر سن کر زیادہ دکھی تھا یا آج طلاق کی خبر سن کر۔ اس نے بانو سے ملنے کی کوشش کی، لیکن چاچی نے بتایا کہ وہ عدت میں ہے، نہیں ملے گی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی بھابھیاں اس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھیں، لیکن اس نے ان دونوں کو دانستہ نظرانداز کیا۔ وہ دل ہی دل میں ان سے مزید متنفر ہو چکا تھا۔ بنا کسی سے کوئی بات کیے، وہ عید کے تیسرے دن ہی واپس چلا گیا۔

بانو کی آنکھیں ہی خشک نہیں ہوئی تھیں، زبان بولنا بھی بھول گئی تھی۔ پہروں ایک ہی انداز میں بیٹھی رہتی۔ بھابھی اچھی تھی جو زبردستی دو چار نوالے کھلا دیتی۔ اماں بانو کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں اور بددعائیں دیتی رہتیں امتیاز اور اس کی ماں کو، ڈی بھی آئی تھی "افسوس" کرنے۔

"مجھے تو بانو نے ماں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا! ایک دن کا سکھ نہیں دیا اس نے ان کو، چلو وہ تو سب جیسے تیسے ماں برداشت کر گئی پر بے اولادی، چچ چچ۔"

وہ الٹا بانو پر چڑھائی کر کے چلی گئی۔ بانو پھر بھی خاموش رہی۔ وہ پوری ایمان داری سے امتیاز کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اپنی سی ہر کوشش کر کے وہ رشتہ نبھانا چاہتی تھی، لیکن ان دو سالوں میں ایک دن بھی اسے اپنی کوشش بار آور ہوتی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہاں جب امتیاز اس پہ ہاتھ اٹھاتا تھا، اس رات سونے سے پہلے وہ کسی گناہ کی طرح شیرو کو یاد کرتی۔

وہ انسان تھی اور انسان بھی ایک عورت جو صدیوں سے محبت کی طلب گار رہتی۔

لیکن امتیاز ایسا مرد تھا جسے شاید محبت کے ہجے بھی نہ آتے تھے۔ اس کا شمار ان مردوں میں ہوتا تھا کہ جو عورت سے محبت کو بزدلی گردانتے تھے اور وہ پنے تئیں ایک بہادر مرد تھا۔ اس لیے حسب ضرورت بیوی کی ٹھکائی کر کے اسے جامے میں رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ بانو کی آنکھیں شاید اسی لیے خشک تھیں کہ وہ اپنے حصے کے سارے آنسو بہا چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا کرے گا اس سے مل کر؟" بانو سے ملنے کی تیسری ناکام کوشش پر چاچی نے پوچھ لیا۔

وہ گڑبڑا گیا۔ اس کی عدت پوری ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی وہ شیرو کو دیکھتے ہی کمرے میں گھس جاتی تھی۔

"اس سے بات کروں گا۔ اس کو حوصلہ دوں گا۔"

دراصل وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے گا۔

"کوئی فائدہ نہیں پتر، وہ تو جیسے چپ کا روزہ رکھے بیٹھی ہے۔ تو نہ آیا کر، کل ویسے بھی میری بہو آجائے گی۔ کس کس کی زبان پکڑوں گی۔" چاچی بڑے پیار

سے اسے نکل جانے اور دوبارہ نہ آنے کا کہہ رہی تھی۔

وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے باہر نکل آیا۔ اگلی صبح مایوسی کے عالم میں بیگ کندھے پر لٹکایا اور نکل کھڑا ہوا، لیکن گلی کی نکڑ پر رک گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر دل نے رک جانے کا ہی مشورہ دیا۔

چاچی تانگے پہ سوار ہو رہی تھی۔ غالباً" وہ اپنی بہو کو لینے جا رہی تھی اور یقیناً" بانو اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ وہ دم سادھے وہیں کھڑا تانگے کے چلنے کا انتظار کرنے لگا مبادا چاچی کا ارادہ بدل جائے۔ چند ہی لمحوں بعد دھیرے دھیرے چلتے گھوڑے نے رفتار پکڑلی اور کچی سڑک دھول اڑانے لگی۔ وہ فوراً" پلٹا اور سیدھا دریار پہ آن رکا۔ زنجیر نما کنڈی کا سرا پکڑ کر کسی فریادی ہی کی طرح التجائیہ دستک دی۔ بانو غالباً" ڈیوڑھی میں ہی تھی۔ دستک میں چھپی التجا کو سمجھے بغیر اس نے دروازے کا داہنی طاقچہ تھوڑا سا کھول کر ایک آنکھ سے آنے والے کو دیکھا۔ شیرو کی شکل دیکھ کر فوراً" دروازہ بند کرنا چاہا۔ شیرو بھی اس کا ارادہ بھانپ گیا، دونوں ہاتھوں سے طاقچے پر دباؤ بڑھایا۔

"اندر آنے دو بانو۔ دروازہ کھولو۔" آواز دبا کر دائیں بائیں دیکھ کر بانو کو پکارا۔ جو ایک گھبرو جوان مرد کے مقابل دروازہ بند کرتے کرتے ہانپنے لگی تھی۔ جلد ہی ہار گئی۔ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ شیرو گرتا گرتا سنبھلا۔

"کیا بچنا ہے یہ 'اندر آنے دو مجھے۔'" شیرو بانو سے اس حرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"آجاؤ اندر۔ دیکھ لو تم بھی تماشا۔ تم کیوں پیچھے رہو۔ دیکھ لو اجڑنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں۔" وہ خود ترسی کی انتہا پہ کھڑی تھی۔

"بانو؟" غصے کی جگہ حیرت نے لے لی۔ غور سے اسے دیکھا۔

"مرگئی بانو، دیکھ لو شیرو۔ تمہاری کوئی بددعا ضائع نہیں گئی۔ ایک ایک جا کے مجھے لگی ہے۔ ایک دن کا سکھ نہیں دیکھا میں نے۔" دونوں ہاتھ گرائے وہ اس پر پھٹ پڑی تھی۔ نجانے کب کا غبار تھا جو نکل رہا تھا۔

"بانو! میں بددعا دے سکتا ہوں تجھے؟" اس نے دکھ سے اپنی اجڑی ہوئی دنیا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر کچھ بھی پرانا نہیں تھا۔ ناک کی لونگ بھی نہیں، وہاں ایک زخم کا نشان تھا، کسی گہرے زخم کا پرانا نشان۔

"تو کیا دعائیں دیتے رہے ہو مجھے؟" اسی کے انداز میں پوچھتی غصے سے لال ہو رہی تھی۔ آنسو آنکھوں سے نکل رہے تھے یا چہرے کے ہر مسام سے۔ وہ طے نہ کر پایا۔

"تجھے لگتا ہے جو تیرے ساتھ ہوا۔ اس میں میرا قصور ہے؟" بہت دقت سے شیرو نے بانو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں قصور تو میرا ہے۔ مجھے ہی بسنا نہیں آیا۔ مجھ میں ہی کوئی گن نہیں۔ میں عیبوں کی پوٹلی۔ بے عیبوں کے سر چڑھ گئی۔ قصور تو میرا ہی ہے، میں زندہ واپس کیوں آگئی۔ طلاق کا داغ لے کر یہاں آنے کے بجائے نہر میں چھلانگ لگا کر مر کیوں نہیں گئی۔ قصور تو میرا ہے۔" غصے سے بولتی اب وہ چیخ پڑی تھی۔" وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ شاید کچھ اور کہنے کو رہ گیا ہو۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو جھٹکے سے دروازہ کھول کر تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

بانو کتنی ہی دیر جھولتی زنجیر کو دیکھتی رہی۔

وہ اماں کے پلنگ پر چت لیٹا چھت کو سہارا دیتے شہتیر کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ بانو سے ملے گا، اسے تسلی دے گا، اس سے کہے گا کہ کوئی بات نہیں، ایسا مشکل وقت سب پہ آتا ہے۔ بس نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس مشکل کا سامنا کرنا ہی بہادری ہے، لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اور وہ کیا کہہ رہی تھی۔ "بددعا" وہ تو سارا وقت اس کو بھولنے میں اپنی جان لگاتا رہا۔ دعا یا بددعا کا تو کبھی خیال ہی نہیں آیا، وہ تو اس کی جدائی کو قبول کر چکا تھا۔ ایسا تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور وہ کیا سوچے بیٹھی تھی۔ شیرو کو اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس میں آج سفر کی ہمت نہیں تھی۔ سو

اپنے کمرے میں لیٹا بانو کے رویے پر کتنی ہی دیر غور کرتا رہا۔ کتنی ہی دیر وہ جوئے خیال میں الٹی سمت بہتا رہا۔ منفی سوچ نے اس کے اعصاب توڑ ڈالے تھے۔

بانو ایسا کیسے سوچ سکتی تھی۔ وہ بانو کو بددعا دے سکتا تھا بھلا؟ کیا بانو کو کبھی اس کی محبت کا اعتبار ہی نہیں تھا۔ ان کے ہاں مرد اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے آنسوؤں کا سہارا نہیں لیا کرتے تھے، لیکن شیرو کو اپنی پلکیں نم ہوتی محسوس ہوئیں۔ بانو کا گھر ٹوٹے، ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا اس نے۔ پہروں یہی سوچتے سوچتے تھک گیا، ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ چاچی تو کہہ رہی تھی کہ بانو نے ایک آنسو نہیں بہایا، لیکن شیرو نے اسے روتے دیکھا تھا۔ چاچی کا کہنا تھا کہ بانو تو جیسے گونگی ہو گئی ہو، لیکن شیرو نے اسے بولتے سنا تھا اور جب ذرا دیر کو اس پہلو پہ سوچا تو تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ تھکن، درد گھٹتا محسوس ہوا۔

وہ شیرو کو دیکھ کر روئی تھی۔ وہ شیرو سے اپنا دکھ بیان کر رہی تھی۔ وہ کیا بول رہی تھی اب یاد سے محو ہو گیا۔ یاد تھا تو بس یہ کہ وہ شیرو کے سامنے بولی تھی۔ وہ ہلکا پھلکا ہو اٹھا۔ آنکھیں ہنوز نم تھیں بانو کو اس محبت کا پاس تھا۔ یہ احساس ہی جاں فزا تھا۔ وہ اٹھا، اسے بھوک محسوس ہوئی۔

"شیرو۔ تو گیا نہیں؟ نکی تو کہہ رہی تھی تو چلا گیا۔" وڈی نے سیڑھیاں اترتے شیرو کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"کچھ کھانے کو ملے گا؟" آخری سیڑھی پر پہنچ کر شیرو نے وڈی کے سوال کو نظرانداز کر کے استفسار کیا۔

"میں نے تو کہا تھا، ہو نہیں سکتا کہ ملے بغیر چلا جائے، ماں صدقے ابھی روٹی لائی۔" اپنی بات کو نظرانداز کیے جانے پر اپنی خجالت مٹاتے ہوئے جلدی سے بولی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

شیرو غسل خانے کی طرف بڑھا۔ ستا ہوا چہرہ کئی کہانیاں سنا رہا تھا۔ اپنے غم کی تشہیر وہ کم از کم بھابھیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"وڈی، تجھ سے ایک بات کرنی تھی۔" آخری نوالہ لے کر اس نے خالی کٹوری ہٹائی تو چارپائی کی پائنتی کی طرف موڑھا رکھ کر بیٹھتی وڈی لگاوٹ سے بولی۔

شیرو جانتا تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ شیرو نے دیکھا نکی بھی وہیں آن کھڑی ہوئی۔ اس کا اپنا ذہن اتنا منتشر تھا کہ وہ حسب معمول بات پھر کبھی پہ ٹال کر کھسکنا چاہتا تھا، لیکن پھر دل نے ڈپٹا۔ "پھر کبھی کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟" سو وہ سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ گویا بات جاری رکھنے کا اشارہ ہو۔

"اماں تو کافی دیر سے شادی کے لیے کہہ رہی ہے، لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا جب تک شیرو کی پکی نوکری نہیں لگے گی، بیاہ کا سوچنا بھی نہیں۔ اب خیری صلاّ پکی نوکری لگ گئی ہے تو اب تو بتا دے اپنی چھٹیوں کا حساب لگا کے۔ تاکہ ہم دن رکھ لیں۔" وڈی نے اپنے مخصوص خوشامدی انداز میں تمہید باندھ کر مدعا بیان کیا۔

شیرو جانتا تھا اس موضوع پر بات کرنا آسان نہیں ہو گا۔ اس مشکل سے گزرنا تو تھا ہی۔ سو وہ خود کو اس مشکل سے گزرنے کے لیے تیار کرتا، گلا کھنکھارتے ہوئے سیدھا ہوا۔

"پا بھی آپ اپنی اماں سے کہہ دیں کہ کلو کا رشتہ کہیں اور کر دیں، میں کلو سے شادی نہیں کر سکتا۔" موت اس کی گھٹی میں تھی، وہ دقت سے بولا۔

"ہیں۔۔۔؟ کیا کہا؟" خلاف توقع جواب سن کر دونوں اچھل ہی تو پڑیں۔

"وہی کہا جو آپ نے سنا۔" دھیرے سے بول کر اٹھنے لگا۔

"کیوں؟ بانو کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتا؟" نکی نے ساری لگاوٹ بالائے طاق رکھ کر تنک کر پوچھا۔

"بانو کا یہاں کیا ذکر؟" بانو کا نام نکی کے منہ سے سن کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شیرو نے جتانے والے انداز میں پوچھا تو دونوں ہی سٹپٹا گئیں۔

"کملی نہ ہووے تے۔ بانو کتھوں آ گئی؟ تو مجھے بتا ویر! کیا ہو گیا؟ کیا کلو نے کچھ کہہ دیا؟ یا کسی اور نے کوئی لگائی بجھائی کی ہے؟" وڈی نے بروقت نکی کو ڈپٹ کر

شیرو کو مخاطب کیا۔
"کوئی کیا لگائی بجھائی کرے گا؟ کیا ایسا کچھ ہے؟"
ان کے انداز سے شیرو ٹھٹکا۔
"نئیں نئیں۔ میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی۔ شریکے کی تو عادت ہوتی ہے دو کی چار کر کے بتانا۔ کون کسی کو خوش دیکھ سکتا ہے؟" جز بز ہوتی وڈی بولی۔
"کسی نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن کلو سے شادی میرے لیے ممکن نہیں اب۔" جملہ مکمل کر کے وہ رکا نہیں اور بیرونی دہلیز پار کر گیا۔
"جس دن سے کلو ہی طلاق لے کر آئی تھی، اسی دن سے میری آنکھ پھڑک رہی تھی۔" شیرو کے انکار کی وجہ بانو کی طلاق کو قرار دے کر نکی بڑبڑانے لگی۔
"ہوں۔" وڈی نے پر سوچ ہنکارا بھرا۔
"یہ سمجھ رہا ہے کہ انکار اتنا آسان ہے۔ میں تو وہ سیاپا ڈالوں گی کہ اس کی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔" وڈی نے زہر اگلا، نظریں ہنوز دروازے پر جمی تھیں۔ جہاں سے شیرو نکلا تھا۔
شیرو بھی سمجھتا تھا کہ یہ سب آسان نہیں ہو گا۔ اس کے دونوں بھائیوں کی ازدواجی زندگی براہ راست متاثر ہو سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے انکار کی خبر بھابھیوں کے ذریعے ان تک پہنچے، وہ خود ان سے مناسب طریقے سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے دور سے ہی اسے دونوں بھائی ڈیرے پر بیٹھے نظر آ گئے۔ وہ دونوں زمین پر بیٹھے تھے۔ ان کے عین سامنے بان کی کھٹولی پر ماسی خیراں بیٹھی رازدارانہ انداز میں کوئی بات بتا رہی تھی اور ساتھ ہی وقفے وقفے سے ہاتھ میں پکڑی حقے کی نلی منہ میں ڈال کر حقہ گڑگڑاتی۔
شیرو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس نے ماسی خیراں کو بھٹی تپاتے اور مکئی اور چنے بھونتے دیکھا تھا۔ اس کے اردگرد ہمیشہ بچوں بلونگڑوں کا ہجوم رہتا۔ خود بانو اور شیرو آدھی چھٹی میں مکئی بھنواتے تھے۔ اب دو چار سال ہوئے تھے، ماسی خیراں کی بھٹی اس کی بہو نے سنبھال لی تھی اور ماسی خیراں چھوٹی سی چارپائی گلی میں ڈالے سارا دن آنے جانے والوں سے بات چیت کر کے اپنا وقت کاٹتی۔ شیرو کی بھی گلی میں ہی ماسی سے ملاقات ہو جایا کرتی، لیکن آج ماسی کی ڈیرے پر آمد شیرو کو کھٹکی۔ "یقیناً" کوئی بے حد ضروری بات ہو گی۔ اسی تذبذب میں قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اس کے سلام کا جواب دے کر ماسی اپنی ادھوری بات مکمل کرنے لگی۔
شیرو کے اعصاب بھی تن گئے۔

☆ ☆ ☆

شیرو ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اتنے عرصے سے اک بوجھ جو وہ اپنے دل پر محسوس کرتا تھا، سرک گیا تھا۔ پہلے اسے کلو سے ہمدردی ہوتی تھی۔ پھر بے زاری نے جگہ لے لی اور اب نفرت ہونے لگی تھی۔ بھابھیوں کی طرف سے ابھی تک مکمل خاموشی تھی۔ وہ اپنے انکار سے بھائیوں کو آگاہ کر چکا تھا۔ وہ شیرو کے ہر فیصلے میں اس کا ساتھ دینے کا عندیہ دے چکے تھے۔ اگر صرف شیرو کی بات ہوتی تو شاید وہ اس کو قائل کرنے کی ایک آدھ کوشش کرتے، لیکن ماسی خیراں کی بتائی بات نے پہلے ہی ان کا دل کھٹا کر دیا تھا۔
بقول ماسی خیراں، کلو لال چوبارے والوں کے لڑکے سے ملنے ان کے چوبارے جاتی تھی۔ ماسی نے دو چار بار خود دیکھا اور کچھ لوگوں سے بھی سنا۔ ماسی خیراں کے مطابق اس نے وڈی کو بھی بتایا تھا جس کے ردعمل کے طور پر وڈی نے نہ صرف ماسی خیراں کی بے عزتی کی بلکہ اس کا بائیکاٹ بھی کر دیا۔ اب "مجبوراً" ماسی ڈیرے پر آئی تھی کیونکہ سارے گاؤں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ان کے گھرانے کی اور بے بے کی گاؤں میں بہت عزت تھی۔ شیرو کو بھی بھابھی کی شریکے کی لگائی بجھائی والی بات سمجھ میں آ گئی۔
ماسی خیراں کو وہ عرصے سے جانتے تھے، اس کی بات پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، لیکن پھر بھی وزیر احمد کے مشورے کے مطابق ابھی گھر میں کھل کر بات کرنے کے بجائے تحمل سے کام لیا جائے۔ یہ بھی تو

ہوسکتا تھا کہ ماسی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ لہٰذا انہوں نے سبھاؤ سے کلو کو وہاں آنے سے منع کردیا اور جہاں تک رشتے کی بات تھی' اس میں شیرو کی مرضی سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ بھابھیوں کو بھی وزیر احمد کا کلو کو منع کرنا کھٹکا' لیکن وہ بھی مناسب وقت کے انتظار میں تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تازہ دم ہو کر غسل خانے سے نکلا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے اڑنے والی دھول مٹی میں اٹ کر آنے والے مسافر کی پہلی منزل غسل خانہ ہی ہوتی تھی۔ نجانے کب اس گاؤں کی سڑک پکی ہوگی۔ تولیے سے اپنے براؤن بال خشک کرتا صحن میں بطور خاص اس کے لیے بچھائی گئی چارپائی پر آبیٹھا۔ بھابھیوں کا لہجہ حسب سابق کھنڈ سے بھی میٹھا تھا۔

"الڑبلھڑ باوے دا
باوا کنک لیاوے دا
باوی بہہ کے چھٹے دی
سو روپیہ کھٹے دی"

دیوار پار سے آتی آواز یقیناً" بانو کی تھی۔ وہی مخصوص کھنک جو جب وہ خوش ہوتی تو اس کی آواز میں رچ جاتی تھی۔ ایک معصوم کھلکھلاہٹ اس آواز کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ وہ غالباً" اپنے بھتیجے کو کھلا رہی تھی۔

"اماں تیری رانی
ابا تیرا راجا
سوتے دا دروازہ"

شیرو بے طرح خوش ہوا۔ پچھلے مہینے والی روتی دھوتی بانو ذہن سے محو ہونے لگی۔ وہی پرانی والی ہنستی کھیلتی گنگناتی بانو سنائی دینے لگی۔ بانو کا زندگی کی طرف لوٹ آنا ایک خوش کن احساس تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا جب ساتھ والوں کی چھت پر کھٹر پٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ کتاب ہاتھ میں پکڑے پکڑے باہر کو لپکا۔ اس امید پہ کہ کاش بانو ہو۔ اور امید بر آئی' وہ بانو ہی تھی تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی۔ ارد گرد سے بے خبر بالٹی میں سے کپڑا اٹھاتی' نچوڑتی اور تار پر پھیلاتی جاتی۔ شیرو منڈیر کے پاس کھڑا فرصت سے اسے دیکھنے لگا۔

چہرے کی زردی پہلے سے کم تھی۔ لونگ ابھی بھی غائب تھی' ہاں زخم کا نشان موجود تھا۔ سورج کی براہ راست روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جس کی شدت سے بچنے کے لیے آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ اس کی شلوار کے پائنچے اور قمیص کا دامن بھیگے ہوئے تھے۔ خوب تسلی سے جائزہ لینے کے بعد شیرو کو شرارت سوجھی' کوئل کی کوک سے مشابہ سیٹی اس کے لبوں سے آواز ہو کر بانو کی سماعت سے لپٹ گئی۔ بے ساختہ بانو نے شیرو کو دیکھا۔ پہلے ٹھٹکی پھر شیرو کی مسکراہٹ دیکھ کر سنبھلی۔

"کیسے ہو فلک شیر؟" ہمت جمع کر کے بولی۔ آخری ملاقات یاد آگئی تھی۔

"میں شیرو سے فلک شیر ہو گیا۔ اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔" اس کو نگاہوں میں سموتا بولا۔

"بھئی اب سنا ہے افسر بن گئے ہو۔ شیرو تو نہیں جچتا افسری پہ۔" ازلی اعتماد سے بولی۔ اور ہاتھ میں پکڑی قمیص نچوڑنے لگی۔

"اس حساب سے تو مجھے بھی تمہیں کنیز بانو کہنا چاہیے۔ کیونکہ طور طریقے تو تمہارے افسروں والے ہیں میڈم سے ایک ملاقات کے لیے سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔" کچھ جتاتا ہوا بولا۔

"نہیں' مجھے بانو ہی رہنے دو۔ مجھے کنیز بانو راس نہیں آیا۔" تلخی سے بولی تو اس کے چہرے پر پڑتی سنہری دھوپ بھی تلخ لگنے لگی۔ وہ چپ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ جو اس کو نظر انداز کیے اپنے کام میں مگن تھی۔ سینے میں دھڑکتے دل نے انگڑائی لی۔

"بانو! چلو وہ کہانی وہیں سے شروع کریں جہاں یہ ختم ہوئی تھی۔" جذب سے بولتا وہ خود کو بھی وہاں محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ہر سو صرف بانو تھی۔ بانو نے مڑ

کرنا گواری سے اسے دیکھا پھر آواز میں سختی لا کے بولی۔
"کلو سے تمہاری منگنی کا سنا' مبارک ہو۔" انداز کچھ باور کروانے والا تھا۔
"میں کچھ اور بات کر رہا ہوں بانو!" دائیں ہاتھ میں پکڑی کتاب کو بائیں ہاتھ میں منتقل کرتا وہ مضبوط لہجے میں بولا۔
"ختم شدہ کہانیاں پھر سے شروع نہیں ہوا کرتیں۔ نئی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔" وقت کی کتاب نے اسے فلاسفر بنا دیا تھا۔
"تو نئی کہانی لکھتے ہیں۔ میں اور تم۔" وہ تمام فاصلے پاٹنا چاہتا تھا۔
"نئی کہانیوں میں کردار بھی نئے ہوتے ہیں۔" وہ بھی اٹل تھی۔
"لیکن میں وہی پرانا شیرو ہوں بانو۔"
"لیکن میں پرانی بانو نہیں ہوں۔" بالٹی کو الٹا کر کے چھت کی جلتی بھنتی سطح پر پانی انڈیلا۔ چھت کی کچی مٹی نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پانی جذب کر لیا۔
وہ ہنوز تشنہ تھی۔ شیرو کی نگاہیں وہیں تھیں۔
"سب وہی ہے بانو۔ تم وہی ہو' میں وہی ہوں۔ یہ منڈیر وہی ہے۔" وہ ذرا کے ذرا رکا۔
"اور ہماری محبت وہی ہے۔" سورج کی تیز روشنی میں بھی اس کی آنکھوں کی لو نمایاں تھی۔
"ایسی فضول باتیں سوچنے کے بجائے اپنے اور کلو کے بارے میں سوچو۔ اچھی لڑکی ہے وہ۔" اس کی نگاہوں کی لو بے اثر گئی۔ وہ تیزی سے بات مکمل کرتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔
"میری بات پر غور کرنا ورنہ ساری عمر دوسروں کے بچوں کے کپڑے دھوتی رہو گی۔" تار پہ پھیلائے گئے چھوٹے چھوٹے کپڑوں پر چوٹ کرتا بہ آواز بلند بولا۔ لیکن وہ کلن لپیٹے بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔ اسے شیرو کی کوئی بات نہیں سننا تھی۔
کلو سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ وہ بانو کی طلاق سے بہت پہلے کر چکا تھا۔ در حقیقت بانو کی طلاق کے بعد بھی اس نہج پر اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر آج جب بانو کو پہلے کی طرح معمول کے کام نپٹاتے دیکھا۔ اسے زندگی کی طرف لوٹتے دیکھا تو اس کا دل بھی پرانی ڈگر پر لوٹنے لگا۔
بانو کو اس کے بھائی ہمیشہ ایسے ہی بٹھائے رکھنے والے نہیں تھے' کبھی نہ کبھی اس کو بیاہ ہی دیتے۔ اگر حالات دوبارہ سے بانو کو اپنی محبت کو پانے کا موقع دے رہے تھے تو اب وہ یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا پہلے ہی کئی گلے شکوے اس کے دامن سے لپٹے تھے۔ اب وہ اپنی زندگی کو مزید شکوؤں کی نذر نہ کرنے کی ٹھان چکا تھا۔
شہر جاتے ہی اس نے پہلا کام سونے کی چھوٹی سی لونگ خریدنے کا کیا۔ اس کے اوپر چم چم کرتے شیشے جیسے نگ میں محبت کے ساتوں رنگ نظر آتے تھے۔ شیرو اس کی ناک کا وہ بدنما زخم چھپا کے اسے پہلے کی طرح لونگ سے سجانا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان کٹھنائیوں سے بھی آگاہ تھا جو اس ایورسٹ کو سر کرنے میں اسے درپیش ہونے والی تھیں۔ وہ ہر مشکل پار کرنے کو تیار تھا۔ بانو کی یاد سے غافل رہنے کے لیے اس نے دل پر جتنے پہرے بٹھا رکھے تھے' وہ سب اٹھ چکے تھے۔ اب دل بانو کی یاد کے علاوہ کہیں لگتا ہی نہ تھا۔ وہ دل کے بل چلتا پھر گاؤں پہنچ گیا۔
منڈیر سے ٹیک لگائے وہ کتنی ہی دیر کوئل کی کوک کا سندیسہ بھیجتا رہا۔ وہ جانتا تھا وہ نہیں آئے گی لیکن پھر بھی چاہتا تھا وہ آجائے اور وہ نہیں آئی۔ کتنی ہی دیر خوش دلی سے مسکراتا رہا۔ یہ سوچ کر کہ وہ آج بھی بانو کو سب سے زیادہ جانتا تھا۔
اور پھر اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ سورج ڈھلتے ہی اپنے بھتیجے کو اٹھائے چھت پر چلی آئی۔ اب خدا جانے وہ بھتیجے کو بہلانے آئی تھی یا شیرو کے لیے، بہرحال شیرو آہٹ محسوس کرتے ہی اپنے "حجرے" سے نکل آیا۔
"کیا سوچا پھر؟" براہ راست بانو سے مخاطب ہوا۔
"کچھ سوچنا تھا؟" احتیاط سے ڈیڑھ سالہ بھتیجے کو

چارپائی سے اتارتے ہوئے بولی۔
"پھلو تم اتنی ہی تم بھولی ہو تو صاف سن لو۔ شادی کرنی ہے تم سے۔" دو ٹوک انداز میں کہا۔ لیکن وہ اس کی بات کو نظرانداز کرکے اپنے بھتیجے کو سیڑھیوں کی طرف نہ جانے کی تلقین کرنے لگی۔ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتا شیرو مضطرب ہوا۔
"بہری ہو گئی ہو؟" اپنی بات بے اثر جاتے دیکھ کر سویٹر بنتی بانو کو غصے سے متوجہ کیا۔
"فضول باتیں سننے کا ٹائم نہیں ہے میرے پاس اور تم بھی بنا وقت ضائع کیے بغیر کلو سے شادی کرو اور گھر بساؤ۔" کسی بڑی بوڑھی کی طرح ڈانٹنے والے انداز میں نصیحت کرنے لگی۔ اور دوسری ٹانگ بھی چارپائی پر پسار لی۔
"تمہاری تسلی کے لیے بتادوں کہ اگر تم مجھ سے شادی نہ بھی کرو تو بھی میں کلو سے شادی نہیں کرنے والا۔" اس کے بگڑتے تیوروں کو نظر میں رکھتے ہوئے مزید بولا۔
"اور ہاں اس کی وجہ خود کو نہ سمجھ لینا۔ یہ بہت پہلے ہو چکا ہے۔" دونوں بھنوؤں کے بیچ کی لکیر نمایاں ہو گئی۔ یہ شدید غصے کی علامت تھی۔
"اور کیوں کیا انکار؟ کیا کمی تھی کلو میں؟" نہ سویٹر یاد رہا نہ بھتیجا۔
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کلو نے انکار کیا ہو۔ تم اپنے چھوٹے سے دماغ کو زیادہ تکلیف نہ دو اس معاملے میں۔" بڑے مزے سے کہنی منڈیر پر ٹکا کر اردگرد دیکھتے ہوئے بولا۔
"وہ کیوں کرے گی انکار؟" بانو ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔
"کیوں۔ کوئی لڑکی مجھے انکار نہیں کر سکتی؟" اس کی حیرت سے پر آنکھوں میں دیکھا۔
"تمہارے مسئلے تم ہی جانو۔ بس مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں، مانی ادھر نہیں جاؤ۔" گڑبڑاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دے کر بلاوجہ ہی بھتیجے کو ڈانٹنے لگی۔

"تمہیں ترس اور پیار میں فرق نہیں پتا، تو کیا کر سکتا ہوں؟" آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"پہلے ذرا کسی سے میری طلاق کی وجہ معلوم کرلو، یہ پیار ویار کا بھوت اتر جائے گا۔" تلخی سے بولتی تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔

"ارے، محبوب کی کمیاں بھی سر آنکھوں پر۔" ذرا سا جھک کر اس نے کہا تو بانو سٹپٹا گئی۔

شیرو نے کبھی اس انداز میں بات نہ کی تھی، تب بھی نہیں جب وہ اس سے محبت کے سلسلے میں تھی۔ اور محبوب لفظ تو انتہائی معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ فوراً" اون سنبھالی، بھتیجے کو بازو میں دبوچا اور تن فن کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔ شیرو کھل کر مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں چاچے نواب کا وہ کوٹھا یاد ہے شیرو! جو طوفان اور آندھی کی وجہ سے ڈھے گیا تھا۔" چند ہی دنوں بعد شیرو پھر اس کے روبرو تھا۔ وہ اس کے بڑھتے قدم روک دینا چاہتی تھی۔ تاسف سے بولتی رہی۔

"میں بھی اپنی زندگی میں آنے والے طوفان کے بعد ویسے ہی ڈھے گئی ہوں۔ جس رستے پر تم چل رہے ہو وہاں صرف کھنڈر ہے۔"

"ہم، یاد ہے مجھے اور یہ بھی یاد ہے کہ چاچے نواب نے اگلے ساون سے پہلے ہی وہ کوٹھا پھر سے کھڑا کر دیا تھا۔ پہلے سے زیادہ بہتر، زیادہ مضبوط۔" وہ دوبدو بولا۔

"میں انسان ہوں۔ مجھے دوبارہ کھڑے ہونے میں نہ جانے کتنے ساون بیت جائیں۔"

شیرو نے غور سے دیکھا اس میں کسی فلسفی کی روح آن بسی تھی۔ "یہ غلط بات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا کہ میں چاچے نواب کا وہ کوٹھا ہوں۔" اس کی بات کو ہوا میں اڑاتے مزاحیہ انداز میں بولا۔

"میں "خالی" عورت ہوں شیرو۔" وہ اسے اپنے بانجھ پن کا جتانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی وجہ سے اسے کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔" اس کی بھیگی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوطی سے بولا۔

"یہ کہہ دینے جتنا آسان نہیں۔" بے یقینی لہجہ بھی بھیگ گیا۔

"یہ نہ کر سکنے جتنا مشکل بھی نہیں۔" وہ اٹل تھا۔

"تم پاگل ہو۔" اس کی ضد سے ڈر گئی تھی۔

"وہ تو میں ہوں۔ اگر تھوڑی سے بھی عقل ہوتی مجھ میں تو یہاں تمہارے ساتھ سر کھپانے کے بجائے اپنے بھائیوں کو تمہارے اماں ابا کے پاس نہ بھیج دیتا۔" اس کے بھیگے لہجے سے اقرار اخذ کر چکا تھا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" بھیگے نقوش غصے میں آ گئے۔

"میں ایسا ہی کرنے والا ہوں۔ تم کرلو جو کر سکتی ہو۔" چیلنج کرتا بولا۔

"میں انکار کر دوں گی۔"

"اور میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔"

"مار دو جان سے۔ اس سب سے تو بہتر ہے مار دو مجھے۔" آواز میں ہار جانے کا سا تاثر تھا۔

"چلو، یہ تو بات ہی ختم ہو گئی۔ شادی ہوتے ہی پہلا کام تمہیں جان سے مارنے کا کروں گا۔" اسے زچ کرتے ہوئے بولا۔

"بھئی یہ کہہ کر جان تو بچا سکوں گا کہ سیلف ڈیفنس میں مارا ہے۔" شادی کے نام پر اس کی گھوری کو دیکھتے ہوئے فوراً" بولا۔

"ہیں؟ کس میں مارا ہے؟" انگریزی ہمیشہ سے اس کی ہیرن تھی۔ وہ ہنسنے لگا۔

"چار جماعتیں اور پڑھ لیتیں تو آج سیلف ڈیفنس پہ ہونقوں کی طرح منہ نہ کھول لیتی۔" اس کے انداز کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس نے فوراً" اپنا منہ بند کیا اور چہرے سے سوالیہ تاثرات ہٹا لیے۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ انگریزی کا رعب ڈال کر اپنی فضول بات منوا لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔" فوراً" چارپائی سے اٹھ کر پاؤں میں چپل اڑسنے لگی۔ اون کا گولہ زمین پر لڑھک گیا۔

"انگریزی کا رعب ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں

پڑی۔ تم ویسے ہی مان گئی ہو۔" اک آسودگی اس کے چہرے کے خطوط میں آن بسی۔
"میں کوئی نہیں مانی شیرو اور یہ بات ختم کرو۔" کمزور سا احتجاج۔ اون لپیٹتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بولی۔
"مان تو تم گئی ہو اور اب میں تمہیں مکرنے بھی نہیں دوں گا۔ جلد ملتے ہیں۔" الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے دھپ دھپ سیڑھیاں اتر گیا۔
وہ بے بسی سے خالی منڈیر کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"سنا ہے بانو بانجھ ہے۔" سفیر احمد نے قدرے وقت سے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ بھائیوں میں محبت تو بہت تھی لیکن ایسی بے تکلفی نہ تھی۔ شیرو نے ان سے بانو کے لیے رشتہ لے جانے کی بات کی تو دونوں متامّل تھے۔
"اول تو میں ان نیم حکیموں کو مانتا ہی نہیں لیکن اگر فرض کرو وہ بانجھ ہے بھی تو پھر بھی کوئی بڑی بات نہیں، یہ ایک بیماری ہی ہے جیسے یرقان یا کالی کھانسی۔ اس کا بھی علاج ہوتا ہے۔ شہر میں بہت بڑے ڈاکٹر ہیں بڑے اسپتال ہیں۔" وہ پوری تیاری سے آیا تھا۔ "اور اگر اولاد نہ بھی ہوئی تو تم لوگوں کے بچے بھی تو میرے ہی بچے ہیں تیری نازو اور تیرا بچہ ان کو مجھے دے دو گے ناں؟ ہلکے پھلکے انداز میں بات ختم کرتے ان کو دیکھا۔
اور ان کے لیے تو شیرو کی خواہش سے بڑھ کر کچھ نہ تھا لیکن ابھی ایک محاذ باقی تھا۔
"یہ کہتے ہوئے تیرا دل نہیں کانپا وزیر احمد! میری معصوم کلو پہ یہ ظلم توڑنے کا منصوبہ بناتے ہوئے تمہیں ذرا خدا کا خوف نہیں آیا۔" حسب توقع ردِّعمل تھا۔ دونوں بہنیں بھڑک اٹھی تھیں۔ وڈی تو شاید وزیر احمد کا گریبان ہی پکڑ لیتی۔
"تیری کلو کے جو معصوم کرتوت ہیں ناں ان پہ میرا مند بند ہی رہنے دے ورنہ منہ چھپاتی پھرے گی۔" وزیر احمد ہمیشہ دھیمی آواز میں بات کیا کرتا تھا لیکن آج اس کی آواز وڈی کی آواز سے بھی بلند تھی۔
"ماسی خیراں نے لگائی ہوگی یہ آگ۔" نکی نے بھی حصہ ڈالا۔
"چنگاری ہوتی ہے تو آگ بھڑکتی ہے اور صرف ماسی خیراں نہیں۔ سارا گاؤں باتیں کر رہا ہے۔ گھر والے ہی اندھے ہوتے ہیں۔ دنیا والوں کی چار چار آنکھیں ہوتی ہیں۔" سفیر احمد نے نکی کو ڈپٹتے ہوئے حقیقت بتائی تو دونوں کھسیانے لگیں۔
"ہاتھ ہولا رکھو سفیر احمد، ہمارے ہاں رشتے توڑنے پر خون خرابہ ہو جاتا ہے۔" وڈی تنک کر بولی۔
"اور طلاقیں دینے پر؟" اب کہ شیرو بھی بولا۔
"اچھا چھچھا! تو ساری تکلیف اس منحوس کی طلاق کی ہے جس کا بدلہ میری معصوم بہن سے لیا جا رہا ہے۔ وہ تو جیسے عطر معطر میں نہائی ہوئی ہے ناں۔" نکی نے شیرو کی بات پکڑلی۔
"اگر اتنی ہی پسند تھی تو اسی سے شادی کرتے میری بہن کی زندگی کیوں خراب کی اور اس منحوس نے میرے بھائی کی۔" وڈی نے بانو اور شیرو کو ایک ہی جملے میں نمٹایا اگر چاہتا تو شیرو یہاں بول سکتا تھا بانو کے راتوں رات رشتے کا پول کھول سکتا تھا لیکن اسے اپنے بھائیوں کا گھر عزیز تھا۔ وہ چپ رہا۔
"بکواس بند۔ کل بانو کا رشتہ لینے جانا ہے۔ تیار رہنا" وزیر احمد نے بہ آواز بلند فیصلہ سنایا۔
"میری لاش پہ سے گزر کر جانا۔" وڈی مقابلے میں آن کھڑی ہوئی۔
"تیری لاش پہ سے گزرنے کے لیے کل تک کا انتظار کیوں، ہنے مر میں تیری لاش سے گزر جاؤں اور ابھی لے آؤں رشتہ۔" وزیر احمد تقریباً حلق کے بل چیخ کر بولا۔
دونوں بہنیں ڈر گئیں۔ جتنی بھی اتھری ہوں، تھیں تو عورتیں اور سامنے تھا بپھرا ہوا مرد۔
"کل جمعے کی نماز پڑھ کر ان کے گھر جانا ہے۔ جس نے نہیں جانا۔ کل میں گھر آؤں تو اس کی بو تھی مجھے نظر نہ آئے۔" غصے میں حکم دیتا تن فن کرتا گھر سے

نکل گیا۔
شیرو نے بے چینی سے پہلو بدلا' سفیر احمد نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی دونوں بہنیں "صم بکم" زمین میں نظریں گاڑے بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

بانو نے اپنے مردہ دل کو ٹٹولا۔ وہاں کچھ باقی نہ تھا۔ محبت نام کا کوئی جذبہ نہیں۔ شیرو کی نہ خود کی۔ شیرو جھوٹ بولتا تھا کہ وہ وہی پرانا شیرو ہے۔ اس میں تو کچھ بھی پرانا نہیں تھا۔ وہ کسی کو اپنی ڈگری نہ بھی دکھائے تو بھی اس کی شخصیت میں آنے والا نکھار اس کی افسری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اور بانو' شیرو کے مقابلے میں خود کو پاتال میں محسوس کر رہی تھی۔ شیرو بلندیوں سے جھک کر اسے پاتال سے کھینچنے کی کوشش میں تھا اور بانو کو خدشہ تھا کہ کہیں اسے کھینچتا کھینچتا خود بھی نہ گر جائے۔ لیکن بانو کے سارے خدشات بے معنی تھے۔ اس کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس بار بھی اس کے انکار کی کوئی اہمیت نہ دی گئی۔

پہلے اسے اماں کی عزت کے لیے خاموش ہونا پڑا اور اب ابا کی عزت آڑے آگئی ابا وزیر احمد کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹی کی مرضی پر ہمسائیگی کی محبت حاوی ہو گئی اور وہ دوسری بار بھی نہ چاہتے ہوئے دلہن بنی بیٹھی تھی۔

"مجھے معاف کر دینا بانو۔ تو شیرو کا ہی مقدر تھی۔ میں سمجھ ہی نہ پائی۔" شرمندہ سی اماں' دلہن بنی بانو کا سر اپنے سینے سے لگائے دکھ سے بولیں۔

"نہیں اماں! مجھے گنہگار نہ کر۔ میں شیرو کا ہی مقدر تھی' لیکن میری تقدیر میں شیرو سے پہلے امتیاز لکھا تھا۔ کسی کی کیا خطا؟ میرا نصیب۔"

آنکھوں کا کاجل پھیلنے لگا۔ ماں بیٹی کے الوداعی ملن کا منظر آنسوؤں سے بھیگ کر دو دلوں کا میل ہونے کو تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سنگی بینچ پر بیٹھی دلچسپی سے اردگرد کھیلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی' جن کی مائیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد انہیں ڈانٹ رہی تھیں۔ کئی لوگ آسمانی جھولے کے پاس لائن لگائے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور کئی لوگ چکر کھاتے سروں کو تھامتے جھولوں سے اتر رہے تھے۔

بانو کے لیے یہ منظر بالکل نیا تھا اس نے بچوں کو جھولے لیتے دیکھا تھا لیکن عورتوں اور مردوں کو پہلی بار جھولوں میں بیٹھے دیکھا۔ شیرو اس کو کئی دنوں سے شہر ہی گھما رہا تھا۔ اب بھی اسے یہاں بٹھا کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ شیرو نے اپنی محبت سے اس کے دل میں بھی محبت کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ اسے پاتال سے کھینچنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسے دور سے شیرو آتا دکھائی دیا۔ وہ مسکرا اٹھی۔

"چلو اٹھو۔" قریب آتے ہی وہ بولا۔

"کہاں؟" وہ اپنا جھلمل کرتا دوپٹا سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹکٹ لایا ہوں۔ مینار پاکستان پر چڑھنا ہے۔"

ایک میٹھی سی یاد نے انگڑائی لی۔

"نہ شیرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ بدکی۔

شیرو نے اپنے مضبوط ہاتھ میں محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا اب بھی؟" لونگ سے پھوٹتی کرنیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ شیرو نے اس کے سارے ڈر ختم کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ انگریزی کا ڈر بھی (ویمن کالج کا فارم اس کے اسٹڈی ٹیبل پر پڑا بانو کے دستخط کا منتظر تھا) وہ اس کا ہاتھ تھام کر چل رہا تھا۔

محبت کے جگنو ان کے اردگرد ناچ رہے تھے۔ انہوں نے پورے چاند کو اتنا آسودہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

عائشہ رباب

ادھوری زندگی

دن روشن تھا۔ سڑک کے کنارے بنے اس چھوٹے سے ڈھابے میں بیٹھے کچھ مزدور اسی ویگن کا انتظار کر رہے تھے جس کا وہ انتظار کر رہی تھی۔ اس نے احمد کو دائیں کندھے سے بائیں کندھے میں منتقل کیا اس کا کندھا اور ہاتھ بری طرح دکھنے لگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس ڈیڑھ سال کے بچے کو کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔ جس کے پیر ابھی ٹھیک سے جمے بھی نہیں تھے کہ بیماری نے اسے اور بھی اَدھ موا کر دیا تھا۔

کچھ دن پہلے تک اس کی قلقاریاں پورے گھر میں گونجتی تھیں۔ دو دن سے جیسے وہ ہنسا ہی نہیں تھا۔ اچانک شروع ہونے والی اس کی الٹیوں نے پورے گھر کو ہلا ڈالا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ اکبر فوراً ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ دادی کی تو جان ہی پوتے میں تھی۔ دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھیں۔ کل بھی طبیعت نہ سنبھلی تو اکبر نے کہا۔

"کل اسے شہر کے اسپتال میں دکھا آؤ۔ کہیں طبیعت زیادہ ہی نہ خراب ہو جائے۔"

اسپتال جانے کے لیے وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔ ناشتا بنا کر وہ لمحے بھر کو بھی نہیں بیٹھی، جلدی جلدی کام نبٹانے لگی۔ سارے گھر کی صفائی، ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر سارے کپڑے دھوئے، آنگن لیپا، دوپہر کا کھانا بنا کر فارغ ہوتے ہوتے اسے نو بج گئے۔ ساس کا سایہ سر پر تھا۔ وہ احمد کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ ان سے کام کرنا تو محال تھا۔ انہوں نے ہی احمد کو تیار کر دیا۔

وہ پانچ منٹ میں نہا کر احمد کو لیے ہائی وے پر پہنچی تو امیدوں کے برعکس نو بجے والی بس نکل چکی تھی۔ اب انتظار کرتے کرتے اس کے پیر دکھ گئے تھے۔ اس کی

نظر ڈھابے کی دیوار گیر گھڑی پر پڑی تو ساڑھے نو ہونے کو آئے تھے اور ویگن کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سورج کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس روشن گولے کی تاب کہاں لا سکتی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ جانے آج اس کی حدت کچھ زیادہ ہی تھی یا صرف اسے ہی محسوس ہو رہی تھی۔
اللہ اللہ کر کے ٹھیک ساڑھے نو بجے ویگن آ گئی۔

بیٹھنے کو جگہ مل گئی تو اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ویگن کے چلتے ہی جیسے خوشگوار ہوا کے جھونکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی احمد اونگھنے لگا۔ ویگن کے چلتے ہی نجانے کہاں سے ڈھیر ساری نیند اس کی آنکھوں میں آ بستی اور وہ کچھ ہی دیر میں سو جاتا۔

یہ بات اسے رحمت لگتی۔ پورے راستے احمد سوتا رہتا اور سفر آرام سے کٹ جاتا۔ لیکن بس سے اترتے ہوئے جب اس کی کچی نیند سے آنکھ کھلتی تو غضب ہو جاتا۔ پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ جھومتے جھومتے اب وہ سو چکا تھا۔ اترنے کے بعد جس مشکل کا سامنا اسے کرنا تھا وہ اسے ابھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

ہر جانب اداسی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں زندگی میں "احمد کی بیماری' امی کے گھٹنوں کا درد' اکبر کی پریشانیاں۔ کھیتوں میں فصل اچھی نہیں ہو رہی تھی "کسانوں کو حقوق نہیں مل رہے تھے۔ اور بھی نجانے کون کون سی پریشانیاں۔
وہ اپنے لب کاٹنے لگی۔

ویگن سیدھی' سیاہ تارکول کی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ دائیں' بائیں بنجر زمین۔ حد نگاہ تک نہ کوئی آدم نہ کوئی آدم زاد' کبھی کسی ہوا میں تیرتے ہوئے پرندے کی آواز سنائی دیتی تو وہ اسے آسمان پر تلاشنے کے لیے نظر دوڑاتی لیکن کوئی پرندہ نظر نہ آتا۔ بس ویگن کے انجن کا شور "لوگوں کی بھنبھناہٹ "بچوں کا رونا' یہ بھی کیا زندگی ہے۔

ویگن اب شہر کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس کی رفتار کو زنگ لگنے لگا۔ ارد گرد ایک سا منظر تھا۔

دکانوں کا سامان باہر تک ابلا ہوا تھا۔ خوانچہ فروشوں اور ٹھیلے والوں نے آدھی سے زیادہ سڑکوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس پر سڑکوں میں خریداری کرتے لوگوں کا رش ٹریفک کی روانی پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔
وہ لوگوں کو دیکھنے لگی۔

ویگن میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اس رش سے الجھن ہونے لگی۔ اسے لگا اس کا دم گھٹ جائے گا۔ جبکہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر کی اداسی اور گھبراہٹ اسے سانس نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس کا اترنے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ یہاں کیسے اتر سکتی تھی۔ اس کی منزل تو بہت دور تھی۔

ویگن میں بیٹھے رہنا اس کی مجبوری تھی۔ اسے اپنی زندگی بالکل اس ویگن کی طرح لگی۔ جس سے وہ اترنا چاہتی تھی لیکن کیسے اتر سکتی تھی۔ اسے ہر حال میں منزل پر پہنچنے تک اس میں وقت گزارنا ہی تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی سوچ ایسی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین سال پہلے وہ بیاہ کر ایک اچھے گھرانے میں ایسی خوش نصیب بہو بن کر آئی تھی جس کے پاس کوئی جھنجھٹ ہی نہیں تھا۔ پیار کرنے والا شوہر "شفیق سی ساس "اور جب احمد ہوا تو ان کی فیملی بھی مکمل ہو گئی۔ لیکن جب جب احمد بیمار پڑتا وہ اسی طرح سوچنے لگتی اور اس کی حالت ایسی ہی ہو جاتی۔ وہ اس کے لیے حد سے زیادہ حساس تھی "اسے اس کا احساس بھی تھا لیکن وہ اس پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔

اس کی سوچوں کا تسلسل برابر میں بیٹھی آنٹی نے توڑا۔ وہ لڑکھڑا کر نیند میں اس پر آ گری تھیں۔ وہ اسے بالکل احمد کی طرح لگیں۔ جس کی آنکھوں میں ویگن کا انجن اسٹارٹ ہوتے ہی نیند ہلکورے لینے لگتی ہے۔

اس نے ٹائم دیکھنے کے لیے کلائی پر نظر ڈالی تو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ اپنی گھڑی بھول آئی اسے افسوس ہوا۔
"پتا نہیں کیا وقت ہو رہا ہے۔" اس نے نظر اٹھا کر

آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے وقت کا اندازہ لگانا چاہا لیکن وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔

"پتا نہیں اماں اس وقت کیا کر رہی ہوں گی؟"

یہ خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ باورچی خانے کی بالٹی تو بھرنا ہی بھول گئی۔ اب اماں اور اکبر کو کھانا کھاتے ہوئے پانی نہیں ملے گا تو وہ کتنا غصہ کریں گے۔ اسے اپنی غلطی پر افسوس ہونے لگا۔ لیکن اب وہ اپنی غلطی درست نہیں کر سکتی تھی۔ بس چلتی ہی جا رہی تھی اور منزل ابھی بھی بہت دور تھی۔

ایک وقت تھا جب وہ کالج آتی تھی۔ ویگن میں گاؤں سے شہر تک کا سفر ایک اذیت ناک سفر نہیں لگتا تھا۔ لیکن آج یہ راستہ بہت طویل لگ رہا تھا۔ اور ویگن جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے لگتا تھا کہ راستے میں آنے والے ہر سائن بورڈ کو یاد کروا کر ہی آگے بڑھے گی اور اس نے بات مان لی اور سائن بورڈ پڑھنے لگی۔ ایسی جانفشانی سے کہ یاد کر کے ہی دم لے گی۔ اس کی نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی۔ "احمد اینڈ سنز" بڑے بڑے اور واضح لفظوں میں لکھا چمک رہا تھا۔

"ایک دن میرے بیٹے کا نام بھی یوں ہی شہرت یافتہ لوگوں میں ہو گا۔" اس نے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھا اور مسکرائی۔ یہ خواب بھی اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اداس لبوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس کی منزل آ گئی۔ پہلے اس نے آنٹی کو ہوش دلایا پھر بڑی احتیاط سے احمد کو اٹھا کر اتر آئی۔ لیکن حسبِ توقع، حسبِ معمول تمام تر احتیاط کے باوجود احمد کی آنکھ کھل گئی۔ دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد بھی اب اسے رونا تھا۔ جیسے کسی نے آنکھ لگتے ہی جگا دیا ہو۔ احمد رونا چاہتا تھا جبکہ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد پرچی بنوا لے لیکن احمد جیت گیا اور وہ اسے بہلانے لگی۔

اپنے پیچھے شور سن کر وہ اس جانب متوجہ ہو گئی۔ دو بندے آپس میں لڑ رہے تھے کسی بات پر۔ زور زور سے چلاتے تماشا بنا رہے تھے اور تماشا بین کھڑے دلچسپی سے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجمع میں کھڑے کتنے ہی لوگ اس جھگڑے کی وجہ سے انجان تھے لیکن اس مفت کے میلے سے لوٹنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی بھی ان کی صلح نہیں کروا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کو بہلاتے ہوئے تاسف سے سوچنے لگی۔ "وہ بھی یقیناً" پریشان ہوں گے' پریشانیوں نے لوگوں کو چڑچڑا کر دیا ہے۔"

اور وہ اپنے روتے بچے سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ اسے بہلانے کا سامان کرنے لگی۔ آخر تھوڑا سا انار کا جوس جو وہ ساتھ لائی تھی پی کر بہل گیا۔ اسے اب ڈر تھا کہیں وہ الٹی نہ کر دے۔ آرام سے پرچی بن گئی اور وہ اپنی باری کے انتظار میں بینچ پر آ بیٹھی۔ اس کے بالکل سامنے اتنے بڑے سائز کا ایل سی ڈی ٹنگا تھا۔ اس نے اتنے اتنے بڑے ٹی وی ہمیشہ ایسے ہی اداروں میں دیکھے تھے۔ وہ سوچنے لگی جب چھوٹے ٹی وی میں بھی فلمیں خبریں دیکھی جا سکتی ہیں تو اتنے بڑے ٹی وی کی کیا ضرورت ہے۔

وہ اس کے حدود اربعہ کا جائزہ لے رہی تھی کہ خبروں کا ٹائم ہو گیا۔ اور ٹی وی سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز برآمد ہوئی "بریکنگ نیوز" اس کے بعد اس نے ہر وہ خبر سنائی جس سے ٹینشن اور بڑھ جائے۔ سڑک پر ہونے والی وارداتوں سے لے کر' ایوانوں میں ایک دوسرے کا گریبان پکڑتے' گالیاں دیتے' ایک دوسرے سے بڑھ کر جاہل ہونے کا ثبوت دیتے سیاست دانوں تک' تمام خبروں میں ایک بھی بات خوش آئند نہیں تھی۔ اس کے گھر میں سرے سے ٹی وی موجود ہی نہیں تھا۔ اس کی لاکھ افادیت سہی لیکن امی اس خرافات کے سخت خلاف تھیں۔ لٰہذا وہ تمام دن بری بری خبریں سننے سے محفوظ رہتی تھی۔ ساری دنیا میں کیا کیا برا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔

بس اکبرو ہی خبریں سناتے جو خوش آئند ہوتیں۔
وہ خالی خالی نظروں سے ٹی وی کو تکتی رہی۔ نیوز کے ختم ہوتے ہی "بانکے میاں کی قوالی ہے سب سے نرالی" شروع ہوئی۔ یہ مزاحیہ سا پروگرام دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بچے تو بچے، بڑے بھی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔
احمد کے متوجہ کرانے وہ میں اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہ کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے لگی۔ وقفے وقفے سے اسے جوس پلا دیتی لیکن کچھ کھلانے میں متامل تھی۔ کچھ بھی کھانے پر وہ فوراً الٹی کر دیتا تھا۔ وقت گزرتا گیا، رش کم ہوتا گیا، لوگ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ وہ سرے پر پہنچ گئی۔
اب اس کی باری تھی۔ وہ تمام باتیں یاد کرنے لگی جو ڈاکٹر کو اسے بتانی تھی۔ اس کا نمبر آگیا۔ وہ جاتے ہی نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر بنا تاثر کے اس کی طرف دیکھے بغیر احمد کا معائنہ کرتا رہا۔ آنکھیں دیکھیں، زبان، ناک اوپر کی، کلائی پکڑی، سینے پر آلہ رکھا اور اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی نامعلوم زبان میں کچھ لکھ کر اسے پکڑایا اور باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اسے ڈاکٹر دستیاب ہوا تھا اور اسے لگا سب سے زیادہ جلدی ڈاکٹر نے اس کے بارے میں دکھائی۔ وہ پرچی لے کر باہر آگئی۔
اسٹور سے دوا خرید کر اس نے اسے وہیں پلا دی۔
سورج آسمان پر تھا اور سارا غصہ زمین والوں پر نکال رہا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی بس اسٹاپ کی جانب چل پڑی۔ تھکن سے اس کی کمر دہری ہو رہی تھی لیکن دوا پی کر احمد کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ احمد کو مسکراتا دیکھ کر اس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی۔ ویگن آگئی۔ وہ ایک نظر اسپتال کی خستہ عمارت پر نظر ڈال کر ویگن میں سوار ہو گئی۔ مسافر آتے گئے۔ ویگن بھرتی گئی اور چل پڑی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ احمد اونگھنے لگا اور جلد ہی سو گیا۔ بس میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ گھٹن بڑھ رہی تھی۔ لیکن اسے الجھن نہیں ہو رہی تھی۔
وہ احمد کے سنہرے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ وہ نیند میں بار بار مسکرا رہا تھا۔ نجانے نیند میں کون سا جہاں آباد کیے بیٹھا تھا۔ احمد کی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو مسکرانے کی دعوت دی اور اس نے قبول کرلی۔
اس کی سوچ پرواز کرنے لگی۔ اکبر کھیتوں میں ہوں گے۔ کچھ ہی دیر میں کھانا کھانے آجائیں گے۔ اماں اپنے پیارے پوتے کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ان کی تو جان ہے پوتے میں۔ اس کی بہتر طبیعت دیکھ کر فوراً ہی شیرینی منگوا کر محلے میں بٹوائیں گی۔ ہر سوچ اس کی مسکراہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ سفر کٹ گیا۔ بس کی رینگتی ہوئی رفتار بھی اسے بری نہیں لگی نہ ہی رش نے گھٹن پیدا کی۔ بس سے اتر کر اس نے ایک نظر سورج کو دیکھا۔ اب اسے اس کی حدت بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔
اس کی نظر ڈھابے سے نکلتے اکبر پر پڑی۔ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کس قدر دل نشین تھا یہ احساس۔ اکبر نے اس کے ہاتھ میں پکڑی تھیلی لے لی اور اپنے مٹی مٹی ہوتے صافہ سے اس کا پسینہ صاف کیا۔
"بھئی جلدی جلدی گھر چلو۔ اماں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ وہ اپنی بہو کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گی۔"
اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کتنا خیال تھا اماں کو اس کا بلمجد جاگ گیا۔ اس کا رونے کا پروگرام تھا۔ لیکن باپ پر نظر پڑتے ہی ارادہ بدل دیا۔ وہ اکبر کی ہم قدم ہو کر کچے راستے پر اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئی۔ اردگرد پھیلے لہلہاتے کھیت، آسمان پر تیرتے طیور، چمکتے سورج کا سنہرا پن، اسے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ کتنا حسین منظر تھا۔ کتنی حسین زندگی ہے۔
افسانہ زندگی۔

ناولٹ

کچن کی کھڑکی سے گردن نکال کر صحن میں بیٹھے اعزاز احمد کو دیکھ کر اس نے مسکراتے لبوں پر انگلی رکھ کر خود کو ہی خاموشی سے کام کرنے کی تاکید کی تھی' کھڑکی کے باہر لٹکتی بوگن ویلیا کے پھول ہوا کے دوش سے اندر کچن کی سلیب پر بکھر گئے۔ ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کھولتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے اس نے پلیٹ میں صبح کے بیک کیے کیک کے ٹکڑے رکھے اور گنگنانے لگی یوں ہی خوامخواہ۔

نکاح کے دو بول کسی کو دل کے اتنا قریب کر دیتے ہیں۔ اس کا خوب احساس ہو رہا تھا' وہی اعزاز احمد جو اسے خشک مزاج' اکھڑ اور غصے والا لگتا تھا۔ اب دنیا کا سب سے اہم اور پیارا شخص لگ رہا تھا۔ چائے کی ٹرے سجا کر وہ دوپٹہ درست کرتی جب باہر آئی تو اعزاز

کے ساتھ تائی امی بھی موجود تھیں۔

"السلام علیکم! تائی امی۔"

"وعلیکم السلام! چائے لائی ہو؟" انہوں نے ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ دوپٹہ قرینے سے سر پر جما تھا۔

"جی، صبح کیک بیک کیا تھا۔ دیکھیں کیسا بنا؟" اس نے ڈبل چاکلیٹ کیک ان کی طرف بڑھایا۔ جسے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے واپس رکھ دیا۔

"بھئی یہ کالی کلوٹی چاکلیٹ، مجھے تو ذرا اچھی نہیں لگتی۔ تم ہی کھاؤ، مجھے تو بس چائے دے دو۔" ان کا لہجہ اور انداز دل دکھانے کے لیے کافی تھا۔ پھر بھی ایک امید کے ساتھ اس نے اعزاز کی سمت دیکھا، وہ بھی کیک کو یکسر نظرانداز کیے اپنا کپ اٹھا چکے تھے۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ صبح کی ٹرین سے فرحانہ آرہی ہے۔ ماشاء اللہ سے گود میں بچی لے کر آرہی ہے۔ کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ تم دیکھ لو.... پھر کل شام میں بازار جاکر فرحانہ، اس کے شوہر اور بچی کے لیے کپڑے وغیرہ لے آؤں گی۔"

تائی امی نے اس کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے اعزاز کو مخاطب کیا۔ وہ اس کے آنے سے پہلے شاید اسی موضوع پر بات کررہے تھے۔ اعزاز نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں امی! میں شام کو ہی آپ کو پیسے دے دوں گا۔ آپ کو جو چاہیے جاکر لے آیئے گا۔"

اعزاز نے فرماں برداری سے کہا۔ ایک انجانی سی خوشی حیا کے دل میں ابھری۔ اس کا اعزاز، اس کا جیون ساتھی، سب کی خوشیوں کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ وہ تو اس کی بیوی بن کر آئی تھی۔ اس کی زندگی میں تو وہ خوشیوں کے ڈھیر لگا دے گا۔ وہ کچھ دیر پہلے کی تلخی بھول کر ان سب کے ساتھ چائے پینے لگی۔

"فرحانہ تو ہماری شادی پر بھی نہیں آئی تھی۔" اس نے گفتگو میں حصہ لینا چاہا۔ جواباً تائی امی اپنا موبائل کان سے لگائے ہیلو ہیلو کرتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اب وہ اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔

"چائے کیسی بنی؟"

"بہت زیادہ اسٹرونگ ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ اپنی طرح کی چائے بنانا۔ تھوڑی سی گوری۔" وہ بات کے آخر میں مسکرایا تھا۔

"میں گوری کب ہوں.... شادی والے دن سب عورتیں یہی تو کہہ رہی تھیں۔ اچھی خاصی سانولی ہے۔ پاؤں دیکھو پاؤں...." وہ بات کرتے کرتے خود ہی

ہنس دی۔

"اچھا! میں نے تو پاؤں پر غور ہی نہیں کیا۔"

وہ ہنستا چلا گیا۔ اس لمحے حیا اعزاز کو زندگی بے حد حسین لگی۔ اعزاز احمد ہنسنا بھی جانتا تھا۔ ابھی ایک ماہ پہلے وہ اس کا کزن تھا۔ ایک ہی گھر کے دو الگ الگ پورشن میں رہتے ہوئے وہ بہت کم ایک دوسرے کے روبرو ہوتے تھے۔ حیا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اپنے ننھیال میں گزرا تھا۔ بابا کی وفات کے بعد ماما نے سسرال والوں سے رشتہ ختم نہیں کیا تھا نہ دوسری شادی کی اور نہ مستقل میکے میں آباد ہوئیں۔ بلکہ وہ بچوں کے ساتھ وہ زندگی سسرال اور میکے دونوں گھروں کے ساتھ گزارنے لگیں۔ شفا نے تو وہیں ننھیال میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی مگر حیا کا دل ددھیال میں ہی اٹک گیا۔ ماما کی وفات پر ہی تائی نے اسے اعزاز کے ساتھ منسوب کردیا۔ یوں وہ سادگی سے نکاح کے بعد مستقل یہیں رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

حسب معمول وہ کچن میں تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے دن تھے' کبھی تو فضا میں خنکی اتنی بڑھ جاتی کہ وہ کمرے سے گرم شال اٹھا لاتی اور کبھی چولہے کی گرمی سے پسینے چھوٹنے لگتے۔ فرحانہ کی آمد تو صبح ہی ہوگئی تھی۔ ناشتا تو بازار سے آگیا تھا۔ دن کے کھانے میں بریانی اور قورمہ بنا تھا۔ فرحانہ میٹھے کی اتنی شوقین نہیں تھی۔ ہاں پھل فروٹ کے ساتھ خوب انصاف کرتی اور ایسے میں اعزاز نے گھر میں پہلے ہی فروٹ کے ڈھیر لگادیے۔

اعزاز کے بڑے بھائی شہزاد کی بیوی تائی امی کی بھانجی تھیں۔ شہزاد بھائی کا چھوٹا سا بزنس تھا۔ جس میں ان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ صائمہ بھابھی اوپر کے پورشن میں جو کبھی حیا کی ماما کا ہوتا تھا اس میں الگ ہوچکی تھیں۔ سو نیچے کی ساری ذمہ داری حیا پر تھی۔ شام کی چائے کے لیے سب صحن میں بیٹھے تھے' خوب صورت پیڑ پودوں سے سجا یہ صحن بچپن سے ہی حیا کو بہت پسند تھا' چائے کے ساتھ اس نے فرحانہ کی پسند کے کباب اور فروٹ چاٹ بنالی۔ اعزاز بھی آفس سے آگیا۔ اس نے کار پورچ سے گزرتے ہوئے ایک نظر کچن میں کھڑی حیا کی سمت دیکھا۔ جس کے چہرے پر اعزاز کی آمد کے ساتھ ہی دنیا جہاں کی خوشی چھلکنے لگتی تھی۔

"آگئے بھائی۔" فرحانہ نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ وہ حیا کو دیکھ کر آنکھ دباتا آگے بڑھ گیا۔ حیا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ چائے لیے وہ باہر آئی تو اعزاز فریش ہوکر ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس بیٹھا فرحانہ اور امی سے محو گفتگو تھا' پھر بات کے دوران اس نے جیب سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ امی اور پھر فرحانہ کی طرف بڑھائے۔

"آج تو میں بھی شاپنگ کے لیے لوں گی ان سے پیسے۔ لگتا ہے سیلری مل گئی ہے۔" اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے دل کو سنبھالا اور سب کے درمیان آبیٹھی۔

"ابھی میرا ادھار ہے آپ کی طرف۔ شادی کے جوڑے کی کمی پوری کرنی ہے آپ نے۔ شادی پر تو میں آنہیں سکی۔ کم از کم سات آٹھ ہزار اور تیار رکھیں۔ رعایت دے رہی ہوں۔" فرحانہ نے کباب پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اعزاز کو خبردار کیا جواباً" وہ مسکرانے لگا۔

"کیوں نہیں' بہنوں کا حق ہوتا ہے۔ بہن کی خوشی کا خیال کرے گا تو دعائیں بھی لے گا۔" تائی امی نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"چائے۔" چوڑیوں کی چھنک نے اعزاز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چائے تھامتے ہوئے اس نے اس کی چوڑیوں کو دھیرے سے چھیڑا تھا۔ ایک شرگیں مسکراہٹ حیا کے چہرے پر آٹھہری۔ تائی امی نے اس منظر کو تنقیدی نظروں سے دیکھا تھا۔ اعزاز کی پوری توجہ اب چائے کی طرف تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کچن سے فارغ ہوکر وہ کمرے میں آئی تو اعزاز

لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔

"اعزاز۔۔۔ آپ کام کر رہے ہیں۔" وہ سامنے آبیٹھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ "نہیں کچھ خاص کام نہیں تھا۔ کیا بات ہے۔" اس نے تکیے سے سر لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے حیا کی سمت دیکھا۔

"اعزاز! مجھے بھی شاپنگ کرنی ہے' آپ مجھے بھی کچھ پیسے دے دیں ناں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ اعزاز نے مسکراہٹ کو بمشکل روکا تھا۔

"تمہیں شاپنگ کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے اعزاز کی سمت دیکھا۔ وہ اب مکمل طور پر سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"مطلب یہ کہ ابھی ہماری شادی کو ایک ماہ اور چند دن ہی ہوئے ہیں اور وارڈروب رنگ رنگ کے کپڑوں سے بھری پڑی ہے۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔

"وہ سب میری پسند کے تو نہیں تھے ناں اعزاز۔ سب یہاں سے تائی امی نے اور وہاں سے ممانی نے بنائے تھے۔ میری مرضی کا تو ایک بھی جوڑا نہیں۔ آپ سب کو شاپنگ کے لیے پیسے دیتے ہیں' میں تو آپ کی بیوی ہوں۔" بڑے مان سے اس نے اعزاز کے شانے پر سر ٹکا دیا۔

"دیکھو حیا! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں' ان دنوں خرچ کچھ زیادہ ہو رہا ہے پھر فرحانہ بھی آئی ہے۔ بس ان دونوں کی فرمائشیں پوری ہو جائیں۔" وہ دائیں ہاتھ سے سر دبانے لگا۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ کیا تھا جو وہ اس کا دل رکھنے کے لیے ہی ہاں کہہ دیتا۔

"میں سر دبا دوں۔" وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔ ہاتھوں کی چوڑیاں مدھر دھن سنانے لگیں' وہ نیند میں کھونے لگا۔ کچھ دیر پہلے کی خواہش مرنے پر آنکھوں کے گوشوں سے آنسو چہرے پر لڑھکنے لگے' صد شکر کہ آنسو دینے والا سو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح فرحانہ اور تائی بہت پرجوش تھیں۔ سارا دن شاپنگ کی لسٹ بنتی رہی۔ پانچ بجے اعزاز کی واپسی ہوئی' حسب معمول چائے پی گئی پھر وہ فرحانہ اور ماں کو لے کر شاپنگ کے لیے نکل گیا۔

"شاید خود ہی خیال آجائے' میرے لیے کچھ لے آئیں۔" ایک خوش فہمی نے سر ابھارا۔ رات کے کھانے کی تیاری میں اس کے ہاتھ ایک نئے جوش سے چلنے لگے۔ ان سب کی واپسی تقریباً" نو بجے کے قریب ہوئی۔ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اعزاز ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔

"آگئیں۔۔۔ آج بڑی خوش لگ رہی ہو' حالانکہ میرے حساب سے تو تمہیں ناراض ہونا چاہیے تھا۔" وہ چینل بدلتے ہوئے بولا۔

"ناراض' مگر کیوں؟"

"میں نے تمہیں شاپنگ سے منع کر دیا۔ اس لیے۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ جسے وہ سمجھ نہ سکا۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" وہ بستر کی چادر سیدھی کرنے لگی' ایک انتظار سا تھا کہ ابھی اعزاز کوئی سرپرائز گفٹ اس کی نظروں کے سامنے لا رکھے گا۔

"آج بہت خرچا ہو گیا۔ جیب میں آخری دو ہزار بچے تھے وہ بھی فرحانہ نے چاٹ' آئس کریم کے نام پر نکلوا لیے۔ گاڑی میں پیٹرول ڈلوایا اور جیب خالی۔" وہ اسے تکیے سے پشت ٹکا کر بیٹھنے کا اشارہ کرتا خود بھی سیدھا ہو بیٹھا۔ حیا کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ کسی امید نے دم توڑا۔

"اسی فکر سے بچنے کے لیے میں نے کچھ ماہوار رقم بچت کر رکھی تھی' سوچ رہا ہوں صبح بینک جا کر نکلوا لوں' کم از کم گھر میں کسی کو شک نہ ہو کہ کوئی مسئلہ ہے اور پھر وہ گھر میں مہمان بن کر آئی ہے' چھوٹی ہے' لاڈلی ہے۔ اس کا حق ہے۔ میرے فکر مند ہونے یا کسی فرمائش پر انکار کرنے سے کہیں وہ دکھی نہ ہو جائے۔ کم از کم بھی چالیس پچاس ہزار تو ہوں گے ہی' میں صبح بینک جاؤں گا۔" وہ ساری بات تفصیل سے کرتا اس کے چہرے کے رنگوں سے قطعی ناواقف ایک بار پھر

وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہوں۔ حق ہے اس کا۔" وہ دھیرے سے کہتی آنکھیں موند گئی۔

☆ ☆ ☆

گاڑی کا ہارن سن کر وہ کھڑکی کی طرف آئی' پردہ ہٹا کر دیکھا' اعزاز وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا تھا۔ گاڑی کی ڈگی سے ڈھیروں ڈھیر سامان نکالا۔ گروسری' فروٹ' بیکری' فروزن فوڈ کے ڈبے۔ وہ کچن کی طرف بڑھتا اسے ہی آواز دے رہا تھا۔

"حیا۔ حیا۔" وہ اس کی آواز پر پاؤں میں چپل اڑستی کچن کی طرف آئی۔

"حیا' یہ میں سامان لے آیا ہوں' صبح امی بتا رہی تھیں کہ سامان ختم ہے۔ تم سب سمیٹ کر رات کے لیے کچھ اچھا سا بنا دینا اور ہاں سنو۔ ہم دونوں رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔ بہت دن ہو گئے میں تمہیں کہیں نہیں لے کر گیا۔ تم سب کا کھانا لگا کر تیار رہنا۔" وہ اسے تاکید کرتا سارے شاپر کھول کر بل سے ملانے لگا۔

"یہ کباب' نگٹس وغیرہ میں تمہاری سہولت کے لیے لے آیا ہوں۔ کہاں سارا دن کچن میں گھسی رہو گی۔" وہ اسے شانے سے تھام کر ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ اتنا خیال ہے میرا؟" زبان سے جو جملہ پھسلا اس میں کہیں کوئی شکوہ بھی نہاں تھا۔

"مجھے نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا پاگل لڑکی۔" اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کی سمت دیکھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے سامان سمیٹنے لگی۔ رات کے کھانے میں اس نے وائٹ قورمہ اور کباب بنا کر جب کھانا لگایا تو اعزاز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تیار ہونے کا اشارہ کیا۔

"ہم لوگ ذرا باہر جا رہے ہیں امی۔" وہ جارجٹ کے سرخ رنگ کے جوڑے میں ملبوس ہلکا ہلکا میک اپ کیے کمرے کے دروازے تک آگئی۔ خلاف توقع تائی امی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھابھی! ابھی تو ملا جلا موسم ہے۔ کوئی شیفون کا سوٹ نہیں ہے آپ کے پاس۔ میں نے تو کل بھائی سے کہہ کر شیفون کا ایمبرائیڈری والا سوٹ لیا ہے۔ بہت نفیس کام ہے۔ آپ بھی بالکل ویسا ہی لینا۔" فرحانہ کباب سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اعزاز کی سمت دیکھا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں اعزاز؟" اس کی ذرا سی تعریف پر وہ دل سے خوش ہو گئی تھی۔

"یوں ہی ڈرائیو پر اور واپسی پر کھانا بھی باہر ہی کھا لیں گے۔" اس کا موڈ بھی خوش گوار تھا۔ پھر جب لانگ ڈرائیو اور کھانے کے بعد وہ گھر واپس آئے تو کچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر اس کا منتظر تھا۔

"لو جی' خالی ہاتھ ہی آگئے' آئس کریم کے لیے میسیج کیا تھا میں نے۔" فرحانہ چھوٹتے ہی بولی' اس کی بات کے جواب میں اعزاز نے موبائل جیب سے نکال کر دیکھا اور پھر اسے ابھی آیا کہہ کر باہر نکل گیا۔ حیا سارا کچن سمیٹ کر کمرے میں آئی تو وہ دو آئس کریم کپ لے کر وہیں آگیا۔

"لو تمہاری فیورٹ چاکلیٹ آئس کریم۔" اس نے اس کے آگے کپ کیا۔ حیا نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بہت خیال رکھنے والا شوہر تھا' وہ یوں ہی اس سے بدگمان ہو رہی تھی۔ وہ تو شاید سب کا خیال رکھنا چاہتا تھا۔

"وہیں چلتے ہیں ناں سب کے ساتھ۔"

"نہیں۔۔۔ وہ لوگ اپنے اپنے بستر میں گھس کر ٹی وی آن کر چکے ہیں۔ ہم بھی کوئی مووی دیکھتے ہیں۔" اس نے ٹی وی آن کر کے اسے بازو سے پکڑ کر ساتھ بٹھا لیا۔ وہ دل سے ہر بات نکال کر اس کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

فرحانہ کے جانے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پھر وہ ایک دو روز کے لیے گئی اور تقریباً" آدھا سامان لے کر پھر آگئی۔

"مجھ سے نہیں ہوتی ان کی بیمار بیٹی کی خدمتیں' کوئی ملازمہ رکھ لیں گے۔۔۔ میں نے بھی کہہ دیا۔ خاندان میں ایک دو شادیاں آگئیں' ایک ہی بار بھگتا کر آؤں گی۔" پھر وہ دونوں ماں بیٹی کسی ٹاپک پر بات کرنے لگیں۔

وہ رات کے کھانے کی تیاری کررہی تھی جب شفا کا فون آگیا۔

"ایک بہت اچھے گھر سے رشتہ آیا تھا۔ لڑکا اچھا خاصا پڑھا لکھا' ویل سیٹلڈ تھا' مگر میں نے انکار کردیا۔" وہ بڑے آرام سے بتارہی تھی۔

"کیوں کیوں انکار کردیا؟" اسے شفا کی بے وقوفی پر حیرت ہوئی۔

"بہت دیکھے ہیں میں نے ایسے جو پہلے تو بہت دعوے کرتے ہیں۔ دنیا جہاں کی خوشیاں دینے کے۔ ہر فرمائش پوری کرنے کے' مگر جب بیوی اور ماں بہن کے درمیان کی بات آتی ہے اماں تو یہ فرمائشیں پوری کرنے اور دنیا جہاں کی خوشیاں دینے کے وعدے کہیں پیچھے ہی رہ جاتے ہیں۔ ماں کو یہ کہہ کر پیسے دیے جاتے ہیں کہ ماں نے تو سارے گھر کا نظام چلانا ہے۔ بہن کو یہ کہہ کر کہ یہ تو مہمان ہے۔ لاڈلی ہے اور بیوی کو یوں ٹال دیا جاتا ہے' تمہیں پیسے کی کیا ضرورت ہے۔ شاپنگ کرنی ہے تو میں کروادوں گا۔"

وہ بول رہی تھی اور حیا کو لگا شفا نے اس کے گھر کے اندر جھانک لیا۔

"قسم لے لو حیا' زہر لگتے ہیں مجھے ایسے مرد جو اپنی بیوی پر اتنا اعتماد' اتنا بھروسا نہیں کرتے کہ جیب خرچ کے نام پر اسے پانچ' چھ ہزار دے دیں۔ کہاں لے جائے گی وہ بے چاری' مگر نہیں۔۔۔ تمہیں پتا ہے وہ ہماری فرینڈ زوہا کا میاں۔ زوہا کے جیب خرچ مانگنے پر کہتا ہے "تم نے کون سا جوا کھیلنا ہے؟" اوہ اللہ۔۔۔ میرا تو سر چکرا کر رہ گیا۔ اپنی بیوی کو اتنی غلط اور گری ہوئی بات' زوہا تو طلاق لے رہی ہے۔ بھئی صحیح ہے' جو شخص اپنی بیوی کو اس قابل نہیں سمجھتا اس کے ساتھ رہنے کا فائدہ۔" وہ بولتی جارہی تھی اور حیا کو لگا یہ ہی سب تو اس کے گھر میں بھی ہو رہا ہے۔

"اگر شادی کے بعد بھی اپنا خرچ خود اٹھانا ہے' کپڑے جوتے کی فکر خود کرنی ہے۔ رشتے داروں' عزیزوں میں خرچ کرنے کے لیے کمانے کی فکر کرنی ہے تو پھر کیا فائدہ شادی کرکے نام نہاد رشتہ نبھانے کا۔۔۔"

"آج کل زمانہ بدل گیا ہے شفا۔۔۔ ہر دوسری عورت اپنا کما رہی ہے۔ مرد کے ساتھ مل کر معاشی ذمہ داری اٹھا رہی ہے۔" اس نے شفا کے ساتھ ساتھ خود

کو بھی سمجھانا چاہا۔

"میں مانتی ہوں، اسی لیے توفی الحال اس رشتے سے انکار کردیا۔ آگے ایڈمیشن لے لیا ہے۔ ایک دو شارٹ کورسز بھی کر رہی ہوں۔ کل کو اپنی خواہشوں اور ضروریات کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے مگر حیا ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔ کم از کم شادی کے ایک دو سال تو اس کا شوہر اس کے ناز نخرے اٹھائے۔ اس کا کفیل بنے اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھے۔ اس کے پرس کو بھی خالی نہ ہونے دے۔ یہ بھی تو محبت کی ایک شکل ہے ناں حیا اور کوئی بھی عوت اتنی بری تو نہیں ہوتی کہ بچوں کی ضروریات اور معاشی مشکلات کو دیکھ کر بھی شوہر کا ساتھ نہ دے۔ یہ جو بے چاری عورتیں لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچا کرتی ہیں۔ ان سے لے کر لیڈی ڈاکٹرز اور پروفیسرز تک سب اپنے گھر کی خوشحالی کے لیے ہی کام کرتی ہیں۔ بس چند سال۔ اب ایسا بھی نہ ہو کہ شادی کے ہفتہ بھر بعد ہی نئی نویلی دلہن غم روزگار کے سلسلے میں نوکری پر حاضر ہوجائے۔ لعنت ہے ایسے مرد پر۔ جو بیوی کو گھر بٹھا کر اس کی ضروریات کا خیال نہ کرسکے۔" شفا تو بھری بیٹھی تھی۔ اس کا دل پھر سے بوجھل ہونے لگا۔

"چلو بس کرو۔۔۔ میری ہنڈیا جل جائے گی۔" اس نے فون بند کردیا۔ یوں ہی کسی خیال کے تحت وہ چولہا بند کرکے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے پرس میں ایک سو دس روپے رکھے تھے اس نے جان بوجھ کر پرس ڈریسنگ ٹیبل پر کھلا چھوڑ دیا۔ دل کا بوجھل پن بڑھتا ہی چلا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ سب کے لیے قہوہ بنا رہی تھی جب بارش شروع ہوگئی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی۔

"یہ فرحانہ کا کیا مسئلہ ہے اعزاز۔" وہ کمبل کھول کر قہوے کا مگ ہاتھوں میں دبائے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے گہری سانس بھری۔

"بس یار، گھر کے کچھ مسائل ہیں۔ طارق بھائی کی جاب کچھ اتنی خاص نہیں ہے، اوپر سے ان کی ایک بہن کا گھر بن رہا ہے تو جب تک گھر مکمل نہیں ہوجاتا وہ یہیں ان کے ہاں رہ رہی ہے۔ ایسے میں فرحانہ کے لیے چھوٹی سی بچی کے ساتھ سارے گھر کے کام کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا، بقول اس کے اس کی ساس نے کام والی بھی فارغ کردی اور اس پر بڑا مسئلہ یہ کہ بچی کی پیدائش کے بعد طارق بھائی نے بھی خرچے زیادہ ہونے کا رونا رونا شروع کردیا۔ بس ایسے ہی مسائل ہیں جیسے ہر دوسرے گھر میں ہوتے ہیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنا پرس سامنے کھول رکھا ہے۔ بھئی اپنی چیزوں کی حفاظت کیا کرو۔ اوپر بھابھی کی کام والی بہانے بہانے سے نیچے کے چکر لگاتی ہے۔ خیال رکھا کرو۔" بات کرتے ہوئے اعزاز کی نظر اس کے کھلے پرس پر پڑی تھی۔

"تو اس میں کون سے ہزاروں ہیں، ایک سو دس روپے ہیں۔ نکالنے والے کا بھی کچھ نہیں بنے گا۔" وہ قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے، ویسے بھی تم نے کون سے بزنس میں شیئرز ڈالنے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور قہوہ پیتے ہوئے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ الفاظ تھوڑے شائستہ اور مہذب تھے۔ ورنہ اعزاز میں اور زوہا کے شوہر میں فرق ہی کیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نمکین پانی نکلا اور کمبل کی فر میں جذب ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

سردیوں کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی، تائی امی اور فرحانہ شاپنگ کے لیے گئی تھیں۔ وہ چائے کا کپ لے کر آسمان پر کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف تھی۔ جب صائمہ بھابھی آگئیں۔ ہاتھ میں رومال سے ڈھکی پلیٹ اٹھائے۔

"سردی کا موسم ہے، پکوڑے بنائے تھے۔ تمہیں اوپر سے اکیلا بیٹھے دیکھا تو لے آئی۔ کیسی ہو؟" وہ اس کے برابر ہی سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔

"جی ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ نیچے بہت کم آتی ہیں اور فرحانہ سے ملنے بھی بس تھوڑی دیر کے لیے آئی تھیں۔" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ میرون رنگ کے گرم سوٹ میں ملبوس' ہلکا پھلکا زیور پہنے' صحت مند جسامت کی مالک صائمہ بھابھی بہت مطمئن اور خوش لگ رہی تھیں۔

"ہوں' بس پھپھو سے تھوڑی ان بن ہے' وہ عجیب ذہنیت کی خاتون ہیں۔ جب تک ہم اکٹھے رہے۔ میں شہزاد کی خالی جیب ہی دیکھتی رہی۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ میں ناراض ہو کر چلی گئی۔ جب راضی کرنے کے لیے آئے تو مجھ سے ناراضی کی وجہ پوچھی۔ میں نے بھی سارے خاندان کے سامنے بتادیا کہ مجھے جیب خرچ نہیں ملتا۔ بس پھر وعدہ کیا' سو قسمیں کھائیں تب میں آئی واپس' وہ دن اور آج کا دن' شہزاد میرا جیب خرچ وقت پر دیتے ہیں۔ میں الگ بھی اسی لیے ہوگئی۔ بہت مسئلے تھے' کولہو کے بیل کی طرح لگے رہو۔ تنخواہ تو کام والی ماسی بھی وقت پر لیتی ہے' میں تو پھر گھر کی بڑی بہو تھی۔ جیسے ہی سنا کہ اعزاز کی بات پکی کردی' میں نے چولہا الگ کرلیا۔ بہت مزے میں ہوں اب میں۔۔۔" وہ اچھی خاصی خودپسند خاتون تھیں۔ حیا نے سر جھٹک دیا۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں اوپر ہی چائے پیوں گی' بچے ٹیوشن سے آنے والے ہیں۔" وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

"میں ایسی بھی تو نہیں ہوسکتی ناں اور اگر ہونا چاہوں تو کیا اعزاز' شہزاد بھائی کی طرح میرے مطالبات مانیں گے۔۔۔ بھابھی تو ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئیں۔ میرا تو کوئی میکہ ہی نہیں۔۔۔ وہاں سب شفا کو سنبھال لیں' مہربانی ہے ان کی۔" وہ نم ہوتی آنکھوں کو آنچل سے صاف کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم کوئی جاب کرلو حیا۔" اس نے دل کا حال اپنی سہیلی کرن سے کہہ ڈالا۔ اس نے دل سے مشورہ دیا۔

"یار ایک بہت مشہور اسکول میں ٹیچر کی آسامی خالی ہے' تمہاری تو کوالیفکیشن بھی ٹھیک ہے۔ تم اپلائی کردو۔ بلکہ کل صبح میں آؤں گی میں تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔" وہ خلوص سے کہہ رہی تھی۔ حیا کوئی فیصلہ کرنے سے ڈر رہی تھی۔

"اگر اعزاز برا مان گئے تو۔"

"تم کھل کر بات کرو۔"

"فی الحال مجھے پیسوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی مگر اچانک ضرورت کی شکل میں میرے پاس کچھ بھی نہیں اگر کوئی ضرورت پڑ گئی تو میں کیا کروں گی۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں حیا۔۔۔ کم از کم بھی ۲۰ ہزار تنخواہ ملے گی تمہیں' کسی کی بھی طرف پیسوں کے لیے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی' اپنا کماؤ گی' کسی کی بھی محتاج نہیں رہے گی اور اعزاز بھائی سے بھی کھل کر بات کرو۔ ابھی تو وقت ہے۔ جاب مل جائے گی کل کو بہت مسئلہ ہو جائے گا؟" وہ واقعی اس کے ساتھ بہت مخلص تھی۔

"ہوں۔ مناسب وقت دیکھ کر بات کرتی ہوں لیکن کل صبح چلیں گے اسکول۔" وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

☼ ☼ ☼

بدلتے موسم کی خنک اور خاموش شام تھی۔ ہوا کی رفتار اگرچہ دھیمی تھی مگر جب سرسراتی ہوئی قریب سے گزرتی تو پورے وجود میں کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی۔ خنک ہواؤں میں ملے جلے پھولوں کی مہک شامل تھی۔

"تم آج صبح کہاں گئی تھیں حیا۔" اعزاز نہ جانے کب ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

"اسکول گئی تھی جاب کے لیے۔" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"جاب؟ یہ اچانک جاب کا خیال کہاں سے آگیا؟" اعزاز ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا تھا۔ اس نے

شانوں سے ڈھلکتی شال ٹھیک کی اور اعزاز کے چہرے کی سمت دیکھا' وہاں غصہ نہیں تھا بس حیرت تھی۔

"بہت مہنگائی کا دور ہے' ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ آپ کا ساتھ دینا میرا فرض ہے' ایسے میں اگر میں جاب کروں گی تو آپ کی تھوڑی بہت مدد ہو جائے گی۔ فی الحال تو مجھ پر بچوں کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے اور پھر اسکول کی جاب ہے' اسکول یہاں سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے۔ پلیز اعزاز انکار مت کرنا۔" وہ بڑی سمجھ داری سے اسے ناراض کیے بغیر' کوئی شکوہ کیے بغیر اپنی مشکل کا حل نکال رہی تھی۔

"ہوں... انکار کیوں کروں گا بھلا؟ تم اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہو اور یہ بھی ٹھیک کہا تم نے کہ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ واقعی مشکل ہو رہی ہے مجھے' تم واقعی ایک ہمدرد بیوی ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ پر فخر ہے۔" اعزاز نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما۔ وہ اسے جتانہ سکی کہ اسے یہ جاب کرنے پر بھی اسی نے مجبور کیا' اسے شکوہ تھا اعزاز سے... مگر وہ خاموش رہی۔

"میں پرسوں سے جوائن کر رہی ہوں... آج ہی فارمل سے انٹرویو کے بعد جاب ڈن ہو گئی۔ اپائنٹمنٹ لیٹر کل گھر آجائے گا۔ اکیس ہزار سیلری ملے گی۔ ٹائمنگ صبح 8 سے دن 2 بجے تک کی ہیں... مجھے گھر کے کام میں تھوڑا مسئلہ ہو گا۔ میں صفائی کے لیے ماسی رکھ لوں گی' بقایا کچن کا کام شام میں ہی مکمل کر لیا کروں گی۔ کپڑوں کی دھلائی اور پریس وغیرہ ویک اینڈ پر ہو جایا کرے گی۔ آخر جو لوگ جاب کرتے ہیں' اسی طرح مینج کرتے ہیں۔"

وہ سب کچھ سوچے بیٹھی تھی۔ اعزاز نے محبت بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"کام والی ماسی کیا لیتی ہے؟ جو اوپر آتی ہے اسی سے بات کر لو۔" اعزاز نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بہت پر جوش نظر آرہی تھی۔

"نہیں' میں نے کرن سے بات کی ہے' اس کی پرانی میڈ فارغ ہے' کل سے وہی آئے گی۔ آپ پلیز تائی امی کو راضی کر لینا۔"

"ہوں۔ میں رات کو طریقے سے بات کروں گا۔ تم نے میرا بہت بوجھ ہلکا کر دیا۔ ہم ایسا کریں گے کہ ایک دو کمیٹیاں ڈال دیں گے ___ ہم دونوں نے اپنے مستقبل کا بھی تو کچھ سوچنا ہے ناں۔" اعزاز نے محبت پاش نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"ہوں۔ دو ہزار ماسی کے' آٹھ ہزار کمیٹی کے اور باقی دس ہزار میرے اپنے... میں نے سب سوچ رکھا ہے۔ آٹھ ہزار کی دو کمیٹی ڈالوں گی۔ کل پچیس کمیٹی ہیں۔ ایک لاکھ والی۔ اس طرح آٹھ ہزار سے دو لاکھ ملیں گے۔" وہ ساری تفصیل اعزاز کو بتا رہی تھی۔ وہ بے حد خوش نظر آرہا تھا۔

"کتنی عقل مند بیوی ملی ہے مجھے... قسم سے کتنا خوش قسمت ہوں میں۔ بس یہ کمیٹی والی بات گھر میں کسی کو مت بتانا... بھول کر بھی ایسی کوئی غلطی نہ کرنا جو مجھ سے ہو گئی۔" وہ اسے نصیحت کرنے کے انداز میں بولا۔

"کون سی غلطی؟ اس نے پوچھنا چاہا اسی وقت تائی امی کمرے سے آتی دکھائی دیں۔ اعزاز ایک لمحے کی دیر کیے بنا اٹھ گیا۔

"چائے بنالو حیا' امی اٹھ گئیں۔ سب مل کر پیتے ہیں۔" وہ لہجے کو نارمل کرتا حیا کو چائے کا کہتا تائی امی کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ تو ہونا ہی تھا' آج نہیں تو کل۔ بہت اچھا ہو گیا۔ یہ صائمہ کی طرح ہوتی تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جاتے۔" وہ کچن صاف کر کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب تائی امی اور فرحانہ کے کمرے سے آتی آوازوں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"اور نہیں تو کیا' آتے کے ساتھ ہی پورے کے پورے مرد کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی ہیں۔ اس کی جیب پر تو یوں حق جتاتی ہیں جیسے باقی سب کو مار کر ان سے شادی کی ہے۔ میرا اعزاز بڑا عقل مند ہے۔ اگر یہ صائمہ جیسی ہوتی تو اعزاز بھی شہزاد والی غلطی نہ کرتا۔ دو بول منہ سے نکال کر الگ کر دیتا۔"

فرحانہ نے تائی امی کی اس بات پر "ہوں" کہہ کر ٹی وی کی آواز اونچی کر دی ' وہ غمگین ہونے کے بجائے خوش تھی کہ انہوں نے اس کی جاب پر کوئی مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

☼ ☼ ☼

جاب کا پہلا دن۔ دن کا آغاز فجر کی نماز کے ساتھ ہی ہو گیا۔ نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد کچن کا رخ کیا۔ سب کا ناشتہ بنا کر تیار کیا۔ دن کے کھانے کے لیے دال بنا کر بگھار لگایا کباب فرائی کر کے ہاٹ پاٹ میں رکھے۔ تیار ہو کر سب کا ناشتہ ٹیبل پر لگایا۔ اگرچہ معمول سے کچھ جلدی ناشتہ لگا دیا مگر سب خاموشی سے آبیٹھے۔

"تائی امی دس بجے ماسی آجائے گی ' اسے صفائی کا کام سمجھا دیجیے گا۔ دن کو کھانا بس گرم کرنا ہو گا۔ ہاں روٹیاں بنا لینا کیونکہ میں تو دو بجے آؤں گی اور آپ لوگ ایک بجے کھانا کھا لیتے ہیں۔" وہ جاتے جاتے تائی امی کے کمرے میں آئی۔

"اور ناشتے کے برتن؟" انہوں نے ابرو چڑھائے۔

میں نے ماسی سے بات کر لی ہے ' وہ دو ہزار میں دونوں کام کرے گی صفائی بھی اور برتن بھی ' ضرورت مند ہے ' مان گئی۔ ویسے بھی ایک ٹائم کے برتن ہیں۔" وہ پرس کندھے سے ٹکا کر اسکارف ٹھیک کرتی باہر نکل گئی۔

"تم روٹیوں کی فکر نہ کرو۔۔۔ ہم اپنی ڈال لیں گے ' تم آکر تازی بنا لینا۔" انہوں نے لہجے میں شیرینی گھولتے ہوئے کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اعزاز نے اسے راستے میں ڈراپ کر دیا۔ واپسی پر وہ پیدل آنے کا کہہ کر اسکول کے اندر چلی گئی۔ اسکول کا ماحول بہترین تھا۔ وہ بے حد مطمئن ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ایک مہینہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بھاگتے دوڑتے گزر گیا۔ اسکول والوں کی وساطت سے بنک میں اس کا اکاؤنٹ کھل گیا۔ اے ٹی ایم کارڈ اور چیک بک بھی مہینے کے اندر اندر مل گئی۔ وہ اعزاز کے ساتھ مہینہ مکمل ہونے پر تنخواہ چیک کرنے گئی۔

"یہ اوپر کا ایک ہزار ہم دونوں کے نام۔" وہ خوشی خوشی اے ٹی ایم سے باہر نکلی۔

"آ گئی پے؟"

"ہوں۔۔۔ آ گئی ' چلتے ہیں کافی پینے۔" وہ اس کے برابر آ بیٹھی۔

"ہوں۔۔۔ چلو۔"

"اس روز آپ کہہ رہے تھے کہ گھر میں کسی کو کمیٹی کے بارے میں نہیں بتانا۔ میری کمیٹی اسی ماہ سے شروع ہو رہی ہے اور تین ماہ بعد میرا نمبر ہے یعنی تین ماہ بعد مجھے ایک لاکھ مل جائے گا اور دوسری کمیٹی تقریباً" آٹھ ماہ بعد ہے۔"

"بس میں نے کہا ناں کہ قطعی خاموشی۔۔۔ بلکہ تم گھر میں کسی کو اپنی تنخواہ کے بارے میں بھی کچھ مت بتانا۔ میرے گھر والے ہیں۔ میں بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا حال دیکھ لو جو کمایا گھر والوں پر لٹایا کیونکہ وہ عادی ہو چکے ہیں اور عادی کرنے والا میں خود ہوں۔ ان کی ہر جائز ناجائز خواہش کو کسی فرض کی طرح پورا کیا میں نے۔ تم یہ غلطی نہیں کرو گی ' تمہاری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ تمہاری اپنی کمائی ہے۔ جہاں چاہے خرچ کرو۔" وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ اس وقت حیا کے دل سے اس کے لیے سارے شکوے ڈھلنے لگے اسے اعزاز پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ واقعی مجبور تھا۔

"کافی۔" اس نے مسکراتے ہوئے یاد کروایا۔

"اوہ۔" اس نے گاڑی کافی ہاؤس کے باہر پارک کر دی۔

☼ ☼ ☼

شدید بارش میں بھی اسکول جانے کے لیے تیار تھی ' حسب معمول کچن سمیٹ کر وہ اعزاز کے ساتھ باہر کی طرف بڑھ رہی تھی جب تائی امی نے اعزاز کو روک لیا۔

"آج ذرا جلدی آجانا ' فرحانہ کا سارا سامان منگوا لیا ہے میں نے ' صائمہ کو بھی کہہ دیا ہے کہ اوپر کا پورشن

خالی کردے۔ فرحانہ کا سارا سامان اوپر سیٹ کروا دوں گی۔ بس اب یہ یہیں رہے گی۔" ان کے لہجے کی سختی سے عیاں تھا کہ کوئی بڑی بات ہوئی ہے۔

"وہ اب اوپر ہی رہے گی۔ بچی کا ساتھ ہے' تھوڑا بہت راشن پانی اوپر کے کچن میں ڈال کر دینا ہوگا' تم شام کو آؤ تو تفصیلی بات کرتے ہیں۔" ان کی بات پر اعزاز کے چہرے پر تناؤ سا آگیا۔

"جی ٹھیک ہے۔" موسم کے تیور دیکھ کر اس نے موٹر بائیک اسٹارٹ کردی۔

"اب نہ جانے کون سی نئی مصیبت سر پر آنے والی ہے۔" وہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں بولا تھا۔

"خدا خیر کرے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

پھر رات دیر تک تائی امی کے کمرے میں خفیہ میٹنگ ہوتی رہی' اس نے کچن کی کھڑکی سے صائمہ بھابھی اور شہزاد بھائی کو بھی بڑے غصے میں نیچے آتے دیکھا تھا۔

"کرائے پر گھر لو یا جو بھی کرو' بس ایک دو دن میں اوپر کا پورشن خالی کرو۔" ان کا فیصلہ حتمی تھا۔ فرحانہ کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔ وہ عشاء کی نماز ادا کرکے کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ اعزاز کے آنے پر اس نے ڈرائی فروٹ اس کے آگے کیا۔

"یہ کون لایا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کی سمت دیکھا۔

"اسکول کی کچھ ٹیچرز شاپنگ کے لیے جارہی تھیں تو میں نے منگوالیا۔ یہی سوچ کر کہ رات کو کمبل میں بیٹھ کر دونوں کھائیں گے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اعزاز نے سر کو جھٹکا دے کر موڈ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"تم کتنا خیال کرتی ہو حیا۔ تمہاری ہر بات میں' میں شامل ہوں اور میں' میں کتنا برا ہوں کہ... تمہیں... تم میری بیوی ہو... تمہارا حق ہے اور میں سب پر لٹا رہا ہوں سوائے تمہارے۔" وہ اعتراف جرم کر رہا تھا۔ حیا کو اچھا نہیں لگا۔ اس نے اعزاز کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کی مجبوری میں نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا؟"

"ہوں... بس یہی تو تسلی ہے مجھے... اب یہ امی اور فرحانہ نے نیا تماشہ لگالیا ہے۔ فرحانہ کی نند کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور اس کے شوہر نے کہا ہے کہ جب تک اپنا مکان مکمل نہیں ہو جاتا وہ لوگ وہیں رہیں گے کیونکہ ان کے سسرال میں کوئی نہیں۔ فرحانہ لڑ جھگڑ کر یہاں شفٹ ہو رہی ہے کہ اس سے ان سب کی چاکری نہیں ہوتی۔ امی بجائے سمجھانے کے اور شہ دے رہی ہیں' اوپر سے شہزاد بھائی کو نکلنے کا کہہ دیا۔ وہ جو بجلی کے بل کی مد میں تھوڑی بہت مدد کر دیتے تھے اب اس سے بھی گئے۔ اوپر کی مرمت وغیرہ ان کے ذمہ تھی... اب وہ الگ رہ کر تو یہ سب نہیں کریں گے ناں۔" اعزاز کا غصہ' بے بسی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"آپ نے فرحانہ کو سمجھایا نہیں۔"

"بہت سمجھایا مگر اس کی ایک ہی رٹ ہے... یہاں اسے کرنا ہی کیا ہوتا ہے' بچی تو دودھ پی کر سو جاتی ہے۔ صفائی والی آکر سارے گھر کی صفائی کر جاتی ہے۔ کھانا تم بنا کر جاتی ہو' شام کی چائے ٹی وی کے سامنے مل جاتی ہے۔ کپڑے دھلے دھلائے' استری شدہ مل جاتے ہیں... ہر فرمائش وہ مجھ سے پوری کروالیتی ہے۔ دن کی روٹیاں وہ گلی کے تندور سے منگوالیتی ہیں۔ ایسے میں جب اسے یہاں آرام ہی آرام ہے وہ وہاں کیوں جائے گی؟"

"مگر اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے ناں اعزاز' شوہر کا گھر' جہاں... پر دکھ سکھ میں اپنے شوہر کا ساتھ نبھانا ہوتا ہے۔"

"ایسا تم سوچتی ہو ناں حیا۔" اس نے بات ختم کر کے سر کو جھٹکا اور اس کے ہاتھ سے ڈرائی فروٹ لے کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اسکول سے آئی تو فرحانہ کا سارا سامان آچکا تھا۔

صائمہ بھابھی اور شہزاد بھائی نے بالکل ساتھ والا مکان کرائے پر لے لیا۔ اعزاز اوپر کے کچن کے لیے کچھ سودا سلف لے آیا۔

"تم نے طارق کو بتا دیا۔" اعزاز نے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے فرحانہ کی سمت دیکھا۔

"ہاں کل صبح آجائیں گے، یہیں رہیں گے، وہاں گھر میں تو ایک طوفان آیا ہوا ہے اخراجات کا۔" فرحانہ نے نفرت سے وہاں کاذکر کیا۔ اعزاز نفی میں سر ہلاتا سامان اس کے سامنے رکھنے لگا۔

"یہ دیکھ لو، جو لسٹ تم نے دی تھی سب کچھ اس کے مطابق ہے۔"

"ہوں، دیکھ لوں گی۔۔۔ اچھا کیا سب لے آئے۔۔۔ میکے کی عزت ہے ورنہ طارق کیا سوچتے کہ رہنے کی جگہ دے دی مگر راشن ڈال کر نہیں دیا۔" وہ سارے شاپرز کا جائزہ لینے لگی۔

"بھابھی، صبح کام والی کو کہہ دیجیے گا، اوپر بھی کام کرے گی۔" اس نے بڑے عام سے انداز میں کہا تھا۔ حیا نے اعزاز کی سمت دیکھا، وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

"وہ اضافی پیسے لے گی فرحانہ۔" اعزاز نے جتایا۔

"کتنے لے لے گی۔۔۔ پندرہ سو۔۔۔ دو ہزار۔ ماشاء اللہ سے دونوں میاں بیوی کماتے ہیں۔ بہن کی خاطر اتنا نہیں کر سکتے۔ دیکھ رہی ہیں امی۔۔۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں کہہ دوں گی، تم پریشان مت ہو۔" اس نے تائی امی کے غصے اور جھگڑے کے ڈر سے بات ختم کر دی۔

"کیا ضرورت تھی بلا سوچے سمجھے ہاں کرنے کی؟؟" اعزاز نے موقع دیکھتے ہی اسے ڈانٹا۔

"مجھے تائی امی کے غصے سے ڈر لگتا ہے اعزاز! آپ فکر نہ کریں۔ میں برتن خود دھو لیا کروں گی اور کوشش کروں گی کہ نیچے ڈرائنگ روم ویک اینڈ پر خود صاف کر دیا کروں۔۔۔ بس دو تین سو بڑھا کر اسے راضی کر لوں گی۔" وہ عقل مندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ فی الحال گھر میں جھگڑا ذہنی بے سکونی کا سبب بن سکتا تھا۔ کوئی فائدہ تو ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"حد ہی کر دی ہے فرحانہ نے۔۔۔ اور وہ طارق بھائی۔۔۔ انہیں ذرہ برابر شرم نہ آئی، سسرال آگئے۔۔۔ گھر والوں کی ذمہ داریوں سے بھاگ کر۔"

"بس اپنی اپنی سوچ ہے۔" اس نے بات ختم کر دی۔

✡ ✡ ✡

شفا کی بات پکی ہو گئی تھی۔ ماموں، ممانی نے اسے اور اعزاز کو بلایا تھا۔ وہ بازار جا کر اپنے اور اعزاز کے ایک دو سوٹ لے آئی۔ شفا اور اس کے منگیتر کے لیے کچھ گفٹ بھی لے لیے۔

"اسکول سے تین دن کی چھٹی لی ہے۔ بہت مشکل سے ملی مگر مل گئی۔۔۔ ہم شام کو ہی نکل جائیں گے۔ دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔" وہ سامان پیک کرنے لگی۔

"یہ گاڑی کی گیس، پٹرول کے پیسے۔" اس نے اعزاز کی سمت تین ہزار بڑھائے۔

"کیوں شرمندہ کرتی ہو یار۔" وہ بال برش کرتے ہوئے شرمندگی سے بولا۔

"اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے اعزاز۔۔۔ جب ہم دونوں نے مل کر زندگی گزارنی ہے تو پھر۔۔۔؟" وہ دل سے اس بات کو سمجھ گئی تھی کہ ذاتی کاموں کے لیے اسے کبھی اعزاز سے کچھ نہیں مانگنا اور شفا کی منگنی پر جانا اس کا ذاتی کام ہی تھا۔ اعزاز سے محبت تھی سو یہ محبت ہی تھی جو ہر قدم پر اس کا ساتھ دینے کے لیے اسے ہمت دے رہی تھی۔

"مجھے بھی آفس سے بہت مشکل سے آف ملا ہے۔" وہ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"عجیب لوگ ہیں۔ منگنی پر صرف تم دونوں کو مدعو کیا۔ مجھ سے بھی کوئی رشتہ ہے شفاء کا۔" تائی امی کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"ممانی نے بلایا ہے آپ کو بھی، بس میں نے فرحانہ کے اکیلے پن کی وجہ سے آپ کو نہیں کہا۔۔۔

تین دن وہ اکیلی کیسے رہے گی، طارق بھائی بھی کام پر چلے جائیں گے صبح۔" حیا نے وضاحت پیش کی۔ اعزاز کی بھاگ دوڑ سے ہی طارق کو اس شہر میں نوکری مل گئی تھی۔

"ہوں... ٹھیک ہے جاؤ تم لوگ۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ وہ سلام کرکے گاڑی میں جا بیٹھے۔

☼ ☼ ☼

شفا کی منگنی خیریت سے ہوگئی۔ اس کا منگیتر خرم ایک پڑھا لکھا سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ حیا نے شفا کے اچھے نصیب کی دل سے دعا کی تھی۔ شفا کی منگنی کے وقت ہی خرم کے گھر والوں نے سادگی سے شادی کی درخواست کی اور تین ماہ بعد شفا کے امتحان دیتے ہی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ بہن کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ گھر واپس پہنچے تو ایک نیا ہنگامہ منتظر تھا۔ طارق بھائی ملازمت چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلے گئے۔ فرحانہ نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔

"میں تو پہلے ہی جانتی تھی، نہیں رہ سکے گا ماں کے بغیر... پتا نہیں کون سے مرد ہوتے ہیں جو بیوی کے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار رہتے ہیں۔" اس نے شاید انہی پر وار کیا تھا۔

"جاب چھوڑ دی، میں نے اتنے واسطے دے کر... یا خدا! کتنی بے عزتی کروادی میری... بمشکل ایک ہفتہ کام کیا اور... یا خدا... فرحانہ! آخر تمہیں مسئلہ کیا تھا وہاں! آخر وہ مرد ہے۔ کیوں چھوڑے اپنا گھر، اپنا شہر۔ قصور میرا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں میں آکر یہ جاب دلانے کی بے وقوفی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دن خنک ہواؤں میں گھرے گزرتے رہے... فرحانہ نے طلاق کی رٹ لگالی۔ تائی امی خاموش بیٹھی رہیں۔ اس کی کمیٹی نکلی تو اعزاز نے شفا کے لیے کچھ خریدنے کا مشورہ دیا۔

"دیکھ لو۔ گولڈ کی کوئی چیز یا پچاس ہزار کی سلامی یا پھر جو تمہارا دل چاہے، تم بڑی بہن ہو۔" وہ خلوص سے مشورہ دے رہا تھا۔

"ہوں... مگر میں نے یہ کمیٹی آپ کی مدد کے لیے ڈالی تھی۔"

"ہاں تو دوسری کمیٹی سے ہم دونوں اپنے لیے کچھ سوچ لیں گے۔" اس نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ اعزاز کی یہ بات اچھی تھی۔ وہ اس کی تنخواہ پر اپنے گھر کے اخراجات کے لیے نظر نہیں رکھتا تھا۔

"چلیں دیکھتی ہوں۔ فی الحال تو گھر کے حالات دیکھ کر دماغ گھومتا رہتا ہے۔ آج کل طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔" وہ حسب معمول بیڈ پر کمبل سیدھا کرتی ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا پسندیدہ ڈراما آرہا تھا۔

"کیا ہوا؟ بخار ہے تمہیں۔" وہ فکر مند ہوا۔

"نہیں، بس کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ بھوک نہیں لگتی اور طبیعت بوجھل سی رہتی ہے۔ کل میں صبح کرن کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔" اس نے دھیان ٹی وی کی طرف مرکوز کردیا۔

"اپنا خیال رکھا کرو... اور کل ڈاکٹر کے پاس میں خود لے کر جاؤں گا۔ میں اسکول سے چھٹی کے ٹائم آجاؤں گا، تم کسی اچھی سی ڈاکٹر سے ٹائم لے لینا۔" وہ اس کے لیے فکر مند ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

صحن میں سردی سے ٹھٹھرتے درختوں کے زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔ وہ نئی الجھن کا شکار تھی۔ آج ڈاکٹر نے جو خوش خبری سنائی تھی اس کی منتظر تو پچھلے کئی مہینوں سے تھی۔ اعزاز بھی بے حد خوش تھا مگر اس حالت میں وہ نوکری کو کب تک برقرار رکھ سکتی تھی اور اب بات صرف اس کے جیب خرچ اور معمولی ضرورتوں کی نہیں تھی بلکہ اب مسئلہ اعزاز کا ہاتھ بٹانے اور آنے والی ننھی جان کی ضرورتوں کا پورا کرنا تھا۔ اوپر سے فرحانہ نے گھر میں خوامخواہ کی پریشانی کھڑی کر رکھی تھی۔ خنک ہوا سے زرد پتے ادھر ادھر چکرا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے جائزہ لے رہی تھی،

اعزاز خاموشی سے چائے کے دو کپ لے کر برابر میں آ بیٹھا۔

"کیا سوچ رہی ہو بیوی؟" وہ بہت لاڈ سے بولا۔ صبح سے اس کی آنکھوں میں انوکھی سی خوشی تھی۔

"سوچ رہی ہوں چار پانچ ماہ بعد جاب کرنی مشکل ہو جائے گی۔"

"ہوں۔۔۔ چھٹی لے لینا۔" اس نے مشورہ دیا۔

"نہیں۔۔۔ بچے کے بعد جاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"میں نے تمہیں کبھی جاب کرنے کے لیے نہیں کہا تھا حیا مگر میں سمجھ سکتا ہوں، ضرورت ہے تمہاری، میں تو خود ایک دلدل میں پھنستا جا رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں پارٹ ٹائم جاب تلاش کر لوں۔" اس نے چائے کا گرم گھونٹ اندر اتارا۔ زندگی کے خوب صورت دن وہ دونوں ہی غم روزگار کا رونا روتے گزار رہے تھے۔

"میں کچھ اور سوچ رہی ہوں اعزاز۔۔۔ اور اس کے لیے مجھے آپ کے اور شفا کے تعاون کی ضرورت ہے۔" وہ بہت سوچ سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ خنک ہوا اس نے جیسے ادھر کا رخ ہی کر لیا تھا۔

"کیا؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ اوپر کے پورشن میں میڈم سے بات کر کے اسکول کی ایک برانچ بنا لوں۔۔۔ میرا یہ ٹائم بھی آسانی سے گزر جائے گا اور بچے کی پیدائش کے بعد بھی مجھے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہو گا۔ ایک دو ٹیچرز تو ہوں گی ہی ہیلپ کے لیے۔۔۔ اوپر کی سیڑھیاں پہلے ہی باہر سے ہیں تو یوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ ہم ٹیرس کے ساتھ والا کمرہ اپنا بیڈ روم بنا لیں گے۔ کافی بڑا ہے اور واش روم بھی ساتھ ہی ہے۔ شہزاد بھائی اور صائمہ بھابھی کو واپس لے آئیں۔ ہم اپنا بیڈ روم انہیں دے دیں گے اور گیسٹ روم کو وہ بچوں کے لیے سیٹ کر لیں گے، ہمارے ہاں کون سے اتنے مہمان آتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شہزاد بھائی غصے میں آ کر آپ سے اس گھر میں اپنا حصہ مانگ لیں پھر کیا کریں گے آپ۔" وہ جو بات کر رہی تھی اس نہج پر تو کبھی اعزاز نے سوچا ہی نہیں تھا کہ شہزاد کا حصہ بنتا ہے۔

"مگر اوپر والے پورشن میں تو فرحانہ۔۔۔"

"آپ شاید بھول رہے ہیں اعزاز! اس گھر میں میرا اور شفا کا بھی حصہ ہے۔ اصولاً" تو اوپر کا پورشن ہمارا حصہ ہے۔ صائمہ بھابھی اور شہزاد بھائی کو بھی اصولاً" مجھے اور شفا کو کرایہ دینا چاہیے تھا مگر خیر۔۔۔ میں شفا سے بات کروں گی، اگر اسے کوئی حصہ نہیں چاہیے تو وہ میرے حق میں دستبردار ہو جائے گی۔ ایسے میں کم از کم تو اس گھر کا فرد ہوں، میں بھلا آپ لوگوں سے اپنا حصہ کیوں لوں گی؟" وہ واقعی بے حد عقل مندی کی بات کر رہی تھی۔

"اس طرح تو فرحانہ بھی کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔" اعزاز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

سردیوں کی دھوپ تھی۔ وہ سب صحن میں جمع تھے۔ انتہائی تکلیف دہ سال گزرا تھا۔ پچھلی سردیوں میں اس نے اعزاز اور شفا کے تعاون سے گھر کے اوپر کے پورشن میں اسکول کی ایک چھوٹی سی برانچ بنائی تھی۔ میڈم نے اسے اس برانچ کی ہیڈ مقرر کیا تھا۔ سیلری میں بھی سات ہزار کا اضافہ ہوا تھا اور فائدہ یہ ہوا تھا کہ فرحانہ بہت سوچ بچار کے بعد اپنے گھر جانے پر راضی ہو گئی تھی۔ تائی امی کے لیے یہ خیال ہی سوہان روح ثابت ہوا تھا کہ انہیں حیا اور شفا کو وراثت میں حصہ دینا پڑے گا۔ ننھی پری سلمنہ گود میں آ چکی تھی۔

یوں تو اب حالات بہتر تھے۔ صائمہ بھابھی اور شہزاد بھائی بھی نیچے کے پورشن میں رہائش پذیر تھے۔ تائی امی کے کان ایک بار تو فرحانہ نے بھرے تھے۔

"اعزاز اور شہزاد بھائی سے کہیں، مل جل کر شفا کو حصہ دے کر فارغ کریں۔"

"کمال کرتی ہو۔ اول تو اتنی رقم کہاں سے لائیں گے دونوں اور دوسری بات یہ کہ شہزاد بھی تو لڑ کر گیا ہے تمہاری وجہ سے۔ اگر یہ بات اس سے کروں گی تو حصہ

لینے کا خیال اسے بھی آجائے گا۔ سب مل کر مکان بیچنے کی بات کریں گے۔ مکان بنانا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ بہت مشکل ہوتا ہے' سب کے حصے دے دلا کر سڑک پر آجائیں گے ہم لوگ' میری مانو تو شام کو ساتھ چلو۔ صائمہ اور شہزاد سے معافی مانگو' انہیں واپس لے کر آؤ۔ رہ گئی شفا تو اس کو کہہ دیں گے کہ بھئی تمہاری اپنی بہن نے اوپر کے حصے میں اسکول کھول لیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہاری بہن۔" تائی امی وہی کہہ رہی تھیں جیسا حیا نے سوچا تھا۔

"اور میں۔۔۔ میرا کیا امی؟" وہ چیخی۔

"میں خود لے کر چلوں گی تمہیں تمہارے سسرال' معافی مانگوں گی طارق سے' اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو حیا کا بہت حق مارا ہے ہم لوگوں نے' اعزاز کی جیب میں اس کی بیوی کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہیں چھوڑتے تھے۔ بچی کی پیدائش کا خرچہ بھی بے چاری نے خود اٹھایا۔ کون عورت ہوتی ہے جو شادی کے بعد بھی الف سے ے تک سارے خرچے خود اٹھائے۔ یہاں تک کہ بچے کی پیدائش کے لیے بھی خود رقم بچا کر رکھے۔ حیا کے لیے نوکری ہی واحد حل تھا۔ صائمہ جیسی ہوتی تو ہم بس ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ مگر اس نے میاں کو ہمارے خلاف ورغلانے اور اپنا حق جتانے کے بجائے خاموشی سے ایک راستہ نکال لیا۔۔۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس بات پر گھر اجڑ جاتے ہیں۔۔۔"

تائی امی کے منہ سے نئے الفاظ نے اسے ایک انوکھی سی خوشی دی تھی۔ اس نے یہ سب کوئی کریڈٹ لینے کے لیے نہیں کیا تھا۔ مگر شادی کے شروع دنوں سے ہی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر اپنے شوہر سے ناز اٹھوانے کے دنوں میں نوکری کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"میں کس منہ سے جاؤں گی طارق کے سامنے۔" فرحانہ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"جانا تو ہو گا' حیا بھی تو نہیں گئی تمہاری آمد کے بعد یہ گھر چھوڑ کر' بلکہ سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھا۔ ہر خواہش ہر فرمائش پوری کی' یہاں تک کہ اپنی ملازمہ کو بھی اپنے خرچے پر تمہارے کام کے لیے رکھ لیا۔ بس فرحانہ اب مزید کوئی بے وقوفی نہ خود کرنا' نہ مجھے کرنے پر مجبور کرنا۔"

انہوں نے دو ٹوک بات کی اور اب پورے ایک سال بعد' سلینہ دادی کی گود میں بیٹھی تھی۔

فرحانہ کا فون آیا تھا' وہ اپنے گھر خوش تھی۔ شفا اور خرم شادی کے بعد دبئی سیٹل ہو چکے تھے۔ شفا کے سارے ڈر خرم نے دور کر دیے تھے۔ شفا کو حیا کی طرح شادی کے بعد اپنی ضرورتوں کے لیے جاب نہیں کرنی پڑی تھی۔ اب نیچے کا کچن صائمہ بھابھی سنبھالتی تھیں۔ حیا کی رہائش بھی اوپر ہی تھی۔ دن دو بجے اسکول کی چھٹی کے بعد کام والی ماسی اسکول کی صفائی کے بعد اس کے بیڈ روم اور باتھ روم کی صفائی کرتی اور حیا اپنا کچن سنبھالتی۔ ہاں شام کی چائے وہ سب لوگ اکٹھے ہی پیتے تھے' نیچے اسی صحن میں' جس کے پیڑ پودے کبھی اسے بہت اٹریکٹ کرتے تھے۔۔۔ اس گھر کی چار دیواروں کے اندر بچپن سے جوانی تک اس نے بہت رنگ دیکھے تھے مگر یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب بہار کا موسم آنے کو ہے' گلابوں کا رنگ بکھرنے والا ہے۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"موسم بدلنے کو ہے' ہواؤں میں وہ خنکی نہیں رہی۔" اعزاز کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔

"ہوں۔۔۔ بس اب بہار کا موسم آنے والا ہے' چمکیلی دھوپ کا موسم۔" خشک پتے اس کے قدموں تلے چرمرائے تھے۔

"عقل مند بیوی بھی اللہ کا انعام ہے حیا۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ تم نے کیسے سب سنبھال لیا۔ مجھ سے کوئی شکوہ کیے بغیر۔۔۔ اگر تم میں یہ صبر' تحمل نہ ہوتا تو میرا گھر تو برباد ہو تا ہی ہوتا۔۔۔ فرحانہ بھی شاید وہ سب نہ سمجھ سکتی۔ جو اس طرح کے حالات نے اسے سمجھا دیا۔ صائمہ بھابھی اور شہزاد بھائی کو بھی اپنی ذمہ داریوں

کا احساس ہوا۔" وہ بے حد محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت پرسکون لگ رہا تھا۔

"ویسے اب تمہیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میرا انکریمنٹ لگنے والا ہے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں گھر کے اخراجات میں بھی شہزاد بھائی اپنا حصہ ڈالنے لگے ہیں۔ تو اب میں اپنی بیوی کے لیے تھوڑا بہت خرچ تو نکال سکتا ہوں۔" اس نے حیا کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کیا تھا۔

"سوچ لیں، میں مہینے کا تقریباً" تیس، چالیس ہزار کماتی ہوں، میرے اور سلمنہ کے شاہانہ خرچے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اعزاز نے اس کے شانے کو ہلکا سا دبایا۔

"میں شروع سے ہی حق تلفی کر رہا تھا تمہاری مگر یہ بھی سوچتا تھا کہ بیوی تو اپنی ہوتی ہے، جسم کا حصہ، ذات کا حصہ... دکھ سکھ کی ساتھی، ہم راز... اگر اسے کچھ نہیں دوں گا تو وہ گلہ شکوہ نہیں کرے گی بلکہ میری پریشانی کا کوئی نہ کوئی حل نکال لے گی اور تم جانتی ہو حیا تم نے سچ میں میرا ساتھ دیا۔ میرے دل میں تمہاری محبت اور عزت کئی گنا بڑھ گئی اور میں نے اپنے دل سے وعدہ کیا کہ ایک دن مجھے یہ سارا قرض چکانا ہے، تمہاری محبت کا، تمہاری قربانی کا، تمہارے ساتھ کا۔"

وہ اس کے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ حیا کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔ تھکن اترنے لگی۔ ایک شکوہ کہ وہ اس بارے میں سوچتا نہیں، وہ بھی دھل گیا۔ ایک طمانیت سی دل میں اتر گئی۔

"آپ کو بتاؤں، شروع شروع میں شفا کے بتائے قصے اور ادھر ادھر کی باتوں سے میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ مرد جو عورت کی ضروریات کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کے ساتھ زندگی نبھانا مشکل ہے اگر عورت کو شادی کے بعد بھی اپنی ضروریات خود ہی پوری کرنی ہیں تو پھر فائدہ۔ مگر پھر میں نے ایک جگہ پڑھا کہ بیوی کی تو آزمائش ہی تب ہوتی ہے جب مرد کی جیب خالی ہو۔ تب مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ بیوی شادی کے بعد شوہر کی ذمہ داری ضرور ہے مگر بیوی کی بھی ذمہ داری ہے کہ شوہر کی مشکلات بڑھانے کے بجائے کم کرنے کی کوشش کرے اور میں نے بس وہی کیا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا، میں نہ تو آپ کو پریشان کر سکتی تھی اور نہ میرا کوئی میکہ تھا جہاں جا کر آپ کو مجرم بنا کر کوئی عدالت لگا لیتی۔" وہ بات کے آخر میں ہنسی تھی۔ اعزاز نے اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

"تم میرا مان ہو حیا۔"

"اور آپ کا ساتھ میرا فخر ہے، غرور ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ اس محبت کا جو اسے اعزاز سے شادی سے پہلے ہوئی تھی اور اسی محبت میں وہ اتنی محنت کرتی چلی گئی مگر اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

"شاپنگ کے لیے کتنے پیسے چاہئیں حیا۔" وہ شرارت سے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے اب اس پر میرا ہی حق ہے۔" وہ بھی شرارت کا جواب شرارت سے دیتی اس کا والٹ دبوچ کر آگے بڑھ گئی۔

"جب اعزاز خود پورے کا پورا تمہارا ہے تو، لے لو، جی لو اپنی زندگی۔"

وہ دو قدم آگے آ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہوا میں کھلتے گلابوں کی مہک رچی تھی۔ حیا ہوا سے مہک ادھار لے کر اعزاز سے جا لگی۔

"اور میری زندگی آپ ہیں۔" وہ اعتراف کرتی آنکھیں موند گئی۔ زندگی بہت پرسکون ہونے والی تھی۔ اعزاز نے کسی قیمتی متاع کی طرح اپنی اتنی اچھی بیوی کو ساتھ لگا لیا۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... ریا خان

میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

مکمل ناول

یہ دن تلوار کی مانند لٹکتا طلوع ہوا تھا۔ بے یقینی، ہراس اور خوف میں گھرا، جس کے آخر میں ایک بند گلی تھی۔ ہر طرف گھٹن تھی۔ اذیت تھی۔ خوف تھا اور بے یقینی تھی۔

زندگی جو اپنی ساری خوش گمانی کے ساتھ ہاتھ سے پھسل چکی تھی۔ ایک طوفان تھا جو آیا اور تنکا تنکا اس کی ذات کو بکھیر گیا تھا۔

اور وہ جو کبھی بھی اس کے لیے چھپر چھاؤں نہیں تھا، آج اپنا آخری داؤ بھی کھیل گیا تھا۔ وہ اسے دھتکار گیا تھا۔

اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے گیا تھا۔ یہ گھر جو کبھی بھی اس کا اپنا نہیں تھا، اب تو بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔

"تم اپنا سامان سمیٹو.... اور یہاں سے جانے کی تیاری پکڑو۔۔۔ میں تمہیں یہاں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ اس وقت کتنا بے رحم لگ رہا تھا۔ کتنا ظالم بے حس اور خود غرض؟ وہ ٹوٹ گئی تھی۔

وہ دکھتے سر کو دباتی اپنے بیگ گھسیٹتی بمشکل لرزتے قدموں پہ کھڑی ہوئی تھی۔ معاً" گلاس ونڈو سے باہر کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ لاؤنج میں سب لوگ اکٹھے تھے۔ سامنے والے بھی اور گھر والے بھی۔

نایاب جیلانی

آخری وار

باہر مہیب سناٹا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں میں بیگ اٹھائے اور ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکل جانے کی خاطر باہر آگئی تھی۔

سامنے ہی صوفے پہ کسی ملکہ کی طرح وہ دونوں براجمان تھیں۔ نخوت اور استہزا سے اس کی بربادی کا تماشا دیکھتی ہوئی۔ آخر وہ دونوں من کی مراد جو پانے والی تھیں۔ خوش کیوں نہ ہوتیں؟ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے جانے کس طرح چلتی ہوئی ان کے قریب سے گزر رہی تھی۔

معاً کسی نے آواز دے کر اسے روک لیا تھا۔ وہ ان سب کے درمیان اپنے وجود کا بوجھ بمشکل اٹھا کر کھڑی تھی اور اپنے شوہر کی جانب سے آخری وار کی منتظر تھی۔ لیکن کچھ ہی دیر میں منظر اچانک بدل گیا تھا۔ کچھ ایسا ہوا جس نے اسے لمحوں کے کھیل میں ششدر کر دیا تھا۔

آخر ایسا کیا ہوا تھا؟

☆ ☆ ☆

فتح مندی کے ایک خوب صورت اور دلفریب احساس کے ساتھ وہ کلب سے لوٹی تھی۔ وہ خود کو بڑا خوش قسمت تصور کر رہی تھی۔ جیسے جب چاہا پالیا۔ اس سے بڑی خوش بختی کیا ہو سکتی تھی۔ اور ابھی وہ انہی خوش رنگ خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی، جب اچانک ہی وہ گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ آج کل اس کی ترنگ ہی نرالی تھی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ، آنکھوں میں شرارت۔

وہ ایک تفاخر بھرے احساس سے کھل کر مسکرادی تھی۔ وہ کل بھی اسی کا تھا اور آج بھی اسی کا تھا۔

"آج جلدی آگئے؟ چائے لاؤں کیا؟" اس نے فوراً ملائمت سے کہتے ہوئے صوفے پہ اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔

"چائے کا موڈ نہیں۔۔۔ تم فری ہو تو ذرا آنٹی کے ساتھ ہمارے گھر آؤ۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" اس کے انداز میں عجلت بھی تھی اور پراسراریت بھی۔

اور آنکھوں میں ڈھیر ساری مسکراہٹ۔

"خیریت تو ہے کیا کوئی اہم دھماکا کرنے والے ہو؟" وہ دل فریبی سے مسکرائی تھی۔ جواباً اس نے بھی ویسی مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

"تمہارے حوالے سے ایک بڑا دھماکا ہے تم آؤ تو سہی۔ بڑا سرپرائز ہے تمہارے لیے۔" اس نے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے اسے اپنی جگہ سے اٹھایا تھا۔

اریبا ایک سرخوشی کی کیفیت میں اس کے برابر چل رہی تھی اور اس کی ماں پیچھے آتے ہوئے اسے نہال ہوتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"واؤ تو ایسے چلتے ہیں۔" وہ خود کو باور کرواتی بڑی مسرور تھیں۔

☆ ☆ ☆

گھر میں آج معمول کی چہل پہل تھی۔

صبح اٹھتے ہی اس نے محسوس کر لیا تھا۔ جب وہ بھاگم بھاگ کچن میں پہنچی تو ماما کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ یعنی ان کے کمرے میں کوئی موجود تھا؟ کیا علینہ؟ لیکن وہ تو اتنی جلدی اٹھتی نہیں تھی۔ اس کی صبح دس بجے کے قریب ہوتی تھی۔ تب ہی وہ اٹھتی اور تازہ بہ تازہ ناشتہ بنوا کر ٹی وی کے سامنے جم کے بیٹھ کر ناشتہ کرتی تھی۔ پھر اچانک خیال آیا تھا۔ یقیناً سامنے فلیٹ سے علیزہ آئی ہوگی۔ وہ اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے شریر بیٹوں کے ساتھ صبح ہی صبح آدھمکتی تھی۔ دونوں بیٹے ماں کے سپرد کر کے ایسا سوتی کہ گیارہ بجے کی خبر لاتی تھی۔ حنان کبھی تو بغیر ناشتہ کیے چلا جاتا تھا اور کبھی اسود اسے لے آتا تھا۔

اب بھی عائشہ نے احتیاطاً دو افراد کا ناشتہ بنا لیا تھا۔ کیونکہ اگر علیزہ آئی تھی تو لازماً حنان بھی ادھر ہی آتا اور ماما کبھی بھی داماد کو بغیر ناشتہ کیے نہیں بھیجتی تھیں۔

فریج میں قیمہ رکھا تھا۔ اس نے آٹے کا تسلہ نکالا اور قیمہ بھرے پراٹھے تلنے لگی تھی۔ ساتھ دھنیے کی چٹنی بھی بنائی تھی۔ چائے دم پہ رکھ کر وہ اسود کو جگانے

کے خیال سے باہر نکلی تو ماما کے روم سے علیزہ باہر آتی دکھائی دی۔ وہ خاصی عجلت میں لگ رہی تھی۔ عائشہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"جا رہی ہو کیا؟ ناشتہ نہیں کرو گی؟"

"ناشتہ ٹھہر کے بنانا۔۔۔ ہم سب اکٹھے ناشتہ کریں گے۔" علیزہ نے بہ عجلت جواب دیا اور آگے بڑھ گئی تھی۔

عائشہ حیران رہ گئی۔۔۔ یہ سب سے کیا مراد تھی؟ وہ قطعاً" نہ سمجھی۔۔۔ پھر خیال گزرا' شاید علینہ' علیزہ اور ماما تینوں ایک ساتھ ناشتہ کریں گی۔ اپنے روم میں آئی تو اسود ابھی تک بے سدھ سو رہا تھا۔ اسود کو نیند سے جگانا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ رات کو دیر تک آفس کے کام میں مصروف رہتا اور ساتھ جمائیوں پہ جمائیاں لیتا اور عائشہ کی دوڑیں لگواتا۔

"چائے بنا کر لاؤ۔" ہر آدھے گھنٹے بعد اسے چائے کی طلب ہوتی تھی۔ وہ جاگتا رہتا تو عائشہ کو بھی جگائے رکھتا تھا۔ اگر وہ نیند سے مات کھا کر سو بھی جاتی تو وہ اس انداز میں گرجتا برستا تھا کہ عائشہ نے سونے سے توبہ کر لی تھی۔

ماما بیڈ ٹی لیتی تھیں۔ پھر بچیاں اٹھ جاتیں۔ ان کو تیار کر کے ناشتہ کراتے ہوئے دس بج جاتے تھے۔ تب تک علینہ اور علیزہ بھی اٹھ جاتیں۔ پھر ان کا ناشتہ بنتا۔ بارہ بجے تک نادیہ (کام والی) آجاتی تھی۔ عائشہ کو صفائی کرواتے دو بج جاتے تھے۔ تب تک لنچ بھی تیار چاہیے ہوتا تھا۔ عائشہ کو اپنے لیے تو وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی کوئی اس سے خوش نہیں تھا۔ نہ ماما' نہ اسود اور نہ اسود کی بہنیں۔

وہ جتنی بھی کوشش کر لیتی' کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ جاتی تھی۔

اب بھی گہرا سانس لیتی جھکی اور پھر کچھ آگے بڑھ کے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ اسود نے کسمسا کر کروٹ لے لی تھی۔ عائشہ نے کچھ جھک کر اس کے بکھرے سیاہ بال ماتھے سے ہٹائے اور نرمی سے پکارا۔

"اسود! اٹھ جائیں۔ پھر آفس سے دیر ہو جائے گی۔"

"سونے دو' کیا مصیبت ہے۔" وہ سخت بیزار سوئی سوئی آواز میں بولا تھا۔

"دیر ہو جائے گی آپ کو پھر مجھ پہ غصہ کرتے ہیں۔ میں جگا ئی نہیں وقت پہ۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا کہ کچھ دیر بعد اس نے مندی مندی آنکھیں کھول ہی لیں۔

عائشہ نے گہرا سانس بھرا اور اٹھنے لگی۔ معاً" اسود نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ رک سی گئی۔ وہ موبائل چیک کر رہا تھا۔ شاید میسج تھے یا مسڈ کالز۔

"رات کو کون آیا تھا؟" اس نے ایک عجیب بات پوچھی تھی۔ عائشہ حیران ہو گئی۔ وہ موبائل پہ ہی مصروف تھا۔

"کون آیا تھا؟" عائشہ نے الٹا استفسار کیا۔

وہ ایک جھٹکے سے کمبل ہٹا کر اٹھ گیا۔ موبائل اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ خود وہ واش روم میں چلا گیا۔ عائشہ دونوں بچیوں کو تھپکنے لگی۔ جو باتوں کے شور سے کسمسا رہی تھیں۔

وہ رونیہ کو فیڈ کروا رہی تھی جب اسود شاور لے کر باہر نکلا۔۔۔ عائشہ بے ارادہ ہی اسے دیکھنے لگی۔ اسود بہت اسمارٹ تھا۔ بے حد خوبرو' بالکل اپنی ماما جیسا۔۔۔ رنگت' آنکھیں' نقش۔۔۔ قد کاٹھ بابا کی طرح تھا۔ اوپر سے اس نے خود کو بہت فٹ رکھا ہوا تھا۔ باقاعدگی سے جم جاتا۔ گیم کھیلتا' ایکسر سائز کرتا۔ تین بیٹیوں کا باپ تو لگتا ہی نہیں تھا۔ جبکہ عائشہ تین سالوں میں تین بچیاں پیدا کر کے کچھ فربہی مائل ہو گئی تھی۔ اسود کے سامنے تو کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ وہ اسے یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر کچھ چونکا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ میں پہلا سا ہوں' بدل نہیں گیا۔" اس نے رکھائی سے نخوت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ عائشہ کے دل میں اس کا جملہ ترازو ہو گیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بدل کیسے سکتا تھا۔ موڈی' تنک چڑھا اور

تنک مزاج۔ اپنا پرستار۔

"اور اس رونی صورت کو دوسرے کمرے میں لے جایا کرو۔ بالکل سونے نہیں دیتی۔ اوپر سے نام بھی رونیہ۔ یعنی رونے والی۔"

اسود نے کڑی نگاہوں سے دودھ پیتی سات ماہ کی رونیہ کو دیکھا تھا۔ رونیہ تو اسے قطعی طور پہ پسند نہیں تھی۔ بلکہ اسے زونیہ اور سونیا بھی پسند نہیں تھیں۔ دراصل وہ باپ بننا چاہتا ہی نہیں تھا۔ یہ تو ماما کی خواہش پہ زونیہ کے بعد سونیا ہوئی۔ ماما کو پوتے کا جنون تھا۔ چونکہ اسود اکلوتا تھا تو ماما چاہتی تھیں کہ اسود کا بیٹا ضرور ہو۔ پوتے کی خواہش میں انہوں نے زونیہ اور سونیا کو برداشت کیا تھا اور اسی خواہش کے باعث رونیہ بھی پورے دس ماہ بعد اس کی گود میں آگئی تھی۔ تینوں میں صرف دس دس مہینے کا وقفہ تھا۔ یعنی اوپر تلے کی۔

دو سال کی زونیہ' ڈیڑھ سال کی سونیا اور سات ماہ کی رونیہ کے ساتھ وہ گھن چکر بن گئی تھی۔

رونیہ کی پیدائش کے بعد ماما کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس گھر میں واحد ایک ماما ہی اس کی حمایتی تھیں۔ تین پوتیاں دے کر عائشہ نے انہیں بھی اپنے خلاف کر لیا تھا۔ شاید اس کی قسمت ہی ایسی تھی۔ کوئی بھی اس کا نہیں بن سکا تھا یا اسے ہی کسی کو اپنا بنانا نہ آیا تھا۔

"اور اس کو فیڈر لگاؤ۔ بہانہ بنا کر آرام کرنے بیٹھ جاتی ہو۔" اسود نے نیا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ وہ سوچوں کی شوریدہ سری سے بمشکل باہر آئی تھی۔

"اوپر کے دودھ سے اس کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔" عائشہ نے دبی آواز میں بتایا تھا۔

رونیہ مسلسل رو رہی تھی۔ بہت روتی تھی۔ اور اسود کو اپنی بچیوں کے رونے سے شدید چڑ تھی۔ ورنہ علیزہ کے بھی تو بچے تھے۔ ان سے کبھی بیزار نہیں ہوتا تھا۔

"اب اس کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟ ہر وقت گلا پھاڑتی ہے۔" اسود ناگواری سے بولتا رہا۔

"دانت نکال رہی ہے نا اس لیے۔" عائشہ کو خوامخواہ صفائیاں دینی پڑ رہی تھیں۔

"بہت ہو چکیں ناز برداریاں۔ اب ناشتہ لے بھی آؤ۔" وہ شرٹ پہنتا تنک انداز میں بولا تھا۔

"اسے پکڑیں پھر۔" عائشہ نے رونیہ کا منہ صاف کر کے ڈرتے ڈرتے ہی کہا تھا۔ وہ یوں بدکا تھا جیسے کرنٹ لگنے کا خطرہ ہو۔ وہ تو عام حالات میں بچیوں کو نہیں اٹھاتا تھا۔ اب تو پھر دفتر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کسی قیمت پر بھی بچی کو نہ اٹھاتا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا جاہل عورت! اسے اٹھاؤں؟ اور ساری استری کا ستیاناس ہو جائے۔" اسود نے بگڑ کر عائشہ کو ایک ساتھ کئی سنا دی تھیں۔ وہ اس کے طعنے پہ چپ چاپ کھڑی رہ گئی۔ وہ ایم ایس سی کیمسٹری تھی اور پھر بھی جاہل تھی۔ وہ اپنی پوری فیملی میں پہلی گولڈ میڈلسٹ تھی اور پھر بھی ان پڑھ تھی۔

اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ وہ تو پہلے دن سے یہ سب طعنے سنتی آ رہی تھی۔ اس نے آنکھ میں اترتی نمی کو آنکھ میں ہی روک کر رونیہ کو واکر میں بٹھایا اور اسے روتا چلاتا چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔ اس سے پہلے ہی اسود بھی لیپ ٹاپ 'بیگ' چابیاں اور موبائل اٹھا کر باہر آگیا۔

رونیہ اب بھی گلا پھاڑ کر چلا رہی تھی۔ اسود نے دروازہ بند کر دیا تو باہر آواز آنا کم ہو گئی تھی۔ عائشہ کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

اور یہ کوئی پہلی مرتبہ تو نہیں تھا۔ ہمیشہ ہی اسود کی بے حسی اسے ایک نئے دھچکے سے روشناس کرواتی تھی۔ وہ جتنا بیوی سے لاتعلق تھا اس سے کئی گنا زیادہ بیٹیوں سے لاپروا تھا۔ وہ بچیوں کو اٹھانا تو دور پیار سے بلاتا تک نہیں تھا۔

اسے یاد تھا جب زونیہ نے پہلی مرتبہ بابا لفظ بولنا سیکھا تھا۔ اس دن عائشہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ زونیہ بابا کا ورد کرتی پورے گھر میں بھاگ رہی تھی۔ اور عائشہ اس پہ واری جاتی نہ تھک رہی تھی۔ اس کی بیٹی نے پہلا لفظ بولا تھا۔

پھر جب شام کو اسود گھر آیا تو زونیہ چہکتی، کھلکھلاتی بابابابا کرتی اسود کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور اسود نے بغیر اس کی منی سی چہکار پہ غور کیے بری طرح سے زونیہ کو جھڑک دیا تھا۔ ساتھ ہی عائشہ پہ بھی چڑھ دوڑا تھا۔

عائشہ اس وقت بھی سابقہ تلخ سوچوں میں گم تھی۔ جب اسود کچن میں داخل ہوا اور ڈائننگ ٹیبل کا اسٹول کھینچ کے بیٹھ گیا۔ عائشہ نے پھرتی سے ٹیبل پہ ناشتہ لگا دیا تھا۔

ناشتہ کرتے ہوئے اچانک اسود نے عائشہ سے پوچھا تھا۔ "کوئی آیا تھا کیا؟" اس کے لہجے میں سرسری پن نہیں تھا۔ کچھ تو ایسا تھا۔ جس نے عائشہ کو چونکا دیا تھا۔

"علیزہ آئی تھی۔" عائشہ نے بتایا۔ علیزہ کا آنا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ وہ بس رات ہی اپنے گھر میں گزارتی تھی۔ صبح صبح ہی یہاں پہنچ جاتی۔ لیکن اسود بے اختیار چونک گیا تھا۔

"کیا چلی گئی؟"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اسود ایک دم بے چین سا ہو گیا۔ پھر اچانک خیال آنے پر بولا۔ "جب رات میں سو گیا تھا تو حنان کی کال تو نہیں آئی تھی؟"

"شاید آئی ہو۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی سو گئی تھی۔" عائشہ نے سنجیدگی سے بتایا۔ اندر سے اسے کھدبد تو لگی ہی تھی لیکن اسود سے کچھ پوچھنے کی مجال نہیں تھی۔

"وہ ایئرپورٹ سے آنٹی کو ریسیو کرنے گیا تھا۔ اس نے مجھے میسج کیا۔ جانے سے پہلے وہ گھر بھی آیا تھا۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔" اب وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

عائشہ کو یاد آیا۔ رات کو حنان آیا تھا۔ عائشہ نے اسے بتایا تھا کہ اسود تو سو گیا۔ پھر حنان رکا نہیں۔ وہ کمپاؤنڈ کی طرف گیا تھا گھر کی طرف نہیں۔ جس کا مطلب تھا۔ وہ کسی کام سے باہر گیا ہے۔

"تو گویا روزینہ آنٹی واپس آئی تھیں۔ اور وہ بھی؟ اروما؟" عائشہ کا چائے ڈالتا ہاتھ لرز سا گیا تھا۔ اسے بھول گیا تھا کہ اسود سے کوئی ضروری بات کرنا تھی۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔

"اوکے، چلتا ہوں میں۔ دروازہ بند کر لو اور ہاں، اسے بھی اندر جا کر دیکھ لو۔ جو گلا پھاڑ کر رو رہی ہے۔" اس کا اشارہ زونیہ کی طرف تھا۔ جو ابھی تک رو رہی تھی۔

اور عائشہ سُن سی اسود کو باہر جاتا دیکھتی رہی۔ جانے سے پہلے وہ ماما کے کمرے میں گیا تھا اور پھر باہر نکل گیا۔ عائشہ کے جسم میں پھریری سی دوڑی۔ اور پھر ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ دوسرے ہی پل وہ بھاگتی ہوئی گلاس وال کی طرف آئی تھی۔ جو باہر کے منظر کو واضح کرتی تھی۔ اس نے پردہ اٹھا کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو چکی تھی۔

اسود گھر سے نکل کر سامنے والے فلیٹ نما عالیشان

گھر میں داخل ہو گیا تھا اور عائشہ کا اپنی ٹانگوں پہ کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کتنے ہی لمحے بیت گئے تھے۔

اس نے اروہا اور اسود کو ہنستے دیکھا تھا۔ وہ اسے باہر تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی۔ عائشہ سے مزید دیکھا نہیں گیا۔ وہ نڈھال سی پلٹ آئی۔ وہ دیر تک صوفے پہ بیٹھی رہی۔ اس کے سر میں اچانک ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اچانک ہی اپنے گھٹنوں پہ اس نے نرم نرم ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا تھا۔ اس کے سامنے زونیہ کھڑی تھی۔ نیند بھری آنکھوں کو مسلتی ہوئی۔

"مما! لونیہ (زونیہ) کو (رو) رہی ہے۔"

عائشہ کو اچانک ہی کرنٹ لگا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے روم آئی تو رونیہ واکر میں رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے رونیہ کو اٹھا کر سینے سے لگایا تھا۔ پھر تینوں کے ہاتھ منہ دھلائے، کپڑے چینج کیے۔ اور ناشتے کے لیے باہر لے آئی ماما بھی اپنے کمرے سے باہر آگئی تھیں۔ عائشہ نے ٹی وی پہ کارٹون لگا کر زونیہ، سونیا کو کشن پہ بٹھایا اور خود کچن میں آگئی۔

عائشہ ناشتہ بنا رہی تھی جب ماما کی آواز آئی۔

"ناشتہ زیادہ بنانا۔۔۔ علیزہ کی فیملی بھی یہیں ناشتہ کرے گی۔ روزینہ آئی ہے رات کو۔" ماما نے پُرسوچ سے انداز میں اپنی جٹھانی کے آنے کا بتایا تھا۔ عائشہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ تو اسود کی تائی بالآخر واپس آگئی تھیں۔ اپنی لاڈلی کے ہمراہ۔

ایسا کیا ہوا تھا جو اروہا بھی واپس آگئی تھی؟ عائشہ سوچوں میں گم شوکیس سے برتن نکال کر لاؤنج کی ڈائننگ ٹیبل پہ لگانے لگی تھی۔

معاً علینہ بھی اپنے روم سے جمائیاں لیتی باہر آگئی تھی۔

"میں تو اپنے لیے حلوہ پوری لینے جا رہی ہوں۔ آپ لوگ کھائیں سوکھے سلائس۔" علینہ نے ماما کو اطلاع دی تھی۔

"آج پراٹھے ہیں۔ روسٹ اور فش فرائی۔" عائشہ کو باہر نکل کر بتانا پڑا تھا۔

"یہ دعوت شیراز کس لیے؟" اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"رات کی فلائٹ سے روزینہ اور اروہا واپس آگئی ہیں۔" ماما نے نگاہ چُرا کر بتایا تھا۔ علینہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"واقعی؟ بالکل اچانک آگئیں۔۔۔ اطلاع بھی نہیں دی۔" اس کی حیرت دیدنی تھی۔ ان کے آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ پھر اچانک ہی تین سال بعد واپس آجانا؟

"تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ روزینہ کا گھر ہے یہاں۔ بیٹا ہے، بہو ہے، دو پوتے ہیں۔ وہ اپنے گھر لوٹی ہے۔ کون سا ہمیشہ کے لیے گئی تھی۔" ماما نے ناگواری سے بیٹی کے حیران تاثرات کو مٹانا چاہا تھا۔

"لیکن اروہا۔۔۔؟" وہ ہچکچائی پھر اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"وہ بھی بھائی، بھابھی سے ملنے آئی ہے؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔ ماما نے اسے گھور کر دیکھا۔ "ہاں تو!"

ماما خاصی کبیدہ خاطر لگ رہی تھیں۔ علینہ بھی خاموش ہو گئی۔ عائشہ نے ٹیبل سجا کر انہیں اطلاع دی تھی۔

"ناشتہ تیار ہے، علینہ! تم سب کو بلا لاؤ۔" عائشہ کی مداخلت پہ علینہ نے واکر سے رونیہ کو اٹھایا اور خارجی دروازے سے باہر نکل گئی۔

عائشہ نے گہرا سانس بھرا اور اپنا حلیہ دیکھنے لگی۔ مسلے کپڑے، الجھے بال، ان دھلا چہرہ۔۔۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف آگئی تھی۔ وہ کم از کم علیزہ کی فیملی کے سامنے اتنے بُرے حلیے میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

اسے اسود کی سابقہ منکوحہ سے بہت ہی اچھے انداز میں ڈریس اپ ہو کر ملنا تھا۔

☆ ☆ ☆

سوا گیارہ کا وقت تھا۔ لاؤنج میں پُر تکلف ناشتہ چل

رہا تھا۔ پورے گیارہ بجے اسود بھی گھر آگیا تھا۔ یعنی آج کی تاریخ کا ایک اور عجیب واقعہ۔ اسود تو دفتر سے چھٹی کا تصور بھی نہیں کرتا تھا۔ اپنے کام سے اسے بڑا جنونی لگاؤ تھا۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ حنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک ہی فیلڈ میں ایک ہی رینک پہ تھے۔ دونوں کے ایک جیسے یونیفارم تھے۔ اور فی الحال دونوں پنڈی میں ہی تعینات بھی تھے۔ حنان کوئٹہ سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ علیزہ اس کے ساتھ تھی اور شادی کے فوراً" بعد ہی ساتھ چلی گئی تھی۔ جبکہ اسود پہلے سیالکوٹ اور پھر کھاریاں میں رہا۔ لیکن عائشہ اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ بلکہ وہ لے کر ہی نہیں گیا تھا۔ وہ ماما اور علیزہ کے ساتھ پنڈی کینٹ میں ہی رہائش پذیر تھی۔ اس کی تینوں بیٹیاں پنڈی میں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ تینوں دفعہ ہی اسود موجود نہیں تھا۔ اور نہ ہی وقت پہ آیا تھا۔

حنان اور علیزہ کی لو میرج تھی۔ بڑی دھواں دھار محبت کے بعد شادی ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسود کی اروما کے ساتھ محبت کی منگنی اور نکاح تھا۔ ان دونوں کا اولیول کے فوراً" بعد نکاح ہو گیا تھا۔ لیکن یہ نکاح اسود کے کپتان بنتے ہی ٹوٹ گیا۔ اسود اب میجر تھا۔

نکاح کیوں ٹوٹا؟ اس بات سے عائشہ ناواقف تھی۔ نہ کبھی اسود نے بتایا تھا اور نہ کبھی عائشہ نے پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

اروما اور اسود کا نکاح ٹوٹنا ایک معمہ تھا۔

دونوں خاندانوں میں بڑا پیار تھا۔ اور باہمی رضا مندی سے رشتے جوڑے گئے تھے پھر نہ جانے کیا وجہ تھی جو اسود اور اروما کا رشتہ ختم ہو گیا تھا۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی رشتہ ختم ہونے کے بعد بھی دونوں خاندانوں نے آپس کے تعلقات خراب نہیں کیے تھے۔ وہ پہلے کی طرح ہی ایک دوسرے سے ملتے' فون پہ بات ہوتی۔ تحائف لیتے دیتے تھے۔

ہمیشہ بڑے گھر میں کھانا پکتا تھا۔ جب اسود کے دادا زندہ تھے یہ تب سے لے کر اب تک کا رواج تھا۔ کھانا ہمیشہ اسود کے گھر پکتا اور تینوں وقت سب ایک جگہ اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دونوں بھائیوں میں اتفاق تھا تو ان کی بیویوں میں بھی بلا کی یگانگت تھی۔ آگے بچوں میں بھی یہی محبت منتقل ہو گئی۔ حنان اور اسود جگری یار تھے۔ پھر رشتے بنے اور بگڑے' پھر بھی دلوں میں کدورت نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی دوست تھے۔ اور ایک ساتھ بہت سا وقت گزارتے تھے۔

حنان اور علیزہ خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ علیزہ شوہر کی من چاہی بیوی تھی اور حنان کے ساتھ ساتھ اس کی فیملی پہ بھی حکومت کرتی تھی۔ پھر اس کے دو بیٹے تھے۔ اس کی حیثیت بہت مضبوط تھی۔

جبکہ عائشہ کا معاملہ قطعی طور پہ الگ تھا۔ اس کا میکہ بھی مضبوط نہیں تھا۔ اور وہ اسود کی پسند بن کر آئی بھی نہیں تھی۔ بلکہ تین سالوں میں ابھی تک اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اسود کے دل میں کتنی جگہ رکھتی ہے۔

اسود شروع سے ہی بے نیاز تھا۔ اپنے آپ میں گم' خود کو فوقیت اور اولیت دینے والا۔ گو کہ وہ ان کی ساری ضروریات پوری کرتا تھا لیکن اس کے پاس ان کے لیے نہ محبت تھی اور نہ وقت تھا۔

اور سب سے بڑی بات وہ عائشہ کے میکے والوں کو پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ عائشہ کی فیملی بھی چھوٹی سی تھی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا اور وہ ڈاکٹر بن چکا تھا۔ باہر سے پڑھ کر آیا تھا اور بہت لائق تھا۔ ایک سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ بہن تھی مریم۔ ابو حیات نہیں تھے۔ ہاں' وہ معاشی طور پہ اتنے مستحکم نہیں تھے۔ بھائی اب کما رہا تھا اور انہوں نے اچھے علاقے میں کرائے پہ گھر لیا تھا۔ ورنہ پہلے اندرون شہر میں چھوٹا سا مکان تھا۔ جسے بیچ کر امی نے بھائی کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔

اسود کو نہ خود سسرال جانا پسند تھا اور نہ عائشہ کو بھیجنا۔ وہ تو مکلاوے کی رسم پہ بھی سسرال نہیں گیا تھا۔ ماما کا لیا دیا رویہ اور داماد کی لاتعلقی دیکھ کر امی اور مریم بھی یہاں نہیں آتے تھے۔ اب عزیر باہر سے

کامیاب ہو کر لوٹا تھا تو امی نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ بطور خاص اسود کو بھی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ لیکن عائشہ کو اسود سے یہ بات کرنی بھی بہت مشکل لگ رہی تھی۔ جب سے وہ لوگ نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے، عائشہ ایک مرتبہ بھی نہیں جا سکی تھی۔ حتیٰ کہ عذیر بھی خود ہی مل کر گیا تھا۔ وہ بھائی سے ملنے بھی نہیں گئی تھی۔

اور اب تو سامنے والے گھر کے مکین واپس آ چکے تھے اور ان کا تین وقت کا کھانا یہیں پکتا تھا سو عائشہ کا باہر نکلنا بھی محال تھا۔ وہ کیسے میکے جانے کے لیے وقت نکالتی؟ مگر اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ رات کو ہر صورت اسود سے بات کرے گی۔

اور اپنی امی کے گھر پورا دن گزارے گی اور رات بھی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ کیا اسے اپنی ماں سے ملنے کا حق نہیں تھا۔

وہ سب لوگ ناشتہ کرتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسود اور حنان ڈرائی فروٹ کھا رہے تھے۔ باقی سب لوگ چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماما تھوڑی خاموش تھیں اور علینہ بھی کترائی کترائی سی تھی۔ زیادہ وقت وہ بچیوں کے ساتھ ہی لگی رہی۔ روزینہ کافی دیر سے نوٹ کر رہی تھیں۔ فوراً" ہی ماما سے مخاطب ہوئیں۔

"راضیہ! علینہ کو بچوں سے بڑا ہی پیار ہے۔" ان کا انداز جتلانے والا تھا۔ ماما نے علینہ کی طرف دیکھا۔ جس نے سونیا کو کندھے پہ بٹھا رکھا تھا اور ذونیہ کو ٹانگوں پہ جھلا رہی تھی۔

حنان اور اسود بھی فوراً" متوجہ ہوئے تھے۔ حنان نے پھڑک کر مداخلت کی تھی۔

"تصحیح فرما لیجیے ممی! بچوں سے نہیں بچیوں سے میرے بیٹوں کو تو یہ دیکھتی بھی نہیں۔" اس نے ہمیشہ والا شکوہ کیا تھا کہ وہ بھانجوں کی نسبت بھتیجیوں سے زیادہ قریب ہے۔

"تو ایسے شرارتی بچوں کے ساتھ کون کھیلے؟ نچلے ہو کر تو بیٹھتے نہیں۔ میری بھتیجیاں فضول شرارتیں نہیں کرتیں۔" علینہ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

روزینہ اس تکرار سے بیزار ہو گئی تھیں۔ اب تو اروما اور علیزہ بھی متوجہ تھیں۔ اور ڈائننگ ٹیبل سے برتن اٹھاتی عائشہ بھی۔۔۔ حنان اور علینہ کی نوک جھونک تو معمول کی بات تھی۔

"اللہ کرے، اسود کے ایک بیٹا بھی ہو۔۔۔ اوپر تلے تین بیٹیاں ہو گئیں۔" روزینہ نے ایسی آہ بھری تھی کہ سب ہی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور عائشہ کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔ اس کے چہرے پہ سایہ سا لہرا گیا تھا۔ ایک ایسا ہی سایہ ماما کے چہرے پہ بھی لہرایا تھا۔

"کہاں سے ہو؟ یہاں تو اب امید ہی نہیں۔" ماما کی ٹھنڈی آہ اور بڑبڑاہٹ اتنی اونچی تو ضرور تھی جو روزینہ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اور روزینہ بے ساختہ چونک اٹھی تھیں۔ پھر انہوں نے بے ساختہ اپنا منہ ان کے قریب کیا تھا۔

"کیوں خیریت تو ہے نا؟" ان کے انداز میں واضح تجسس تھا۔

"رونیہ کی دفعہ کوئی پیچیدگی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا ہے مزید بچہ نہیں کرنا۔" ماما نے بھرے دل سے بتایا۔

عائشہ کے اندر تیزی سے کچھ کٹنے لگا تھا۔

اسود کو جانے بیٹے کی خواہش تھی یا نہیں، البتہ عائشہ کو تو جنونی خواہش تھی اور اس خواہش میں شدت تب آتی تھی جب ماما۔ پوتا نہ ہونے کی حسرت کا اظہار کرتیں۔ اور ہر آئے گئے کے سامنے یہی رونا لے کر بیٹھ جاتیں۔

"ارے؟" روزینہ کو دھچکا سا لگا۔۔۔ "تو کیا عائشہ اب بچہ پیدا نہیں کر سکتی؟" ان کی آواز میں واضح بے چینی تھی۔ اور ایک نہ سمجھ میں آنے والا احساس۔۔۔ جو ارد گرد پھیل رہا تھا۔

"اسود نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا۔ پھر برتھ کنٹرول،" وہ دھیمی آواز میں بتا رہی تھیں۔ "اسود سختی سے ڈاکٹر کی ہدایت پہ عمل پیرا ہے۔ ورنہ میں نے تو بہت

دفعہ کہا بھی تھا۔"

"تو اور کیا۔ یہ ڈاکٹر تو ایسے ہی بکتے ہیں۔ ساری دنیا رسک پہ جی رہی ہے۔ لوگ اتنے بڑے بڑے رسک لیتے ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یاد نہیں عاطمہ کا۔ پانچ پانچ آپریشن ہوئے اور بالکل ٹھیک ٹھاک رہی۔ ورنہ ڈاکٹر نے تو ڈرا مارا تھا۔ اب گئی کہ تب گئی اور فریدہ کی بیٹی کا نہیں پتا؟ جس کے سات سال بعد بیٹا ہوا اور پھر دوسرا بیٹا۔ ڈاکٹرز نے اسے بھی سختی سے منع کیا تھا۔ وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی اور دیکھ لو سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔" روزینہ نے ماما کو جانے کون کون یاد کروا کے ان کے اندر دبی خواہش کو ایک مرتبہ پھر گرما دیا تھا۔

"میں تمہیں ڈاکٹر بتاؤں گی۔ بڑی قابل ہے۔ وہ ایسے رسک لے سکتی ہے۔ اسی کو دکھانا۔ عائشہ کو لے جانا۔ اب ہمارے اکلوتے اسود کا بیٹا ہی نہ ہو۔ یہ کوئی بات ہے۔" روزینہ نے ہمدردانہ لہجہ اپنایا تھا۔

"میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ کیا میرے اسود کا نام بھی سلامت نہیں رہے گا اور اس کی نسل ختم ہو جائے گی۔" ماما کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اور ان کے چہرے پہ بڑے تکلیف دہ تاثرات تھے۔ عائشہ کا دل چاہا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔

ان سے کچھ فاصلے پہ اروبا اور اسود کسی بحث میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد حنان اور اسود اپنے آفس چلے گئے تھے۔ اروبا بھی سونے کے بہانے اٹھ گئی تھی۔ علیزہ اپنے بچوں کو نہلانے چلی گئی۔ ماما اور روزینہ آنٹی اب کھل کر اس موضوع پہ روشنی ڈال رہی تھیں۔ علینہ ناگواری سے اٹھ کر روتی ہوئی رونیہ کو کچن میں لے آئی۔

"بھابھی! اس کو فیڈ کروا دیں۔ بھوک لگ رہی ہے اسے اور نیند بھی آ رہی۔" اس نے عائشہ کو رونیہ زبردستی تھمائی تھی۔

"بہت کام ہے علینہ! میں اس کا فیڈر بنا دیتی ہوں۔ ویسے بھی اسے عادت ہونی چاہیے۔ صبح اسود بھی کہہ رہے تھے۔" عائشہ نے لجاجت سے کہا۔ اسے ابھی لنچ بھی بنانا تھا۔ اور صفائی ستھرائی بھی کروانی تھی۔

"بھائی کا تو دماغ خراب ہے۔ پتا نہیں، اوپر کے دودھ سے بچی بیمار پڑ جاتی ہے۔ اسے فیڈر سوٹ ہی نہیں کرتا۔ آپ رونیہ کو لیں۔ میں یہ کرتی ہوں۔" علینہ نے ناگواری سے کہتے ہوئے برتن صاف کرنے شروع کر دیے تھے۔ عائشہ نے رونیہ کو گود میں لیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"اب اللہ خیر کرے۔ آنٹی آ تو چکی ہیں۔۔۔ راتوں رات بھائی کا بیٹا پیدا کروا کے چھوڑیں گی۔" علینہ کے تبصرے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی عائشہ کو ہنسی آ گئی تھی۔ اس نے تبصرہ ہی کچھ اس انداز میں کیا تھا۔

"اور یہ ممکن نہیں۔" عائشہ کچھ افسردہ سی ہو گئی۔

"سنا نہیں آپ نے۔۔۔ کچھ بھی ناممکن نہیں۔" علینہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "اور آنٹی کا حال دیکھیں۔ اپنی بیٹی سے ایک چڑی کا بچہ نہیں پیدا ہو سکا اور دوسروں کو اندھا دھند مشوروں سے نوازا جا رہا ہے۔"

علینہ نے بگڑے تاثرات سے اندر کی جلن نکالی تھی۔ عائشہ اس دفعہ پھر اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی تھی۔

"اور ایک بات نوٹ نہیں کی۔" اچانک علینہ کو کچھ یاد آیا تھا۔ وہ اس کی طرف مڑ کر بولی۔ "میرے بھائی میں اتنی کرٹسی؟ آج تک کسی مہمان کے لیے آفس سے اٹھ کر آئے ہیں جناب؟ بہت غصہ آیا مجھے۔ آپ کا بھائی باہر سے آیا تھا اور اسود بھائی نے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی۔ بات کرنا، بیٹھنا تو دور، سلام کا جواب دے کر احسان کرتے نکل گئے کہ آفس میں کام بہت ہے اور اب آفس میں کام نہیں تھا کیا؟"

وہ سارا غصہ برتنوں پہ نکال رہی تھی۔ اور عائشہ حیرت سے علینہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ان ہی جیسی تھی۔ ان ہی لاتعلق اور بے حس لوگوں جیسی مگر اس لمحے ان سب سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ علینہ کی اپنائیت پہ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

☆ ☆ ☆

رات کو پھر وہی ماحول تھا۔ ایک شور ایک ہنگامہ۔۔۔ ہنسی، آوازیں اور جمی ہوئی محفل۔

جہاں پہ حنان اور اسود ہوں وہاں خاموشی کا کیا کام۔ اسود کی ساری خوش مزاجی، ساری بذلہ سنجی، ساری خوش اخلاقی، حنان اور اس کی فیملی کے لیے تھی۔

چونکہ وہ سب کزنز تھے اور دوست تھے۔ سو آپس میں بے تکلفی بھی بہت تھی۔ ایسے میں عائشہ خود کو ان کے درمیان مس فٹ سمجھتی تھی۔

اس نے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چائے کے برتن اٹھائے اور پچن میں آگئی تھی۔ لاؤنج میں ابھی تک محفل سجی تھی۔ اس نے برتن دھوئے اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اسی پل امی کی بھی کال آنے لگی۔ عائشہ کا دل بھرا ہوا تھا۔ فوراً" ہی کال ریسیو کرلی تھی۔ امی نے بے ساختہ ہی شکوہ کیا تھا۔

"بہت مصروف ہو گئی ہے میری بیٹی! فون پہ بات کرنے کا بھی وقت نہیں۔" امی کی آواز سن کر اس کا دل بھر آیا۔

"میں بہت اداس ہوں امی!" اس کی آواز میں کچھ تو تھا جس نے امی کو چونکا دیا تھا۔

"تو آجاؤ ملنے۔ اسود سے کہو۔"

"وہ۔۔۔ بہت مصروف ہیں۔" عائشہ نے بہانہ بنایا۔

"عذیر کو بھیج دوں؟ ابھی وہ ہسپتال سے آتا ہے تو۔" امی نے بے ساختہ کہا تھا۔ عائشہ گھبرا گئی۔

"نہیں امی! ابھی نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں گی جب آنا ہوگا تو۔" اس نے فوراً" امی کو منع کیا۔ مبادا وہ آج ہی عذیر کو نہ بھیج دیں۔ وہ ابھی کہاں جاسکتی تھی جبکہ گھر میں مہمان بھی تھے۔

"پھر جلدی چکر لگانا۔ آج کل عذیر کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہوں۔ تم آؤگی تو فائنل کریں گے۔ اسود کو بھی ضرور لانا۔" امی نے تاکید کی تھی۔

"کوشش کرتی ہوں۔ کیسی لڑکیاں دیکھیں آپ نے۔" وہ بے ساختہ کچھ پُرجوش ہوئی۔

"ایک تو ڈاکٹر ہے اور دوسری وہ بھی بہت اچھی ہیں۔ فیملیز بھی بہت اعلا۔ مجھے تو ڈاکٹر پسند تھی۔ لیکن عذیر نے منع کردیا۔ کہتا ہے۔ وہ ڈاکٹری کرے گی یا گھر دیکھے گی۔" امی نے اسے تفصیلاً" بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں ایک دو دن تک چکر لگاتی ہوں۔" اس نے حامی بھری اور مریم کا حال احوال پوچھ کر فون بند کردیا۔

بستر پر لیٹتے ہی تکلیف دہ سوچوں نے یلغار کردی تھی۔ اس کو اروما کی آمد بے مقصد نہیں لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ کسی خاص نیت سے آئی تھی۔ اسے تو روزینہ آنٹی کے انداز بھی کھٹک رہے تھے۔ جب سے آئی تھیں۔ عائشہ کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی تھیں۔

گو کہ اسود تو وہی تھا۔ مطلب پرست، دل کرتا تو بات کرتا۔ موڈ ہوتا تو بلاتا، دل چاہتا تو نظر عنایت ڈالتا۔ یوں اسود کے بدلنے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ تو سدا کالا تعلق تھا۔

جانے کتنی دیر ہوگئی۔ عائشہ کا دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ بلاوجہ ہی رونے لگی۔ اور رونے سے اور تو کچھ نہیں ہوا تھا بس دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا اور وہ تھک ہار کر نیند میں کھوگئی تھی۔

پھر جانے کب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ عائشہ نے گردن اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ اس نے گردن کو دائیں گھمایا تو چونک گئی۔ اسود موبائل پہ مصروف تھا۔

"یہ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" عائشہ نے حیرت سے سوچا۔ اسود بھی اسے جاگتا پاکر متوجہ ہوا۔

"بہت نیند آتی ہے تمہیں۔۔۔"

عائشہ نے بڑے ضبط کے ساتھ اس کا طنز حلق میں اتار لیا تھا۔

"سارا دن بہت آرام کرتی ہوں۔ رات بھی جلدی سو جاتی ہوں۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہوں گے؟" عائشہ نے بے ترتیب بال سمیٹ کر جمائی روکی تھی۔ اسود نے کندھے اچکا کر اسے دیکھا۔

"خاصی چہرہ شناس ہو چکی تم۔ بن کہے بات سمجھ جاتی ہو۔" اس نے مزید طنزیہ انداز میں جتا کر کہا تھا۔

"چہرہ شناس نہیں، مزاج شناس کہیں۔" عائشہ نے تصحیح کی۔

"لگتا ہے تمہاری نیند پوری ہو گئی۔ تب ہی دماغ ٹھکانے پہ ہے۔" اس نے موبائل بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ پھر تکیہ دہرا کیا اور اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ یوں کہ عائشہ اب اس کی نگاہوں کے حصار میں تھی۔

"میرا عموما" دماغ ٹھکانے پہ ہی ہوتا ہے۔ آپ نے کب مجھے پاگل پن کے مظاہرے کرتے دیکھا ہے؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"اب نیند کے مزے لوٹ چکی ہو تو کوئی خدمت کر کے ثواب حاصل کر لو۔" اسود نے یکسر بات بدل دی تو عائشہ نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ پھر اٹھتے ہوئی آہستگی سے پوچھا تھا۔

"چائے بنا لاؤں؟" وہ واقعی ہی مزاج آشنا تھی۔ اسود نے سر ہلایا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کڑک سی بنا لاؤ۔" اسود نے انگڑائی لی اور عائشہ اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی تھی۔ عائشہ کے جاتے ہی رونیہ نے سُر نکالنے شروع کر دیے تھے۔ عائشہ جب چائے لے کر آئی تو اسود شدید جھنجلایا ہوا رونیہ کے کاٹ پاس کھڑا تھا۔ اور اپنی طرف سے اسے چپ کروا رہا تھا۔ منہ پہ ہاتھ دبا دبا کر۔ عائشہ نے مگ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور جلدی سے رونیہ کو گود میں لے کر بیڈ پہ آ گئی تھی۔

"یہ بہت روتی ہے۔" فورا" جلا کٹا سا تبصرہ آیا تھا۔

"بچے روتے ہی ہیں۔ اسے بھوک لگی تو رو پڑی۔ اب وہ بول تو نہیں سکتی جو بھوک کا بتا سکے۔" عائشہ نے رسان سے جواب دیا تھا۔ پیٹ میں غذا گئی تو وہ فورا" چپ ہو گئی تھی۔

"تم اسے ٹھوس چیز کھلایا کرو۔ تاکہ پوری رات سکون سے سویا کرے۔" اسود نے ہمیشہ والا مشورہ دیا تھا۔ جسے عائشہ نے خاموشی سے سن لیا تھا کہ وضاحت کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

"تم کو کوئی ضروری بات کرنا تھی؟" چائے پیتے ہوئے اسے خیال آیا۔ "امی کی کال آئی تھی۔" عائشہ نے سوچا کہ اس کا موڈ اچھا ہے تو یہ والی بات ابھی ہی نمٹا لے۔

"تو اس میں کیا نیا ہے؟ وہ تو روزانہ ہی کال کرتی ہیں اور تم میری چغلیاں کرتی ہو۔" اسود نے آرام سے الزام لگا دیا تھا۔ عائشہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"میں نے ایسا کب کیا؟" عائشہ نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"اب میں کیا کیا گنواؤں؟ تمہارا بھائی مجھے ہفتے میں ایک مرتبہ تو ضرور کال کرتا ہے۔ جس کا متن کچھ یوں ہوتا ہے؟ "بیوی اور بچوں کو کبھی باہر کی ہوا بھی لگا دو۔۔۔ گھر والوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور ایسی ہی بے شمار باتیں۔ وہ مجھے بیویوں کے حقوق پہ لمبے لمبے لیکچر دیتا ہے۔ جانے اسے کیوں وہم سا ہو گیا ہے کہ میری ایک چھوڑ کئی بیویاں ہیں۔ جن میں مابدولت انصاف نہیں کر پا رہے اور وہ حقوق و فرائض پہ لیسن دیتا ہے تاکہ میں گناہ گار ہونے سے بچ جاؤں۔"

اسود نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر سنجیدگی سے بتایا۔ عائشہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ یقینی طور پہ عذیر نے ایسا ضرور کہا ہو گا۔ وہ اپنے بہنوئی کے رویے سے کبیدہ خاطر رہتا تھا۔

"ویسے اپنے بھائی سے پوچھ کر بتانا میں نے کون سے "حقوق و فرائض" پورے نہیں کیے؟ کیا اچھا کھانے کو نہیں ملتا؟ پہننے کو نہیں ملتا؟ اولاد نہیں ہے؟ اپنے حساب سے تو میں سارے فرض پورے کر رہا ہوں۔۔۔ پھر تمہارے بھائی کا مشورہ اور لیکچر بنتے تو نہیں۔" اس نے سر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھے اور نیم دراز ہو گیا تھا۔ عائشہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔

"ہاں ٹھیک ہی کہا۔۔۔ کوئی کمی تو نہیں۔ یہی کچھ تو ہوتا ہے۔ باقی بیوی بچوں کے جذبات، احساسات بھاڑ میں جائیں۔ بچے باپ کی توجہ کو ترسیں۔ بیوی کے لیے محبت کا ایک لفظ پیار کا ایک بول نہیں، بچے باپ کو

دیکھ کر سہم جائیں۔ ایک اچھے شوہر اور باپ کو یہی کچھ تو دینا ہوتا ہے؟" وہ اندر تک کلس کر رہ گئی تھی۔

"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ کسی سے بھی۔" عائشہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"ہاں 'ان کو الہام ہی آتے ہوں گے۔" اسود نے پُرسوچ انداز میں سرہلایا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میری تو اتنی بات بھی نہیں ہوتی عذیر سے۔" عائشہ خواہ مخواہ صفائی دے رہی تھی۔

"اچھا! اب تم اصل موضوع پہ آؤ۔" اسود نے اس کے بکھرے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو عائشہ کچھ دیر سوچ میں گم رہی تھی پھر آہستگی سے بولی۔

"امی کی طرف جانا تھا۔"

"کیوں؟ وہاں پہ کترینہ کیف آرہی ہے؟" اسود نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ عائشہ کی آنکھوں میں خفگی سی اتری۔ اس کی بات پہ کبھی اس نے سنجیدگی ظاہر نہیں کی تھی۔ ہمیشہ مذاق ہی اڑا دیتا تھا۔

"امی نے عذیر کے لیے لڑکی دیکھی ہے۔ وہی فائنل کرنی ہے۔ آپ کو بھی بلا رہی تھیں۔" عائشہ خود ہی بتانے لگی۔ وہ سنجیدگی سے سنتا رہا۔

"آپ چلیں گے ساتھ؟" اس نے آس بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ "میں بھی ایک دو دن رہ لوں گی۔" آخر میں اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

"اوں۔؟" وہ کچھ چونکا تھا۔ "کہاں رہنا ہے؟"

"امی کی طرف۔" عائشہ نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے ناگواری سے کہا تھا۔ "گھر کو کون دیکھے گا؟ اب تو آنٹی بھی آگئی ہیں۔ تمہیں ریسٹ کرنے کے بہانے چاہئیں۔"

"اسود!" عائشہ رو دینے کو تھی۔ "آپ ہمیشہ اسی طرح مجھے ڈی گریڈ کرتے ہیں۔ آج سے پہلے میں نے کون سے ریسٹ کرنے کے بہانے بنائے ہیں؟"

"اب ساری رات مکالمے ہی سناؤ گی؟" اسود نے لہجہ تھوڑا دھیما کرلیا تھا۔ عائشہ لب کاٹنے لگی۔

ایک بات تو طے تھی کہ مطلب پرستی اس پہ ختم تھی۔

☆ ☆ ☆

دوسری صبح معمول سے کچھ ہٹ کر تھی۔

دیر سے سونے کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ اب اسود کو جگانا تھا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"سات بج چکے ہیں اسود! اب اٹھ جائیے۔ آپ لیٹ ہو چکے ہیں۔" اس کے رونے سے انداز پہ بمشکل ہی اسود نے آنکھیں کھولی تھیں پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر اچھل ہی پڑا۔

"تم نے مجھے جگایا نہیں۔ بے وقوف عورت! اتنی دیر ہو گئی۔ مجھے ٹائم پہ آفس پہنچنا تھا۔" وہ غصے میں بولتا ہوا اس پہ چڑھ دوڑا تھا۔ پھر عائشہ کے کپکپاتے وجود کو دیکھ کر ایک دم چپ کر گیا۔

"میرے لیے ناشتہ مت بناؤ' جب بچیاں اٹھیں گی تو سب کے لیے ایک ساتھ بنا لینا۔"

وہ کہتا ہوا واش روم میں چلا گیا تھا۔

اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔ پھر بھی شال لپیٹ کر کچن میں آگئی۔ گرم دودھ اور سلائس کے ساتھ ابلا انڈا لے کر جب وہ اندر آئی تو کچھ ہی دیر بعد اسود بھی باہر نکل آیا تھا۔ تولیے سے سر رگڑتے ہوئے اس کی نگاہ ٹرے پہ پڑی تو اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا۔"

"تو آپ بھوکے آفس جاتے؟ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا؟" اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔

"کیا حرج تھا۔ میں آفس میں چائے کے ساتھ اسنیکس لے لیتا۔" وہ جلدی سے گرم دودھ کے ساتھ انڈا کھانے لگا۔

"میرے لیے اتنی ہمدردی؟ یقین نہیں آرہا۔" عائشہ نے واقعی بے یقین سے لہجے میں پوچھا تھا۔

اسود نے ترچھی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔

"تمہیں بیمار کر کے ریسٹ کا موقع دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" اس نے لمحوں میں اس کی ساری خوش

گملائی میں سے ہوا نکال دی تھی۔ وہ چپ سی رہ گئی تھی۔ اسود کو دل رکھنا بالکل نہیں آتا تھا۔ کیا تھا جو منہ سے کچھ نہ ہی کہتا۔ عائشہ نے افسردگی کے عالم میں تین چار چھینکیں ماری تھیں۔ ٹھنڈا موسم اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

اسے عائشہ کے چھینکنے پہ غصہ آرہا تھا۔ جانے کیوں اسے بیمار دیکھ کر اس کا مزاج بگڑ جاتا تھا۔ اس کا دل کرتا عائشہ بس۔ چاق و چوبند کام کرتی رہے۔ بستر پہ لیٹی ہو دکھائی نہ دے۔

"ناشتے کے بعد میڈیسن لے لینا۔ خبردار' جو لمبا بیمار ہونے کی جرات کی۔" اس کے حکم نامے پہ عائشہ سرہلا کے رہ گئی تھی۔ اسود تیزی سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج میں ماما بیٹھی تھیں۔ وہ لحہ بھر کے لیے رک گیا۔

"آج بہت دیر کردی بیٹا! اور یہ عائشہ نہیں اٹھی ابھی تک؟" انہیں تشویش لاحق ہوئی۔ عائشہ نے کبھی دیر تک کمرے میں بند رہنے کا رواج اوائل شادی کے دنوں میں بھی نہیں ڈالا تھا۔ ان کی فکر یقینی تھی۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اسود نے مختصرا" بتایا۔ ماما کا تفکر کچھ اور بڑھا تھا۔

"کیا ہوا...؟"

"موسمی فلو..." اسود اپنا سامان اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔ ماما کے چہرے پہ ناگواری سی آگئی تھی۔

"تو اب ناشتہ کون بنائے گا۔ ویسے فلو اتنی بڑی بیماری تو نہیں... کیا کھایا ہے اس نے؟" انہوں نے ایک ساتھ کئی سوال کرڈالے تھے۔ انہیں ایک دم ٹینشن لاحق ہو چکی تھی۔ کون گھر سنبھالے گا؟ کون بچیاں سنبھالے گا؟ کون کوکنگ کرے گا؟ ان کا سوالنامہ اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

"خود ہی کرلے گی۔" وہ جز بز سا ہوا۔ تب تک عائشہ یقینی طور پہ ان کی "تکرار" سن کر باہر آگئی تھی۔ اسود نے اک نظر عائشہ کو دیکھا۔ پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔ اور ماما اسے گہری نگاہ سے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ عائشہ کی آنکھوں سے پانی آرہا تھا۔ ناک سرخ تھی اور چہرہ بھیگا بھیگا۔ گال تپ رہے تھے۔

وہ کچن میں گرم دودھ فیڈر میں بھر رہی تھی کہ علیزہ بھی آگئی۔

"بھائی نے آج ناشتہ نہیں کیا؟" علیزہ چولہا ٹھنڈا دیکھ کر چونکی۔ کیونکہ اسود کچھ بھی ہو جاتا پراٹھے کے بغیر صبح کا آغاز نہیں کرتا تھا۔

"نہیں' بس دودھ اور سلائس ہی کھایا تھا۔ دیر جو ہو گئی تھی۔ آنکھ نہیں کھلی۔" عائشہ اسے بتا رہی تھی۔

"او... تو یہ مہربانی بیگم کے خیال سے کی؟ تب ہی فرمارہے تھے۔ علیزہ! تم ناشتہ بناؤ جاکر۔ عائشہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ ہنسی۔

ویسے وہ اچھی نیچر کی تھی لیکن جب ماما کا موڈ آف ہوتا تو دونوں بیٹیاں انہی کے موڈ میں چلی جاتی تھیں۔ اور اسود تو ان سب پہ بھاری تھا۔ وہ اپنے ہی موڈ کے تابع رہتا تھا۔

"ویسے اتنا ہمدرد نہیں ہے تمہارا بھائی۔ مطلب کا پورا ہے۔ سوچا ہوگا۔ زیادہ نہ بیمار پڑجاؤں۔ پھر گھر کون سنبھالے گا۔" عائشہ کی سچی بات پہ علیزہ نے منہ بنالیا تھا۔

"تم ہر بات میں نیگیٹو پہلو نکال لیتی ہو۔"

"حقیقت بیان کرتی ہوں۔" وہ برجستہ بولی تھی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا اور وہ چونک گئی۔

"اسود تمہاری طرف گئے تھے آفس جانے سے پہلے؟" اس کے انداز میں کچھ تو تھا جو علیزہ چونک گئی تھی۔

"کیا نہیں جانا چاہیے تھا؟ حنان' ان کے ساتھ ہی تو جاتے ہیں۔" علیزہ نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔

عائشہ قدرے سنبھل گئی تھی۔ پھر سرسری انداز میں بولی۔ "آنٹی اور اروما کا بھی ناشتہ بنادوں۔"

"نہیں۔ ناشتہ میں بناتی ہوں۔ تم دیکھو' رونیہ اٹھ گئی ہے شاید۔ پھر آرام کرو۔ میرا بھائی اسپیشلی مجھے تاکید کرکے گیا ہے۔" علیزہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔ عائشہ اس اپنائیت پہ تشکرانہ انداز میں دیکھتی

باہر نکل آئی تھی۔ علیزہ اپنے بھائی کی طرح کبھی کبھار ہی مہمان ہوتی تھی۔

✡ ✡ ✡

اور پھر ہمیشہ کی طرح وہی ہوا۔

اسود اسے میکے لے جانا بھول گیا۔ امی کی دوبارہ صبح کال آئی تو عائشہ نے بہت دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسود کو آفس میں فون کھڑکا دیا تھا۔ امی نے اسے وارننگ دی تھی کہ اگر وہ آج نہ آئی تو امی اکیلی ہی لڑکی دیکھنے چلی جائیں گی۔

اسود نے پہلی بیل پہ کال ریسیو کرلی تھی۔ گو کہ بہت مصروف لگ رہا تھا پھر بھی عائشہ کی آواز سن کر عجلت میں بولا۔

"خیریت تو ہے؟ ابھی صبح تو ملاقات ہوئی تھی۔"

"آپ کو کچھ یاد کروانا تھا۔" عائشہ نے بے قابو ہوتے غصے کو کنٹرول میں لاتے ہوئے کہا۔

"میری یادداشت کو گھر آنے کے بعد بھی تازہ کیا جا سکتا تھا۔ ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی۔" اسود نے سنجیدگی سے جتایا۔

"مجھے امی کے گھر جانا ہے ابھی اور آپ کے پاس تو وقت نہیں' پرسوں آنٹی روزینہ کو بینک لے گئے تھے۔ کل کا دن اروما کے ساتھ بزی رہے۔ آج بھی کوئی نہ کوئی مصروفیت ہوگی۔" عائشہ بھی جتلائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"او... نو۔" اسود نے لب بھینچے۔ "میں آج بھی فارغ نہیں ہوں۔ ہمارے سی او کے ہاں بیٹا ہوا ہے وہاں جانے کا ارادہ ہے۔ تم کسی اور دن چلی جانا۔"

"میرا آج ہی جانا ضروری ہے۔ سی او کا بیٹا کسی اور دن دیکھ آئیے گا۔" عائشہ کا انداز سنجیدہ تھا۔

"ایک تو تم بیویاں بھی نا... اپنی منوا کے ہی دم لیتی ہو۔ یوں کرو' عذیر کو بلوالو۔" اسود نے عجلت میں مشورے سے نوازا تھا۔

"تو آپ نہیں جائیں گے؟" وہ مایوس سی ہوئی۔

"میرا جانا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں۔" اسود نے کچھ سوچ کر کہا۔ "تم عذیر کے ساتھ چلی جانا اور رات کو رہنے کی ضرورت نہیں۔ رات کو گھر آجانا۔" اس نے آخر میں تاکید کی تھی۔

"اطلاعاً عرض ہے کہ اگر عذیر فارغ ہوتا تو آپ کی اتنی منتیں نہ کرتی۔" عائشہ نے اندر کی کھولن دباتے ہوئے ملامت سے بتایا۔ اسود کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوبا۔

"اوکے' میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں۔ تم تب تک بچیوں کو تیار کرلو۔" اسود نے مسئلے کا فوری حل نکال کر فون بند کردیا تھا۔

پھر ایسی ہی بے دلی سے اس نے بچیوں کو تیار کیا تھا۔ وہ نانو کے گھر جانے کی خوشی میں چہکتی پھر رہی تھیں۔ جب وہ چینج کرکے باہر آئی تو علینہ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ ننھی منی پریوں کو تیار دیکھ کر کچھ حیران ہوئی۔ "کہیں جانے کی تیاری ہے؟"

"امی کی طرف جارہی ہوں۔ عذیر کے لیے لڑکی دیکھنے جانا تھا۔" اس نے بیک وقت ماما اور علینہ دونوں کو بتایا تھا... علینہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ اس نے اتنا ضرور کہا۔

"بھائی نہیں جائیں گے؟"

"نہیں' وہ بزی ہیں۔" عائشہ کا لہجہ روکھا سا ہوگیا تھا۔ جب بھی اسے میکے جانا ہوتا تھا۔ اسود اسی طرح کے بہانے بنالیتا تھا۔ اس کے میکے والوں کو اس نے کبھی قابل اعتنا نہیں جانا تھا۔

"کمال ہے... ابھی اروما سے تو کوئی اور ہی پروگرام بن رہا تھا۔" علینہ زیر لب بڑبڑائی۔ ماما نے اسے گھور کر دیکھا۔ ابھی اروما آئی تھی اور وہ انہیں کچھ اور ہی بتا کر گئی تھی۔

"معاً" ڈرائیور نے گیٹ پہ ہارن بجایا تو عائشہ بچیوں کو اٹھا کر باہر نکل گئی۔ پیچھے ماما نے علینہ کے خوب لتے لیے۔ یہ تو شکر تھا عائشہ نے سنا نہیں تھا۔ ورنہ وہ میکے جانے کا پروگرام ہی کینسل کردیتی۔

"کیا ضرورت تھی' تمہیں بکواس کرنے کی۔" ماما نے اسے بری طرح گھرکا تھا۔

علینہ ہکا بکا رہ گئی۔ "میں نے کیا کہا ہے؟"

"عائشہ کے سامنے کیا ضرورت تھی۔ اروما کا پروگرام بتانے کی۔" ماما نے خفگی سے جتایا تھا۔

"تو اس میں کیا حرج ہے؟ بھابھی کو پتا تو چلنا ہی ہے۔" علینہ کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ احمق لڑکی! ابھی اسے بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔" ان کا انداز رازدارانہ تھا۔

علینہ کچھ چونک گئی تھی۔

"کس چیز کی بھنک؟" وہ قطعاً "نہیں سمجھی تھی۔ اور حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ماما کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ علینہ کو ان کی خفیہ میٹنگز کا بھلا کیا پتا تھا؟

"کچھ نہیں۔" ماما نے فوراً" لہجہ بدل لیا۔ لیکن علینہ کچھ کھٹک گئی تھی۔

"ماما! یہ آج کل بھائی اور اروما کی انڈر سٹینڈنگ کچھ زیادہ نہیں بڑھ رہی۔۔۔ بہت وقت گزارا جارہا ہے ایک دوسرے کے ساتھ۔" اس کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا اور ناگواری بھی۔ ماما کو بہت ہی برا لگا تھا۔

"تو کون سی نئی بات ہے؟ کزنز ہیں' دوست ہیں۔ دہری رشتے داری ہے۔ اس میں کیا نیا پن ہے؟" انہوں نے ناگواری سے جواب دیا تھا۔

"کبھی دوست تھے۔ بیچ میں تین سال بھی آئے۔ آپ بھول گئی ہیں سب کچھ۔" علینہ چبا چبا کر بولی۔

"تو کیا پرانی باتوں کو سینے سے لگا کر رکھیں؟" ماما کا لہجہ بھی سرد ہو گیا تھا۔

"یعنی آپ سب کچھ بھول گئی ہیں؟" علینہ کو جیسے شاک لگا تھا۔ "اور بھول تو سب کچھ بھائی بھی گیا ہے۔ ایسے ملے اروما سے جیسے کبھی بچھڑے ہی نہیں تھے۔ اور بیچ میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔" وہ افسردگی کے عالم میں کہتی جارہی تھی۔

"تو کیا کریں؟ گھر سے باہر نکال دیں اروما کو۔ فضول لڑکی! ہماری بیٹی کے سسرال کا بھی مسئلہ ہے۔" ماما اسے جھڑک رہی تھیں۔ علینہ کے تاثرات بگڑ گئے۔

"پھر بات یہیں تک ہی رکھیں۔ بہت آگے تک نہ لے جائیں۔" علینہ دھپ دھپ کرتی اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ جبکہ ماما ہکا بکا رہ گئیں۔

یہ علینہ کو کیا ہوا تھا؟ اور اس کی سوچ کہاں تک جاری تھی؟ کیا اس نے اندر پکتی کھچڑی کی بو پالی تھی۔ وہ ان کے دل میں دبی خواہش کو جان گئی تھی۔ اگر ایسا تھا تو بالکل بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس نے ایک بھرپور دن امی کے گھر گزارا تھا۔ عذیر کے لیے دیکھی لڑکی اسے بھی پسند آگئی تھی۔ وہ لوگ بہت ہی مسرور سے گھر واپس آئے تھے۔ بچیاں بھی بہت خوش تھیں۔ عذیر انہیں سیر کروانے لے گیا تھا۔ پھر ڈھیر ساری شاپنگ بھی کروائی۔ واپسی پہ میکڈونلڈ بھی لے کر گیا تھا۔ اور وہیں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے خاصا بے چین کر گیا تھا۔ پھر وہ جلد ہی بچیوں کو لے کر گھر آگیا۔

امی اور عائشہ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

عذیر وہیں ان کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

"تو پھر تمہاری ساس کی جٹھانی مستقل پاکستان آگئی ہیں؟" امی نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا تھا۔

"ان کا گھر ہے یہاں کیا پتا اب واپس نہ جائیں۔" اس کے جواب نے امی کی تسلی نہیں کروائی تھی۔

"اور ان کی بیٹی؟" امی نے متفکر انداز میں پوچھا۔ عذیر بھی ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ میرڈ ہے امی۔" عائشہ نے دھیمی آواز میں بتایا تو امی کا رکا رکا سا سانس قدرے بحال ہوا۔

"تو واپس کب جائے گی؟" وہ ماں تھیں نا۔ بیٹی کے اندر پنپتے خدشات از خود ان کے اندر منتقل ہو گئے تھے۔

"پتا نہیں۔" عائشہ کچھ چڑ گئی تھی۔

"جانتی ہو نا۔۔۔ وہ اسود کی سابقہ منکوحہ ہے۔" امی نے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ عائشہ نے ایک سرد سی آہ سینے کی قید سے نکالی تھی۔

"پتا ہے مجھے۔" اس کا انداز جلا کٹا سا تھا۔

"پھر اسے اسود سے دور ہی رکھو۔" امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ عائشہ انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"میں کیسے روک سکتی ہوں۔ وہ کزنز ہیں۔" وہ لاچاری سے کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی تم اپنے شوہر پہ نظر رکھو۔ دیکھو عائشہ! تمہارا کھونٹا کمزور ہے۔ بیٹا ہو تو قدم جمتے ہیں۔ آج کل تو لوگ بیٹیوں کی مسلسل پیدائش پہ طلاق دے کر فارغ کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ہمارے پرانے محلے میں۔" امی جان نہ جانے کون سی اسٹوری سنانے والی تھیں۔ تب ہی عذیر نے فوراً" ہی مداخلت کی تھی۔

"کس بحث میں پڑ گئے آپ لوگ؟ اور امی! آپ کیوں عائشہ کو پریشان کر رہی ہیں۔ اسود ایسا نہیں ہے اور نہ ہی اس کی فیملی ایسی ہے۔ آپ بیکار کے وہموں میں اسے مت ڈالیں۔" عذیر نے بہت طریقے سے انہیں سمجھایا تھا۔ امی بس ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔

"اسود کی کلاس میں بیٹا ہونے پہ طلاقیں نہیں دی جاتیں۔ لوگ ایک ایک بیٹی پہ بھی صابر شاکر ہوتے ہیں۔ پھر رافیہ آنٹی بہت ایجوکیٹڈ ہیں۔ وہ ایسا کیوں خیال کریں گی۔" وہ عائشہ کو ذہنی دباؤ سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ جو امی کی باتوں سے ہراساں ہوتی جا رہی تھی۔

"رہنے دو بیٹا! تنگ ذہن لوگ ہر کلاس میں تنگ ذہن ہی رہتے ہیں۔ یاد نہیں، رونیہ کی پیدائش پہ کیسا واویلا کیا تھا اس کی ساس نے۔ کتنے دن صدمے کی حالت میں بیمار پڑی رہی تھیں۔ کسی سے کلام تک نہیں کرتی تھیں۔

لوگ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کیا پتا، پوتے کی خواہش میں وہ اسود کی دوسری شادی کروا دیں۔"

امی اپنے خدشات ظاہر کر رہی تھیں اور عائشہ کا دل ڈوب رہا تھا۔ امی کا کہا غلط نہیں تھا۔ اس کی ساس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

"اسی لیے سمجھا رہی ہوں۔ اپنے شوہر کے قریب رہو۔ اسے قابو میں رکھو۔" امی نے بیٹی کو ملامت سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اس کے دل میں بیٹیوں سے محبت کا احساس جگاؤ۔ اولاد تو زنجیر ہوتی ہے میاں بیوی کے رشتے میں۔ اگر یہی زنجیر کمزور پڑ جائے تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔"

امی کا کہا۔ ایک ایک لفظ درست تھا۔ وہ جو کہہ رہی تھیں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ رہی تھیں۔ عذیر بھی امی کی باتوں سے متفق تھا۔ لیکن وہ عائشہ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے انہیں موضوع سے ہٹاتے ہوئے بولا تھا۔

"اب چلو تمہیں گھر ڈراپ کر دوں۔ پھر کہو گی دیر کر دی۔" عذیر بچیوں کا سامان کار میں رکھنے کے لیے اٹھ گیا تو عائشہ بھی عجلت میں رونیہ کو اٹھا کر مریم اور امی سے ملنے کے بعد باہر نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

گاڑی میں معمول سے بڑھ کے خاموشی تھی۔

عذیر خاموشی کے ساتھ ڈرائیونگ کرتا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بار بار میکڈونلڈ کا خیال آتا۔ ایسا منظر جو ذہن سے ہٹتا نہیں تھا۔

عائشہ نے بتایا تھا اسود کو کوئی ضروری کام تھا۔ اس لیے وہ آ نہیں سکا تھا۔ تو کیا یہی ضروری کام تھا؟

وہ ماڈرن سی طرح دار لڑکی اسود کی کزن تھی۔ علیزہ کی نند۔ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے کچھ متفکر بھی تھا۔ ان دونوں کے درمیان خاصی بے تکلفی بھی لگ رہی تھی۔

ایسے ہی عذیر نے بے ارادہ پوچھ لیا۔ "یہ اروما کا کیا چکر ہے؟ اسود کا نکاح کیوں ٹوٹا تھا؟"

عذیر کے استفسار پہ عائشہ اپنی تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"مجھے زیادہ تفصیل نہیں معلوم ــــ اروما کو اسکالرشپ ملا تو اس نے باہر جانے کی ضد پکڑ لی۔ ماما کو بیٹے کی شادی کرنے کی جلدی تھی۔ اور اروما فوری طور

پہ شادی کے لیے تیار نہیں تھی۔ یوں اروما باہر چلی گئی اور وہیں سے اس نے اسود کو کہا کہ اسے ڈائیورس دے اور خود شادی کرلے۔ علیزہ نے ہی بتایا تھا۔ وہ اپنے کسی کلاس فیلو کے چکر میں تھی۔ یوں باہمی رضامندی سے طلاق ہو گئی تھی۔ کوئی لڑائی تماشا نہیں ہوا۔ یہ طلاق کے بعد بھی اچھے دوست رہے۔ ٹیلی فونک رابطے اور اسکائپ پہ ملاقاتیں۔ وہی سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔" عائشہ کو جو کچھ معلوم تھا۔ وہ بتادیا۔ عذیر پرسوچ انداز میں جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

"میں نے آج انہیں میکڈونلڈ میں دیکھا تھا۔" کچھ دیر بعد اس نے عائشہ کو بتا ہی دیا۔ اور عائشہ جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"اسود اور اروما کو؟" عائشہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"ہاں۔" عذیر نے سنجیدگی سے سرہلایا تھا۔

"اسود' اروما کے ساتھ تھے؟" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

معا" اس کے سیل پہ اسود کی کال آنے لگی۔ اس پل عائشہ کا قطعا" بھی اسود کی کال ریسیو کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر بلنک کرتی اسکرین کو نظرانداز کردیا تھا۔

"اسود کی کال آرہی ہے۔" عذیر نے ۔ ڈیش بورڈ پہ رکھے فون پہ نظر ڈالی۔ عائشہ نگاہیں موڑے شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔

"عائشہ! کال پک کرو۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"مجھے نہیں کرنی بات۔" وہ بیزاری سے بولی تھی۔ عذیر نے خفا انداز میں بہن کو دیکھا "بدگمان مت ہو۔ کیا پتا' وہ کسی کام سے ہی وہاں آیا ہو۔" عذیر بہن کو ذہنی دباؤ سے نکالنا چاہتا تھا۔

"امی ٹھیک کہتی ہیں میں ہی جان بوجھ کر خوش گمانی میں مبتلا ہوں۔ دیکھ لینا۔ ایک دن ایسا ہی ہوگا۔" وہ مایوسی کی انتہا پہ پہنچ چکی تھی۔

"اور کیا میں مر گیا ہوں؟ تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اسود کچھ الٹا سیدھا سوچے تو سہی۔" عذیر کے برادرانہ جذبات گرم ہو گئے تھے۔ عائشہ تلخی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"تم نہیں جانتے۔ وہ کتنا سیل فش انسان ہے۔ اپنے سامنے کسی کو نہیں دیکھتا۔ حتیٰ کہ بچیوں کو بھی نہیں۔ جو میں خود پہ سہتی ہوں۔ وہ تمہیں نہیں پتا۔ تم لوگ نہیں جانتے۔"

وہ دل ہی دل میں سوچتی رہ گئی تھی۔ زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا۔ ہاں' کچھ دکھ اسے اکیلے ہی جھیلنے تھے۔ گھر کے سامنے کار رکی تو عائشہ کی سلگتی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے تھے۔ وہ گہرا سانس کھینچتی خود کو پھر سے جوڑنے لگی۔

☆ ☆ ☆

گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ جانے سب لوگ کہاں تھے۔

عائشہ نے رونیہ کو کاٹ میں لٹایا اور سونیا کے کپڑے چینج کرنے لگی تھی۔ اس کا ڈائپر گیلا تھا۔ کیبنٹ چیک کیا تو اس میں ایک بھی ڈائپر نہیں تھا۔ واپسی پہ اسے خیال ہی نہیں آیا تھا ورنہ عذیر سے ہی کہہ دیتی۔ اب بھلا کیا کرے؟ وہ سوچ میں گم ہوتی باہر آئی تو ماما صوفے پہ بیٹھی نظر آئی تھیں۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور علیزہ کے گھر کا سامنے کا حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ تو اسود وہیں تھا؟

کچھ دیر بعد علیزہ کاشان ہاتھ میں چکن ونگ پکڑے کھاتا ہوا اندر آیا تھا۔ دونوں بچیاں بھی لاؤنج میں تھیں۔ انہوں نے شان کے ہاتھ میں پکڑے ونگ کو دیکھا تھا۔ وہ بسورنے لگیں مگر عائشہ نے توجہ نہیں دی تھی۔ ماما' سونیا کو بغیر ڈائپر کے دیکھ کر چلا اٹھی تھیں۔

"عائشہ! کارپٹ گندا کردے گی۔ ابھی پچھلے ماہ تو نیا ڈلوایا ہے۔ ناپاک ہو جائے گا۔ کتنی لاپروا ہو تم۔" ماما کا جیسے ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔

انہیں اپنے گھر کی چیزوں سے بڑا پیار تھا۔ کسی بچے کو کچھ بھی خراب کرنے نہیں دیتی تھیں۔ ٹی وی ٹرالی

سے لے کر کرسٹل لیمپلز' دیواریں اور ڈیکوریشنز تک ہر چیز بچوں کی پہنچ سے دور تھی۔ اس معاملے میں وہ بچوں کو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھیں۔

"ماما! ڈائپرز ختم ہوگئے ہیں۔" عائشہ نے سونیا کو اٹھا کر شرمندگی سے بتایا تھا۔

"کیا؟ تو ابھی اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھیں۔ کسی سپر اسٹور سے لیتی آتیں۔ کون سا لاکھوں کے آتے۔" اس کی توقع کے عین مطابق وہ شروع ہو چکی تھیں۔

تب ہی اسود بھی پہنچ گیا تھا۔

"یہ کب آئی ہے؟" اس نے عائشہ کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا۔

"ابھی' عذیر چھوڑ گیا ہے۔" ماما نے تنک کر جواب دیا تھا۔

"اچھا!! میری تو کال ریسیو نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا' شاید ادھر ہی رہنا ہو۔" اسود نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں" آپ تو خوش ہوں گے۔ رنگ رلیاں منانے کا مزید موقع مل رہا تھا۔" عائشہ اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی تھی۔

"ابھی کیا میٹنگ چل رہی ہے؟" اسود کشیدہ صورت حال کا پس منظر جاننا چاہتا تھا۔ عائشہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ اور ماما نے تیور اور بھی خراب کر لیے تھے۔

"ڈائپرز ختم ہیں۔ اب رات کیسے گزرے گی۔ بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ رستے میں اتر کر توفیق نہیں ہوئی لینے کی۔" وہ دوبارہ شروع ہو چکی تھیں۔ اسود نے گہرا سانس بھرا۔ علیمہ بیزار کھڑی تھی۔

"میں لے آتا ہوں۔" اسود نے فوراً" اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ماما نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"یہ تو چاہتی ہی یہی تھی۔۔۔ ہونہہ۔" ان کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ جانے کیوں آج کل وہ بات بہ بات عائشہ سے بیزار نظر آتی تھیں۔

زونیہ باپ کو باہر جاتا دیکھ کر فوراً" پیچھے لپکی تھی۔

"بابا! میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ مجھے بھی ونگز کھانا ہے۔" وہ شان کے ہاتھ میں ونگز کی باقیات دیکھ کر رہ نہیں سکی تھی۔ زونیہ کی فرمائش پہ ماما کے تاثرات میں اور بھی برہمی اتر آئی تھی۔

"وہاں سے ندیدیاں بھوکی اٹھ کر آگئی ہیں۔" ماما کی بڑبڑاہٹ اسود کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر پہنچی بھی تھی تو وہ جان بوجھ کر نظرانداز کر چکا تھا۔ تاہم وہ زونیہ کو ساتھ نہیں لے کر گیا۔ وہ روتی چلاتی رہ گئی تھی۔

"ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ عائشہ بھابھی کی ذرا ذرا سی بات آپ کو چبھنے لگی ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جانے اب کیا ہوا ہے۔"

"مجھے پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ دماغ خراب ہے میرا۔" ماما کو غصہ ہی آگیا تھا۔ علیمہ ہکابکا رہ گئی۔

"آپ پہلے ایسی نہیں تھیں۔ اب ایسا ری ایکٹ کرنے لگی ہیں۔ اور یہ سب آنٹی کی کمپنی کا اثر ہے۔" علیمہ نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔ اتنے دنوں سے جو بات وہ سوچ رہی تھی بالآخر زبان پر آگئی تھی۔

"بھابھی کا یہاں کیا ذکر؟" ماما جز بز سی ہو گئیں۔

"ان ہی کی وجہ سے آپ کا موڈ بگڑتا ہے۔ وہ آپ کو مس گائیڈ کرتی ہیں اور ہمارے گھر کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ وہ خود اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ بہت اچھی ہیں جبکہ آپ کو۔" علیمہ غصے میں ہونٹ بھینچ کر رہ گئی تھی۔

ماما نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے۔ بھابھی کو الزام دیتے ہوئے۔ وہ کون سا غلط کہتی ہیں۔ یہ منحوس جب سے آئی ہے' ہمارے گھر سے رحمت ہی اٹھ گئی ہے۔"

ماما نے ایک الگ ہی بات چھیڑ دی تھی۔ اس کا دماغ سنسنا گیا تھا۔

"ماما! فار گاڈ سیک۔۔۔ کیسی لینگویج یوز کر رہی ہیں آپ۔ کون سی رحمت اٹھ گئی یہاں سے۔" وہ غصے میں بھڑک اٹھی۔ "بس کریں آپ۔۔۔ بہت ہو گیا۔ آنٹی سے ہمارے گھر کا سکون برداشت نہیں ہوا۔ اپنی بیٹی تو آباد ہو نہیں سکی۔ دوسروں کی بھی اجاڑنا چاہتی ہیں۔"

علینہ کے تلخ لہجے پہ ماما کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا تھا۔
"بہت بدتمیز ہو چکی ہو تم۔ شرم نہیں آتی۔ بڑوں کی عزت کا کچھ خیال نہیں رہا تمہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہو۔"
"اور جو بڑے رول پلے کر رہے ہیں۔ وہ بھی نظر آ رہا ہے مجھے۔" علینہ نے دوبدو کہا تھا۔
"علینہ! اپنا منہ بند رکھو۔" وہ زچ ہو کر رہ گئی تھیں۔
"مزید یہ کہ جو آپ سوچ رہی ہیں۔ ویسا ممکن ہی نہیں اور نہ ہو گا۔ سنا آپ نے۔ سو یہ پُراسرار میٹنگز کرنا بند کر دیں۔" علینہ انہیں بہت کچھ "جتا" کر اٹھ کر چلی گئی تھی۔ ماما ہکا بکا رہ گئیں۔ یعنی علینہ کو خبر تھی کہ وہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

☆ ☆ ☆

عائشہ بے دم سی ہو کر زونیہ کو اٹھا کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ ماما اور علینہ کی کچھ نہ کچھ گفتگو اس کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ تب سے لے کر اب تک عائشہ کا دل عجیب سے وسوسوں کی زد میں تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔
جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ وہ بچوں کو سلاتے سلاتے بے آواز روتی رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد اسود کی آواز آئی تھی۔ وہ مارکیٹ سے آچکا تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے تمام پیکٹس ٹیبل پہ رکھے اور عائشہ کو آواز دی۔
"اٹھ کر چیزیں دیکھ لو۔ ڈائپرز، سیریل، نمکو، کیز، چاکلیٹس وغیرہ سب کچھ آگیا ہے۔ ایک دم ان کے سامنے مت رکھ دیا کرو۔" اسود نے سارے شاپرز ڈھیر کر دیے تھے۔
عائشہ بے حس پڑی رہی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ اسود نے خفگی سے عائشہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ منہ پہ بازو رکھے تمام تاثرات چھپائے پڑی تھی۔
"عائشہ!" اسود کی آواز میں نمایاں خفگی تھی۔ "سنا نہیں تم نے۔"
"سن لیا ہے۔ اٹھا لوں گی۔" وہ بھاری آواز میں بولی تھی۔ اسود کچھ چونک گیا۔
"ابھی اٹھو۔" اس کے انداز میں تحکم تھا۔ عائشہ کو لامحالہ اٹھنا ہی پڑا تھا۔
وہ اٹھی اور تمام پیکٹس اٹھا کر سنبھالے۔ ایک پیکٹ میں ونگز بھی تھے۔ عائشہ کچھ چونک گئی تھی۔ تو اسود کو زونیہ کا رونا اور فرمائش یاد رہی تھی؟
وہ کچن سے اسود کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ تب تک وہ اپنی جگہ پہ لیٹ چکا تھا۔ عائشہ نے اسے چائے دی تھی۔ سونیا کا ڈائپر بدلا گیا۔ دونوں کے منہ میں فیڈر لگائے تھے۔ پھر خود بھی اپنی جگہ پہ لیٹ گئی۔ اس کے لیٹتے ہی اسود اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟ بھائی کا رشتہ طے کرنے گئی تھیں۔ منہ لٹکا کر آگئی ہو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کا پژمردہ چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی لگ رہی تھیں۔ عائشہ نگاہ چرا گئی۔
"لڑکی والوں نے جواب دے دیا ہے؟" اسود نے پھر سے گوہر افشانی کی تو عائشہ اندر تک سلگ گئی۔
"جواب کیوں دیں گے؟ میرے بھائی میں کیا کمی ہے؟" اس نے تنک کر کہا تھا۔
"تو پھر منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟" اسود نے چائے پیتے ہوئے پوچھا تھا۔ عائشہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔
"تو کیا کرنا چاہیے مجھے؟"
"کم از کم منہ سجا کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔" اسود نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
"جب سب آپ کا وہاں پوچھیں گے اور میں آپ کی مصروفیات کا ڈھول پیٹوں گی۔ اور وہی لوگ آپ کو ہوٹلنگ کرتے دیکھ لیں گے تو پھر اس کے بعد میں کیا کروں گی؟ کیا بہت خوش ہوں گی میں؟" وہ جیسے چیخ کر بولی تھی۔ اسود کو چائے پیتے ہوئے اچھو لگ گیا تھا۔ وہ بمشکل ہی خود کو سنبھال کر سیدھا ہوا۔
"کس نے یہ ہوائی اڑائی ہے؟" اسود کچھ دیر بعد ناک چڑھا کر پوچھ رہا تھا۔

عائشہ نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا تھا۔
"عذیر نے۔"
"او۔۔۔ اچھا۔" اسے تسلیم کرتے ہی بنی تھی۔ "وہ تو اروما نے خوامخواہ دماغ کھالیا تھا۔ تبھی جانا پڑا۔ اسے وہاں کسی سے ملنا تھا۔ میں نے بس ڈراپ کیا تھا اسے اور ہسپتال چلا گیا۔" اسود نے جانے کیوں وضاحت کی تھی۔ عائشہ کو قطعاً یقین نہیں آیا تھا۔
"اور ابھی جو علیزہ کے گھر میٹنگز چل رہی تھی۔ اتنے اتنے گھنٹے وہاں بیٹھنے کی کیا تک ہے۔" وہ جیسے کھول اٹھی تھی۔
"وہ میری بہن کا گھر ہے۔ وہاں جانے پہ کرفیو ہے کیا؟" اسود نے تیکھے چتونوں سے اسے گھور کر جتایا تھا۔
"پہلے بھی تو بہن کا ہی گھر تھا۔" عائشہ سلگی۔
اسود مگ ایک طرف رکھ کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو!"
"جو آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔ یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں۔" عائشہ نے کروٹ بدل کر جواب دیا تھا۔ اسود کے سر پہ جا لگی تھی۔ اس نے عائشہ کا بازو اپنی طرف دبوچ کر کھینچا۔
"میری بات سنو۔ یہ کیا پہیلیاں شروع کر رکھی ہیں۔ اس گفتگو کا مقصد کیا ہے؟" وہ برہم ہوا تھا۔
"میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ کیا میرے بھائی کے لیے آپ آدھا گھنٹہ نہیں نکال سکتے تھے۔ اروما کے لیے اتنا لمبا راؤنڈ لیا۔ ایک الگ روٹ سے گھنٹہ بھر ڈرائیو کر کے واپس ہسپتال پہنچے۔۔۔ اور ہمارے لیے آپ کے پاس دس منٹ بھی نہیں تھے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے شکوہ بر آمد ہوا تھا۔ اسود کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔ "عذیر کا رشتہ ہی ہوا ہے نا۔۔۔ شادی تھوڑی ہو گئی ہے۔ جس میں شرکت سے میں محروم رہا ہوں یا اس کا ولیمہ مس کر دیا ہے؟"
عائشہ نے بے ساختہ کروٹ اس کی طرف بدلی۔
"اسود۔۔۔!" وہ دکھ اور کرب کی اتھاہ میں ڈوب کر ابھری تھی۔
"آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟" عائشہ رو دینے کو تھی۔ آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گئی۔
اسود نے چونک کر اس کی بھری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔
"بہت دیر بعد تم نے پہلی مرتبہ عقل مندانہ سوال کیا ہے۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں؟" اس نے تھوڑی دیر سوچنے کی اداکاری کی تھی۔ پھر ذرا قریب کھسکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔
"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟" وہ نرم گرم نگاہوں سے دیکھتا کچھ شریر ہوا تھا۔
"اچھی بیویاں خود ہی اندازہ لگا لیتی ہیں۔ شوہروں کی خواہشوں اور نیک تمناؤں کا۔" اس کا موڈ بدل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

گلاس ونڈو کے پار سبزہ ہی سبزہ بکھرا ہوا تھا۔
وہ کب سے ونڈو میں کھڑی تھی۔ روزینہ نے اندر آ کر اس کی محویت کو توڑا تھا۔
"اٹھ گئیں میری جان!" انہوں نے گرین ٹی کا کپ ٹیبل پہ رکھا اور بیٹی کے قریب آ گئیں۔ اروما نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
"اب روٹین سیٹ کروں گی ممی! کل سے آفس جوائن کرنا ہے۔" اس نے مسکرا کر ماں کو بتایا تھا۔
"ہوں' یہ تو اچھا ہے۔" وہ بے ساختہ خوش ہوئیں۔ "انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے۔ فارغ بیٹھنے سے بھی کیا حاصل؟ صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔"
"اور آپ کو پتا ہے۔ میں فارغ بیٹھنے والی نہیں۔" اروما نے چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔
"اچھا' اب یہاں آ کر میری بات سنو۔" معاً روزینہ بے پناہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ اروما بھی کچھ ٹھٹکی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ ماں نے کس کے بارے میں کیا بات کرنی ہے۔ اسی لیے ان کے قریب ہی آ کر بیٹھ گئی۔

"جی ممی۔" اس نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔
روزینہ کچھ دیر سوچتی رہی تھیں۔ پھر اروما سے پوچھا۔
"تمہاری اسود سے بات ہوئی؟"
"کس موضوع پہ؟" اروما نے کچھ حیران ہوتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ روزینہ نے اسے خفگی سے دیکھا تو وہ نگاہ چرا گئی تھی۔
"نہیں تو۔"
"تمہیں کرنی تو چاہیے تھی۔" انہوں نے بیٹی کو کریدا تھا۔
"کیسے کرلیتی؟" اس نے خفگی سے کہا تھا۔
"جیسے کرتے ہیں۔" روزینہ نے چڑ کر جتلایا تھا۔
اروما کچھ جھنجلا گئی تھی۔ "اتنا آسان نہیں ہے۔"
"تو مشکل کیا ہے؟" انہیں غصہ آگیا تھا۔
"اب وہ پہلی والی بات نہیں رہی ممی! بہت کچھ بدل گیا ہے۔" اروما نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔
"کچھ بھی نہیں بدلا۔ وہی اسود ہے اور وہی سب لوگ ہیں۔ بس تم خود میں چینج لاؤ۔ اسود کو خود سے قریب کرو۔ دیکھنا' سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"
روزینہ اب پرامید تھیں۔
"ممی! اسود تو نہیں بدلا' اس کا بی ہیویئر تسلی بخش ہے۔ مگر اس کی بیوی اور بچیاں۔" وہ کچھ تذبذب کے عالم میں نظر آرہی تھی۔ "یہ بھی تو حقیقت ہے۔"
"وہ ہمارا مسئلہ تو نہیں۔" روزینہ نے لاپروائی سے کہا تھا۔ "رافیہ تو سمجھو تیار ہے اور دیکھنا' وہ اسود کو قائل کرلے گی۔"
"اسود مان جائے گا؟" اس کے لہجے میں آس سی تھی۔
"کیوں نہیں' تم فکر مت کرو۔ دیکھنا' سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بہت پرامید تھیں۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔
"تم بھی' کچھ کوشش کرو۔ کوشش سے ناممکن بھی ممکن میں بدل جاتا ہے۔" انہوں نے محبت سے کہا تھا۔ بیٹی کے ڈولتے مستقبل کے لیے وہ بہت پریشان تھیں۔ رافیہ کو تو انہوں نے قائل کر ہی لیا تھا۔ اب اسود کو قابو میں کرنا ضروری تھا۔
"اسود مجھ سے خفا نہیں۔ میں تو حیران ہوں۔ اس کا انداز ذرا بھی نہیں بدلا۔ وہ سب کچھ بھلا چکا ہے اور یہ اسود کی اعلا ظرفی کے سوا کچھ نہیں۔" اروما کی آواز میں سرسراہٹ سی تھی۔
"تم کیوں کلٹی فیل کرتی ہو۔ اگر ان لوگوں کے دل موم ہیں یا وہ پرانی باتیں بھول چکے ہیں تو اس میں بھی ان کا مطلب اور غرض پوشیدہ ہے۔"
وہ ماں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
"اب دیکھو نا' اب عائشہ ماں نہیں بن سکتی۔ یہ بہت بڑا رسک ہوگا اس کی جان کے لیے اور رافیہ کبھی نہیں چاہے گی کہ اسود کے ہاں بیٹا نہ ہو۔ اس نے اسود کی دوسری شادی ہر صورت کروانی ہے تو پھر بہتر نہیں کہ وہ اسود کے لیے کہیں اور سے لڑکی نہ لائے۔" ان کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ انہوں نے اپنے تئیں سب کچھ طے کر رکھا تھا۔
"اور عائشہ؟ بچیاں؟" اروما کچھ متفکر تھی۔
"یہ ہمارا درد سر نہیں ہے۔ رافیہ کا ہیڈک ہے۔ وہ جانے اور اس کا مسئلہ۔" روزینہ نے منہ بنا کر کہا تھا۔
"تو آنٹی نے آپ سے بات کی؟" اروما پریشان سی تھی۔
"کی تو ہے۔ میں کھل کر مزید بات کروں گی اور کتنا انتظار کریں؟ اب اونٹ کسی کروٹ تو بیٹھنا چاہیے۔ میں اس معاملے کو زیادہ نہیں لٹکا سکتی۔"
وہ بولتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل گئی تھیں جبکہ اروما ابھی تک ونڈو کے پار دیکھ رہی تھی۔
اسود جو پورچ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور عائشہ جو دروازے پہ میں کھڑی تھی اور اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ ایک بھرپور اور مکمل منظر تھا۔ جس میں اروما کی گنجائش تھی؟

☆ ☆ ☆

تین سال پرانا ایک ایسا ہی منظر اس کی نگاہوں میں اتر رہا تھا۔

اسود ان دنوں کیپٹن تھا۔۔۔ اور صبح صبح سیالکوٹ کے لیے نکل رہا تھا۔ ان دنوں اس کی سیالکوٹ میں پوسٹنگ تھی۔ اروما کو یونی جانے کی جلدی تھی۔ اس کے سیالکوٹ جانے سے پہلے اسود ہی علیزہ، علینہ اور اروما کو یونی ڈراپ کرتا تھا۔ اب علینہ اور علیزہ کو وین پک کرتی تھی جبکہ اروما اپنی گاڑی میں جاتی تھی۔ اس دن گاڑی خراب تھی۔ سو اسود اسے یونی چھوڑنے جا رہا تھا۔

راستے میں ہی اروما نے اسود سے کہا۔

"اسود! تم تو ساری عمر خانہ بدوشوں کی طرح کبھی ایک اسٹیشن تو کبھی دوسرے اسٹیشن پہ گھومو گے۔ میرے اتنے اونچے خوابوں کا کیا ہو گا؟" وہ خاصی روہانسی ہو رہی تھی۔ رات ہی ممی نے اسے بتایا تھا۔ رافیہ آنٹی شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہتی تھیں۔ اروما کا یہ ایم فل کا آخری سال تھا۔ آگے اس کی لمبی پلاننگ تھی۔ اس نے پی ایچ ڈی کرنا تھی۔ جاب کرنا تھی۔ اس کے بڑے لمبے چوڑے خوابوں کا سلسلہ تھا۔

اسود نے اس کی ساری بات آرام سے سنی تھی۔

"تو کرتی رہنا۔۔۔ میں روکوں گا تو نہیں۔" اس نے سدا کے لاپرواہ انداز میں جواب دیا تھا۔

"ہاں کرتی رہنا۔۔۔ اور وہ میری ہائیر اسٹڈیز؟ اس کا کیا بنے گا؟ میرا اسکالرشپ؟" وہ رو دینے کو تھی۔ "میں نے اتنی محنت اس لیے نہیں کی تھی کہ شادی کر کے تمہارے بچے پیدا کرنا شروع کر دوں۔" اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں دہائی دی تھی۔ اچھا بھلا سنجیدہ ہوتا اسود بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"تو نہ کرنا۔ مجھے بچے ویسے بھی پسند نہیں۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اپنی ماما کا نہیں پتا تمہیں۔ وہ رات دن خوابوں میں بھی اپنا پوتا کھلاتی ہیں۔ انہیں تمہارے بچوں کا جنون ہے۔ تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو۔" اروما نے اسے احساس دلایا تو اسے بھی ماما کی خواہشوں کا خیال آ گیا تھا۔ واقعی اروما ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ماما تو اس کی سلیکشن کے فوراً" بعد شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

بس اس لیے کہ جلد از جلد پوتے کو پا سکیں۔

"بچوں کو نہیں، صرف بیٹے کو۔" اسود نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ "تو تم ایسا کرنا۔ ماما کی ذرا سی خواہش پوری کر دینا۔ ایک بیٹا پیدا کرنے میں کیا قباحت ہے؟ ماما خود اسے سنبھال لیں گی۔ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیں گی۔" اسود نے مسئلے کا حل پیش کیا تھا۔ جو اروما کو بالکل بھی نہیں بھایا تھا۔

"اور میرے اسکالرشپ کی مدت گزر جائے گی۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔" اروما نے ضدی لہجے میں کہا تھا۔ تب اسود نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔

"پھر بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھے اس مسئلے سے نکالو۔" وہ ضدی لہجے میں بولی تھی۔ اسود اسے دیکھنے لگا۔

"کیسے بھلا؟" اسود کچھ حیران تھا۔

"رافیہ آنٹی سے بات کرو۔" وہ اسے راستہ دکھا رہی تھی۔

"کیا بات کروں؟" اسود نے سابقہ انداز میں ہی پوچھا تھا۔ اروما جھنجلائی۔

"یہی کہ شادی کو ڈلے (ملتوی) کریں۔"

"کتنے عرصے تک؟" اسود کچھ سوچنے لگا تھا۔ پھر اروما کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آنکھیں میچے جلدی سے بولی تھی۔

"تین سال کے لیے۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" اسود متذبذب تھا۔ "ماما اتنا انتظار نہیں کریں گی۔"

"پلیز اسود! میری خاطر۔" وہ منتوں پہ اتر آئی تھی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ حنان اور علیزہ کے ساتھ ہماری شادی بھی ہو گی۔ یہ تو ڈن تھا۔" اسود خفگی سے اسے کچھ یاد دلانے لگا تھا۔

"تب میرا ہائیر اسٹڈیز کا موڈ نہیں تھا۔" وہ انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

"کیا بات ہے جناب کے موڈ کی۔" اسود کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ "ایک بات یاد رکھنا اروما! ماما بالکل بھی نہیں

مائیں گی۔ اور میں ماما کو مجبور نہیں کر سکتا۔"
اس نے دو ٹوک لفظوں میں اروما کو سمجھا دیا تھا۔ اور اروما اس کے واضح قدم پیچھے ہٹانے پہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔ پھر وہ اس کی بات سمجھنے لگی۔ اور بعد میں اس نے بہت تنگ کر جواب دیا تھا۔
"اگر تم مجبور نہیں کر سکتے تو میں بھی اپنے خوابوں کو جلا نہیں سکتی۔" اس کے لہجے میں خود سری تھی۔
"تو پھر جو تم چاہو کرو۔" اسود نے بات ہی ختم کر دی تھی اور اروما کو اس کے رویے سے دھچکا پہنچا تھا۔ کیا اسود اتنی آسانی سے دست بردار ہو سکتا تھا؟ اروما کو چھوڑ سکتا تھا؟

۞ ۞ ۞

"اسود! تم ناراض ہو۔۔۔؟" ایک صبح اروما کی کال آگئی۔ بہت الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ اور خود کو دو کشتیوں کا سوار سمجھ رہی تھی۔
اسود بھی گھر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ پھر اس نے ایک صبح اسود کو کال کر ہی لی تھی۔
"میں تم سے کیوں ناراض ہوں گا؟" اسود نے الٹا اس سے استفسار کیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ سی ہو گئی۔

"میرے انکار کی وجہ سے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔
"تم کیوں گلٹی فیل کر رہی ہو؟ کیوں پریشان ہو؟ ایسا کچھ بھی نہیں۔ یہ تمہارا حق تھا جو تم نے استعمال کیا۔ میں کیوں خفا ہوں گا تم سے۔" اسود نے اسے رسان سے سمجھایا تھا۔
"پھر بھی اسود! تم نے اتنے دن سے کال بھی نہیں کی۔ میسج بھی نہیں کیا۔" اس نے بے ساختہ شکوہ کیا تھا۔
"میں مصروف تھا۔ اس لیے بات نہیں کر سکا۔" اسود نے وجہ بتائی تو اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔
"اور ایک بات سمجھ لو اروما! شادی ہو نہ ہو۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہم ہمیشہ کزن اور دوست رہیں گے۔ تم یہ بات کبھی مت بھولنا۔" اس نے بہت اپنائیت سے کہا تھا۔
وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ دل میں جو کانٹا چبھ رہا تھا۔ وہ نکل گیا تھا۔ اسود اس سے ناراض نہیں تھا۔ یہی بات اس کے لیے کافی تھی۔
"شادی کیوں نہیں ہو گی؟ تم نے یہ بات کیوں کی؟"
اروما کو اچانک خیال آیا تھا۔
"بس ایسے ہی کر دی۔ اب کام کرنے دو گی۔" اسود بھی جھنجلا گیا تھا۔
"ہرگز نہیں۔" وہ دلار سے بولی تھی۔ لیکن اسود کسی اور ہی موڈ میں تھا۔ اس نے فون بند کر دیا اور اروما کو دوسرا دھچکا تب لگا تھا۔ اسود نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟ وہ شدید غم و غصے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پھر یہ غصہ تب بڑھا تھا جب اسود چھٹی پہ گھر آیا مگر اس سے ملا تک نہیں۔
پہلے کبھی ایسا ہوا تھا؟ وہ تو آتے کے ساتھ ہی اروما کے پاس چلا آتا تھا۔
تو پھر ایک بات طے تھی۔ ان کے درمیان دوریاں آرہی تھیں۔
ان دنوں گھر میں علیزہ اور حنان کی شادی کا ماحول گرم تھا۔ رافیہ آنٹی تو دونوں کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ انہیں اسود اور علیزہ دونوں کی شادی ایک ساتھ کرنی تھی۔ جبکہ اروما اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسود' اروما سے ملنے اور بات کرنے سے گریزاں تھا۔ اروما اہمیسی کے چکروں میں تھی۔
گھر میں شادی کا ہنگامہ بپا تھا۔ پھر ایک دن اروما کو اسود اکیلے میں مل ہی گیا۔ اسود اس سے کترا کر گزر جانا چاہتا تھا مگر اروما نے اسے زبردستی روک لیا تھا۔
"اسود! یہ سب کیا ہے؟ تم آنٹی کو روکتے کیوں نہیں۔" وہ شدید پریشانی کے عالم میں چلا اٹھی تھی۔
"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ میں انہیں روک نہیں سکتا۔" اسود بلا کا سنجیدہ ہوا۔
"مگر میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔" اسے غصہ آگیا تھا۔
"تو نہ کرو۔" اسود نے بے زاری سے کہا۔

"یہ ہنگامہ کیوں ہے پھر؟" وہ تلخی سے گویا ہوئی تھی۔
"کم از کم تمہارے لیے نہیں ہے۔ ہم علیزہ کی شادی تو نہیں روکیں گے نا۔" اسود نے بھی تڑخ کر جواب دیا تھا۔
"مگر آنٹی تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔" اروما جھنجلا گئی تھی۔
"تو ان کو کہنے دو.... میں تمہاری رخصتی نہیں کرواؤں گا۔ بس تم خوش رہو۔" وہ برہم انداز میں بولا تھا۔ اروما بے ساختہ خوش ہو گئی تھی۔
"کیا واقعی؟" اسے قطعاً یقین نہیں آیا تھا۔
"جب تم رضامند ہی نہیں۔ تو میں کیا پاگل ہوں جو تم پہ زبردستی کروں۔" اس نے بگڑ کر کہا تھا۔ اروما اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ واقعی ہی ناخوش تھا۔
"صرف تین سال کی تو بات ہے۔" وہ اسے بہلانا چاہتی تھی لیکن مقابل بھی اسود تھا۔
"اور تین سال کس نے دیکھے ہیں؟" اسود کا لہجہ گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ اروما پہلی مرتبہ ٹھٹک گئی تھی۔ اسود کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا۔ جس نے اروما کو ٹھٹکا دیا تھا۔

"مطلب؟" وہ چونک گئی تھی۔
"مطلب بہت واضح ہے اروما! ماما میری شادی ابھی کے ابھی کرنا چاہتی ہیں۔ اور تم مان نہیں رہیں۔ انہوں نے کچھ تو فیصلہ کرنا ہی ہے۔" اسود نے واضح لفظوں میں اسے جتا دیا تھا۔ اروما ہکابکا سی رہ گئی۔
"تو تم کہیں اور شادی کر لو گے؟ اور ہمارا نکاح؟؟" اروما کے حواس جواب دینے لگے۔
"یہ بات تمہارے سوچنے کی ہے۔ تم اچھی طرح فیصلہ کر لو۔ تمہیں اپنا کیریئر بنانا ہے یا رشتہ برقرار رکھنا ہے۔" اسود نے بہت سنجیدگی کے عالم میں اسے بتا دیا تھا۔ اور اروما پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا اسود یہ سب کر سکتا تھا؟ کیا اسود ایسا کر سکتا تھا؟

کیا اسود اور وہ الگ ہونے والے تھے۔

وہ ہر بات میں اسود کو ہی قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اس نے اپنے عمل اور ضد کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ کہ اس کا عمل کہاں تک درست تھا۔ پھر دن پر دن گزرنے لگے تھے اور ایک دن علیزہ، حنان کی مہندی والی رات بھی آنگن میں اتر آئی تھی۔ اسود کی شادی کینسل ہو گئی تھی جس کا اسود کی ماما کو اتنا قلق تھا کہ وہ بیمار پڑ گئیں۔ وہ بیٹی کی شادی میں بھی بھرپور طریقے سے شرکت نہیں کر رہی تھیں۔ ان کا دل پھیکا پڑ چکا تھا۔
ادھر اروما کا جھٹ پٹ ویزا لگا اور وہ اپنے گروپ کے چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ بیرون ملک چلی گئی۔ اس نے اکلوتے بھائی کی شادی اٹینڈ کرنا بھی ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ حنان کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ وہ اپنی ماں سے الجھ پڑا۔
"آپ کی ڈھیل نے اسے اتنا خود سر بنا دیا ہے۔ ورنہ اس کی مجال تھی یوں شادی کی تیاریوں کو ٹھوکر مار کے چلی جاتی؟؟"
حنان شدید غصے میں تھا۔ اسے اسود کی آکورڈ سچویشن کا بھی احساس تھا اور چچی کی خرابی طبیعت بھی ندامت میں مبتلا کر رہی تھی۔ سارا قصور اس کی ضدی بہن کا تھا۔ جسے کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ شروع سے اپنا سوچتی تھی۔ اپنا مفاد عزیز رکھتی تھی۔ اب بھی اس نے صرف اپنا ہی سوچا تھا۔
"اب وہ اپنا کیریئر داؤ پہ لگا دیتی؟ کبھی کبھار تو قسمت ساتھ دیتی ہے۔ اپنا اسکالر شپ چھوڑ دیتی۔ اس فضول جھنجھٹ کے لیے۔" روزینہ نے بہت تپ کر اپنے بیٹے کے غصے کو کم کرنا چاہا تھا۔
"جتنی تعلیم لڑکی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اتنی وہ حاصل کر چکی ہے۔ اب مزید کیا ضرورت تھی باہر جانے کی؟" حنان بہت گرم ہو رہا تھا۔ لیکن روزینہ کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔
"تو کون سی قیامت آگئی ہے؟ اسود تین سال انتظار نہیں کر سکتا؟" وہ چڑ کر رہ گئیں۔
"میرا نہیں خیال کہ ایسا ہو گا اور ہر دفعہ صرف آپ

کی خواہش پوری ہو۔ یہ ضروری بھی نہیں۔ نہ ہی رافیہ آنٹی تین سال تک انتظار کریں گی۔ آپ کو پتا نہیں۔ وہ اسود کی شادی اور اس کے آنے والے بچوں کے لیے کیسی اتاؤلی ہو رہی ہیں۔"

حنان نے ان کی آنکھیں کھولی تھیں۔ تب روزینہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ لیکن انہیں اپنی عقل پہ بڑا ناز تھا۔ انہیں خبر تھی۔ وہ رافیہ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگائے رکھیں گی۔ مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا۔

اسود نے ماں کی بے دلی محسوس کی تو آرام سے مشورہ دے ڈالا تھا۔

"غم کیوں کھاتی ہیں ماما! آپ کو میرے سر پہ سہرا سجانا ہے تو شوق سے یہ کام کریں۔"

رافیہ جو واقعی بڑی پریشان اور چپ چپ تھیں اچانک ٹھٹک گئیں۔ بہت دنوں سے ان کی یہی کیفیت تھی۔ انہوں نے تو شادی کی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ زیورات تیار تھے۔ لہنگا بن کے آ چکا تھا۔ وہ مکمل بری بنا چکی تھیں۔ جب روزینہ نے آکر انہیں شدید دھچکا پہنچایا۔

"رافیہ! اروما کا ویزا لگ کے آ گیا۔" روزینہ خوشی سے کھلی پڑ رہی تھیں۔ اور اپنی خوشی میں انہوں نے رافیہ کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ جو زیورات کے ڈبے ترتیب سے لاکر میں رکھ رہی تھیں لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گئیں۔

"کیوں؟" انہوں نے انتہائی تفکر سے بھونڈے انداز میں پوچھا تھا۔ ان کی رنگت فق ہو رہی تھی۔ روزینہ ان کے "کیوں" پہ بدمزہ ہو گئیں۔

"ارے برسوں کا خواب تھا میری بچی کا۔ اللہ کا شکر ہے پورا ہو گیا۔ خاندان کی پہلی بچی ہے جو باہر سے پڑھ کر آئے گی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ میری بیٹی نے تم سب کا نام اونچا کر دیا ہے۔" وہ چمک کر بولیں۔

"اور شادی کا کیا ہو گا؟ میں تو علیزہ کے ساتھ ہی اسود کی۔" رافیہ ابھی کچھ بولنا چاہتی ہی تھیں کہ روزینہ نے بیچ میں ہی ان کا جملہ اچک لیا تھا۔

"کیا احمق ہوئی ہو رافیہ! کب سے تو راگ الاپ رہی ہوں۔ پھر پوچھتی ہو شادی کا کیا ہو گا؟ بھئی ڈلے کر دیتے ہیں۔ اروما کی واپسی پہ ہو گی شادی" بس میں نے طے کر دیا۔ تب تک اسود کا رینک بھی اور بڑھ جائے گا۔ تنخواہ بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اب دیکھو نا۔۔۔ ساٹھ باسٹھ ہزار میں گزارہ کرنا بھی تو بہت مشکل ہے۔" انہوں نے بڑے طریقے سے بات گھمائی تھی۔

"حنان کی بھی تو یہی تنخواہ ہے۔ میری بیٹی بھی تو گزارہ کرے گی اس تنخواہ میں۔" رافیہ کو جٹھانی کی بات حد سے زیادہ بری لگی تھی۔ اب کے روزینہ کچھ گڑبڑائی تھیں۔

"یہی تو تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ اروما پڑھ کر آئے گی باہر سے تو جاب بھی من پسند ملے گی۔ تنخواہ بھی پرکشش ہو گی۔ میاں بیوی دونوں کمائیں گے تو تمہارا ہی فائدہ ہے نا۔" روزینہ نے میٹھے لہجے میں رافیہ کو لالچ دینا چاہا تھا مگر وہ ان کے میٹھے لہجے میں نہیں آئیں۔

"اسود کو نوکری کرنے والی ورکنگ لیڈیز پسند نہیں بھابھی! آپ جانتی تو ہیں۔"

"اروما کو کچھ نہیں کہے گا۔ بخوشی اروما کو ایئرپورٹ تک خود چھوڑ کر آئے گا۔ تم دیکھ لینا اور پھر اب بھی کہاں ناراض ہے؟ اسود تو روزانہ آتا ہے ہماری طرف۔ کئی کئی گھنٹے پہلے کی طرح گپ شپ کرتے ہیں۔" روزینہ نے اطمینان سے کہا اور رافیہ کا سارا اطمینان بھک سے اڑ گیا۔ ان کا دل برا ہو چکا تھا۔ اندر سے ارمان بکھر بکھر کر ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ ساری خوشی کا اروما اور اس کی ماں نے بھرکس نکال دیا تھا۔

تب رافیہ کا ان ماں بیٹی سے دل بری طرح سے کھٹا ہو گیا تھا اور پھر روزینہ نے جیسا چاہا تھا ویسے ہی ہوا تھا۔ اسود خود اروما کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔ اور جانے سے پہلے اسے ڈھیر ساری شاپنگ بھی کروائی تھی اور پرتکلف سا ڈنر بھی۔ علیزہ اروما کی "خاطر داریوں" پہ اندر ہی اندر کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ بھائی پہ بھی شدید غصہ تھا۔ لیکن اسے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ یہی حال علینہ کا بھی تھا۔ سب کو ہی اروما کے عمل نے

دھچکا پہنچایا تھا۔ لیکن اروما کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ آرام سے باہر جا کر اپنی پڑھائی میں گم ہو چکی تھی۔

لیکن اصل پریشانی تو ماما کی طویل ہوتی بیماری کی وجہ سے لاحق ہوئی تھی۔ انہوں نے اسود کی شادی کے معاملے کو کچھ زیادہ ہی دل پہ لے لیا تھا۔

ان کی حالت کو دیکھ کر اسود نے ازراہ مذاق ماما کو اپنی شادی کا مشورہ دے ڈالا تھا۔ جو علینہ کو اتنا بھایا کہ وہ ماما کے سر ہو گئی تھی۔

"آپ بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈیں۔ ذرا آنٹی اور ان کی لاڈلی کو بھی پتا چلے کہ دنیا ایک اروما پہ ختم نہیں ہوتی۔" علینہ کچھ زیادہ ہی ان سے کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔ رافیہ اس کی فرمائش پہ ہکابکا رہ گئی تھیں۔

"پاگل ہو گئی ہو! ایسا کیسے ممکن ہے؟" انہوں نے خفگی سے بیٹی کو گھرکا تھا۔ لیکن وہ غصے میں بھڑک اٹھی۔

"کیوں ممکن نہیں؟ ان کے لیے سب کچھ ممکن ہے؟ اور ہمارے لیے کچھ بھی ممکن نہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ منگنی نہیں نکاح ہوا ہے اور نکاح توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ حد ہے بے عقلی کی!" انہوں نے اسے بری طرح سے جھاڑا تھا۔ "وہ بھی اس صورت میں جب کہ تمہاری بہن اس کے بھائی سے بیاہی ہوئی ہے۔ علیزہ کی زندگی پہ اس رشتے کی وجہ سے کوئی برا اثر پڑے، یہ میں گوارا نہیں کر سکتی۔"

"علیزہ کی زندگی کو کچھ نہیں ہوتا۔ نہ حسان بھائی کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اپنی آنکھوں سے اور ہم بلاوجہ اپنے بھائی کی شادی کو ٹال نہیں سکتے۔" علینہ بضد تھی اور علیزہ خاموش۔ اسود اس معاملے سے قطعاً "الگ" تھا۔ ایک سال تک یہ معاملہ ایسے ہی لٹکتا رہا تھا۔ علینہ اپنی ماں کے پیچھے پڑی رہی۔

"آپ کوئی لڑکی تو دیکھیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی ہیں۔ یہ اروما صاحبہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیں۔ انہیں باہر کی ہوا لگ چکی ہے۔" علینہ انہیں مسلسل جوش دلاتی تھی اور رافیہ کا بلڈ پریشر بڑھاتی تھی۔

"ماما! آپ کو اسٹینڈ لینا چاہیے۔ فضول میں بھائی کی شادی کو لٹکا رکھا ہے۔ ویسے بھی اروما ہمارے گھر کے لیے قطعاً "ناموزوں" ہے۔" علینہ نے بانگ دہل اعلان کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت اروما کو اپنی بھابھی بنانے کے حق میں نہیں تھی۔ علیزہ کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم وہ علینہ کی تائید بھی نہیں کرتی تھی۔

"تم میری زندگی جہنم بنا کر ہی چھوڑو گی۔" علیزہ کو بہت ہی غصہ آیا تھا۔

"تمہاری زندگی کیسے جہنم بنے گی؟" علینہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کیا خیال ہے۔ اروما کے ساتھ ایسا ویسا کچھ کر کے تم میری زندگی میں خوشیوں کی امید رکھ سکتی ہو؟" وہ غرائی تھی۔ علینہ کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"تو یہ لوگ ہمیں بلیک میل کریں گے۔ ان کی بیٹی دس سال تک نہیں آئے گی تو ہمارا بھائی شادی نہیں کرے گا؟" علینہ نے چبھتے لہجے میں جتلایا تھا۔

"معاف کرنا۔ ہمارا اکلوتا بھائی ہے۔ اور اسے روایتی رشتوں کی بھینٹ ہرگز نہیں چڑھا سکتے۔"

"اور اگر تمہارا بھائی خود ہی شادی نہ کرنا چاہے۔ وہ اروما سے کافی اٹیچڈ ہے۔ تب تمہارے بھڑکتے ارمان کہاں جائیں گے؟" علیزہ نے اس کا تمسخر اڑایا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے علینہ بھی چپ ہو گئی تھی۔ علیزہ کی بات میں وزن تھا۔ اگر اسود ہی نہ مانتا؟ وہ انکار کر دیتا تو؟ یہ سوچنے کا پہلو تھا۔ لیکن علینہ ہار ماننا نہیں چاہتی تھی۔

"وہ کیوں نہیں مانے گا۔ ماما بات کریں گی۔ کیوں ماما!" اس نے خاموش بیٹھی ماما کو بھی اکسایا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔ ایک دم چونک گئیں۔ واقعی، علینہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر اروما تین سال بعد بھی نہ آئی تو؟

"فرض کریں اروما کو وہیں جاب مل جاتی ہے اور یقیناً "مل بھی جائے گی۔ پھر وہ اپنی اعلا جاب کو چھوڑ کر کبھی واپس آنا نہیں چاہے گی۔ بھائی یہاں اپنی جاب

میں بہت مطمئن ہے۔ وہ کبھی باہر نہیں جائے گا۔ تب بھی تو یہ رشتہ بننے والا نہیں پھر ابھی کیوں نہیں۔"

اس بات پر ماما اور علیزہ نے پہلو بدل کر پریشانی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"میں کہتی ہوں۔ آپ آنٹی سے دو ٹوک بات کریں۔" علینہ نے انہیں مزید تحریک دی تھی۔

"اتنی جلدی ایسا ممکن نہیں۔" ماما قدرے متذبذب نظر آئی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ ماما۔" علیزہ نے بھی انہیں روکا۔ "فی الحال آپ کچھ مت کریں۔ میں پہلے حنان سے بات کرتی ہوں۔" وہ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر چلی گئی تھی۔ ماما الگ سوچوں میں مگن تھیں۔

☆ ☆ ☆

ماما ابھی تک اروما کے غم سے نہیں نکلی تھیں اور انہیں ذہنی دباؤ کا شکار دیکھ کر اسود ۔۔۔ دو تین مرتبہ اپنی شادی کر دینے کا مشورہ دے چکا تھا۔

"تو اروما کہاں جائے گی؟" ماما نے چونک کر غصے سے پوچھا۔

"اس سے دوسری شادی کر لوں گا۔" اسود نے بڑا آسان حل بتایا تھا۔ علینہ ہنسنے لگی تھی۔ ماما نے اسے گھورا تھا اور علیزہ کچھ متفکر نظر آتی تھی۔ وہ خاصی الجھی الجھی تھی۔ اور اپنی الجھن کی وجہ بھی نہیں بتاتی تھی۔

"اسود! مذاق مت کرو۔" ماما نے جیسے تنبیہہ کی تھی۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" وہ واقعی ہی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ پھر اروما کی کال آئی تو اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ان کی اب بھی باقاعدگی سے بات ہوتی تھی۔ ایک دوسرے سے میسیج پہ بھی رابطہ تھا۔

اور ابھی وہ سب لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے جب اروما سے ڈیڑھ گھنٹہ بات کرنے کے بعد اسود نے ان سب کے سروں پہ دھماکا کیا تھا۔

"آپ سب کی ٹینشن ریلیز کرتے ہوئے اروما صاحبہ نے' ماما کے جذبات کی دلی قدر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں آزادی کے ساتھ اپنے لیے کچھ فیصلہ کر لوں۔۔۔ ماما کی خواہش کو مد نظر رکھوں اور اروما صاحبہ کو فارغ کر دوں۔" اس نے اتنے ڈرامائی انداز میں بتایا تھا جیسے کوئی خبر نشر کر رہا ہو۔

ماما' علینہ اور علیزہ تو ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ ان کے رنگ فق ہو گئے۔ انہیں جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

علینہ اور علیزہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

اسود نے نہایت اطمینان سے ہاتھ جھاڑے تھے۔

"وہ اروما ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ویسے اس نے بندوق میرے ہی کندھوں پہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ماما کی خاطر' ماما کی وجہ سے۔۔۔ ماما کے لیے۔۔۔ یعنی وہ ماما کی خواہش کو مد نظر رکھ کے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔"

"اروما حواسوں میں تھی؟ اس کا دماغ خراب ہے کیا؟" ماما نے بہت دیر بعد سنبھل کر بھڑکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"وہ بقائمی ہوش و حواس مطالبہ کر رہی تھی۔ بقول اس کے کہ' آدرش بہت بلند ہیں۔ اس کے کیریئر کا آغاز ہے اور وہ اس معاملے کو طول دے کر آنٹی رافیہ کے جذبات کا خون نہیں کر سکتی۔" اسود' اروما کی گفتگو کو دہرا رہا تھا۔ ماما کو بے طرح غصہ آیا۔

"میں ابھی کے ابھی بھابی سے بات کرتی ہوں۔ یہ کوئی کھیل تماشا تھا؟ رشتہ جوڑا اور رشتہ توڑ لیا۔" ماما کسی بھی طور اروما کو معاف کرنے پہ تیار نہیں تھیں۔ ان کا آنٹی سے لڑنے کا پکا موڈ تھا۔ اور وہ مارے جذبات کے اٹھ کر چلی بھی جاتیں۔ مگر اسود نے انہیں روک دیا تھا۔

"دفع کریں ماما! آپ اروما کو جانتی نہیں؟ وہ ایسی ہی ہے۔ بدلے گی نہیں۔ آپ اس معاملے کو دفع کریں۔ اور آنٹی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" اسود نے نرمی سے انہیں سمجھایا تھا۔

"کیوں ضرورت نہیں؟ کل کو ہمیں پھر الزام دیں

گے۔" ماما نے تنفر سے کہا تھا۔

"کوئی ہمیں الزام نہیں دے گا۔ میں اس معاملے کو خوش اسلوبی سے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ماما! ہماری دہری رشتے داری ہے۔ ہمیں حالات کو خراب نہیں کرنا۔ ویسے بھی اروما اپنے گھر والوں کو انفارم کر چکی ہے۔ حنان کو بھی شدید غصہ آرہا ہے اور وہ ابھی ہماری طرف ہی آرہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا ہے۔ آنٹی سے دو ٹوک بات کر کے میں کاغذی کارروائی مکمل کروا دوں گا۔ آپ بس دل پہ مت لیں۔"

وہ ماما کو ٹھنڈا کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور شرمندہ شرمندہ سی علیزہ بھی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

آنٹی کو بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی بلکہ وہ خود ہی شرمندہ شرمندہ سی چلی آئی تھیں۔

"رافیہ! مجھے معاف کرنا اور اروما کو بھی میری بیٹی نے دل پہ پتھر رکھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ اسود سے دستبردار ہونا آسان نہیں تھا۔"

وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پہ حقیقی دکھ نظر آرہا تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ اروما کا فیصلہ ان کے لیے بھی باعث تکلیف تھا۔ ماما نے تنفر سے منہ پھیر لیا۔

"رشتے مذاق تو نہیں ہوتے؟ پہلے وہ میرے ارمان جھٹک کر باہر چلی گئی تھی اور اب نیا تماشا شروع کر دیا ہے۔ پہلے ہی میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے بالکل بھی مت چھیڑیں۔"

"رافیہ! غصہ جانے دو۔ بچے ہیں۔ خود مختار بھی اور تعلیم یافتہ بھی۔ ہماری پرانی قدروں کو نہیں سمجھتے اور پھر اروما بھی غلط نہیں کہتی۔" کچھ دیر بعد آنٹی نے بیٹی کی حمایت کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

"وہ اگر مزید چار سال نہ آئی تو اسود کب تک چپ رہے گا۔ اس نے تمہارا بھلا سوچا ہے۔ وہ تمہارے خوابوں کو جانتی تھی۔ وہ تمہیں تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" روزینہ آنٹی نے لگے ہاتھوں ماما کا دل بھی اروما کے لیے صاف کرنا چاہا تھا۔ تب پاس بیٹھی علینہ چپ نہیں رہ سکی تھی۔

"پتا نہیں اروما نے کس کا فائدہ سوچا اور کس کا نقصان۔" اس کے اندر بھی تلخی بھری تھی۔ خوامخواہ ایک سال ضائع کیا۔"

ماما نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں روکنا چاہا تھا۔ جبکہ آنٹی نے برا سا منہ بنا لیا۔

"اب بھی وقت نہیں گزرا ___ اسود کی بارات سجالو۔"

"ان شاء اللہ ضرور سجائیں گے۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے۔" علینہ نے ترنت جواب دیا تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔

"میری بیٹی کی قسمت ہی خراب تھی۔" اب انہوں نے چسکوں پھسکوں رونا شروع کر دیا تھا۔ علینہ اس ڈرامے سے بیزار نظر آرہی تھی اور ماما نالاں دکھائی دیتی تھیں۔

"ہم نے تو خراب نہیں کی۔" وہ جزبز ہوئیں۔

"بس جی! نصیب میں ہی سیاہی تھی۔"

آنٹی کی دہائی پہ اسود اندر آتا آتا نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔ "تو سیاہی کا برش کس نے پھیرا تھا؟"

اسود کے سوال پہ آبدیدہ ہوتی آنٹی سنبھل گئیں۔ کوئی جواب نہ سوجھا تو بے ساختہ بول اٹھیں۔

"میرا تو دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے۔" انہوں نے آہ بھرتے ہوئے جتلایا تھا۔

"کیا دنیا سے؟" علینہ نے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا تھا۔

تب اسود نے گفتگو میں مزید حصہ لیا۔ "نہیں ___ پاکستان سے۔"

اسود کی مداخلت پہ جہاں آنٹی کا رنگ اڑا تھا۔ وہیں علیزہ اور علینہ چونک گئی تھیں اور چونکی تو ماما بھی تھیں۔

"کیا مطلب؟" سب کے چہروں پہ حیرت بھرا سوال درج تھا۔ اسود نے ایک نظر آنٹی کو دیکھا۔ جنہیں اٹھنے

کافی الحال کوئی بہانہ بھی نہیں مل رہا تھا۔
"مطلب یہ کہ۔۔۔ آنٹی اروما کے پاس وزٹ ویزے پہ جارہی ہیں۔" اسود کے انکشاف پہ ماما بری طرح سے حیران ہوئی تھیں اور علینہ حیران ہی رہ گئی۔ علیزہ البتہ جزبز ہوئی تھی۔ یعنی اسے کچھ نہ کچھ خبر تھی۔
"کیا واقعی آنٹی! میرے لیے تو اچھے سے سویٹر لائیے گا۔" علینہ نے نچلا لب دبا کر شرارت سے انہیں چھیڑا تھا۔
"اور میرے لیے پرفیوم' اگر ہو سکے تو میری ہونے والی بیوی کے لیے آئی فون' جاپانی موزے' امریکی کارڈیگن' چینی گلاسز' فرانسیسی کوٹ شوز' اور۔۔۔" اسود کی فرمائشی لسٹ لمبی ہوتے دیکھ کر علینہ نے دہل کر ہانک لگائی تھی۔
"بس کرو بھائی! آنٹی کہیں جانے کا پروگرام ہی نہ ترک کر دیں۔" علینہ نے اسے احساس دلانا چاہا تھا۔
"آنٹی تو مر کے بھی پروگرام تبدیل نہیں کریں گی۔" اسود کی بڑبڑاہٹ صرف علینہ تک محدود تھی۔ وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں لگ گئی۔
"بھابھی! آپ واقعی جارہی ہیں؟" ماما نے انتہائی متفکر انداز میں استفسار کیا تھا۔ علینہ کا دل چاہا ماما کی اس بے یقینی پہ اپنا ہی سر پیٹ لے۔
"آنٹی کی سیٹ بھی کنفرم ہو چکی ماما! اب تو آپ کے پاس آخری دعوت کھائیں گی۔ پھر ہم انہیں جہاز پہ چڑھا آئیں گے۔" اسود نے انہیں مزید بھی بتایا تھا۔ آنٹی کچھ شرمندہ سی ہو گئیں۔
"بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ یہ قدم اٹھالے گی۔ اب سیٹ کینسل بھی نہیں کروا سکتی۔" آنٹی نے جزبز سا ہو کر جواب دیا تھا۔ اسود نے انہیں مزید تنگ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔
یوں یہ محفل کسی خوفناک لڑائی تک جانے سے پہلے ہی برخاست ہو گئی تھی۔ اور اگلے چار دن میں اسود نے کاغذی کارروائی مکمل کروا دی تھی۔ یوں اروما کے ساتھ اس کا کاغذی بندھن خود بخود ٹوٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

عائشہ وہ پہلی اور آخری لڑکی تھی جسے اروما کے بعد دیکھا اور پسند کیا گیا تھا۔ یوں جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا کام ہوا۔ اسود کے رشتے پہ انہوں نے ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کی تھی یوں عائشہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔
وہ مزاجاً "درشت نہیں تھا مگر اروما کے ہاتھوں چوٹ کھانے کے بعد قدرے روکھا اور سرد ہو چکا تھا۔ اس کے نزدیک عورتیں ایسی مخلوق نہیں تھیں جنہیں خواہ مخواہ سر چڑھا کر ڈھیل دے کر خود پہ سوار کر لیا جائے۔
اروما سے اسے کوئی طوفانی محبت نہیں تھی۔ جو اس کے غم کو سینے سے لگائے رکھتا۔ وہ کچھ ہی عرصے میں اپنی نئی زندگی اور بچوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ ایک حد تک اس کی فیملی بھی عائشہ سے مطمئن تھی۔ یہ اور بات تھی کہ عائشہ کبھی کبھار عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی تھی۔ اور یہ بے یقینی اسود کے روکھے رویے کی وجہ سے تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ وہ اسود کی زندگی پہ زبردستی مسلط ہے۔ اسود نے بھی کبھی اس کی بے یقینی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اس کے احساس میں شدت تب آئی تھی۔ جب اروما اور اس کی ممی واپس آگئیں۔ عائشہ کو یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔ گو کہ اس کی ساس اور نندوں کا رویہ بہتر تھا۔ خاص طور پر دونوں نندیں بہت تعاون کرتی تھیں تاہم اوپر تلے بیٹیوں کی پیدائش کے بعد ساس کا رویہ کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ انہیں پوتے کی شدید چاہ تھی اور عائشہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو کوئی امید بھی باقی نہیں تھی۔
وہ شاید صبر و شکر کر ہی لیتیں مگر روز نہ آنے والی ان کے "آتش شوق" کو بڑھانے سے باز نہیں آتی تھیں۔
اس دن بھی وہ صبح صبح ناشتے کے بہانے یہاں آگئی تھیں۔ عائشہ کچن میں تھی۔ وہ ماما کے کمرے میں گھس گئیں۔ وہ معمول کے مطابق ناشتہ ٹرے میں سجا کر ماما کے روم کی طرف جارہی تھی۔ جب اندر سے آتی آوازوں پہ ٹھٹک کر رک گئی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی

تھی۔ گو کہ آگے پردے پڑے تھے۔ پھر بھی آوازیں صاف آرہی تھیں۔

آنٹی زور و شور سے ماما کو کسی بات پہ قائل کر رہی تھیں۔

"تم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں۔ میں ماشاء اللہ سے دو پوتوں کی دادی بن چکی ہوں اور اسود کا بیٹا ہی نہیں۔ تم کب ہوش کرو گی؟ جب وقت نکل جائے گا۔"

"تو کیا کروں بھابھی!" ماما نے بے بسی کے عالم میں ہونٹ کچلتے ہوئے کہا تھا۔

"کرنا کیا ہے؟ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" انہوں نے تمہید باندھی تھی۔ ماما کی لاچاری کچھ اور بڑھ گئی۔

"فضول ہے۔ بتایا تو تھا آپ کو۔ اب اس کی جان تو نہیں گنوانی۔"

"یعنی تم ناامید ہو چکی رافیہ! کیسے کیسے خواب دیکھے تھے تم نے۔" آنٹی نے ان کے زخموں پہ نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔

"خوابوں کا کیا ہے؟ وہ تو اور بھی بہت دیکھے تھے۔ کیا پورے ہوئے؟" ماما کے جواب پہ لحہ بھر کے لیے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔

"تو کیا ہوا۔ تب نہیں پورے ہوئے۔ اب تو کوشش کی جا سکتی ہے نا۔" کچھ دیر بعد انہوں نے بڑے طریقے سے ماما کو باتوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ "مطلب؟" ماما کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اسود کی دوسری شادی کروا دو۔" بالآخر روزینہ آنٹی نے کچھ جھجک کر کہہ ہی دیا تھا اور ماما ہکا بکا رہ گئیں۔

"دوسری شادی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" ان کا تو دماغ ہی چکرا گیا تھا۔

"تو اس میں ناممکن کیا ہے؟" وہ برامان کر رہ گئی تھیں۔ "بس تم ارادہ کرو۔ کوشش میں کرتی ہوں۔"

"تین بیٹیوں اور ایک سوکن پہ کون اپنی لڑکی دے گا؟" وہ جیسے قائل ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"کون نہیں دے گا؟ یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" روزینہ آنٹی فوراً "میدان عمل میں آئی تھیں اور اب آگے کے پروگرام طے کر رہی تھیں۔ جبکہ عائشہ سے مزید کچھ بھی سنا نہیں گیا تھا۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ واپس کچن میں آ گئی تھی۔ ٹرے سلیب پہ رکھی اور وہ خود اسٹول پہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

علینہ کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ پھر فوراً "ہی اندر آئی۔

"کیا ہوا بھابھی! آپ ٹھیک تو ہیں؟" علینہ کے نرم انداز اور ہمدردی بھرے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جسے محسوس کر کے اس کا پہلے سے بھرا دل چھلک پڑا تھا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں علینہ! میں ٹھیک کیسے ہو سکتی ہوں؟ میرا دل اُجڑ رہا ہے۔ میرا گھر اُجڑ رہا ہے۔" وہ بری طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ علینہ اور بھی گھبرا گئی۔

"کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ خدانخواستہ ایسا کیا ہو گا؟"

"ایسا ہو کر رہے گا۔ یہ جو چند دن پہلے کسی طوفان کی طرح ہماری زندگیوں میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ کچھ نہ کچھ کر کے رہیں گی۔" اس کا پورا وجود ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جب آپ کا قلعہ مضبوط ہے تو۔ غم کیوں کرتی ہیں آپ؟ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔" علینہ نے نرمی سے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا تھا۔ عائشہ لب بھینچ کر رونے لگی۔

"فرض کرو علینہ! اگر قلعہ ہی مضبوط نہ ہوا تو؟" اس کی آنکھوں میں ایک خوف ہلکورے لے رہا تھا۔ علینہ کچھ پل کے لیے اسے دیکھتی رہی تھی پھر سر جھٹک کر رہ گئی۔

"آپ کا قلعہ کمزور نہیں ہے بھابھی! کیوں مفروضوں پہ زندگی کو کٹھن بناتی ہیں۔"

"اور یاد رکھیں ہمیں کوئی بھی تب تک ہرا نہیں سکتا۔ جب تک ہم خود نہ ہارنا چاہیں۔" علینہ نے

ایک ایک لفظ مضبوطی سے، بہت یقین کے ساتھ ادا کیا تھا یوں کہ عائشہ اس کا چہرہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن اسود جلدی ہی گھر آگیا تھا۔ اس کا موڈ پہلے سے کچھ خوش گوار تھا۔ عائشہ جب چائے بنا کر کمرے میں آئی تو اسود الماری سے کپڑے نکال رہا تھا۔ عائشہ کو دیکھ کر فوراً" بولا۔

"میں چائے نہیں پی رہا۔ تم ایسا کرو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ قاسم کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ ابھی ہسپتال چلنا ہے۔" اسود نے اپنے بیسٹ فرینڈ کا نام لیا تھا۔ عائشہ سرہلا کر رہ گئی تھی پھر ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"چائے کیوں نہیں پینی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کیا یہ ممکن تھا؟ وہ گھر آکر چائے ہی نہ پیتا؟ جس کے بغیر وہ چلتا ہی نہیں تھا۔

"اروما نے آتے کے ساتھ ہی روک لیا تھا۔ بس کھڑے کھڑے ہی چائے پی۔" اسود نے مصروف انداز میں بتایا تھا پھر کپڑے بدلنے کے لیے چلا گیا تھا۔

"یہ اروما کا سایہ میری زندگی سے ہٹنے والا ہرگز نہیں۔" اس کے اندر دور دور تک تلخی بھر گئی تھی۔ پھر وہ چائے رکھ کر خود بھی تیار ہونے لگی۔ گو کہ موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ بہت اچھا تیار ہوئی تھی۔ اسود نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

"ہم بچہ دیکھنے جا رہے ہیں۔ بچے کے باپ کا ولیمہ اٹینڈ کرنے نہیں۔"

"آپ کے دوستوں سے کیا بعید ہے؟ بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے ولیمہ بھی منعقد کرتے پھریں۔" اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار تھا۔ بے حد طنزیہ سا۔ اسود کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"میرے کتنے دوست اس گناہ کے مرتکب ہو چکے ہیں؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔

"دوستوں کا تو پتا نہیں۔۔۔ آپ سے کچھ بھی امید رکھی جا سکتی ہے۔" عائشہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ پہ اسود قدرے چونک گیا تھا۔ پھر چند قدم کا فاصلہ مٹاتا اس کے قریب آگیا۔

"ذرا وضاحت کرو گی؟" اس نے عائشہ کے کندھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ کر ایک زنجیر سی بنالی تھی۔

"کچھ نہیں تم اب چلیں۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"اتنی آسانی کے ساتھ؟ ہرگز نہیں۔ جانتی تو ہو۔ میں کچھ اور ہی چیز ہوں۔ ذرا وضاحت کرو اپنے الفاظ کی۔" اسود نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ پھر اس صورت میں جب اس نے عائشہ کے بات سن لی تھی۔

"یہی کہ مردوں کا کیا بھروسا؟ کسی بھی وقت بدل سکتے ہیں۔" عائشہ نے جان چھڑاتے ہوئے کہنا چاہا تھا۔ اسود نے فوراً" ہی ٹوک دیا تھا۔

"بات مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ اب مردوں پہ چلی گئی؟ تمہیں کتنے مردوں کا تجربہ ہے؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا تھا۔ عائشہ تو بات کر کے پچھتائی تھی۔

"ایک ہی تجربے کو بھگت لوں۔ یہی بہت ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں جتایا۔

"اسی تجربے کی روشنی میں سیکھو اور اسی ایک تجربے تک محدود رہو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" اسود اب کے کچھ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔ عائشہ اس کی بات سن کر کچھ پل کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ پھر دھیمی آواز میں بولی۔

"اگر یہی بات آپ کے لیے کہوں تو پھر؟" اس کے تیکھے سوال پہ اسود نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"بھئی مجھ میں ایسا حوصلہ نہیں۔۔۔ اتنا خطرناک تجربہ بار بار دہراتا پھروں۔ میری تو ایک سے ہی توبہ۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔ مسکراہٹ تھی۔ اس کا چہرہ نرم تاثرات سے سج گیا تھا۔ عائشہ نگاہ چرا کر رہ گئی۔

"اپنی بات پہ قائم رہیے گا۔" وہ جیسے کوئی یقین دہانی چاہتی تھی۔ اسود اس کا چہرہ کھوجتا تھوڑا چونک گیا تھا۔ پھر اس کے ماتھے سے اپنا ماتھا ٹکرا کر مسکرایا۔

"تم مجھ سے کوئی پکا وعدہ لینا چاہتی ہو۔" وہ اس کے اندر تک جیسے اتر گیا تھا۔ عائشہ اس کی گہری بولتی

آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔
"تو آپ دیں گے وعدہ۔" عائشہ نے آس بھری نگاہوں سے اسود کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا تھا۔
"مجھے پاگل سمجھا ہے۔" وہ فوراً" نفی میں سر دائیں بائیں ہلانے لگا۔ "تم میرا دوسری شادی کا چانس مارنا چاہتی ہو۔۔۔؟" اسود نے سنجیدگی سے اس کے فق ہوتے چہرے کی طرف دیکھا تھا پھر اسے بازو سے تھام کر باہر لے آیا۔
"یہ بحث طویل ہے۔ ابھی جانے کی کرو۔ پھر بچیوں کا بھونپو آن ہو جائے گا۔ ابھی تو علینہ انہیں پارک میں لے گئی ہے۔" اسود کی آواز پہ ٹی وی دیکھتی ماما بھی متوجہ ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ آرہے تھے اور بلاشبہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ماما نے نگاہ چرائی تھی۔
"کون سی بحث۔۔۔؟" انہوں نے گفتگو کے ابتدائی حصے پر غور فرمایا تھا۔ اسی تناظر میں سوال کیا۔
"میری دوسری شادی کی بحث۔" اسود نے عائشہ کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھ کر شرارتاً" کہا تھا۔ وہ آج خاصے موڈ میں لگ رہا تھا۔ ماما کے فوراً" کان کھڑے ہو گئے تھے۔
"ماما! آپ بھی اس نکمی بہو سے بور ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کسی نئی کو لانے کی کریں۔" اسود انہیں زِچ کر مزید پھیل گیا تھا۔ اور عائشہ کی رنگت مزید زرد پڑ گئی تھی۔
"ہماری ایسی قسمت کہاں۔" ماما نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔
"آپ ٹھنڈی آہیں مت بھریں۔ بس حکم کریں۔ کئی کنیزیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔" اسود نے انہیں جی بھر کے تسلی دے کر اکسایا تھا۔
ماما کے اندر بے چینی بھر گئی تھی۔ اور عائشہ کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
"رہنے دو بیٹا! اتنی کنیزوں کی بھرتی کروا کے ہمیں گھر سے ہی نکلواؤ گے۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئی تھیں۔ پھر عائشہ کی تیاری کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا تھا۔
"کہیں جا رہے ہو؟"
"جی ہاں' وہ قاسم کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اس لیے تو۔" اسود کو بتا دینے کے بعد احساس ہوا تھا۔ اس نے غلط جگہ غلط بات کر دی تھی۔ ماما تو بس حق دق ہی رہ گئی تھیں۔
"چار بیٹیوں کے بعد ہوا ہے نا۔۔۔؟" انہوں نے جیسے تسلی کرانی چاہی تھی۔ اسود کو سرہلانا پڑا۔
"جی۔۔۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا تھا۔
"ایک ہماری کھوٹی قسمت نکلی ہے۔" ان کی آواز نے عائشہ کو بے قرار کر دیا تھا۔
"آپ کی قسمت کو جلدی چمکا ڈالوں گا۔ ابھی تھوڑا سا ویٹ کریں۔" وہ انہیں دلاسا دیتا عائشہ کا بازو پکڑ کر فوراً" باہر کی طرف بھاگا تھا۔ مبادا ماما اسے ابھی کے ابھی پکڑ کر اپنی قسمت کو کھرا کروانے کے لیے وعدے نہ لے لیں۔

☼ ☼ ☼

واپسی پہ گاڑی میں بہت خاموشی تھی۔
اسود کن انکھیوں سے عائشہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب تھی۔ اپنے ہاتھوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ جانے لکیروں سے کیا سوال' جواب کر رہی تھی۔ اسود نے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔
"تمہارے ہاتھوں کی لکیریں اب بدلنے والی نہیں ہیں' جو ہونا تھا۔ ہو چکا' جو ملنا تھا۔ مل چکا۔" اسود کی آواز پہ عائشہ کرنٹ کھا کر چونکی۔
"میں نے کب کہا۔ میرے ہاتھ کی لکیریں بدل جائیں گی۔" اس کے لہجے میں عجیب سی شکستگی تھی۔
اسود نے گہرا سانس کھینچا اور اعصاب تھوڑے ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ بڑے پرسکون انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔
"آج کل تم بڑی زود رنج ہو رہی ہو۔ خیر تو ہے' یہ اداسی اور فلسفہ؟"
تو گویا وہ اتنا بھی لاتعلق نہیں تھا۔ وہ دیکھتا تھا اور

محسوس بھی کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ جتاتا یا اظہار نہیں کرتا تھا۔

"تو آپ محسوس کرتے ہیں؟" وہ اتنا حیران ہوئی کہ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں کیا احساسات سے عاری ہوں؟" وہ خفگی سے گویا ہوا۔

"پہلے کبھی کہا نہیں آپ نے تو اس لیے۔" عائشہ خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"پہلے تم اس قدر قابل غور لگی نہیں تھیں اس لیے۔" اسود بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ کبھی جو دل رکھ لیتا۔ لیکن وہ دل رکھتا کیوں؟

"یہ بھی خوب کہی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہلکا سا مسکرائی تھی۔

اسود کچھ چونکا "میں ہمیشہ خوب ہی کہتا ہوں۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ تمہیں اندازہ نہیں ہوتا میری گفتگو سے۔"

"اگر میں کہوں آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تو پھر؟" اس کے لہجے میں واضح طنز پوشیدہ تھا۔

"اس خیال کو تو غلط ثابت کر دوں گا۔" اسود نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "میرا نہیں خیال کہ میں اپنا فالتو وقت باہر گزارتا ہوں۔" اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"میں نے یہ بھی نہیں کہا۔" عائشہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"تو پھر؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"آج کل آپ پڑوسیوں کی طرف بہت جاتے ہیں۔" عائشہ نے بالآخر اندر کی پھانس نکال ہی لی تھی۔

"تم شک کر رہی ہو۔" وہ فوراً "معاملے کی تہہ میں اتر گیا تھا۔

عائشہ جز بز سی ہو گئی۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"بات گھما پھرا کر کہی جائے تب بھی یہی مطلب نکلے گا نا۔" اسود اپنی بات پہ قائم تھا۔ عائشہ کی سانس اٹک سی گئی تھی۔۔۔ وہ کبھی بھی ڈائریکٹ اسود سے یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔" وہ صاف مکر گئی تھی۔

"ویسے اروہا سے تمہاری جیلسی بنتی نہیں۔" کچھ دیر بعد اسود نے مزید ٹکڑا لگایا تھا۔ عائشہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں اس سے کیوں جیلس ہوں گی۔" وہ برا مان کر بولی تھی۔

"ہونا بھی نہیں چاہیے۔" اس کا انداز واضح اور دو ٹوک قسم کا تھا۔ وہ بس خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

پھر باقی کا سفر خاموشی سے کٹا تھا۔ اسود اسے ڈراپ کر کے مارکیٹ چلا گیا تھا۔

عائشہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف آ گئی تھی۔

سامنے ہی آنٹی اور ماما کسی بہت سنجیدہ بحث میں گم تھیں۔ بہت دھیمے انداز میں صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ عائشہ کو دیکھ کر دونوں ہی ٹھٹک گئی تھیں۔

"آ گئی ہو مبارک بادیں دے کر۔ جانے پوتے کی مبارکیں وصول کرنے کا ہمارا وقت کب آئے گا۔" آنٹی نے اونچی آواز میں ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ علینہ' رونیہ کو اٹھا کر اسی وقت باہر آئی تھی۔ ان کی گفتگو پہ چونک گئی تھی۔ پھر عائشہ کا لٹھے کی مانند سفید چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ کے تو آل ریڈی دو پوتے ہیں۔ ابھی بھی خواہش ہے تائی امی!" بظاہر اس نے ہنس کر کہا تھا۔ تاہم در حقیقت وہ شدید تاؤ کھا رہی تھی۔

علینہ کے جواب پہ آنٹی تڑک کر بولی تھیں۔

"میں تو اسود کے بچے کی بات کر رہی ہوں۔" ان کا منہ بگڑ گیا۔ "تمہاری ماں پوتے کی صورت کو ترس کر رہ جائے گی۔"

"میرا بھائی بے اولاد تو نہیں۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے بیٹیاں دیں۔ اگر یہ بھی قسمت میں نہ ہوتیں تو ہم کیا کر لیتے۔" علینہ دھپ دھپ کرتی رونیہ کو لے کر واپس اندر چلی گئی تھی۔ اگر مزید وہاں رکتی تو ان دونوں کی لڑائی پکی تھی۔ ماما بیٹی کے انداز پہ قدرے پشیمان

دکھائی دی تھیں۔
علینہ کے جاتے ہی آنٹی کو پھر سے کھل کر چرکے لگانے کا موقع مل گیا تھا۔
"تمہیں وہاں جانے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر بچے کو کچھ ہو جائے تو۔" اب وہ جان بوجھ کر توہم پرستی کی باتیں کر رہی تھیں۔
"اسے ایسے موقعوں پر مت جانے دیا کرو رافیہ!"
اب کہ انہوں نے ماما کی طرف رخ روشن کیا تھا۔
"ایسی عورتیں سبز قدم ہوتی ہیں۔"
عائشہ کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔
وہ بمشکل ہی اپنے کمرے تک پہنچی تھی۔ پھر اپنے بیڈ پہ گر کر رو پڑی تھی۔
وہ روزینہ آنٹی کے خطرناک عزائم کی بو پا چکی تھی۔ روزینہ آنٹی اسے بیٹا نہ پیدا کرنے کے جرم میں طلاق دلوا کر اپنی بیٹی کا گھر آباد کرنا چاہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھر جانے شام سے گہری رات کب ہوئی تھی۔
عائشہ کو کچھ پتا نہیں تھا۔ بچوں کو کھانا بھی علینہ نے کھلایا اور کھانا پکایا بھی علینہ نے تھا۔ جانے اسود کب گھر آیا؟ کتنی دیر باہر بیٹھا؟ اور کب تک اروما کے ساتھ رہا تھا۔ عائشہ کو کچھ خبر نہیں تھی۔
وہ بچیوں کو سلا کر خود بھی اپنی جگہ پہ لیٹ گئی تھی۔
تب ہی اسود اندر آگیا تھا۔ عائشہ آج جلدی بستر میں گھس گئی تھی۔ تبھی اسے تشویش لاحق ہوئی۔ وہ کچھ سوچتا ہوا عائشہ کے قریب آگیا تھا۔
"خیریت! آج جلدی سونے کا ارادہ ہے کیا؟ طبیعت ٹھیک نہیں؟"
اس نے کمبل کھینچ کر عائشہ کا چہرہ دیکھنا چاہا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا تھا۔ تاکہ اسود اس کی روئی روئی آنکھیں نہ دیکھ لے۔ تب اس کا موڈ بگڑ جاتا۔ اسے روتی دھوتی عورتیں بالکل پسند نہیں تھیں۔
"بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ یہ آنکھیں کیوں رو رو کر سجا رکھی ہیں؟" وہ اتنا انجان ہرگز نہیں تھا۔ جتنا عائشہ اسے سمجھتی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹک گئی تھی۔
"ایسے ہی سر میں درد تھا۔" عائشہ نے ٹالنا چاہا تھا۔
اسود کو قطعاً "یقین نہیں آیا۔
"جھوٹ وہ بولنا چاہیے۔ جس پہ یقین آجائے۔ چلو "تمہاری مرضی" نہ بتاؤ۔"
"پتا نہیں' دل گھبرایا تو آنسو نکل آئے۔" عائشہ متذبذب سی بولی تھی۔ گویا اسے خود بھی اپنی کیفیات کی خبر نہیں تھی۔
"اپنے ایک بیان پہ قائم رہو۔ پہلے سر میں درد تھا۔ اب دل گھبرانے لگا۔"
"مجھے نہیں پتا۔" وہ جز بز سی ہو گئی تھی۔
"کوئی بات نہیں۔ پتا لگالیں گے۔" اسود کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ پھر کافی دیر خاموشی کی چادر تنی رہی۔ وہ دونوں ہی قریب تھے۔ پھر بھی دور تھے۔ دونوں ہی بول رہے تھے۔ پھر بھی خاموش تھے۔
عائشہ اپنی زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ خطرات جو آندھیں بن کر آرہے تھے۔ اور اگر عائشہ کی زندگی کی ناؤ ایک بیٹا پیدا کرنے سے بچ سکتی تھی تو پھر یہ "رسک" لینا ضروری ہو چکا تھا۔
ضروری تو نہیں تھا ڈاکٹر کا کہا سچ ہوتا۔ معجزہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ کیا خبر اس کی قسمت میں ایک بیٹا لکھا ہو؟ اس سے کیا فرق پڑتا اگر وہ زیادہ بیمار ہو جاتی یا خدانخواستہ زندگی سے ہاتھ دھو لیتی۔
کم از کم رافیہ ماما کی خواہش پوری ہو جاتی اور روزینہ آنٹی کی زبان بند ہو جاتی۔
"اسود! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ بولی۔ اسود اس کے انداز پہ حیران ہوا تھا۔
"خدانخواستہ مجھے دوسری شادی کرنے کی اجازت دینے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا۔" وہ سنجیدگی نما شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ عائشہ زچ ہو گئی تھی۔
"اسود! کیا ہے اگر ڈاکٹر کی ہدایت کو ترک کر دیا جائے۔ ایک دفعہ پھر' میرا مطلب ہے۔۔۔ میں چاہتی ہوں۔" وہ گڑبڑا کر بے ربط سی ہو رہی تھی۔

"زونیہ، سونیا کا ایک بھائی آجائے۔ اسود! معجزے بھی تو ہوتے ہیں۔ کیا خبر، ماما کی خواہش پوری جائے اور ہمارا ایک بیٹا۔" اس کی آنکھوں میں حسرتیں کروٹ بدل رہی تھیں۔ اسود گہرا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

"میں تمہارے اس فیصلے سے متفق نہیں ہوں۔" عائشہ اس کے صاف جواب پہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ یعنی اتنا کورا انکار؟ سوچا بھی نہیں تھا۔

"مگر کیوں؟" اس نے بچوں جیسی بے قراری سے کہا تھا۔ "اگر بیٹا نہ ہوا تو آپ کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"مجھے تمہاری عقل پہ افسوس ہو رہا ہے۔ حد ہے بیک ورڈ خیالات کی۔ اور تم ڈاکٹر کی ہدایت بھول گئیں؟ اس نے کہا تھا مزید کوئی بھی پریگننسی تمہاری جان کے لیے خطرہ ہو گی۔ انہی بیٹیوں کے ساتھ دل بہلاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔ وہ بھی تو ہیں جن کی بیٹیاں بھی نہیں ہوتیں اور آئندہ اس موضوع پہ تم مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گی۔" اس کا انداز دو ٹوک قسم کا تھا۔ واضح اور مستحکم۔ عائشہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اور ماما... روزینہ آنٹی؟ آپ کو نہیں پتا۔ میں کس کرب سے روزانہ گزرتی ہوں۔ کم از کم جان تو چھوٹ جائے گی۔" عائشہ نے بھیگی آواز میں کہا تھا۔

"ماما کو خوش کرنے کے لیے یہ ہی ایک کام بچا ہے؟ اور تمہیں سولی پہ لٹکا کے موت کے دہانے پہ لے جا کر خواہشات پوری کرنے سے بہتر ہے کہ ان خواہشوں کی جڑیں کاٹ ڈالوں۔" وہ سنجیدہ سا بول رہا تھا۔ اور عائشہ مضطرب سی اسے دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر پھر سے خاموشی چھائی رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔ کمرے کی فضا کشیدہ ہو چکی تھی۔ اس کشیدگی کو اسود کی آواز نے توڑا تھا۔

"اس کا ایک متبادل حل بھی ہے۔" اسود نے تھوڑی دیر کے بعد بڑے ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔

عائشہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا... وہ عجیب گھبرائے انداز میں اسے دیکھنے لگی تھی۔

"کیا..." اس نے بے آواز انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے اندر کچھ بری طرح سے کھٹکنے لگا تھا۔

"دوسری شادی" اسود نے آرام سے دھماکا کیا تھا۔ اور عائشہ جیسے پتھرا کر رہ گئی تھی۔ تو اسود بھی یہی چاہتا تھا۔ کہ سانپ بھی مرتا اور لاٹھی بھی بچتی۔ عائشہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر کچھ ہی دنوں میں روزینہ آنٹی کی ماما کے ساتھ خفیہ میٹنگز بڑھ گئیں۔ ان دنوں اروما بھی ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔ علیزہ سنجیدہ رہتی تھی اور علینہ غصے میں بھری۔ ماما کا کردار نیوٹرل تھا۔ وہ بہت خاموش تھیں یا پھر پراسرار، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اسود ان دنوں نوعمر لڑکوں کی طرح بنتا سنورتا اور شام کو کلب چلا جاتا تھا۔ وہیں اروما بھی ہوتی تھی۔ دونوں واپس اکٹھے گھر آتے تھے۔

عائشہ کے لیے یہ صورت حال بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ سارا دن غم زدہ رہتی۔ راتوں کو کروٹیں بدل بدل کر بے حال ہو جاتی تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور سکون جیسے دل سے اٹھ ہی چکا تھا۔

اس دن بھی اروما اور اسود اکٹھے تھے کلب میں۔

آج اروما اسود سے دو ٹوک بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اسود جم سے نکلا تو اروما سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ اسے بصد اصرار لان میں لے آئی تھی۔ اسود نے جوس منگوالیا۔ اروما بہت فریش لگ رہی تھی۔ بہت خوب صورت اور چمکتی ہوئی۔ اسود کے بغور دیکھنے پر وہ ایک احساس تفاخر کے ساتھ مسکرانے لگی۔ وہ ایسی نہیں تھی جو اسود اسے نظر انداز کر دیتا تھا۔

بہت دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اصل بات کی طرف آگئی۔

"پھر تمہارے کیا ارادے ہیں اسود؟" اس نے بڑی نزاکت سے جوس پیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ اسود پہلے تو حیران ہوا پھر مسکرا دیا تھا۔

"بڑے نیک ارادے ہیں۔" یہ ایک مثبت اشارہ تھا۔ جسے سمجھ کر اروما کی نخوت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

"تو پھر میں کیا سمجھوں؟" اروما نے بڑے نخرے کے ساتھ سوال کیا تھا۔ جیسے اسود فوراً" ہی اسے پروپوز کر دے گا۔

"جو تمہارا دل کہتا ہے وہی سمجھ لو۔" اسود نے ڈھکا چھپا جواب دیا تھا۔

"پلیز اسود! مذاق نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکا تھا۔

"میں کب مذاق کر رہا ہوں۔ میں تو سنجیدہ ہوں۔" اسود نے مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔ "اب تم ہی اتاؤلی ہو رہی ہو۔ تو میں کیا کروں۔" اس نے معنی خیزی سے بات کی شروعات کی تو اروما شرما کر رہ گئی۔

"اسود! ممی کو بہت جلدی ہے۔" وہ دبی آواز میں بولی۔ اپنی بے تابی کو حتی المقدور چھپا رکھا تھا۔

"ان کی جلدی کو بہت دور کر دوں گا۔ ان کی بے قراری کا خاتمہ کر دوں گا۔" اسود نے اسے تسلی دی۔

"کب؟ بھلا کب۔۔۔؟" وہ بہت بے تابی سے بولی تھی۔

"ایک دو دن تک۔" اسود نے جیسے اروما کو زندگی کی خوش خبری دے دی تھی۔ وہ مارے خوشی کے گنگ سی ہو گئی۔ اور عائشہ کے مسئلے پہ بات کرنا ہی بھول گئی تھی۔ ورنہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ وہ اسود کو دو ٹوک بتا دے گی کہ عائشہ کو طلاق دے اور بچیاں بھی ماں کے حوالے کرے۔ لیکن اس وقت مارے خوشی کے اسے کچھ سوجھا ہی نہیں تھا۔

گھر آکر بھی اس نے ماں کو پہلی خوش خبری ہی سنائی تھی۔ انہیں بھی قطعاً" یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہ پائیں۔

"تم اس کمینے شیراز سے طلاق کا مطالبہ کر دو۔ اب تو اسود بھی مان گیا۔ رافعہ میری مٹھی میں ہے۔ علیزہ کی مجال نہیں جو اعتراض کرے۔ اور علینہ کس گنتی میں ہے؟" روزینہ نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹی کو اکسایا تھا۔ لیکن یہاں پہ اروما کچھ متذبذب ہوئی تھی۔

"ممی! ایک مرتبہ بات طے ہو جانے دیں۔ یہاں سے کنفرم ہو لے۔ تب ہی شیراز سے پیچھا چھڑواؤں گی۔ یہ نہ ہو کہ نہ ادھر کی رہوں اور نہ ادھر کی۔" اروما نے کچھ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ روزینہ اس سے متفق نظر آئی تھیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"اسود نے ایک دو دن تک کا وعدہ کیا ہے۔" اروما نے ماں کو مزید بتایا۔ وہ بے ساختہ خوش ہو گئی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بڑی بے یقین سی تھیں۔ پرجوش اور بے تاب۔

"آپ کو یقین آجائے گا۔ جب اسود مجھے خود اپنائے گا۔" اروما نے مغرور انداز میں جتلایا تھا۔

"شکر ہے تمہیں بھی عقل آگئی۔ جانے اس شیراز میں کیا دیکھ کر فریفتہ ہوئی تھیں۔ صد شکر جان چھوٹی۔ اور تم نے اسود کے لیے دوبارہ سوچا۔" انہوں نے بیٹی کی عقل مندی کو سراہا اور اسے گلے لگا لیا تھا۔

ناممکن ہوتا کام ممکن ہو رہا تھا۔ وہ کیوں نہ خوش ہوتیں۔

✡ ✡ ✡

اگلے ہی دن روزینہ آنٹی نے عائشہ کو بوریا بستر گول کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس نے سنا تو وہ دل تھام کر رہ گئی۔ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔

آنٹی کے حکم نامے پہ اس نے امید طلب نگاہوں سے ماما کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دم ہی نگاہیں چرا لی تھیں۔ اس کا مطلب تھا۔ عائشہ کو اس گھر سے نکالنے میں ان کی پوری پوری رضا مندی شامل تھی۔

عائشہ کے اندر صدمے کی تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر بچیاں بھی ڈر کے رونے لگیں۔ آنٹی کی باہر سے آواز آرہی تھی۔

"ارے ' ایسی بیل کو کیا کرنا ہے؟ جو پھول تو دے پھل اور میوے نہ دے۔ ایسی بیل کو تو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے۔" وہ کسی سفاک حکمراں کی طرح گرج رہی تھیں۔

"اسود دو دنوں میں تمہارا فیصلہ کرنے والا ہے۔ بہتر ہے ' خود ہی عزت سے چلی جاؤ۔ بچیوں کا خرچا تمہیں ملتا رہے گا۔" وہ اس کے کمرے کی طرف منہ کرکے اپنے تئیں سارے فیصلے سنانے لگیں۔ عائشہ کے رونے کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

"اپنا سامان باندھو۔ اور نکلو ' بہت برداشت کرلیا تمہیں۔" ان کی نخوت بھری آواز میں بلا کا تکبر تھا۔ عائشہ سُن ہو گئی تھی۔

جانے وہ کتنی دیر غائبانہ اسے سناتی رہی تھیں۔ پھر باہر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ خاموشی کا وقفہ آدھے گھنٹے پہ محیط رہا تھا۔ یکایک کسی کے بولنے کی آوازیں پھر سے ابھرنے لگیں۔

ان آوازوں میں نمایاں آواز اسود اور اروما کی تھی۔ وہ کسی بات پہ ہنس رہے تھے۔ عائشہ کا رواں رواں سماعت بن گیا تھا۔

"تمہاری بیوی سے کوئی بھی خوش نہیں۔ پوچھ لو اپنی ماں سے۔ ایسی خاموش صورت کہ گھر میں ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ نہ عقل نہ شکل۔۔۔ پتا نہیں ' کہاں سے رافیہ نے اسے دریافت کیا۔ کیا لڑکیوں کا کال پڑ گیا تھا؟" آنٹی ایک مرتبہ پھر سو کی اسپیڈ سے شروع ہو چکی تھیں۔

"کال کیوں پڑتا تھا؟ مجھے تو اب بھی کئی لڑکیاں از خود پروپوز کرتی ہیں۔" اسود نے نخوت بھرے لہجے میں جتلایا۔

"تو اس میں کوئی شک ہے کیا؟ تم میں کیا کمی ہے بیٹا!" آنٹی کا لہجہ شہد آگیں ہو گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ کوئی ڈھونڈیں میرے لیے اور۔" اس کی آواز میں واضح بے تابی تھی۔ اندر موجود عائشہ کا دل اس بے رخی پہ کانچ کی مانند ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ دیکھنا ' کیسی دلہن لاؤں گی تمہاری۔" آنٹی نے نہال ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "بس تم دو دن کے اندر اندر عائشہ کا فیصلہ کرو۔" ان کے لہجے میں واضح التماس تھا۔

اسود لحہ بھر کے لیے چونکا تھا پھر جیسے سمجھ کر معنی خیزی سے سرہلانے لگا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں۔ عائشہ کی صورت آپ کو دکھائی ہی نہیں دے گی۔"

اس نے بھرپور انداز میں آنٹی کو تسلی دی تھی آنٹی کا چہرہ کھل کر گلنار ہو گیا تھا۔ "بس بٹیا! اب اس معاملے کو مت لٹکاؤ۔ کل بھی اروما تمہاری تھی۔ آج بھی تمہاری ہے۔ سمجھو ' جو شادی کا ایک مہینہ اس نے رذیل پروفیسر کے ساتھ گزارا تھا۔ وہی قیامت تھا۔ اتنا شکی کہ حد نہیں۔ ہر بات پہ پابندی لگاتا تھا۔ اروما ایسے شخص کے ساتھ بھلا رہ سکتی تھی؟" آنٹی کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ اسود نے اپنا بازو آنٹی کے گرد حمائل کرکے بڑی محبت سے کہا۔

"اروما کے مزاج کو میں ہی سمجھتا ہوں۔ وہ بھی اس کی مرضی تھی جو نکاح کو اس نے خود توڑا۔ ویسے بھی اروما مجھ جیسے الّو کے پٹھے کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی تھی۔ اسے آخر اندازہ ہو ہی گیا۔"

"کوئی ایسا ویسا۔" آنٹی زار و قطار رونے لگیں۔ "اپنی غلطی پہ آج تک پچھتا رہی ہے۔ بس تمہیں اروما کو معاف کرنا ہے۔ اسے دھتکارنا نہیں ۔۔۔ وہ بہت ٹوٹ چکی ہے۔"

"آپ کیوں غم کرتی ہیں۔ اروما کے لیے میرے دل میں اب بھی بڑی گنجائش ہے۔ پھر معافی کا کیا سوال؟ میں اس سے قطعاً "خفا نہیں ہوں۔" اسود کی ملائمت کا کوئی انت نہیں تھا۔ عائشہ جیسے تھک ہار کر بکھر گئی تھی۔

"یہ تمہاری اعلا ظرفی ہے بیٹا! اس نادان کے آنسو پونچھ لو۔ آخر گھر کی ٹھکرائی بیٹیوں کو گھر کے بیٹے ہی سہارا دیتے ہیں۔"

آنٹی لوہا نرم دیکھ کر چوٹ پہ چوٹ کر رہی تھیں۔ یہ پہلا موقع ملا تھا جو اسود سے کھل کر بات ہو رہی تھی۔

ورنہ وہ تو تمہیدی الفاظ ہی سوچتی رہ جاتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اسود کو اروما کی طرف مائل کریں۔ لیکن اسود تو پہلے سے ہی جی جان کے ساتھ اروما کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

"پر بیٹا! اروما کو دوسری مرتبہ ٹھوکر لگنے کا خدشہ ہے۔ وہ اب تحفظ چاہتی ہے۔ تم ان سب کا پہلے کوئی ٹھکانہ کرلو۔"

آنٹی کی فرمائش نے ماما کو پہلو بدلنے پہ مجبور کردیا تھا۔ آنٹی کا واضح اشارہ عائشہ اور بچیوں کی طرف تھا۔ نجانے ماما کے دل کو پہلی مرتبہ کیا ہوا تھا؟ اندر بے چینی ہی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جو ہو رہا ہے ٹھیک نہیں۔ ان کا دل چاہا۔ وہ بے ساختہ اسود کو روک دیں۔ مگر ان کی جنونی خواہش پہ اسود نے ہتھیار پھینک کر اروما کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن عائشہ؟ اسود کی بچیاں، وہ کہاں جاتیں؟ ان کا مستقبل کیا ہوتا۔" یہ باتیں انہیں اب یاد آرہی تھیں۔ اس وقت جب سب ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ اور ڈوریں ساری بھابھی کے پاس چلی گئی تھیں۔ "ڈونٹ وری آنٹی! میں جلد ہی کچھ کرتا ہوں۔ آپ سب کی ٹینشن کا بہت آسان حل میں نے ڈھونڈلیا ہے۔ بس کل کا دن انتظار کرلیں۔۔۔ عائشہ آپ کو دکھائی بھی نہیں دے گی۔"

اسود نے دوٹوک انداز میں اپنا تحکمانہ فیصلہ سنایا تھا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ پیچھے سے آنٹی نے گم صم بیٹھی ماما کو مارے خوشی کے دبوچ لیا تھا۔

"مبارک ہو۔ تمہاری دلی تمنا پوری ہونے کے قریب ہے۔ اب شادیانے بجاؤ۔۔۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی پوتے کی صورت بھی دیکھوگی۔" وہ ماما کو پرانا لالچ دے کر خوش کرنے کی کوشش میں تھیں اور ماما سے جواب میں کچھ بولا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ اندر سے ایک دم خالی ہوگئی تھیں۔

اسود کی دوسری شادی اور ایک پوتا ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ لیکن جب خواہش پوری ہونے کا وقت آرہا تھا تو وہ اندر سے ایک دم ٹوٹ گئی تھیں۔ آخر یہ اچانک کیفیات کیوں وارد ہوئی تھیں؟

اسود اپنے کمرے میں آیا تو عائشہ گھٹنوں میں منہ دیے رو رہی تھی۔ وہ تھم سا گیا۔ تو عائشہ نے سب کچھ سن لیا تھا؟ اسے لمحہ بھر کے لیے عجیب سوچوں نے جکڑا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ پتھر سا ہو گیا تھا۔

"عائشہ! میں نے تمہیں یہاں سے نکالنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ تم ابھی کے ابھی پیکنگ شروع کردو۔۔۔ اور ہاں بچیوں کا سامان بھی رکھو۔ میں تمہیں زیادہ دیر یہاں رہنے کی مہلت نہیں دے سکتا۔"

اس نے دوٹوک لہجے میں عائشہ کے سر پہ بم گرایا تھا اور پھر تن فن کرتا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اور یہ تابوت کی آخری کیل تھی اس کے بعد بچا کیا تھا؟

پھر دن سے رات ہوئی۔ سورج ڈھل گیا۔ شام پھیل گئی تھی۔ اسود بھی دفتر سے آگیا تھا۔ اور آنٹی کی فیملی بھی۔ بس حنان نہیں تھا۔ علیزہ اور بچے تھے۔ اروما تھی۔ علینہ بھی اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لیے موجود تھی۔

اسود نے اک نظر عائشہ کے شکستہ وجود پہ ڈالی تھی۔ پھر اس نے حاضرین کی طرف توجہ کرلی تھی۔ اور سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا تھا۔

"اروما میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ ہمارا نکاح بڑوں کی رضامندی سے ہوا تھا۔ شاید یہ آخری لڑکی بھی ثابت ہو جاتی مگر اس کی آسمانوں کو چھوتی خواہشوں کو پورا کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ پھر بھی میں اس رشتے کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اروما کو چاہتا تھا۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا تو عائشہ کے دل کی دھڑکنیں تھم گئی تھیں۔ جبکہ اروما کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

"لیکن یوں ہوا کہ اروما کو اس چاہت کی قدر ہی نہ ہوئی۔ اس کے سامنے چمکتا فیوچر تھا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو کیوں زنگ لگاتی؟ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ میں نے اس کی اسٹڈیز پہ سمجھوتا کرلیا۔ لیکن پھر آگے کیا ہوا؟"

اب وہ بات کو گھما کر کس طرف لے جارہا تھا؟ آنٹی

اور اروما تھوڑا جزبز ہوئی تھیں۔ ان باتوں کا بھلا کیا مقصد تھا؟

"ایکچوولی! اروما نے ماما کی خواہش پہ مجھ سے طلاق نہیں طلب کی تھی۔ بلکہ اسے اپنی یونی کا امیر کبیر پروفیسر بھا گیا تھا۔ اس نے سوچا' زندگی میں ایسے مواقع کم کم ہی آتے ہیں۔ سو اروما نے اس موقع کو نہیں گنوایا تھا۔ جو کہ بالکل ٹھیک ہی کیا۔"

وہ نرمی سے مسکرا دیا تھا اور اروما بے قرار سی ہو گئی تھی۔

"یوں اروما نے ادھر نکاح کیا اور میری یہاں شادی ہو گئی۔ آنٹی' اروما کی شادی میں شرکت کرنے اس کے پاس چلی گئیں۔ تب تک سب کچھ ہی ٹھیک تھا۔ لیکن بعد میں کیا ہوا؟ اروما کا پروفیسر شوہر بہت شکی مزاج کا تھا۔ اس نے اروما کی یونی بند کروا دی۔ پڑھائی رکوا دی۔ وہ فیوچر جس کی چاہ میں وہ یہاں ہر رشتے کو ٹھوکر مار کر گئی تھی۔ وہ فیوچر تباہی کے دہانے پہ کھڑا تھا۔ تب جلد باز اروما نے وہی کیا۔ جو اسے کرنا تھا۔ اس نے پروفیسر سے علیحدگی اختیار کر لی۔۔۔ اور اپنی تعلیم مکمل کرتی رہی۔ یوں بیچ میں تین سال آ گئے۔ اروما نے سوچا' اب اسے واپسی کا سفر کرنا چاہیے۔ تجدید تعلقات کے لیے اسود ہے نا۔۔۔ الو کا پٹھا؟ دل ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھا ہو گا۔"

اس نے انتہائی نرم لہجے میں آنٹی اور اروما کے حواس اڑا دیے تھے۔ اتنی انسلٹ؟ اتنی شرمندگی؟ وہ بھی عائشہ کے سامنے؟ اروما کا بس نہیں چل رہا تھا وہ یہاں سے کسی بھی طرح غائب ہو جائے۔ یہ اسود نے اسے بے وقوف بنا کر کیسا ڈراما کھیلا تھا؟

"اور مجھے اروما کی ذہانت پہ کسی بھی طور شک نہیں تھا۔ وہ پورا پلان بنا کر یہاں آئی تھی۔ اسود قائل ہوا تو ٹھیک' ورنہ پروفیسر کا آپشن تو ہے ہی۔۔۔ کیا حرج ہے وہ کچھ شکی مزاج ہے۔ دولت بھی تو اس کے پاس بے تحاشا ہے۔ آپ سوچ رہی ہوں گی۔ مجھے یہ باتیں کس نے بتائیں؟" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا تھا اور پھر شروع ہو گیا۔

"مجھے حنان نے سب کچھ بتایا ہے۔ یہ بھی کہ پروفیسر اس کے ساتھ تعلقات ٹھیک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس پہ ایک مرتبہ پھر اسود کا یعنی میرا بھوت سوار ہے۔ تو تمہیں یہاں بلانے کا یہ مقصد نہیں اروما! میں تمہیں ڈس ہارٹ کروں؟ تمہیں شرم سار کروں؟ ایسا ہرگز نہیں۔۔۔ میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے "مفاد پرستی" کو ختم کر دو۔ صرف اپنے بارے میں مت سوچو! خود غرضی پہ مبنی کوئی بھی رشتہ پائیدار نہیں ہوتا۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ اپنی زندگی میں لوٹ جاؤ۔ کیونکہ تم اگر سونے میں ڈھل کر بھی آتیں تب بھی میرے لیے حرام تھیں۔ میں کبھی تمہاری طرف دیکھتا نہیں۔ کیونکہ خود غرض لوگوں کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کل تم نے اپنے مفاد کے لیے طلاق لی تھی۔ آج تم پھر اپنے مفاد کی خاطر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہو۔ تم کل بھی میرے

لیے شجر ممنوعہ تھیں اور آج بھی۔۔۔ حالانکہ کوئی بھی لڑکی۔ مجھے نہ کل دوسری شادی کی خواہش تھی اور نہ آج ہے۔"

اس کا ایک ایک لفظ انگارے کی طرح آنٹی کے اندر پیوست ہو رہا تھا۔ وہ مارے شرمندگی کے کچھ بول نہیں پائی تھیں۔ ان کا سر جھک گیا تھا۔ اور یہی حال اروما کا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"پھر ہمارے ساتھ ڈراما کیوں کیا؟ عائشہ کو گھر سے نکالنا؟" روزینہ آنٹی بہت دیر بعد شکوہ کناں ہوئی تھیں۔

"یہ ڈراما نہیں۔۔۔ حقیقت ہے۔ عائشہ یہاں سے جا رہی ہے۔" اسود نے جیسے دھماکا کیا تھا۔

ماما کا رنگ فق ہو گیا۔ علیزہ گھبرا گئی تھی۔ البتہ علینہ مطمئن تھی۔ جیسے وہ ساری کہانی کا پس منظر جانتی تھی۔ اور عائشہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"عائشہ کہاں جا رہی ہے؟ تم پاگل ہو اسود! عائشہ کو کیوں نکال رہے ہو؟ یہ معصوم جانیں کہاں رلیں گی؟"

ماما جیسے تڑپ اٹھی تھیں۔ اسود کے چہرے پہ استہزائیہ تبسم پھیل گیا تھا۔

"جب پوتے کی خواہش میں اسے گھر سے نکال رہی تھیں۔ تب ان معصوم جانوں کا خیال نہیں آیا تھا؟" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا تھا۔ ماما ندامت کے مارے لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئی تھیں۔

"اب اس بھول کو معاف کر دو۔ میری توبہ۔ جو پوتوں کی خواہش بھی دل میں رکھوں۔" انہوں نے یکسر بدلے لہجے میں منت بھری درخواست کی تھی۔ ان کا دل خدشات سے لرز رہا تھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ عائشہ یہاں نہیں رہے گی۔ کیونکہ یہ آپ کی نگاہ کا کانٹا ہے۔ آپ اسے پسند نہیں کرتیں۔ تو کیا ضرورت ہے اسے بیکار کی خدمتیں کرنے کی۔ میں اسے یہاں سے نکال رہا ہوں۔" اس نے پتھریلے انداز میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

عائشہ گھبرا گئی تھی' لرز گئی تھی۔ اسود نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا تھا۔ عائشہ کے ہاتھ سے بیگ گر پڑے تھے۔ اسود نے اسے سہارا دیا تھا؟ عائشہ کو یقین نہ آیا۔

"عائشہ کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میری بچیوں کو اس کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک بات آپ کو بتا دوں۔۔۔ مجھے عائشہ سے بہتر کوئی لڑکی نہ ملتی۔ یہ آپ کا احسان ہے مجھ پہ۔۔۔ جو میرے لیے ایک وفاشعار' خدمت گزار' محبت کرنے والی بیوی ڈھونڈ کر لائی ہیں۔ اور میں اپنی زندگی میں اپنی بچیوں کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اور جہاں تک اس ڈرامے کا تعلق ہے۔ یا عائشہ کو اس گھر سے نکالنے کا؟ تو اطلاعاً عرض کرتا ہوں۔ میری سرگودھا پوسٹنگ ہو چکی ہے۔ یوں میں اپنی بیوی اور بچیوں کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ امید ہے۔ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو آپ معاف کر دیں گی۔ خدا حافظ ماما! اب آپ کو عائشہ کی صورت دکھائی نہیں دے گی۔"

اسود نے دوٹوک لہجے میں ہر ایک کے سر پہ بم پھوڑا اور بچیوں کو اٹھا کر عائشہ کو باہر آنے کا اشارہ دے کر خود نکل گیا تھا۔

ماما ہکا بکا تھیں۔ آنٹی مارے خجالت کے منہ بند کیے بیٹھی تھیں۔ اروما خفت زدہ سی اٹھ کر چلی گئی تھی۔

علینہ اور علیزہ لپک کر باہر نکلی تھیں۔ عائشہ اور اسود کو الوداع کہنے۔۔۔ اور عائشہ اسود کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دبا دیکھ کر ایک لمحے کے اظہار میں پوری زندگی کو دھڑکتا محسوس کر رہی تھی۔ کیا اب پوری زندگی اسے اسود سے کسی اظہار کی ضرورت تھی۔ اس نے لمحوں میں اس کے سارے شکووں کو دھو ڈالا تھا۔ اور اس محفل کو سجا کر آج ثابت کر دیا تھا کہ وہ لاکھ لاتعلق سہی مگر اسے اپنی بیوی اپنی بچیوں سے محبت تھی۔

داغ

سمیرا حمید

زمین اپنی کوکھ میں بنجر ہو چکی تھی۔ جب سے اس کنویں کی کوکھ میں کوکھیں اجڑنے لگی تھیں۔ پہلی قسم چوہدری عنایت نے کھائی تھی' پھر سب نے اس قسم سے اپنے پیٹ بھر لیے' خون بینت لیے' سانسیں دھونک لیں۔

ماسی نے ماسیڑھ کو زہر دے دیا تھا۔ اور ماں۔۔۔ وہ اپنے پیار کے فراق میں آہیں بھرتی بھرتی اس کے باپ کی زندگی جہنم بنا گئی تھی۔ پھوپھی شادی سے ایک رات پہلے گھر سے بھاگ گئی تھی یہندی کی رات پچھواڑے میں پھپھی نے جھٹکے سے ہاتھ کی چوڑی' پیر کی پازیب پھینک کر ماری تھی جسے وہ اتارنا بھول گئی تھی اس کالسبا پراندہ رات کے اندھیرے کا سانپ بنا' درخت کے پیچھے کھڑے عنایت کو ڈس رہا تھا۔

بارات کا پنڈال اجڑ گیا۔ گاؤں کی پگڈنڈیاں گھوڑے کی نعلوں سے اجڑی ہوئی ملیں۔ وہ رانجھا رانجھا کرتی' پیچھے جھوک سیال چھوڑ گئی تھی۔ عشق کی آگ سے سب جلا کر' جدائی کے بچھو کنویں کے پینڈے میں چھوڑ کر وہ اپنے یار کی پشت سے لگی' گھوڑے کے ٹاپوں تلے گاؤں کی ایک ایک لڑکی کو روند گئی تھی۔

چھوٹی پھوپھی کو بھادوں میں سانپ سے ڈسوا دیا۔ ماگھ میں تیسری کی لاش نالے سے نکلی۔ اس کے باپ نے' اپنے باپ کے ساتھ مل کر پھوپھیوں کے جنازے نکال کر عزت کے جنازے بچا لیے۔

تب وہ بچہ تھا۔۔۔ بڑا ہوا تو سب سمجھ گیا۔

ان کے ڈنگروں کا رکھوالا اس کی پھوپھی کا یار تھا۔

نانے کا منشی' حرامی شہری بابو' انگریزوں کا ٹٹو اس کی ماسی کا۔۔

اس کنویں میں پہلی بچی اس نے اپنی ماں کے نام پر پھینکی تھی جو اس کے باپ کو چاٹ گئی تھی۔ پھر ماسی' پھر پھپھی اور چوتھی اس لیے کہ اس نے تین بچی تو پھینکی تھیں۔ اس کی بیوی رضیہ راکھ کی پوٹلی بن گئی تھی۔ باس دینے لگی تھی۔ گاؤں کے پچھواڑے کنویں کی طرف منہ کر کے سوتی تھی' جہاں پانی کی پشت پر

اس کی بچی آنکھیں موندے پڑی تھی۔

ہر عورت بغل کا سانپ تھی۔ رت کی سیاہی کی بدکردار تھی۔ انگ کی چنی' ہر عورت۔۔ یار کی بکھی بنی دکھائی دینے لگی تو گاؤں کے ایک ایک مرد نے کنویں کی راہ دیکھ لی اور ایک ایک ماں کے دل میں انی گاڑنی شروع کر دی۔

گئے سالوں میں صرف تین بچیاں کنویں کی کوکھ سے محفوظ رہی تھیں۔ نویں مہینے کمہارن بچی کو پیٹ میں ہی لیے قبر جا سوئی تھی۔ ایک وہ اور ایک دودھی کمالے کی۔ اس نے جیسے ہی بچی کی طرف ہاتھ بڑھایا' اس کی نئی نویلی دلہن نے نیلا تھوتھا چاٹ لیا تھا۔ مسکین بچی دودھ کے لیے بلک بلک کر مر گئی اور آخری

وہ جس کے پیدا ہونے سے دو دن پہلے پانی کی لڑائی میں اس کا باپ مر گیا تھا۔

بچی منحوس تھی۔۔۔ گاؤں کی گلیوں میں کھیلتی پھرتی تھی۔ جھلی تھی۔۔۔ مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ اول فول بکتی رہتی تھی۔۔۔ پھر بھی سارے گاؤں کی مائیں اس پر واری صدقے جاتی تھیں۔ اسے روک روک کر سینے سے لگاتی تھیں۔ اپنی کلثوم' شیداں' جمیلہ' ثریا' بختاں کو۔ اس کے منہ کو چومتیں اور اپنے داج کے زرتار کپڑے کاٹ کاٹ کر اسے گڈے گڑیا بنا بنا کر دیتیں۔۔۔

داج۔۔۔ جو کسی کو نصیب نہیں ہونے والا تھا۔۔۔

نہ ٹانکے۔۔۔ نہ نگندے۔۔۔ گوٹا کناری اور نہ ہی سوت کے ڈھیر۔۔۔

اب گاؤں میں ایک ساتھ نو عورتیں کچے دل اور پکے پیٹ سے تھیں۔

نو عورتیں۔۔۔ گاؤں کی ساری ماؤں کے دل اپنے پیٹ میں سمیٹے ہوئے تھیں۔ سب کی کوکھ میں لڑکیاں تھیں۔ سب سیانی اور سیانے جان گئے تھے۔ گاؤں بھر میں سانپ پھنکارتے پھرتے تھے۔ ماؤں کی کمریں جھک آئی تھیں اور کبڈوں کے دل کا بغض ہر مرد کی آنکھ میں سمٹ آیا تھا۔

گاؤں مردوں سے بھرا پڑا تھا اور کنواں عورتوں سے۔۔۔

ندی کے دو کنارے آملنے والے تھے' لیکن کنویں کا منہ اب بند ہونے والا نہیں تھا۔ چوہدری عنایت کی حویلی سے نکلی ''پھل پائی گاؤں کے ہر گھر کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ گاؤں کے سارے مردوں نے اپنی راہیں پچھواڑے کے اس کنویں کے لیے کھول لی تھیں۔

رات کے اندھیرے میں درخت کی شاخ کے ساتھ لالٹین لٹکاتے' کنویں کے رکے ہوئے پانی میں سڑاپ کی آواز للکار سے بیدار کرتے اور لکڑی کے تختے سے کنویں کا منہ بند کرتے ان کے سینے غرور اور جی داری سے پھول جاتے تھے۔

دو دن گاؤں مرگھٹ کی آندھی بنا رہتا۔۔۔ مائیں بین کرتیں۔۔۔ کرلاتیں' واویلا کرتیں اور پھر جا کر کنویں کی منڈیر کو زبان سے چاٹنے لگتیں۔ کنویں کی پگڈنڈیوں کی مٹی پانی میں گھول گھول کر پیتیں۔۔۔ گھر کی کوٹھڑیوں میں صندوقوں میں رکھے اپنے داج کے کپڑے تار تار کرتیں۔۔۔

لیکن پھر اگلی بار بھی۔۔۔ درخت کے ساتھ ایک لالٹین جھولتی۔۔۔

گاؤں کی باس میں عورتوں کی آہیں سسکتی تھیں۔ تندوروں میں ان کے کلیجے جلتے تھے۔ بھٹی کے کوئلے ان کی کوکھوں میں سلگتے تھے۔ مردوں کے سنگ ان کے دل کچلتے تھے۔ ان کے لمس انہیں تار تار کرتے تھے۔

اس پر بھی یہی عورتیں پھر سے امید سے تھیں۔۔۔

گاؤں میں کبھی کسی دوسرے گاؤں کی لڑکی بیاہ کر نہیں آئی تھی۔ کوئی دوسرا گاؤں والا یہاں اپنی لڑکی دیتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے گاؤں' قصبوں میں رہنے والے چاچے' مامے ہی رشتہ کر رہے تھے۔ لڑکوں کی بہتات تھی۔ گورے صاب آئے تھے' پولیس بھی آئی تھی' لیکن سارا گاؤں ایک مٹھ ہو گیا تھا۔ مردوں نے آنکھیں نکال لی تھیں اور عورتوں نے گھونگھٹ۔ کوٹھڑیوں میں انہیں دھکیل کر' انہوں نے باہر سے تالے لگا دیے تھے۔

کنویں کی تلاشی لی گئی تو سانپوں نے کھوجی کو دس فٹ سے نیچے نہیں اترنے دیا تھا۔ ہٹلر نے گورا صاب پر ہلا بول دیا۔ گورے سب بھول بھال دشمن کے ساتھ دوبدو جنگی ہو گئے۔

کنویں کا منہ کھلا رہا۔۔۔ دوبدو جنگ کے آثار کہیں ظاہر نہیں ہوئے۔۔۔

دشمن بھی تھا۔۔۔ ظالم بھی۔۔۔ وار بھی' لیکن ہتھیار کند رہے۔۔۔

تو گاؤں کی نو عورتیں امید سے تھیں اور سب بیٹیاں پیدا کرنے والی تھیں۔ ساری بیٹیاں کنویں میں پھینکی جانے والی تھیں۔ ہرماں نے جان لیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر' پھل پائی کا پھیرا ہونے والا تھا۔۔۔ ممتا کی ہر سسکی نے الٹے پیروں کا ہر نشان بھانپ لیا تھا۔

دل ابھی سے بھٹی کا کوئلہ ہو گیا تھا۔
ایک ایک کس۔ بائیں آنکھ میں پھڑکنے لگی تھی۔۔۔
ایک ایک کوکھ اجڑنے والی تھی۔۔۔ کنویں کی دیواروں سے لپٹا ایک ایک سانپ' پانی کی قبروں کا رکھوالا بننے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

بختاں نو سال کی ہو چکی تھی۔ نوری بارہ اور ثریا کے لیے چاچی حاجراں کنویں پر جا کر گوٹا کناری لگا لال دوپٹہ پھینک آئی تھیں۔ مہندی کا کٹورا۔۔۔ سہاگ کا جوڑا اور سہیلیوں کے لیے چھوہارے بتاشے۔
جب مرد دور میلوں پر جاتے تھے۔ تو عورتیں کنویں کی منڈیر پر گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتی تھیں۔ سپارے' یسین پڑھتیں' لمبی لمبی دعائیں کرتیں اور کنویں کے گدلے بدبودار پانی میں ایسے جھانکتیں جیسے بیاہ کر پرایا دھن ہوئی بیٹی کی واپسی کے انتظار میں کملی دھملی ماں' نظر کا نور گنوا بیٹھی ہو۔
"کملیاں۔۔۔" پیچھے رہ جانے والے بڈھے زمین پر ڈانگ مار مار کر کہتے۔
کملیوں نے پندرہ سالہ ثریا کے لیے سہاگ کے گیت بھی گائے۔
نہ کچھ پردے میں رہا۔۔۔ نہ سب ظاہر ہوا۔ آس پاس کے گاؤں والیاں ڈرتے ڈرتے آتیں اور گاؤں کی عورتوں کا حال احوال پوچھ کر چلی جاتیں۔
"پگلا گئی ہیں سب۔۔۔"
شوکت اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر بھاگ گیا تھا' لیکن جس گاؤں اس نے جا ڈیرا لگایا۔ اس کے سب مرد اسے کمینے' نٹھلے' بے غیرت لگے۔ عورتیں بے شرم' کم ذات۔ شام ڈھلے زینب کی آنکھ کا سرمہ اور سرخ پراندہ' اس کی آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ ابھی ساتواں مہینہ تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ چوہدری عنایت نے کنویں میں ان چنڈالوں کو کیوں جھونکنا شروع کیا تھا۔ عورت ذات ہے ہی جہنم کی راکھ۔ بے حیا۔ اس کے گھر کی چوکھٹ ہر نظر پار کرنے لگی ہے۔ ایسے ہی تو اس کے گھر کے باہر دو حرامی ہیر گاتے ہوئے نہیں گزرتے۔۔۔ بلھے شاہ پڑھتے پڑھتی گاؤں کے سارے کنجر' سوہنی کے ہجر کے ہوکے بھرنے لگے تھے۔
وہ گاؤں واپس آ گیا۔۔۔ تین بیٹوں کا باپ بنا وہ۔۔۔ اور دو بیٹیوں کی ماں بنی زینب۔
مٹی سے اٹے گاؤں میں' خون سے لتھڑی مائیں رہنے لگیں۔ ایک ایک ماں کا دل کنویں کے تھال میں پڑا تھا۔ ایک ایک بیٹی کی سانس' ان کی سانس پر طعنہ زن تھی۔ پھٹکار تھی۔ لعنت ملامت تھی۔ ایک ایک کی داج کی چنی' لال پراندہ' سہاگ کا گیت' ان پر قہر تھا۔
کنویں کے پیندے کے رکھوالے سانپ' گاؤں کی ایک ایک ماں کو ڈسنے کے لیے بے تاب تھے۔
کنویں کا دہن۔۔۔ وہ ابھی بھی کھلا پڑا ہے۔۔۔
نو عورتیں پیٹ سے ہیں۔۔۔
جاڑے کی راتوں نے سارے گاؤں کو اداس کر دیا۔ صبح گجردم کنویں سے سانپ نکلتے دکھائی دینے لگے۔ عورتوں کی ٹولیوں نے دم سادھ لیا تھا۔ وہ اپنے اپنے چرخے لے کر بیٹھ جاتیں اور کاتے جاتیں' کاتتے جاتیں۔۔۔ سرخ سوت۔۔۔ جہیزوں کی دریاں' کھیس۔۔۔
ان کے چرخوں کی ہوک نے سارے جگ کو کاٹ ڈالا تھا۔ جو داج کسی کو بھی نصیب ہونے والا نہیں تھا' وہ صبح سے شام تک بننے لگا تھا۔
مردوں کو روٹی پانی دیتے ہوئے اب ان کی آنکھیں چڑھنے لگی تھیں۔ نالے میں ان کے کپڑے دھوتے دھوتے انہیں اپنے ہاتھ غلیظ لگنے لگے تھے۔ گھڑوں سے کٹورے بھر بھر پانی بچھوؤں کو پلاتے' ان کے ہاتھ ٹیڑھے ہونے لگے تھے۔ کوٹھریوں کو جندرے (تالے) لگا لگا' انہوں نے کندھاروں کو تیز کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔
سیانے بھانپ رہے تھے۔۔۔ ہوا الٹی چلنے لگی ہے۔۔۔ کنویں کی منڈیر پر اب بڑی چوڑیاں ٹوٹنے لگی ہیں۔۔۔ دن ڈھلے' شام پڑے' اب سب کی سب کنویں پر راضی نامے کرنے لگی ہیں۔ اپنے گھڑوں کے دم

شدھ پانی وہ کنویں میں الٹنے لگی ہیں۔
سوت کا سوت اب ایک ایک چرخے کی پلی پر چڑھنے لگا ہے۔

مردوں کی آنکھوں میں تندی آنے لگی تھی' جیسے گاؤں میں ایک ساتھ کئی بلوائی آگئے ہوں۔ کنویں کی طرف جاتی پکی پگڈنڈی کچی ہونے لگی تھی۔ جہاں دھول اڑتی تھی' وہاں اب گھاس اگنے لگی تھی۔ کوے منڈیر پر بیٹھ کر کاں کاں کرنے لگے تھے۔ باجرے کے کوروں' چڑیوں کے ڈیروں نے جنگل میں منگل کردیا تھا۔

گاؤں کا پچھواڑا' آباد ہونے لگا تھا۔ اب ان کے میلوں میں جانے کی راہ نہیں دیکھی جاتی تھی۔ قرآن پاک ہاتھ میں لیے گھڑوں سے پانی نکال نکال کر وضو کرتے' ان کے دل کا خوف ان کی آنکھ کی للکار بن گیا تھا۔

مونچھوں کو تاؤ دیتے' کلہاڑیوں سے لکڑیاں چیرتے' کدال سے کھیتوں کو پانی کی راہ دکھاتے' انہیں سب نظر آرہا تھا۔ عورتوں کی چال میں جو چڑیلیں غرانے لگی تھیں اور ان کی زبان پر جو خون چڑھ آیا تھا۔ سب۔۔۔

☆ ☆ ☆

کنویں کی منڈیر انتظار میں تھی اور درخت کے ساتھ لالٹین جھول جانے کو تھی۔

رات کے تیسرے پہر دائی جیناں نے صغراں کے پہلو میں روتی بلکتی بچی کو رکھا۔ صغراں نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ بچی پوری جان سے چیخ رہی تھی۔

"جا مائی گھر جا۔"

دائی جیناں نے اگلی بات نہ کی اور اپنی سہارے کی ڈانگ کو زمین پر دے دے کر مارتی' اپنا لنگڑا پیر گھسیٹتی سارے گاؤں کی عورتوں میں بچی کی پیدائش کا اعلان کرنے لگی۔

گاؤں کا ہر مرد سو رہا تھا' گاؤں کی ہر عورت جاگ رہی تھی۔ کچھ چھتوں پر کھڑی تھیں' کچھ دروازوں کی درزوں سے اس کنویں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ کنویں سے سارے سانپ نکل آئے تھے اور ایک ایک ماں کے سامنے پھن اٹھائے کھڑے تھے کہ وہ مچھ کیں اور وہ اپنا زہر ان کی نس نس میں بھر دیں۔

غنودگی سے صغراں نے آنکھ جھپکی۔ بچی اس کے سینے پر پڑی سسک رہی تھی۔ کوٹھڑی کی چوکھٹ پر وہ لالٹین لے کر کھڑا تھا۔ اس نے آنکھ کھول کر' چوکھٹ کے شیطان کو دیکھا۔

دور۔۔۔ بہت دور کنواں بھی اسے صاف نظر آیا۔۔۔ اس کی منڈیر کے سائے میں گڈے گڑیاں کھیلتی اپنی رشیداں' ماسی کی بختاں اور دلہن بنی بیٹھی ثریا۔۔۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ہاتھ بچی پر اور سختی سے ٹکا لیے۔

ایک وہ پہلے ہی دے چکی تھی۔ ایک اس کے سینے پر پڑی تھی۔ کنویں کا پیٹ بھرنے والا نہیں تھا۔ کنویں کی منڈیر ٹوٹنے والی نہیں تھی۔ سانپوں نے کنویں کے خزانے کی رکھوالی سے اپنی چوکیداری اٹھالی تھی۔

لالٹین چوکھٹ پر چھوڑ کر اس نے اپنے پیر اندر گھسیٹے اور ماں کی بند آنکھ کے سائے تلے سے بچی کو سینے سے اٹھالیا۔

تکیے کے نیچے سے صغراں نے تلوار کی دھار جیسا ناتر اٹھالیا۔

☆ ☆ ☆

بٹوارے سے ذرا پہلے' گاؤں اجڑنے کے ذرا دیر بعد' سرکاری پٹواری کے کاغذوں کی پوٹلی کنویں میں جاگری تھی۔ پٹواری کی جان پر بن آئی تھی۔ چھ بندے کنویں کے پینڈے میں اتارے۔ گند نکال نکال کر زمین پر ڈھیر کیا۔ پٹواری کو اپنی پوٹلی تو بڑی جلدی مل گئی' لیکن اسے اس افتاد کی خبر بڑی دیر بعد ملی کہ مردوں کے ہاتھوں کے پنجر کے ڈھیر کے ڈھیر کنویں کے پینڈے تک کیسے پہنچے۔

ثریا کے باپ کے۔۔۔ شیداں کے چاچے کے۔۔۔
جمیلہ کے واوے کے۔۔۔ بختاں کے بھائی کے۔۔۔

داج کا سوت کاتتے کاتتے' ماؤں نے ناتروں کی دھار بھی تیز کرلی تھی۔ کنویں کی کنواریوں کے داج کی تیاری انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر کی تھی۔

☆

فرح بخاری

یہ جونفسیاتی داؤ پیچ، الجھاؤ دیتی گھماتی پھراتی دلیلیں، حالات کی ستم ظریفی کے قصے، مجبوریوں کے سر الزام دھرتے آپ بری الذمہ ہوجانے کے اپنی دانست میں آزمودہ ٹوٹکے ہوتے ہیں ناں۔۔ سب خود فریبی ہے، بہلاوا ہے۔۔اپنی کمزوریوں کو طاقت کا انجکشن لگا کر پھر سے اُٹھ کھڑا ہونے کی

اپنے خلاف رچائی اندھی سازش ہے۔۔۔اور کچھ نہیں۔۔۔کچھ بھی نہیں۔۔

ثانی کی ناٹ ڈھیلی کرتے، یہ اپنے حالات سے بیزار و بے حال سکون کی چھاؤں میں ذرا دیر ستانے والے شاہ زیب ملک کے خیالات تھے۔ اور ثانیہ اسلم وہ عارضی چھاؤں تھی، جسے تپتی دوپہروں میں پل بھر کے سایے جیسا محسوس کرتے۔

وہ برسوں سے یہیں ٹِکا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ثانیہ اسلم صرف سنتی ہے۔ محبت کے ماروں کا حال بس ایک وہی جانتے ہیں۔۔ہاتھ آئے چند انمول احسان جیسے پل بحث میں گنوا کر کون محبوب کی پیشانی کے بل گِنے۔۔

پیشانی کی ہر بڑھتی سلوٹ دل پہ گرہ جیسی پڑتی وہم و اندیشوں کو اور کس دیتی۔ اور ثانیہ کبھی کسی قیمت پر شاہ زیب کی ناراضی مول لینے کا رسک نہیں اٹھایا کرتی تھی۔ وہ بگڑا شہزادہ تو ہمیشہ ہی ہاتھ سے نکلنے کو تیار بیٹھا ہوتا تھا۔

گزرے اٹھارہ برسوں نے شہزادے کو حقیقتاً نہیں مزاجاً بھی بادشاہ بنا دیا تھا۔ اور اب گزرے ایک برس کے دوران۔۔ثانیہ کے سینے سے آہ اب بھاری پتھر سا سِرکا کرتی۔

☆☆☆

لرزتی انگلیاں۔۔ پانچویں بار موبائل فون کی طرف بڑھی تھیں۔۔آج مہینوں بعد اُس نے وہ نمبر نکالا تھا جسے استعمال کرنے سے وہ بے رحم سختی سے منع کر گیا تھا۔ ثانیہ نے خود کو اِس عادت سے روکنے کے لیے کیسے اپنے دل کا خون کیا تھا۔ یہ تک سننا جسے گوارا نہ تھا۔

''چائے آپی۔۔۔!'' بالوں میں چھ سات قسم کے کلپ پھنسائے، ایک ہاتھ میں ویکس کریم پہ شاید ایکسپائری ڈیٹ کھوجتی دوسرے سے چائے کا کپ سامنے رکھتی وہ روشنی سہیل تھی، جو قریب آتے اب ویکس کریم کو سائیڈ پہ رکھ کر ثانیہ کے کان میں گھسی تھی۔

''پتا ہے آپی۔۔!وہ جو چلبلی ابھی یہاں سے گئی ہے ناں۔۔وہی برقعے والی۔۔ارے کالے کا برقع۔۔'' روشنی نے خود ہی منہ بسور کر اپنے کہے کو جھٹلایا۔ ''رانی کہتی ہے، ایک بچی کی ماں ہے اور۔۔''

''بس کرو روشی۔۔!'' ثانیہ نے اپنے سوکھے حلق کو تھوک نگل کر تر کیا ''بُری بات ہے بنا جانے کسی پر بولنا۔ ہمارا کام کسٹمرز کو اپنے کام سے مطمئن کرنا ہے، وہ کیا کرتے ہیں، کہاں سے آئے، کہاں جاتے ہیں۔۔ہمیں ڈسکس کر کے اپنا ٹائم ویسٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''پر آپی۔۔!'' روشنی کا چہرا پھیکا پڑ گیا۔ یک لخت اُسے سُبکی سی محسوس ہوئی تو بولا بھی نہیں گیا۔ اور ثانیہ کا دل اتنا نرم اتنا حساس تھا کہ روشنی کے چہرے کے بدلتے رنگ اس کا دل ڈبونے لگے۔

''پاگل تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔'' اُس نے روشنی کا پھولا گال نرمی سے تھپتھپایا ''لوگ تو ہم پر بھی باتیں بناتے ہیں ناں۔ خود ہم بھی یہی سب کچھ کرنے لگیں تو دنیا سے کیسا گلہ۔''

''میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی''۔ وہ خفا خفا سی فوراً اُٹھ گئی۔ جاتے جاتے ویکس کریم کی ڈبیا اٹھانا نہیں بھولی۔ ثانیہ نے ہنس کر اس کے بچکانہ پن پر سر ہلایا۔ چائے کا کپ لبوں سے لگاتے پہلا گھونٹ لیا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی نے پورے لب جلا دیئے، اُف۔۔کیسا کرنٹ سا دوڑا تھا وجود میں۔۔وہ کم بخت بیل۔۔گہری سانس کو اوپر کھینچ کر باہر خارج کرتے اُس نے موبائل اٹھایا۔ کسی نامحسوس جذبے کی حدت نے اُس کے پورے چہرے کو گرما دیا تھا۔

پانچ سات منٹ پہلے جسے مِس کال بھیجی تھی۔ اُسی کی متوقع کال کے تصور نے ہونٹ جلا دیے تھے۔۔پر نہیں۔۔۔ایک مایوس کُن سی آہ کھینچتے اس نے موبائل واپس رکھا۔

کال مسز شفقت کی تھی۔ ضرور اسکن پالش کے

لیے کوئی بالکل فارغ پرسکون وقت مانگنا چاہ رہی ہوں گی۔ اور تانیہ ابھی ہرگز کسی سے بات کے موڈ میں نہ تھی۔ ذہنی خلفشار نے اندر طوفان سا مچا رکھا تھا۔ پسینے کے ننھے قطروں کو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ایک مرتبہ پھر شاہ زیب کا نمبر نکال کر سامنے رکھا۔

انگوٹھے کو بے دھیانی میں اس کے نام پر پھیرتے وہ نچلا لب چباتے ایک بار پھر حد سے زیادہ کنفیوز نظر آتی تھی۔ شاہ زیب سے رابطہ کرنا بہت ضروری تھا۔ پر جانتی تھی کہ اس کا نمبر دیکھ کر وہ ناگوار سے محسوسات کے ساتھ موبائل کو سائیڈ پہ رکھ دے گا۔

تانیہ کی مِس کال کو اس کی بے بسی۔ محبت کی مجبوری سمجھتے اُکتاہٹ کا اظہار کرے گا۔ بادلِ نخواستہ کال اٹینڈ کر بھی لی تو پتھر مار انداز میں یوں جی بولے گا کہ لگے" بکو کیوں سر کھا رہی ہو۔ اور تانیہ یہ سب بھی سہنے کو تیار تھی۔ اٹھارہ برسوں میں شاہ زیب کی طرف سے اِس سے بھی برے رویے سہے تھے اور پوری ثابت قدمی و دل جمعی سے اپنے عشق کی انتہا کو دیکھا تھا۔

تانیہ کا انگوٹھا ابھی بھی اس دلربا نام کو سہلا رہا تھا اور ذہن۔۔ بہت پیچھے کہیں آغاز کے دِنوں میں۔

"تمہارا ملنا، میری زندگی کو اس قدر حسین و رنگین بنانا سوائے میری خوش نصیبی کے اور کچھ نہیں ہے تانیہ۔ کبھی بدل مت جانا، صرف میری ہو کر رہنا، میں تمہیں ہر مالی فکر سے آزاد۔" تانیہ نے ہاتھ بڑھا کر شاہ زیب کے لبوں پہ رکھتے اسے روک دیا تھا۔

"میرے تمہارے بیچ مالی فکروں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تم نے میری روح کو آسودہ کیا ہے۔ تانیہ کے دل کو اس کے وجود سے چھلنی سا نتھار کے دیکھا کر و شاہ زیب۔۔ اس کے ہر تار سے ایک شاہ زیب کی پکار آتی ہے۔ اور کوئی نہیں، کبھی نہیں۔"

"حیرت ہے۔۔ تم لوگ تو دِلوں سے کھیلنا جانتی ہو۔۔ آج تک تو بس یہی سُنا تھا۔" وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے پھر انجانے میں اسکا تمسخر اُڑا بیٹھا تھا۔ اور تانیہ نے ہمیشہ کی طرح تب بھی اپنے آنسو اندر گرا دیئے تھے کہ آنسوؤں کو بھی وہ اُن جیسیوں کے ہتھیار سے تعبیر کرتا۔۔ ہاں لیکن اس سب کے باوجود شاہ زیب نے بھی اسے اپنے دل میں بڑی کھلی بڑی وافر جگہ دی تھی۔ ایک لطیف سی ملائمت اول روز سے تانیہ نے شاہ زیب کے دل سے اپنے دل میں اترتی محسوس کی تھی۔ یہ ملائمت ہمیشگی کا تاثر دیتی اُسے صرف ایک ہی بات سمجھاتی کہ اس کا اور شاہ زیب کا رشتہ قدرت نے بہت خاص، بڑی لبھاتی سی مٹی سے گوندھا ہے۔ وہ بھی اُس سے الگ نہیں ہو سکتی۔۔

باوجود اس کے کہ آغاز کے دو برسوں میں ہی کچھ کچھ اس محبت کی پرتیں شاہ زیب کے ہاتھوں کھلنے سی لگی تھیں لیکن تانیہ نے اپنی استقامت اور حوصلے کے بل پر ہمیشہ بڑی نفاست سے اُس تحفے کو بھی کھول کے استعمال نہ کرنے کا تہیہ کرتے دوبارہ ریپ اپ کر دیا۔ وہ خود فریبی کی زندگی جی رہی تھی لیکن جانتی تھی کہ خود کو فریب نہ دیا تو جینا محال ہو جائے گا۔۔ اور اُسے جینا تھا شاہ زیب کی محبت کو لیے تا دمِ آخر۔

فقط ایک ہی سوچ لیے دنیا سے رخصت ہوتے کہ وہ عشق کرنے کے لیے بنی تھی اور آخری سانس تک بامراد ٹھہری تھی۔ شاہ زیب کے آنکھیں پھیرتے ہی درد کو کسی اور دوا سے کم کرنے کا نہ اُس میں یارا تھا نہ ہی عشق کے آداب تھے۔ شاہ زیب کے جنون اس کی دیوانگی کی کم پڑتی شدت کو اس نے ہر لہجے سہنے، ہر رویہ برداشت کرنے کی لگام ڈال کر اُس سرکش گھوڑے کو اپنے آنگن میں باندھے ہی رکھا تھا۔

☆☆☆

تانیہ کو اٹھارہ برس پہلے کی وہ اُودی سرمئی سی شام آج بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد تھی۔ چوبیس پچیس سال کا وہ گہری کالی آنکھوں والا سرخ وسفید اونچا لمبا جوان کیسے شرمایا ہوا سا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

تانیہ کاسنی رنگ کی شفون کی سادہ ساڑھی باندھے کھلے شولڈر کٹ بالوں کو شانوں پر پھیلائے پلو درست کرنے میں کوشاں تھی، جب نظر اُس جوان پر پڑی۔۔۔ انتہائی نروس سا وہ اندر تو داخل ہو گیا لیکن تانیہ پر نظر پڑتے ہی چہرے کی سرخی میں ہلدی سی پیلاہٹیں لہریں لینے لگی تھیں۔

تانیہ نے اسکا اعتماد اپنی نرم مسکراہٹ سے بحال کرنا چاہا لیکن وہ مزید گھبرا سا گیا۔

''آجائیے۔۔'' تانیہ نے پاس رکھی کرسی جلدی سے گھسیٹ کر سامنے رکھی۔۔۔اور وہ تھوڑا آگے تک آ بھی گیا۔

''تشریف رکھیں۔'' تانیہ نے پلو کو دوسری جانب سے نکالتے دوپٹے کے انداز میں لپیٹ کر خود کو سمیٹ لیا، اور یہ لاشعوری سی کوشش شاہ زیب کا جھجک بھرا انداز دیکھ کر اپنے آپ سرزد ہوئی تھی۔ لہجہ بھی تانیہ نے حتی الامکان متوازن ہی رکھا۔ اور وہ رعب حسن کے زیر اثر بیٹھ بھی گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ خود بھی پلنگ کے کنارے پر ٹک گئی۔

چائے یا کافی۔۔؟ آج ٹھنڈ ذرا زیادہ ہے۔''

''ہم۔۔۔ معذرت چاہوں گا، مجھے واپس جانا ہے۔'' وہ سخت نادم سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

تانیہ نے بس پل بھر میں آنکھوں کی حیرت سمیٹ کر سادگی سے اثبات میں سر ہلایا اور ہلکا سا مسکرا دی۔ گویا جیسی آپکی خوشی۔

شاہ زیب جاتے جاتے ٹھٹکا تھا۔ یعنی وہ محض اپنی مرضی سے نہیں جا رہا تھا۔ لڑکی کی مسکراتی تائید بھی ساتھ شامل تھی۔

وہ حیران حیران سا اُس شام وہاں سے گیا تو ہفتے بھر بعد ریوالونگ چیئر پر دائیں بائیں جھولتے سگریٹ کا دھواں فضا کے سپرد کرتے پھر اس کے سامنے موجود تھا۔

''تو اس لیے تم لوگ مسکرا کر رخصت کرتی ہو ۔۔۔ کیونکہ تم پر یقین ہوتی ہو کہ یہاں سے جانے والا دراصل جاتا نہیں بلکہ چند دن بعد کچھ اور اعتماد لیے پھر یہیں آتا ہے۔۔۔ مطلب یہ مسکرانے کی ادا کوئی پرانی ریت لگتی ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر خود اپنی بات پر ہنسا تھا۔ تانیہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر لہرا گیا

''میں اس لیے نہیں ہنسی تھی۔۔۔ میں تو بس مروتاً۔۔ تاکہ آپ کو جانے میں دقت نہ ہو۔''

وہ ایسی کھلی بے عزتی کم از کم اُس وقت برداشت نہیں کر پائی تھی۔ کیونکہ مواعشق تو کیا۔۔ اُس وقت تک محبت۔۔۔ حتیٰ کہ معمولی سی پسندیدگی کی لہر بھی دل کو چھو کر نہیں گزری تھی۔۔۔ اور یہ بدبخت حادثہ جب رفتہ رفتہ دیمک سا کھوکھلا کرنے لگا تب شاہ زیب کے حواس نشے کی کیفیت سے باہر آنے لگے تھے۔

دو سال۔۔۔ پورے دو سال کے اُس بے نام رشتے کی گرہوں نے شاہ زیب کے وجود سے آزاد ہوتے تانیہ کے دل کو کسنا شروع کر دیا تھا۔ اور اُس وقت جب پوری طرح اسے لگا کہ شاہ زیب اب رُکنے والا نہیں۔۔۔ وہ اس کے عشق میں سر کے آخری بال تک ڈوب چکی تھی۔

اور شاہ زیب نے بھی جانے اُس آخری دن تانیہ کی آنکھوں میں ایسا کیا دیکھا کہ اٹھارہ برس گزر جانے پر بھی پوری طرح جا نہیں پایا۔ فرق صرف اتنا آیا کہ دو سالوں میں جتنے چاؤ اُن نے تانیہ کے اٹھائے تھے حساب برابر کرنے کا ایک طویل دورانیہ اُس کے سر پہ تپتی دھوپ سا آن رُکا تھا۔

اب وہ اپنی منواتا اور تانیہ کسی داسی کی طرح صرف مانے جاتی۔ شاہ زیب کا رعب بھی غیر محسوس تھا۔

☆☆☆

تانیہ کی محبت کا نشہ ہوا ہوتے ہی اُس پر مجبوریوں نے حملے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ بیوی سے جھگڑے، بچوں کے مسائل، کاروبار کے جھنجھٹ۔ اب اسے سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے تھے۔

کم از کم وہ تو یہی کہتا تھا۔۔ اور تانیہ کی محبت جواب میں یہ کہتی کہ اگر وہ ڈوب بھی رہی ہو۔۔۔

ایسے کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ نظر آئے، ایسے لمحے میں بھی شاہ زیب اسے پکارے تو حاضر جناب کہنے کی فرصت بہر حال نکال لے گی۔ لیکن تانیہ کی بدقسمتی کہ شاہ زیب نے اُسے "تم لوگ" سے آگے بھی کوئی مقام دیا ہی نہ تھا۔

وہ اُس روز یونہی کسی لہر میں شاہ زیب کو اپنی مجبوریوں کے قصے بتانا شروع ہوئی۔۔۔ شاید پھر اس نے "تم لوگ۔۔ کہتے کوئی جملہ پھینکا تھا جواباً تانیہ نے نہایت نرمی سے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔

"لوگوں کو اچھا یا بُرا اُن کے حالات بناتے ہیں شاہ زیب۔۔ عزت سے سر اُٹھا کر کون جینا نہیں چاہتا۔ پر حالات ہر ایک کے موافق کہاں آتے ہیں۔۔ میں نے تیرہ سال کی۔"

"چھوڑو حالات کے رونے۔" اس نے سخت بیزاری سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔ "مائی ڈیئر تنو۔ یہ جو نفسیاتی داؤ پیچ، الجھاؤ دیتی گھماتی پھراتی دلیلیں، حالات کی ستم ظریفی کے قصے، مجبوریوں کے سر الزام دھرتے آپ بری الذمہ ہو جانے کے اپنی دانست میں آزمودہ ٹوٹکے ہوتے ہیں ناں۔۔ سب خود فریبی ہے، بہلاوا ہے۔۔ اپنی کمزوریوں کو طاقت کا انجکشن لگا کر پھر سے اُٹھ کھڑا ہونے کی اپنے خلاف رچائی اندھی سازش۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔"

کچھ بھی نہیں۔ اور تانیہ ایک بار پھر چپکی بیٹھی اسی کو سنتی رہی۔۔

اعلا خاندان، سچا نسب۔۔ یہاں۔۔ اس نے پیشانی کی طرف انگلی پھیری۔ "یہاں پیشانی پہ کھدا ہوتا ہے۔۔ یہ اعلیٰ نسبی، یہ مرتبے نسل در نسل خون میں منتقل ہوتے ہیں۔۔ تم کبھی ہمارے گھر کی عورتیں دیکھو تنو۔"

وہ اب سمجھانے والے انداز میں نہایت رسان سے اسے مطلع کر رہا تھا۔ تانیہ کی بے عزتی کرنے جیسا انداز بھی ہرگز نہیں تھا۔ ایسی باتیں وہ بڑا ہی معمول کا رویہ لیے بہت نارمل انداز میں کرتا تھا جیسے دنیا کی اونچ نیچ اپنی تنو کو سمجھا کر ہی چھوڑے گا۔۔ اور تانیہ زیرِ لب مسکراتے محبت سے اپنے معشوق کو دیکھے جاتی۔

بھلے اپنی دانست میں اسے آئینہ دکھانے کو سہی۔۔ وہ اتنی اپنائیت سے خوب فرصت نکال کر اس کے پاس آیا تو سہی۔۔ حالانکہ شاہ زیب کے ہر جملے کے جواب میں اس کے پاس دوگنا کہنے کو ہوتا، لیکن وہ اسے خفا کر کے بھیجنے کا تصور ہی نہ کر سکتی۔

اپنی من مرضی سے آنے جانے والا خفا ہو کے اگر جو کبھی واپس نہ پلٹتا۔۔ اللہ نہ کرے۔۔ وہ جھرجھری لے کر حال میں واپس آتی۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے۔۔ صاحب عالم۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو کر "اپنے جیسوں" کی برائیاں سنے جاتی۔۔

"ایک خاندانی کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی غلط راہ نہیں اپنا سکتا۔۔ اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے، ذہن و دل پوری طرح اس کی مٹھی میں ہوتے ہیں۔"

وہ بولے جا رہا تھا اور دھیان سے سنتی تانیہ کے چہرے پر الجھن بھرا عکس سا ابھر کر معدوم ہوتے اس لمحے شاہ زیب نے شاید بہت شدت سے محسوس کیا۔۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ تو اس کی محبت اور کچھ اس کی شخصیت کے رعب میں وہ کہہ نہیں پائی تھی۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ نام نسب رکھنے والے غلط کام نہیں کر سکتے۔۔" وہ بات روک کر اچانک سوال کرنے لگا۔

"نن۔۔ نہیں۔۔ میں نے کب کہا۔" وہ از حد حیران تھی۔

"تمہارے ذہن میں کچھ ہے۔۔ پوچھو ناں تنو۔۔ میرے تمہارے بیچ یہ جھجک کیسی؟" اب وہ تکیے کو بازو میں دبوچ کر بڑے پیار سے تانیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔ بس یونہی خیال سا آیا تھا۔" وہ گلے کو شہد سی نرمی میں ڈبوئے بمشکل بولنے کی ہمت جوڑ پائی۔ "تت۔۔ تم۔۔"

دل زور زور سے ایسے دھڑکنے لگا کہ آگے وہ

بول ہی نہیں پائی۔۔اور شاہ زیب کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔ وہ ایک زبردست قہقہہ لگا کر لیٹے سے اُٹھ بیٹھا۔

''میں بھی اعلا خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔

پھر مجھ جیسے کا یہاں کیا کام۔۔۔ہوں۔۔؟''

ابرو اٹھا کر تائید مانگتے اس نے تانیہ کی بات آپ ہی مکمل کردی۔ جواباً وہ سر ہلا کر ہاں بھی نہ کہہ سکی۔

''مرد کی شان ایسی باتوں سے نہیں گھٹتی تنو۔

اُسے قدرت نے رعایتیں بخشی ہیں۔۔میرے نام اور وقار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔۔جانتی ہو کیوں؟

___ کیونکہ سویٹ ہارٹ۔۔میں نے اپنے جیسی خاندانی سے شادی کی ہے۔ بچپن کی منگ، سگی چچازاد سے خالص روایتی انداز میں شادی کر کے اُسے اچھے شوہروں کی طرح ہر آسائش سے نواز رکھا ہے۔ وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ وہ بچے جنہیں ایک دنیا عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں شاہ زیب!''

وہ دھیمے سے بس اتنا ہی کہہ پائی۔۔پر اُس پوری رات وہ خواب میں بھی اپنا گھر اپنی گلیاں اور اماں بابا کو دیکھتی رہی تھی۔۔اُس کے ماں باپ۔۔جو بہت اعلا نسب اور خاندانی نہ تھے۔۔پر عزت دار شریف لوگ تھے۔ ماں درزن تھی اور ابا میونسپل کمیٹی میں معمولی ملازم۔۔اور وہ۔۔ماں باپ کی اکلوتی اولاد۔۔اس کی ماں نے سنی سنائی تھی کہ کچھ پانچ چھ بچے پیدا کیے تھے پر کچھ تو پیدا ہی مردہ ہوئے اور کچھ زندہ پیدا ہوئے تو چھلے میں ہی گزر گئے۔۔ایک وہی کرموں جلی جانے کیسے دنیا کے روشن ماتھے پہ سیاہی ملنے کو بچ گئی۔۔ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔۔پر جس کے مقدر میں زیادہ دیر چمکنا نہ لکھا تھا۔

دس برس کی عمر کو پہنچی تو ابا چل بسے۔۔اور بارہویں سال میں داخل ہوئی تو ماں کو سانپ نے کاٹ لیا۔۔وہ بدنصیب اب بھری دنیا میں ایک ماما، مامی کے رحم و کرم پر تھی۔۔تیرہ سال کی عمر میں ہی ماما نے ایک نشئی کے ساتھ چلتا کیا۔۔وہ بیاہ کر ایک ٹوٹے پھوٹے اجاڑ گھر میں آ گئی۔۔اور اپنے ہاتھ کا ہنر دکھاتے اس جھونپڑے کو محل بنانے کی کوشش میں جٹ گئی۔۔پر جھونپڑے بھی کبھی محل بنا کرتے ہیں۔

چودھویں کے سن تک پہنچنے سے پہلے ہی نشئی شوہر نے اُسے کسی کو بیچ دیا۔ جانے جوئے میں ہارا یا سودا کیا۔۔تانیہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس وہ ایک نئے عجیب ہیئت کے آدمی کے گھر آ گئی۔۔چیخنا چلانا۔ رحم کی بھیک مانگنا، خود پر ہوتے ظلم و جبر پر احتجاج کرنا کچھ بھی کام نہ آیا۔۔وہ سانڈ جیسا بیوپاری اسے کمائی کے ذریعے کے طور پر استعمال کرنے لگا۔

ایک روز موقع پا کر وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ جہنم سے نجات پانے پر صد شکر ادا کرتے سنبھل بھی نہیں پائی کہ ایک اور کھائی میں جا گری۔ اس مرتبہ اس نے ایک عورت سے مدد چاہی تھی کہ وہ اسے کسی ادارے میں بھیج دے۔

شہناز بی بی نے کہا ''ہمارے چھوٹے شہروں میں تو کوئی ادارے وادارے نہیں ہیں۔ تمہیں میں کراچی بھجواتی ہوں۔''

تانیہ خود اس شہر سے نکلنا چاہتی تھی۔ شہناز بی بی کا دیا پتہ مٹھی میں دبائے ٹرین میں سوار ہوگئی۔۔اور پھر کراچی۔۔وہ روشنیوں کے شہر اور لوگوں کے اژدھام کو حیرت اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی جس پتے پر پہنچی وہ کوئی ادارہ نہیں بلکہ۔۔خیر۔۔تو بڑا شہر بھی تانیہ اسلم کی حیثیت و مقام کو بدل نہ پایا۔ حتیٰ کہ ایک بار تو وہ صحیح سلامت ایک فلاحی ادارے تک بھی پہنچ ہی گئی تھی۔ پر اس کے پیچھے آنے والوں نے جعلی نکاح نامہ دکھا کر بڑی سہولت سے اُسے وہاں سے نکلوا دیا۔

یوں سترہ برس کی عمر میں کراچی کو سینے سے لگانے والی تانیہ اسلم نے مزید دھکے کھانے سے یہی بہتر جانا تھا کہ زندگی دو وقت کی روٹی کھانے کا سب سے اہم فریضہ انجام دیتے گزار دی جائے۔

اس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس بحر خرافات میں

ڈوبنے کو ابھی ایک آخری نامراد عشق کا دھکا لگنا باقی ہے۔ تانیہ اسلم نے زندگی میں فقط ہارنا ہی سیکھا تھا۔ پہلے حالات کے آگے۔۔۔ پھر دل برباد و نامراد کے آگے۔۔۔ کہ رہی سہی کسر بھی کسی مرد نے ہی پوری کرنا تھی اور اس کے لیے شاہ زیب ملک سے بہتر کون ہوسکتا تھا۔۔

جو سب سے پہلے ہی رزمِ وفا میں کام آئے
فراز ہم تھے اُنہیں عاشقوں کے دستے میں

☆☆☆

وقت کو جیسے تیسے آگے کو گھسیٹتے۔۔ ٹوٹا تباہ حال دل اور تنہا ویران وجود لیے وہ سترہ برس تو گزار ہی آئی تھی۔۔ رشتوں سے خالی زندگی میں صرف شاہ زیب کے ہونے سے کچھ زندگی جیسے آثار دکھائی دیتے، اگرچہ تعلق وہ بھی بے نام ہی تھا، اور جو تھا اُسے کھینچ تان کر سترہ برسوں تک خود تانیہ نے ہی پہنچایا تھا۔

ہاں۔۔۔ پر یہ اٹھارواں برس۔۔ تانیہ کو اب سے پہلے ہمیشہ بس یہی لگا کہ جیسے وہ اس نام نہاد تعلق کو کھینچے چلی آرہی ہے۔۔ مرتے دم تک یونہی چلے گا سب کچھ۔۔ اسی دھکا اسٹارٹ انداز میں۔۔ لیکن بے نام رشتے کی وہ ڈوری تو ایسی نازک نکلی کہ شاہ زیب کی زندگی میں آنے والے ایک ہی جھٹکے نے سب سے پہلے اسی کمزور کڑی کو جدا کیا۔ اور اِس بار روکنا تانیہ کے بھی بس میں نہ تھا۔۔ کہ بات ہی ایسی تھی۔

شاہ زیب نے اپنی بڑی بیٹی شائنہ کی قریب چار برس پہلے اپنے خاندان میں شادی کردی تھی۔ چوبیس پچیس سال کا شرمایا گھبرایا شاہ زیب جب پہلی مرتبہ اس کے پاس آیا تھا تب وہ دو ننھی کلیوں کا باپ تھا۔۔ آنے والے برسوں میں اللہ نے اُسے دو بیٹے بھی عطا کئے تھے۔۔ وہ سب ہی بچے جنہیں تانیہ نے باپ کے ساتھ کبھی بائیک تو کبھی گاڑی میں آتے جاتے کسی نہ کسی بہانے دیکھ ہی رکھا تھا۔۔ کہ محبوب سے متعلقہ ہر چیز ہر بات کو اُس نے ہمیشہ بڑی محبت اور اپنائیت سے دیکھا تھا۔

برسوں پہلے دل کی اسی خواہش نے اُسے کلثوم کو دیکھنے پر بھی مجبور کیا تھا۔۔ نازک، سفید سی کلثوم شاہ زیب جسے دیکھ کر جانے کیسے عجیب وغریب احساسات نے تانیہ کو گھیرا کہ اُس کے بعد وہ کبھی کلثوم کے سامنے نہیں آئی۔ ہاں پر اس کے بچے بتدریج عمر کی منزلیں طے کرتے بیاہ، شادی اور یونیورسٹی کالج کی عمروں تک پہنچتے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ دیکھ ہی لیا کرتی تھی۔

شائنہ کی شادی کے بعد شاہ زیب بہت خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اور مرد کی خوشی اسکا اطمینان اس کی شوخ مزاجی سے ظاہر ہوتا ہے۔ شاہ زیب بھی اُن دنوں بنا اس کے بلائے اور مجبور کئے اس کے ساتھ رابطے میں تھا۔ وہ بولتا جاتا۔۔ جیسا کہ خوشی اور آسودگی میں شاہ زیب کی عادت تھی اور وہ اُسے سنتی جاتی۔

اُن دنوں وہ اُس سے اپنی نواسی کی باتیں کرتا۔۔ تینتالیس سالہ ڈیشنگ سا نانا جو دیکھنے اور سننے والوں کو ہمیشہ ہی حیرت میں مبتلا کر جاتا کہ وہ ایک عدد نواسی کا نانا بھی ہوسکتا ہے۔

ہاں پر یہی سچ تھا کہ چھوٹی سی ایک سال کی لائبہ شاہ زیب کی جان تھی۔ وہ اُس ننھی پری کی مختلف اینگل سے تصویریں بنا کر تانیہ کو دکھانے آتا۔۔ اور وہ بھی بے اختیار اُس لعل پرنسز کو تصویر میں ہی چوم لیتی۔

اور پھر شادی کے چار برس بعد ایک حادثے میں شاہ زیب کے جواں سال داماد کا انتقال ہوگیا۔ کم عمر، جوان بیٹی بیوہ ہوکر باپ کے گھر آگئی۔ اور وہ ننھی پری یتیم ہوگئی۔

یہ حادثہ شاہ زیب کی فیملی کے لیے اتنا تکلیف دہ اور دردناک تھا کہ سنبھلنا شاید برسوں ممکن نہ تھا۔ تانیہ کو بھی حادثے کی اطلاع ملی۔۔ پر وہ سوائے شدید دُکھ کا اظہار کرنے کے اور کچھ نہ کرسکتی تھی اُس کے لیے۔۔ شروع کے چند ماہ وہ تانیہ سے

بات بھی کر لیتا تھا۔ موضوع وہی ایک شائنہ اور اس کی بچی ہوتے۔۔ تانیہ اسے تسلی دیتی۔ حوصلے اور صبر سے اس کڑے وقت کو گزار لینے کی نصیحت کرتی۔۔ اور ہمیشہ اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی خوشی اور سلامتی کے لیے دعا گو رہتی۔

☆☆☆

ان ہی دنوں میں ایک روز بڑے دنوں بعد شاہ زیب کا اس کے ہاں آنا ہوا۔ تانیہ اب سات آٹھ برس ہوئے اپنے عذاب ناک ماضی کی تاریک گھٹن زدہ گلیوں سے نکل کر آزاد و خود مختار ہو چکی تھی۔ اپنے اب تک کے جمع جتھا سے ایک چھوٹا اور سادہ سا بیوٹی پارلر شروع کیا۔

آغاز میں لڑکیاں اس کے پاس کام سیکھنے آنے سے کتراتی تھیں۔۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ کام سے اپنی لگن اور خلوص کے باعث بہر حال اپنی نئی شناخت اور پہچان بنانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ لڑکیاں اس کے ساتھ کام کر کے بہت کمفرٹ ایبل محسوس کرنے لگی تھیں۔

پہلے شاید انہیں یا گھر سے انہیں رخصت کرنے والے والدین کو یہ گمان گزرا کہ تانیہ اسلم کا پارلر شاید ایک سائیڈ بزنس ہے۔ جس کی آڑ میں وہ اُن کی بیٹیوں کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ بہر حال جنہوں نے ایسا سوچا انہوں نے اپنی بچیوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دی۔۔ اور جن کے گھریلو حالات نے مجبوراً بچیوں کو اس کے ہاں بھیجنے پر آمادہ کیا ان کے اعتماد کو تانیہ نے کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔

جس دلدل میں ایک روز وہ خود حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں جا گری تھی اُس میں وہ اپنے ہاتھوں سے کسی معصوم و مظلوم کو ہرگز دھکا نہیں دے سکتی تھی۔ سیلون کھول کر کمائی کے نیا ذریعہ اپنا نا دراصل تائب ہونے کی جانب اس کا پہلا عملی قدم تھا۔۔ اور یہ اس کی صاف نیتی تھی کہ اب سات آٹھ برس بعد اس کا بیوٹی پارلر علاقے کا سب سے معتبر بیوٹی پارلر مانا جاتا تھا۔ جلنے والے اس کے ماضی سے آگاہی کی بنا پر اب بھی بولنے سے باز نہیں آتے تھے پر تانیہ کو ہمیشہ اپنے ہاں بڑی محنتی اور مخلص کام کرنے والی لڑکیاں ملیں۔ تانیہ آپی پر انہوں نے ہمیشہ اعتماد کا اظہار کیا۔ اور تانیہ آپی نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ باتیں کرنے والوں سے انہیں بھی اتنے ہی گلے تھے کہ بنا حقیقت جانے لوگ کیسے دوسروں پر بڑے یقین سے انگلی اُٹھا دیتے ہیں۔ وہ بھی تانیہ کی طرح ایسے لوگوں کے لیے محض ہمدردی اور افسوس محسوس کیا کرتیں۔

☆☆☆

خیر۔۔ تو اُس روز بڑے دنوں کے بعد شاہ زیب کا تانیہ کے ہاں آنا ہوا۔۔ اسکا چھوٹا سا گھر بیوٹی پارلر کے عین پیچھے تھا جہاں وہ ہمیشہ سے اکیلی رہتی آئی تھی۔ شاہ زیب کی غیر متوقع آمد پر وہ اتنی بولائی، سٹپٹائی سی تھی کہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس کے لیے کیا بنائے۔۔ کیا بولے کیا کہے۔۔

"اچھی سی کافی بنا دو تنو!۔۔ آج تو بہت تھک گیا ہوں۔۔ آفس سے نکلا تو کم بخت گاڑی خراب ہو گئی۔۔ کسی طرح دھکے لگا تا یہیں پچھلی سڑک کی ورکشاپ پر لے آیا۔۔ اب تو بازو ٹوٹ رہے ہیں۔"

شاہ زیب نے بنا لگی لپٹی اپنے وہاں آنے کی وجہ بیان کی اور تانیہ یہ سن کر اور بھی خوش ہوئی کہ کچھ دیر ستانے کے لیے شاہ زیب کو اس کے ہاں آنے کا خیال آیا اس سے بڑے اعزاز کی بات اس کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔ چاہتا تو رکشہ ٹیکسی لے کر واپس گھر یا آفس بھی جا سکتا تھا۔

اُس روز یونہی باتوں باتوں میں تانیہ کے لبوں پر شائنہ کے مستقبل کا ذکر آگیا۔ اب تو اس کی عدت کو بھی چار، پانچ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ شاہ زیب نے شائنہ کے حوالے سے اپنی فکر مندی ظاہر کی تو تانیہ نے تسلی دی کہ ابھی تو وہ بہت کم عمر ہے۔۔ بچی بھی چھوٹی ہے۔ چند سالوں میں جب اللہ پاک اس کے نصیب سے کوئی اور اچھا رشتہ بھیج دے گا تو یہ تکلیف اور آزمائش کا وقت یاد بھی نہیں رہے گا۔

"یہ آزمائش تو اب زندگی بھر کی ہے۔۔" کافی کے مگ کا کنارا چھوتے وہ ہلکا سا بڑبڑایا تو تانیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔۔

"کیا مطلب۔۔؟ اتنے مایوس کیوں ہو۔۔ ابھی اس کی عمر ہی۔"

"یہ دوسری شادی وادی کی باتیں ہم سوچنا بھی نہیں چاہتے تو۔۔" وہ ایک دم بے زار و اُچاٹ سا لگا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو شاہ زیب۔۔؟ تم جیسے پڑھے لکھے، لبرل بندے کو ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔" وہ دکھ اور صدمے سے چیخ ہی اٹھی۔ کیونکہ وہ بھول رہی تھی کہ شاہ زیب جیسے بندے ایک بس اپنے۔۔ یا پھر اپنے جیسے مردوں کے معاملے میں لبرل ہوتے ہیں۔۔ گھر، خاندان اور فیملی میٹرز میں ان جیسا کنزرویٹو کوئی نہیں ہوتا۔۔

"ہمارے خاندان میں اب شائنہ کے جوڑ کا کوئی رشتہ دُور نزدیک تک کہیں نہیں ہے۔" وہ اس بار بھی تحمل سے اپنے کہے کا دفاع کر رہا تھا۔

"ایسی پریشان کن گھڑی میں اپنے پرائے کون دیکھتا ہے۔" وہ بے یقینی سے دبا دبا چیخ کر قائل کرنے میں کوشاں تھی۔۔ "تمہارے لیے ہر بات پہ اہم شائنہ کی خوشی ہونی چاہیے۔۔ زندگی بھر اس ایک دُکھ کو گلے لگا کر جینے سے کہیں اچھا ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا اچھا مخلص جیون ساتھی ڈھونڈا جائے جو اسے اور اس کی بچی کو محبت سے سمیٹ لے۔۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ شائنہ پہلے جیسی خوش اور مطمئن نظر آئے۔"

"یہ سب کتابی اور فلمی باتیں ہیں تانیہ کہ کوئی اچھا پر خلوص آدمی آئے اور سارے دکھوں کو چھڑی گھماتے ہمارے سروں سے دور کر دے۔۔ آج کون ایسا ہے جو پرائی بچی کو سہارا دے اُسے اپنی اولاد کی طرح اپنائے۔۔" شاہ زیب نے طنزیہ ہنکارا ابھرا۔

"اگر ایسا ہوتا شاہ زیب، تو مذہب میں اس کی اجازت بھی نہ ہوتی۔" تانیہ نے بھی ٹھان لیا کہ قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کو وہ ہرگز ترک نہیں کرے گی۔" جب مذہب آپ کو تلقین کر رہا ہے کہ بیوہ اور مطلقہ کا فیصلہ جلد کر دو۔ تمہارے لیے باقی ہر کام پر مقدم ہونا چاہیے شائنہ کی آنے والی زندگی کا فیصلہ۔"

"مذہب کی تلقین سے مجھے بھی انکار نہیں۔ میں تو تمہیں گراؤنڈ ریلیٹی بتا رہا ہوں۔۔ پھر ہمارے گھر کی عورتوں کا مزاج بھی تم نہیں جانتیں۔۔ میں جانتا ہوں شائنہ کے لیے کسی نئے رشتے کی گنجائش نکالنا بہت مشکل ہوگا۔۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ اب وہ اپنی بچی کی اچھی تربیت پر دھیان دے۔۔ یا چلو بہت ہوا تو آگے پڑھنا بھی جاری رکھ سکتی ہے۔"

وہ اب پھر سے حالت سکون میں آ گیا تھا۔ جیسے سب سوچ رکھا ہو، سب طے کر لیا ہو۔۔ تانیہ کو باوجود چاہنے کے جواباً کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ جبکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اسلام میں اگر بیوہ یا مطلقہ کے لیے لفظ جلد کی تلقین ہوئی ہے تو اس کی گہرائی میں جانے کی اشد ضرورت ہے۔۔ والدین کے گھر سے شوہر کے گھر جانے اور وہاں جا کر رچ بس جانے کے بعد حادثاتی طور پر کسی طریقے واپس والدین کے گھر آ جانے کی بتدریج منازل کو بڑی باریک بینی سے کسی ماہر معالج کے انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بیوہ یا مطلقہ جو، اب لاابالی چلبلی لڑکی سے ایک سنجیدہ عورت کا رُوپ دھار چکی ہے۔ ماں باپ کے گھر کو ایک عارضی پناہ گاہ تو تصور کر سکتی ہے۔۔ پہلے جیسی اپنائیت اور مان کا پیدا ہونا اب غیر فطری سا رویہ لگتا ہے۔ پھر قرب و جوار میں رہنے والوں کے رویے غیر محسوس انداز میں اُس پر نفسیاتی طور پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی اُس پرانے ماحول میں پہلے جیسی فٹ نہیں ہو سکتی۔

سب سے بڑھ کر ذاتی زندگی میں در آنے والی تبدیلی۔۔ اور کچھ وہ جذباتی اور نفسیاتی معاملات۔ جن کا وہ تذکرہ بھی کسی اور سے کر نہیں سکتی۔۔

شاہ زیب نے اپنے اور اس کے تعلق کی ہمیشہ اپنے آپ کو اور اس کو یہ توجیہہ پیش کی تھی کہ خاندانی عورت سے شادی کرنا اس کا فرض اور مجبوری تھی

جیسے اس نے خوبی سے نبھایا تھا پر تانیہ اس کی جذباتی تسکین تھی اور یہ بات وہ کسی کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔

تانیہ نے ہمیشہ اس کی توجیہہ پر متانت سے سر ہلاتے اسے بعینہ ویسے قبول کیا تھا۔۔اب وہی شاہ زیب اپنی بیٹی کو ایک بے جان مومی مجسمہ تصور کرتے اُسے ہمیشہ کے لیے کسی ایک کمرے کی نظر کر دینا چاہتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ بنا کسی تبدیلی کا تقاضا کیے ایک جیسی رہے۔۔یونہی مٹی کی مورت جیسی۔۔

تھک ہار کر تانیہ نے ایک بار پھر سرینڈر کر دیا۔

☆☆☆

اور شاید اسی بحث سے بچنے کی کوشش تھی کہ شاہ زیب نے دوبارہ اُدھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ کال کرتی تو کسی نہ کسی بہانے اجازت طلب کر کے بند کر دیتا۔ وہ ناراض نہیں تھا، بس تنگ نظر آتا تھا۔ اور پھر ایک دن اس نے تانیہ کو باقاعدہ منع کر دیا یہ کہہ کر کہ اس کے حالات اب اسے تانیہ سے روابط رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔۔وہ اندرونی طور پر بدل رہا تھا۔

بیوہ بیٹی کا باپ اور یتیم نواسی کا نانا ہونے کا رعب اسے ان باتوں کی طرف مائل نہیں ہونے دے رہا تھا۔

تانیہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی کہ بس کبھی کبھار صرف کال کرنے۔ اس کا حال احوال جاننے کی اجازت تو دے دے۔۔لیکن جانتی تھی وہ اُکھڑ جائے گا اس بات پر۔۔تب ہی سر تسلیم خم کرتے ہمیشہ کے لیے وہ ادھ کھلی کھڑکی بھی بند کر دی۔

اور آج۔۔مہینوں بعد وہ ایک مرتبہ پھر اس بے مہر کا نمبر نکال کر رابطہ کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کی مِس کال کو وہ اس کی مجبوری تصور کرے گا۔ سوچے گا بس اتنا ہی جبر کر پائیں خود پر۔۔یہیں تک تھا تمہارا حوصلہ اور صبر۔۔تو پھر کیسے بتائے وہ اسے رابطے کی اصل وجہ۔

اصل وجہ۔۔۔جو دھیرے دھیرے میسج میں ٹائپ کرتے۔۔ایک بار دھیان سے دوبارہ اُسے پڑھ کر تانیہ نے ایک لمبی گہری سانس اندر کو کھینچتے بالآخر شاہ زیب کے نمبر پر سینڈ کر دی۔ کال پک نہ کرے، مِس کال کا جواب نہ دے پر میسج پڑھنے سے تو خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

شاہ زیب نے شاید شائنہ کو آگے پڑھنے کی اجازت دی تھی۔۔ایک دو مرتبہ تانیہ نے اُسے کالی چادر میں لپٹے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔۔اور ایک بار مارکیٹ سے واپسی پر ایک اکیڈمی سے باہر آتے۔۔جب اس کی شادی ہوئی، وہ ایف اے کی طالبہ تھی۔ اور اب اتنے برسوں بعد غالباً وہ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال کی تیاری کر رہی تھی۔

تانیہ نے اس کا حوصلہ اور عزم دیکھتے دل سے اس کی کامیابی کی دعا کی تھی۔۔کہ آج صبح جب وہ پارلر میں روشنی اور رابی کے ساتھ مل کر معمول کے کام نمٹا رہی تھی۔ کالی چادر میں خود کو لپیٹے وہ بلاشک و شبہ شائنہ تھی جو بیوٹی پارلر کے اندر داخل ہوئی تھی۔

"مجھے لائٹ سا پارٹی میک اپ کروانا ہے، بال بھی اچھے سے سیٹ کر دیں۔۔" اس نے ایک ہلکی پُراعتماد مسکراہٹ لبوں پر لاتے تانیہ کو ہی مخاطب کیا تھا۔

"اوشیور۔۔آیئے۔۔" تانیہ کا دل اپنی بیٹی کو اپنے بہت قریب پاتے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

ارے نہیں بھئی۔ غلط مت سمجھیں۔۔وہ حقیقتاً کلثوم اور شاہ زیب ہی کی بیٹی تھی۔ تانیہ نے تو شاہ زیب کے بچوں کو ہمیشہ اولاد کی نظر سے دیکھا تھا بس صرف اپنی لیے۔۔

روشنی اور رابی کے آگے بڑھنے سے پہلے اس نے خود ہی شائنہ کو اٹینڈ کیا۔ اس کے ریشمی لمبے بال اچھے سے شیمپو کئے ہوئے تھے۔ ساتھ لایا ایک ماڈرن سا لباس اُس نے اندر جا کر چینج کیا تانیہ نے بال بنا کر اس کی مرضی کے مطابق لائٹ سا پارٹی میک اپ کر دیا۔ اور اب وہ سر سے پیر تک کالی چادر والی شائنہ سے یکسر الگ نظر آ رہی تھی۔۔آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیتے وہ دھیمے دھیمے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

"میں یہاں کچھ دیر بیٹھ کر انتظار کرسکتی ہوں۔ میرے ڈرائیور نے آنا ہے۔" وہ اپنا سامان اپنی کالی چادر سمیت سمیٹ کر ساتھ ساتھ موبائل پہ ٹیکسٹ میں بزی تھی۔

"کیوں نہیں۔آپ یہاں آجایئے۔" تانیہ اُسے لیے سائیڈ کے صوفے کی طرف آگئی۔روشنی اور رابی کے پاس دو اور خواتین آچکی تھیں۔

شائنہ اب نہایت بے دلی سے ایک میگزین دیکھ رہی تھی۔نگاہیں بار بار شیشے کے پار اور موبائل اسکرین پر بھٹک رہی تھیں۔تانیہ کو اب تک کے وقت میں یہی لگا تھا کہ آج ضرور اکیڈمی میں کوئی پارٹی ہوگی۔اور اچھا نظر آنا تو ظاہر ہے، کسے پسند نہیں ہوتا۔پارٹی کے شایانِ شان تیار ہونا اس کا بھی حق بنتا تھا۔

شاہ زیب کے ڈرائیور کو تانیہ بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی۔اُدھیڑ عمر شبیر چاچا قریب دس سالوں سے شاہ زیب کے ساتھ منسلک تھے۔اور ان کے بچوں کو اسکول کالج وغیرہ چھوڑنے جایا کرتے تھے۔کسی کسی وقت ایک اُڑتی پڑتی نگاہ وہ بھی شیشے کے پار ڈال لیتی۔جب ایک میسج ریسیو ہونے پر شائنہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بنا سلام دعا کی پرواہ کیے نہایت عجلت میں باہر نکل گئی۔

تانیہ نے بے ساختہ شیشے کے پار دیکھا۔دل میں بے اختیاری ایک خواہش سی جاگی کہ اللہ کرے ڈرائیور کے بجائے شاہ زیب خود اپنی بیٹی کو لینے آجائے۔۔سال بھر ہونے کو آیا تھا وہ تو اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گئی تھی۔

پر۔۔ایک خیال سے تانیہ کا یک بارگی دل اوپر نیچے ہوا۔۔شائنہ کالے برقعے میں آئی تھی اور اب محض دوپٹہ سر پہ ڈال کر باہر نکل گئی تھی۔روشنی اور رابی نے ہنس کر معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا اور وہ اُٹھ کر گلاس ونڈو تک آئی۔بلیک پراڈو تو کبھی کسی دور میں بھی شاہ زیب کے پاس نہیں رہی تھی۔۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اُس اسمارٹ، ماڈرن سے لڑکے نے ایک بھرپور توصیفی نظر شائنہ کے سراپے پر ڈالتے کار آگے کو بڑھا دی تھی۔۔نہ وہ شائنہ کا باپ تھا، نہ بھائی اور نہ ڈرائیور۔۔!

تھکے تھکے قدموں سے واپس اپنی جگہ پر آتے تانیہ کو اپنا آپ شاہ زیب سے بھی بڑھ کر بوڑھا، مضمحل اور اپنے آپ سے بیزار و اُچاٹ لگا۔شاہ زیب اپنی بیوہ بیٹی اور نواسی کے خیال سے بدل تو رہا تھا پر یہ کافی نہیں تھا۔اُسے اپنی سوچ کو بھی بدلنا تھا۔۔وہ سوچ جو خاندانی عورتیں گھر میں رکھ کر صدیوں سے اُن مردوں کے ذہن و دل پر تالا لگائے ہوئے تھی۔

کانپتی اُنگلیوں کی لرزش پر بمشکل قابو پاتے اُس نے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"نفسیاتی داؤ پیچ کو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کا ٹوٹکا وہ شخص ضرور سمجھے شاہ زیب جس نے حالات کے تھپیڑے نہ سہے ہوں، کل تک تم یہ سب کہنے میں حق بجانب تھے، پر آج۔۔کچھ بھی کہنے سننے سے پہلے اپنے اردگرد پہ ایک نگاہ ضرور ڈال لینا۔۔عورت کے لیے مرد سے ہٹ کر معیار بنانے سے پہلے "دل" کو اُس کے اندر سے نوچنا مت بھولنا۔کاش اٹھارہ برسوں میں کبھی ایک بار بھی تم نے تانیہ اسلم کی مجبوریوں کا قصہ سُنا ہوتا تو آج میرے لیے اپنی بات سمجھانا آسان تھا۔شائنہ کے معاملے میں اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے بتائے پر چلو گے تو سہولت اور آسانیاں خود بخود راہ بنائی جائیں گی۔اُمید کرتی ہوں کہ سختی کے بجائے سمجھداری سے کام لوگے۔شائنہ کو زندگی کے اِس نازک موڑ پر تمہارے اعتماد کی اشد ضرورت ہے۔کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے ایک آخری بار اور بات ضرور کرلینا آخری بار اس لیے آج پہلی بار میں بھی خود کو ایک بیٹی کی ماں محسوس کرتے اِس نامُراد "دل" کی مجبوریوں سے تائب ہوتا دیکھ رہی ہوں۔تانیہ اسلم نے زندگی میں ایک بار پھر ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔۔پر اِس بار مقابل اس کی بیوہ بچی تھی۔۔۔!

☆

سائرہ رضا

حسن آرا جے اور....

دسویں قسط

ایک بار پھر موسیٰ عبدالمبین کے ہمراہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "آپ نے کہا تھا' یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان نے زندگی میں نیک عمل نہ کیے ہوں۔ اور میں نے آپ کے کہنے پر... صرف آپ کے کہنے پر جائزہ لیا۔ میرے پاس کوئی نیک عمل نہیں ہے۔ میں نے بڑی گناہوں سے لتھڑی زندگی گزاری ہے مولانا صاحب...! بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں۔" آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے۔

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں۔دنیا بھر... Readmore
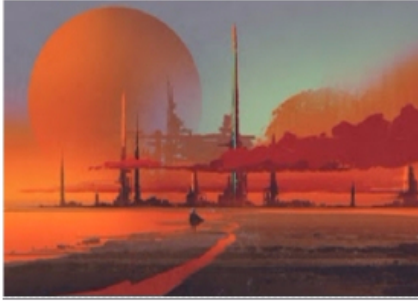
Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا۔ فوٹو: حکومتِ دبئی متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائل انسان چاند پر... Readmore

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر پہنچی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے آٹو ٹیل... Readmore

مکمل ناول

"پتا ہے میں۔" اس نے بتانے کی کوشش کی۔ مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمیع الدین!"
"میں آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں کہ میری زندگی میں کوئی نیک عمل نہیں۔ کوئی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے مجھے صحرا میں پھنسا دیا۔"

ناقابل عمل چیز سمجھ لیا ہے۔" مولانا صاحب کا لہجہ پُرملال تھا۔
"نیکی پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کا نام نہیں ہے۔ نیکی تو راہ میں پڑی کانٹے دار جھاڑی اٹھا لینے سے بھی مل جاتی ہے۔"
"کسی کی راہ میں کانٹے نہ بچھانا بھی نیکی ہے۔"

وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ عبدالمبین اور مولانا صاحب نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔
"اتنی جلدی نتیجہ نہیں نکالتے۔ اللہ نے آپ کو بچایا بھی تو ہے۔"
موسیٰ نے چونک کر سر اٹھایا۔
"پتا نہیں کیوں لوگوں نے نیکی کو بہت مشکل،

عبدالمبین نے مولانا صاحب کے توقف پر ذرا شوخی سے ذومعنی انداز سے ٹکڑا لگایا۔
وہ یک دم جوش سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ "میں نے کبھی کسی کے راستے میں کانٹے نہیں بچھائے۔" اس نے جیسے کچھ پالیا تھا۔
"تو یہ بھی تو نیکی ہے بھلائی ہے۔" وہ یقین سے

بولے۔

"ہاں مگر میرے گناہ زیادہ ہیں۔ اس ایک نیکی سے کیا ہوگا۔" وہ پھر مایوس ہو گیا۔

عبدالمبین اور مولانا صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسے سمجھانا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اگر اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا۔ تو اس کی سمت مائل کیسے ہوتا۔ اس کی جانب قدم کیسے بڑھاتا۔ تمام زندگی ایسے ہی سر نیہوڑائے بیٹھا رہتا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ منہ ہی نہیں ہے جس کو لے کر اللہ کے حضور پیش ہو سکے۔ باقی سب تو بعد کی باتیں تھیں۔

"اپنے لیے اور اپنے عیال کے لیے فکر معاش۔۔۔ اور حلال رزق کی تگ و دو کرنا بھی نیکی ہے۔"

موسیٰ نے سر اٹھایا۔ اس کے لیے معاش کبھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اسکارلٹ اور محی الدین کی ساری دولت کا وہ اکیلا وارث تھا۔ اور خود بھی کون سا کم کماتا تھا۔

وہ مطمئن انداز سے سرہلانے لگا مگر پھر رک گیا۔۔۔ عبدالمبین نے لفظ "حلال" رزق استعمال کیا تھا۔

"میں "حلال" رزق کماتا ہوں ناں؟" فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوال کیا تھا یا خود کو یقین دلانے کی کوشش۔۔۔

عبدالمبین نے کچھ گھبرا کر مولانا صاحب کو دیکھا۔ اس سوال میں پڑ جاتے تو باقی کے سارے سوال راستے میں ادھورے کھڑے رہ جاتے۔ موضوع بدل جاتا۔ موسیٰ ہتھے سے بھی اکھڑ سکتا تھا۔ بحث جھگڑے کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ دلیل موسیٰ کو مایوس کر سکتی تھی۔

"اس وقت ہم نیکی کی بات کر رہے ہیں سمیع الدین۔۔۔! آپ کی تشفی ہو جائے تب دوسرے موضوعات کو چھیڑیں گے۔" مولانا صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عبدالمبین کو باز رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

"آپ نے سنا ہوگا اپنے مسلمان بھائی کو مسکرا کر دیکھنا بھی نیکی ہے۔

کسی کو سلام کرنا۔۔۔ اچھا سوچنا۔۔۔ اچھا۔۔۔"

عبدالمبین کسی ریکارڈ کی طرح شروع ہو گیا۔ اس نے بڑی بڑی اعلا و ارفع مثالوں کے بجائے بہت چھوٹی مثالوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ایسی باتیں جو موسیٰ کے تصور سے باہر تھیں کہ "نیکی" میں شمار ہوتی ہیں اور سب سے خاص بات یہ تھی، وہ جو ہاتھ جھاڑ کے بیٹھا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تو اگر عبدالمبین سچ کہہ رہا تھا۔ تو اس کے پاس تو نیکیوں کا ڈھیر اکٹھا ہو گیا۔ بہت خوب (مولانا صاحب اور عبدالمبین طے کر چکے تھے۔ وہ اسے گناہوں کے بارے میں ابھی نہیں بتائیں گے، غلطی سے بھی نہیں۔۔۔ مبادا وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے۔ اسے مائل کرنا تھا۔۔۔ متنفر نہیں۔۔۔ یہ بہت پیچیدہ معاملہ تھا۔ وہ مایوس تھا۔ مرجاتا۔۔۔ پہلے ہی اپنے خالی ہاتھوں کے احساس سے رو تا تھا۔

اور عبدالمبین کے پاس مثالیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ مگر آج کے لیے بس اتنا ہی۔۔۔ اس نے اختتامی جملے کہہ کر بات ختم کرنا چاہی۔

"نیکی تو اپنے والدین بالخصوص بوڑھے والدین کی طرف شفقت اور ہمدردی سے مسکرا کر دیکھنے سے بھی ملتی ہے۔ جب وہ بوڑھے ہوں لاچار ہوں جب۔"

موسیٰ کا سینہ اپنی نیکیوں کے زعم سے پھولا ہوا تھا اور سر اٹھا ہوا۔۔۔ موسیٰ کو لگا بلٹ ٹرین اس کے اوپر سے گزر گئی۔

"والدین۔۔۔ بوڑھے۔ لاچار۔۔۔ بے سہارا۔" عبدالمبین بولتا جا رہا تھا۔

مولانا صاحب اپنے شاگرد کی فصاحت و بلاغت پر فخر سے مسکرا رہے تھے اور موسیٰ۔۔۔ والدین۔۔۔ ماں اور باپ۔۔۔ بلکہ صرف ماں۔۔۔ باپ سے تین درجے اوپر۔۔۔ ماں۔۔۔ اسکارلٹ۔۔۔ باپ بدر الدین۔۔۔ آہ آہ آہ۔

☆ ☆ ☆

اس نے دوا پینے سے انکار کر دیا۔ وہ آج پھر کسی بچے کی طرح مائل بہ ضد تھی۔

"تم جھوٹ کہتے ہو۔ وہ اب تک ڈیزرٹ میں پھنسا ہوا ہے۔ میرا بلو کوٹ نکال دو۔ میں آج خود ابھیبسی جاؤں گی۔"

"وہ اپنے گھر لوٹ چکا ہے۔" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

وہ ابھیبسی جانے کا ارادہ نہ ظاہر کرتی تو وہ ہاں میں ہاں ملا لیتا کہ وہ اب تک پھنسا ہوا ہے۔ اس سے وہ اگلے بہت سے سوالوں سے بچ جاتا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا' وہ رونے لگتی ناں۔۔۔ تو روتی۔ اپنی بیماری اور لاچاری کو لے کر بھی تو روتی تھی ناں۔۔۔

"تو پھر اس نے مجھے اب تک کال کیوں نہیں کی؟" اس نے کسی مقرر کی۔۔۔ طرح احتجاجی پکار بلند کی۔

"وہ پہلے کون سا تمہیں۔۔۔ ہمیں کال کیا کرتا تھا۔" اس کا سر جھک گیا اس نے بروقت تصحیح کی ورنہ ایک اور لڑائی شروع ہو جاتی۔

"مگر اب تو میں بیمار ہوں۔ ابھی تو وہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا میرا حال' وہ یہیں۔۔۔ اس جگہ پر کھڑا تھا ناں۔۔۔" وہ تیزی سے بیڈ کی پائینی کی طرف جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دایاں ہاتھ بغل میں دے کر بائیں کی انگشت شہادت لبوں پر جما لی۔ اس نے اسے پورا پورا کاپی کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا ہاں وہ بالکل ایسے ہی کھڑا تھا۔

ساکت و صامت۔۔۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ہاں

کبھی کبھی اس پر پل بھر کو ایسے تاثرات آجاتے تھے۔۔۔ جیسے سڑک کنارے دم توڑتی بلی کے پاس کوئی راہ گیر کھڑا ہو جائے۔ وہ بلی کے لیے سخت غم زدہ تو ہو۔ مگر وہ اس کے لیے کر بھی کیا سکتا ہے۔ کمال کی بات یہ تھی ایسی نیم جان غنودہ کیفیت میں بھی اسے اس کا کھڑا ہونا یاد رہا۔ تو کیا اس کی سرد مہری نہ دیکھ سکی۔ وہ آگیا تھا۔ ماں کی عیادت کے لیے ۔۔۔ اور یوں کھڑا تھا جیسے دشمن پڑوسی کے جنازے پر طوعاً و کرہاً آکر کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے۔

"تم اس سے میری بات کروا دو۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"وہ کسی سے بات نہیں کر رہا ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟ تمہارے باپ نے ناں؟ وہ مجھ سے تمہیں چھیننا چاہتا تھا۔ تم کو نہیں لے سکا تو میرے بیٹے پر قابض ہو گیا۔ میں نفرت کرتی ہوں اس موہی دین سے۔" وہ چلانے لگی۔ "ابھی تک زندہ ہے وہ اولڈ مین۔ اور میں۔۔۔ ڈاکٹر کہتا ہے' میں مرنے والی ہوں۔ تمہارا باپ کیوں نہیں مرتا بولو۔۔۔ بولو۔۔۔ تم بولتے کیوں نہیں۔۔۔" اس نے اس کا گریبان تھام لیا۔

"ڈیڈ سے تو میری بات ہی نہیں ہوئی' یہ سب تو اس ہنی نے بتایا۔"

"ہنی۔۔۔!" اس کے مزاج کا آتش فشاں سرد ہو گیا۔ "وہ بھی تو تمہارے باپ کی چوائس ہے ناں۔۔۔ وہ کیسے آنے دے گی؟

وہ بھی رکاوٹ ہے۔ وہ بھی نہیں چاہتی کہ موسیٰ مجھ سے ملے۔" اس نے نکتہ پردازی کی انتہا کر دی۔ اب وہ ہنی کے خلاف بولے جا رہی تھی۔

یہ جملے ساس' بہو کی روایتی چپقلش کے خانے میں فٹ کیے جا سکتے تھے۔ وہی سوچ کہ بہو نے آکر بیٹے کو ماں سے جدا کر دیا ورنہ پہلے تو۔۔۔ ماں بیٹا شیر و شکر تھے۔

یہ بات ہر پہلو سے غلط تھی۔ ماں بیٹا کبھی بھی شیر و شکر نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان دونوں ساس بہو کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا۔

بلکہ ان دونوں کی ملاقاتوں کے مجموعی اوقات کو اکٹھا بھی کیا جاتا تو وہ بھی چوبیس کا ہندسہ عبور نہ کرپاتے۔ تو ایسے میں وہ بول بول کر بھڑاس نکال رہی تھی۔ اس نے موقع پا کر اسے دوا کھلا دی تھی۔ جس کا اسے احساس تک نہ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوا کی غنودگی میں ۔۔ اس نے چپ ہو جانا تھا۔

وہ چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکا کہ ان دونوں ساس بہو کو ایک دوسرے سے ملانے میں کسی اور کا نہیں۔۔۔ خود موسیٰ کا ہاتھ ہے۔

دوا نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ یک دم بیڈ پر بیٹھی تھی۔

"اسے تمہارے باپ نے موسیٰ کے لیے چنا۔۔۔ وہ بہت خوب صورت ہے۔ انوسنٹ۔ موسیٰ اس کے ساتھ بہت خوش ہے۔ وہ وہی اچھی عورت ہے ناں جو تمہارا باپ تمہیں لا کر نہ دے سکا۔ خیر اس نے تو بہت کوشش کی تھی۔ مگر تم کو میں اچھی لگی ناں۔ ہے ناں بدر بولو ہے ناں؟"

"ہاں!" اس کے سینے سے سکھ کا سانس نکلا۔ اس کے خیالات کی رو بھٹک گئی تھی۔

"تمہارا باپ تو بہت خوش ہوتا ہوگا۔ اس نے اپنے خاندان میں اچھی عورت داخل کرلی۔ میں نہیں تھی ناں اچھی۔۔۔ دیکھو، اسے مت بتانا کہ میں اس کے خاندان سے نکلنے والی ہوں۔ مرنے کے بعد ہم ہر چیز سے نکل جاتے ہیں ناں۔"

بدر نے آہستہ سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بیڈ پر تکیے کی سمت گھسیٹ لیا۔ اس کے نیچے کو لٹکتے پیر بیڈ پر رکھ دیے اور سینے تک کمبل اوڑھا دیا۔

تنہائی تھی اور غم غلط کرنے کو پینے کا سہارا ابھی نہیں تھا۔

ساقی نے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔

جام ٹوٹنے کو تھا۔ چھلک کر آدھا تو ہو ہی چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس نے چکن میکرونی کے پیالے باپ بیٹی کے سامنے رکھتے ہوئے چور مگر گہری نگاہ سے موسیٰ کو دیکھا۔ وہ ایمانے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ دونوں ٹیبلٹ پر گیم کھیل رہے تھے۔ جیسے دنیا میں اس سے ضروری دوسرا کوئی کام نہیں۔ انہوں نے حسنل کو دیکھا تک نہیں۔ حسنل نے کانٹا پیالے پر بجایا۔

"اوہو ممی۔۔۔!"

موسیٰ نے صرف نظر اٹھائی تھی۔ وہ سیدھی ہو گئی اور پھر بے آواز قدموں سے موسیٰ پر نگاہ جمائے جمائے کمرے سے نکل گئی۔

"تو یعنی ایک دو اور آج تیسرا دن موسیٰ گھر سے نہیں نکلا تھا اور آج کا دن بس اختتام پذیر ہونے کو تھا اور تین دن پہلے وہ نجانے کون سے زمانوں کی گرد چھان کر ایسے گھر لوٹا تھا جیسے بھاگ کر آرہا ہو۔ جان بچا کر پہنچا ہو۔ وہ خود کو سوال کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔

"سب ٹھیک ہے نا، موسیٰ!"

اور جواب فقط خالی بے تاثر آنکھیں۔۔۔ مگر خاموشی کسی گہری سوچ کا پتا دیتی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔ وہ یقیناً" جائے نماز پر ہوگا اور ہوتا بھی یہی تھا کہ وہ نماز وغیرہ ادا نہیں کررہا ہوتا تھا۔ بس جائے نماز بچھا کر قبلہ رو بیٹھ جاتا، مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ ٹیرس پر چلی آئی۔

"موسیٰ۔۔۔!" اس نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بدکا۔۔۔ پھر اس کی صورت پر نگاہ پڑی تو سانس بھر کے دوبارہ سے آسمان کو دیکھنے لگا۔

اس نے اس کے شانے پر سر ٹکا دیا۔۔۔ اور پہلے تو وہ اسے فوراً" بازو کے حلقے میں لے لیا کرتا تھا۔ اب جنبش بھی نہ کی۔

"یہاں کیوں کھڑے ہیں موسیٰ۔۔۔؟"

"کیا وقت ہوا ہے ہنی؟" سوال پر سوال۔۔۔

"رات بہت زیادہ رات۔۔۔"

وہ چہرہ اٹھا کر اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھرلے۔

"انگلینڈ میں اس وقت دن ہوگا ناں۔۔۔" وہ بولا تو اس کے اٹھتے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

"انگلینڈ۔۔۔" اس نے دہرایا اور طویل سانس بھرا۔ تو یہ بات تھی "آپ کو اپنے مام ڈیڈ یاد آرہے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔" وہ متذبذب تھا، مگر وہ بری طرح چونکی تھی۔

پندرہ سالہ ساتھ میں اس نے اس سوال کے جواب میں ہمیشہ صاف انکار کیا تھا تو پھر آج کیا ہوا تھا۔

"ابھی تو آپ ان سے مل کر آئے تھے۔ (صحرا میں پھنسنے سے پہلے وہ ان ہی سے تو ملنے لگا تھا نا۔۔۔) آپ

کال کرلیں۔" اس نے فوری حل پیش کیا۔
"کال!" وہ یوں دیکھنے لگا جس اس لفظ کے معنی ہی نہ جانتا ہو۔
"ہاں کال۔۔۔!"
اس بار اس کی سمجھ میں آگیا کہ کال کسے کہتے ہیں' مگر اگلے ہی پل اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"وہاں تو دن ہوگا۔"
"دن۔۔۔" اس نے دہرایا۔
دن ہو یا رات اس سے کبھی بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ کون سے ہوش میں ہوتے تھے۔ ایک پینے والا' ایک پلانے والا۔۔۔ (اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا کہ اسکارلیٹ بستر مرگ پر تھی اور اب صرف گولیاں پھانکتی تھی اور بدرالدین اب بھی پلاتا تھا' مگر وہ دوائیوں کے سیرپ ہوتے تھے)
موسیٰ یک دم کمرے میں چلا گیا۔ وہ بری طرح چونکی۔ وہ کال کرنے گیا ہوگا وہ پیچھے لپکی مگر یہ کیا؟ وہ تو بستر پر آنکھوں کو کلائی سے ڈھانپے یوں لیٹا تھا جیسے گہری نیند میں ہو۔ پکارنے پر بھی حرکت نہ ہوئی۔
"بدرالدین اور اسکارلٹ۔۔۔"
محی الدین سہگل کے منہ سے سن سن کر اسے ہمیشہ بدر اور اسکار ہی یاد آتے تھے اور یہ ایسا موضوع تھا جس پر موسیٰ نے کبھی گفتگو نہیں کی تھی کبھی بھی۔۔۔ تو کیا وہ
محی الدین کو جاکر بتائے کہ آج موسیٰ کس طرح سے اپنے ماں باپ کو یاد کررہا تھا' مگر اس کی ضرورت کیا تھی اور فائدہ بھی کیا تھا۔ محی الدین اب اتنے بوڑھے ہوچکے تھے کہ سن کر کیا کرلیتے۔
اور صبح ناشتے کی میز پر وہ منتظر رہی کہ موسیٰ رات کے حوالے سے کوئی بات کرے' مگر اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ سارا دن گلاس وال کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا رہا۔ اتنا خاموش اور ساکت جیسے مجسمہ۔۔۔ اس نے بھی پہلو تہی کی۔ ہاں وہ کچھ وقت اپنے ساتھ گزارے۔
مگر اس سے اگلے دن وہ چونکی۔ وہ جو موسیٰ نے گھر سے باہر جانے کی ایک روٹین سی بنالی تھی۔ اکیلے یا کبھی احمد غفار کے ہمراہ۔ وہ گھر سے نہیں نکلا تھا اور دوسرے وہ جو اذان کی آواز پر چونکتا ہوجاتا تھا۔ ظہر گزر گئی' عصر اور مغرب بھی پر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو نماز پڑھنے کے لیے کیا اٹھتا۔ عشا کے وقت وہ بیڈ روم میں تھا۔ یہاں اذان کی آواز نہیں پہنچ پاتی تھی' مگر۔
وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے سامنے وضو کرکے آئی پھر یوں ہی جائے نماز ڈھونڈنے لگی۔
"آپ کو جائے نماز نظر آرہی ہے؟" اس نے پوچھا۔
اپنے خیالات میں غرق موسیٰ چونکا۔ اس نے طائرانہ نظر دوڑائی اور ایک سمت اشارہ کردیا وہ جائے نماز بغل میں داب نماز کے لیے دوپٹا کستے کمرے سے نکل گئی۔
اور موسیٰ ویسے ہی ٹس سے مس بیٹھا رہا۔
اور وہ جو گزشتہ کئی روز سے کسی پرہیزگار کی طرح پنج وقتہ نمازی بنا ہوا تھا تو وہ ذوق و شوق بس یہیں تک تھا۔ چار دن کی چاہ۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ اس طرح کے حالات سے دوچار ہونے والے اسی طرح مذہب کے نزدیک ہوجاتے ہیں' مگر پھر دھیرے دھیرے نارمل ہوجاتے ہیں تو یعنی نارمل ہونے کا عمل شروع ہوگیا۔ حسنل کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔
تو یعنی ایک بار پھر حسن المآب کی دعائیں قبول ہوگئی تھیں۔ وہی دعائیں کہ موسیٰ بدرالدین اس ابنارملٹی کو چھوڑ کر نارمل لائف کی طرف لوٹ آئے۔

☼ ☼ ☼

"ڈنر کے لیے کہیں باہر چلیں گے ہنی۔۔۔ تم کچھ مت بنواؤ۔"
"باہر۔۔۔؟" وہ جو شیف کو ہدایات دے رہی تھی۔ بری طرح چونکی۔
"ہاں باہر' ایمانے کہتی ہے۔ وہ بور ہوگئی ہے گھر میں رہ رہ کر۔۔۔ ڈنر کے ساتھ کچھ شاپنگ بھی۔۔۔" وہ اتنے آرام سے کہہ رہا تھا جیسے بیچ میں کچھ انہونا ہوا ہی

نہیں۔
اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ گرتے پڑتے قدموں سے بیڈ روم میں چلی آئی۔ اس کے لیے لباس کا انتخاب مشکل تھا۔ موسیٰ نے خود ہی جینز کے ساتھ کرتا اٹھالیا۔ اوہ۔ اس نے کتنے دنوں بعد جینز کو ہاتھ لگایا تھا۔
حسنل نے اپنے لیے بہترین لباس منتخب کیا۔
"اف۔!" اس نے آئینے میں اپنے بھیگے سراپے کو دیکھا تو ایک بار پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ کتنی پریشان تھی وہ موسیٰ کے لیے۔ کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی۔ ڈاکٹرز دوست احباب' دوائیاں علاج مشورے اور کوششیں سب بے کار جا رہی تھیں۔ دنیا سے کٹ کر گھر میں پڑا شوہر۔ خلاؤں میں تکتا۔ ویران آنکھوں میں اجنبیت کی پرتیں' سب ضرورتوں اور خواہشوں کو فراموش کر کے بیٹھا۔
ایسے تو نہیں گزر سکتی تھی نا زندگی تو جو کرنا تھا اسی کو کرنا تھا اور وہ سمجھا رہی تھی اسے اور خود کو صبر کی تلقین کرتی تھی۔ اسے اپنی محبت پر یقین تھا۔ اسے خود پر یقین تھا۔ وہ موسیٰ کو زندگی کی طرف بلالے گی۔ اس نے ایک دنیا کے سامنے دعوا کیا تھا۔ اس نے تنہائی میں خود سے عہد بھی باندھ لیا تھا' مگر موسیٰ۔۔۔ وہ تو اس کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔
اس کا موسیٰ دنیا کی طرف' زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

وہ بالوں کو ڈرائر کرنا چاہتی تھی۔ یک دم دھیان آیا۔ گھڑی دیکھی اور دوپٹا لپیٹ لیا۔ ابھی وقت تھا۔ وہ دو نفل شکرانہ تو پڑھ لے (اس نے حسب عادت ڈھیروں نفل اور منتیں مانی ہوئی تھیں' مگر ابھی فقط دو چار۔۔۔) وضو کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے وضو کر لینا فطرت بن چکا تھا۔ سو شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس نے یوں ہی منہ ہاتھ دھویا ہو۔
امی کہتی تھیں جب بیٹھ ہی گئی ہو تو وضو ہی کر لو۔ منہ ہاتھ کے بعد پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا دل جانے والی حسنل۔۔۔ عام طور پر باوضو رہا کرتی تھی۔
تو اس وقت اپنے انتظار میں بیٹھے موسیٰ اور ایمانے کو چھوڑ کر دو رکعت نفل شکرانہ پڑھنے میں' اس نے دیر نہ لگائی۔ باقی حساب کتاب بعد میں دیکھا جاتا۔

☆ ☆ ☆

شہرزاد عیسانی نے پلکیں زور زور سے جھپکیں' مگر منظر وہی تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس بڑے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ کی دیوار کے نزدیک سرک آئی۔ دور سے کچھ دھندلے نظر آتے چہرے اب واضح تھے۔
یہ موسیٰ ہی تھا۔ ہلکی داڑھی۔۔۔ یا۔۔۔ یا بڑھی شیو۔۔؟ یہ کنفیوژن ابھی تھا۔ صحت مندی کی جانب مائل چہرہ۔ وہ ہنسا تھا۔ تب آنکھوں میں موجود حزن کی تحریر مدھم ہوئی' لیکن بحیثیت مجموعی وہ بہت بہتر نظر آرہا تھا۔ ایمانے مسلسل بول رہی تھی اور وہ ہمیشہ سے بغور سننے کا عادی تھا اور بولنے والی اس کی لاڈلی بیٹی ہو تو۔۔۔ وہ اس کی لایعنی باتوں کو سننے کے لیے دوسروں کو گھنٹوں انتظار کرواتا رہا تھا اور ہنی۔۔۔
شہرزاد کے حلق میں نیم گھل گئے۔ ہنی باپ بیٹی کو دیکھتے ہوئے بہت رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھتی تازگی نے اردگرد کے ماحول کو تروتازہ کر دیا تھا۔ اس کے لباس میں بہت سے رنگ تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی۔۔۔ اک بے نیازی' ایک استحقاق' ایک بے فکری۔۔۔ کوئی اجنبی دیکھتا تو ہیپی فیملی کہہ کر رشک کرتا۔ جان پہچان کا دیکھتا تو ماشاء اللہ کہتا اور دوست۔۔۔ جس کا دعوا شہرزاد کرتی تھی تو اس نے دیکھا تو۔۔۔ حسد کی تیز لہر اس کی رگوں میں لہو کی جگہ دوڑنے لگی۔ (ہاں نا۔۔۔ دوست ہی تو حسد کرتے ہیں نا۔ دشمن تو دشمنی کرے گا۔ جان لیوا ڈنک اس سانپ کا ہوتا ہے جسے آستین میں پالتے ہیں پر افسوس شہرزاد کو اتنے عرصے میں موقع نہ ملا ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔)
حسد اشتعال میں بدل گیا۔ نس نس پھڑکنے لگی۔ اس کا دماغ کھول رہا تھا۔
"تو ہنی۔۔۔ سب کو بے وقوف بنا رہی ہے۔" اس

نے اپنے گالوں کی ہڈیاں سہلائیں اتنی زور سے جبڑے بھینچے تھے کہ دکھنے لگے۔

"وہ بیمار ہے۔ اداس ہے۔ خاموش ہے۔ پکارنے پر بھی جواب نہیں دیتا۔ اس کا دل ہی نہیں لگتا اور پھر کبھی کہتی ہے۔ وہ ری کور کر رہا ہے۔ کبھی کہتی ہے۔ کچھ نہیں بدل رہا تو اصل کہانی یہ ہے' میں بتاؤں گی سب کو۔"

سب سے کہا جا رہا ہے کہ موسیٰ کمرے سے نہیں نکلتا اور یہاں۔ لیکن یہ۔ یہ سب کیوں کر رہی ہے؟

اس کی سوچوں کو بریک لگا۔ پھر اس نے فوری فیصلہ کیا وہ ان تینوں کے سر پر پہنچ جائے اور پوچھے کہ یہ سب کیا ہے۔ جو نظر آ رہا ہے اور وہ سب کیا ہے، جو وہ کہتی ہے یا جس کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے' مگر اس کے قدم بڑھانے سے پہلے وہ ڈنر سے فراغت پا کر کھڑے ہو گئے۔

شہزاد کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیڑھیاں چڑھ کر تھرڈ فلور تک پہنچ گئے۔ یقیناً" اب شاپنگ ہو رہی تھی۔ موسیٰ نے ایمانے کو گود میں لے لیا۔

حسنل ذرا سا جھک کر جیولری شاپ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ ٹین ایج لڑکوں کا ایک گروپ کانوں میں ہینڈز فری لگائے' کچھ ناچتا جھومتا سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے میں مگن شوخیوں پر آمادہ تھے۔ حسنل کا دھیان نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے ٹکرا جاتے اور وہ گر جاتی۔ موسیٰ کا ہاتھ بڑھا۔ اس نے بروقت اسے اپنے پہلو میں سمیٹ کر بچا لیا تھا۔ حسنل اس اچانک جھٹکے سے بری طرح گڑبڑائی تھی۔ موسیٰ نے اس کے سرک جانے والے دوپٹے کو سر پر جمایا اور سب ٹھیک ہونے کا یقین دلایا۔ حسنل کی نظریں لڑکوں پر تھیں اور شہزاد کی اس پر۔۔۔

بغض اور نفرت پر کسی نے سنجیدگی سے تحقیق نہیں کی۔

ورنہ ایٹم بم بنانے کی نوبت نہ آتی۔ کاش کوئی شہزاد کے دل میں جھانکتا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ اگلے ہی روز کی بات ہے۔۔۔

شہزاد کی کینہ توز نظریں حسنل کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کے اندر تناؤ بڑھتا جا رہا تھا اور چہرے سے چھلکنے لگا تھا۔ جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ابھی سب کو حسنل کی حقیقت بتا دے گی کہ وہ جو سب سے کہتی پھرتی ہے کہ موسیٰ کسی سے ملنا نہیں چاہتا اور وہ سب باتیں جو اس کے حوالے سے اڑ رہی ہیں۔ وہ سب جھوٹ ہے۔ دراصل خود ہی اپنے کسی خاص مقصد کے تحت موسیٰ کو سب سے کاٹ کر بس اپنی ذات تک محدود کر دینا چاہتی ہے۔

اور ثبوت کے طور پر وہ رات کا سارا واقعہ بیان کرے گی جو نہ صرف اس نے دیکھا تھا بلکہ موبائل میں قید بھی کر لیا تھا۔

لیکن اپنا منہ کھولنے سے پہلے اس نے تحمل سے حسنل کو سننے کا فیصلہ کیا۔ دیکھوں تو یہ کیا کہتی ہے۔ کس لیے سب کو اکٹھا کر لیا ہے۔ سب ہی منتظر تھے بس ڈر مر نہیں پہنچا تھا۔ موسیٰ کی گمشدگی اور پھر بعد کی ساری صورت حال میں حسنل کا آفس آنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا' مگر اس نے قطعاً" پہلو تہی بھی نہ کی تھی' مگر تب وہ سب کام طوعاً" و کرہاً" سرانجام دیتی تھی' لیکن آج۔ آج وہ بہت بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ خوش' تازہ دم' پرجوش اور معمول سے زیادہ خوب صورت۔۔۔

کورم پورا ہوتے ہی وہ کھنکھار کر اپنی کرسی پر سیدھی ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے سب کا شکریہ ادا کیا کہ جس طرح ان سب نے اس مشکل وقت کو صبر سے کاٹا۔ ہمت نہیں چھوڑی بلکہ اس کی ہمت بھی بڑھاتے رہے۔

اور خوش خبری یہ تھی کہ موسیٰ کا رویہ نارمل ہونا شروع ہو گیا ہے۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ امید کی جا سکتی ہے بلکہ یقیناً" عنقریب وہ اپنی سیٹ پر آ جائے گا' ہر چیز کو خود

سنبھال لے گا۔
اس نے باس کی کرسی کو تھپتھپایا جس پر خود براجمان تھی۔
"اوہ رئیلی۔۔۔! تم سچ کہہ رہی ہو۔ کیسے ' کب۔ اوہ گاڈ۔۔۔ تھینک گاڈ۔"
پورے کمرے میں آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ مسکرا کر سنتی رہی۔ پھر اس نے اس کے پچھلے پورے ہفتے کے معمولات بتائے اور یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح رات کتنے دنوں بعد وہ ڈنر کے لیے گھر سے باہر نکلا اور شاپنگ۔۔۔ اور۔۔۔
ماسوا شہرزاد کے سب کے چہرے جگمگانے لگے ' جو کچھ ہنی بتا رہی تھی ' یہ سب تو واقعی ایک نارمل انسان کی ایکٹی وٹیز تھیں۔ سب کرید کرید کے پوچھ رہے تھے۔ وہ کھل کر ہر کسی کی تشفی کروا رہی تھی۔
شہرزاد کے پاس سوچنے اور کہنے کو کچھ نہیں بچا۔
شکست خوردگی و بے بسی کے احساس نے اس کا جی اچاٹ کر دیا۔
"تو کیا البم کی ڈیٹ اناؤنس کر دوں؟" جے کے نے میز پر ہاتھ مارا۔ وہ کرسی کے اگلے دو پیروں پر جھک آیا تھا۔ بینڈ کے باقی لوگوں کے چہرے بھی پُرجوش ہو گئے۔
"ابھی چند دن ٹھہر جائیں۔" وہ مسکرائی۔
"ہاں ' لیکن ہلکا سا اشارہ تو دے دیتے ہیں ناں۔ موسیٰ کی انٹری دھماکے دار ہونی چاہیے۔"
وہ سب ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ ایک سے بڑھ کر ایک آئیڈیا۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتی رہی۔
اپنی رگ و پے میں اترتے سکون سے سرشار ہوتے ہوئے اس کی نظر شہرزاد پر پڑی جس کے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق نہ تھی۔ وہ بالکل چپ تھی۔ اس نے شہرزاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کرسی پر آگے کو جھک آئی۔
"آپ کچھ نہیں بولیں شہر۔۔۔؟ آپ کے لیے تو یہ سب سے بڑی خوشی کی خبر ہونی چاہیے ' آخر کو آپ دوست ہیں موسیٰ کی۔۔۔" وہ اپنے تئیں اس کا مان بڑھا رہی تھی۔ اسے دوسروں سے جدا کر رہی تھی۔
اسے لگا وہ اسے جتا رہی ہے۔ تم دوست اور میں بیوی ہوں۔ سب اس کے جواب کے منتظر ہو گئے۔
"اور وہ جس نئے ٹریک پر تھا ' اس کا مذہبی رجحان۔۔۔ مسجد ' نماز اور تبلیغی اجتماعات اور سب سے بڑھ کر اس کا حلیہ۔۔۔ کیا اس نے وہ سب بھی چھوڑ دیا۔ ایک ڈنر اور شاپنگ پر تم نے سمجھا کہ سب ٹھیک ہو گیا۔"
اس کے جملے تلخ تھے ' مگر غیر محسوس طریقے سے حسد آشکار ہو رہا تھا۔ سب اس سوال پر اش اش کر اٹھے۔
"ہاں وہ رجحان بھی۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ اور پھر چند لمحے کے توقف کے بعد تفصیلی جواب۔۔۔ جزئیات کے ساتھ کھنکتا لہجہ۔۔۔ متبسم چہرہ۔
"ایک وقت ایسا آیا تھا جب مجھے لگا کہ موسیٰ ہاتھ سے نکل گئے ' مگر پھر میں نے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں کہ اللہ موسیٰ کو ٹھیک کر دے۔۔۔ اور اللہ نے موسیٰ کو ٹھیک کر دیا۔"
وہ خاموش ہو گئی۔ اور باقی سب بولنے لگے۔ سب مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔
حسنل نے شاندار سی چائے کا کہا۔ شہرزاد کی تفکر آمیز خاموشی کو حسنل سمیت سب نے پُریقین دلاسے سے کم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔
"ہے سنو۔۔۔!" ڈرمر کے ہاتھ میں اسمارٹ فون تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ "موسیٰ انسٹا پر لائیو ہے۔"
"موسیٰ۔۔۔ انسٹا پر لائیو۔۔۔" سب ساکت رہ گئے اور ڈرمر کے اوپر جھک آئے۔
ہاں یہ سچ تھا۔ سب نے مسرت آمیز استعجاب سے حسنل کو دیکھا۔ حسنل نے لیپ ٹاپ نزدیک کر لیا۔ چند بار کلک کرنے سے وہ سامنے آ گیا۔
گٹار اٹھائے کمر کے بل آخری حد تک پیچھے کو

جھکا۔ تان اُڑاتا موسیٰ یہ اس کی پرفائل پکچر تھی۔
"ہاے!" حسنل نے نزاکت سے ہاتھ ہونٹوں پر رکھا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ "میں نے کہا تھا ناں۔۔۔ وہ نارمل ہو رہا ہے۔ اف" اس نے دوسرا ہاتھ بھی ہونٹوں پر دھرا" میں کنفرم کر کے آپ کو بتاؤں گی کہ کتنے فینز ہو سکتے ہیں"، پینتیس بلین سے زیادہ فین تھے اس کے۔۔۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ سوالات کا انبار لگ گیا۔
"ایسا نہ ہو لوگ اس سے اس کی گمشدگی کے بارے میں سوال کرنے لگیں۔" حسنل کی پریشان آواز نے سب کو چونکایا۔ "وہ اس تذکرے کو برداشت نہیں کر پاتا۔"
اور واقعی اسی طرح کے سوالات کی بھرمار تھی' مگر دوسری طرف موسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ حسنل کا رنگ فق ہو گیا' اس نے صحرا کے ذکر پر موسیٰ کو گھٹنوں میں منہ دے کر روتے دیکھا تھا۔ کاش وہ ہٹ جائے اس سب کے سامنے سے۔
حسنل نے فیصلہ کیا وہ بھاگ کر گھر چلی جائے یا اسے فون کر کے منت کرے پر جو کرے فوراً" کرے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ رہی تھی۔ جب موسیٰ کسی سوال کا جواب دینے لگا۔ اسے رکنا پڑا۔ بات ہی اتنی خاص تھی۔ لوگ صحرا کے دنوں کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔ لوگ سوال کر رہے تھے۔
وہ دنیا چھوڑ کر دین اپنا رہا ہے؟
"میں دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلوں گا۔ دعوا تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ آپ دعا کریں میں کامیاب رہوں۔" اگلا جواب۔۔۔ اس سے اگلا۔۔۔ اور۔۔۔
"میوزک چھوڑ دوں گا۔۔۔؟ میں میوزک چھوڑ چکا ہوں۔"
دھڑام۔ کمرے کی چھت سب کے سروں پر آ رہی۔
"تم تو کہہ رہی تھیں ہنی۔۔۔ وہ نارمل ہو گیا ہے۔"

گٹار سٹ حلق کے بل چلایا۔ جے کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ شہزادی نے بھی تقلید کی۔ حسنل کسی کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ سن رہی تھی کہ موسیٰ کیا کہہ رہا ہے۔
"ہمارے جسم کی طرح ہماری روح بھی حرام کھانے کی عادی ہو چکی ہے۔ ہمارے جسم۔۔۔ ہمارے جسم۔۔۔"
موسیٰ نے یہ جملہ دوسری بار کہا تھا' مگر حسنل اس جملے کو پہلے بھی کہیں سن چکی تھی۔ کہاں۔۔۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر ہونٹ کا کونہ دانتوں میں دبایا۔
"ہمارے جسم کی طرح۔۔۔"
آہ! روشنی کا جھماکا ہوا تھا۔ سب بھونچکا رہ گئے۔ آواز دی۔ پیچھے کو بھی لپکے۔ آفس میں کام کرنے والے ہر ورکر نے میڈم کو اندھا دھند بھاگ کر گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

کلفٹن آفس سے نارتھ ناظم آباد۔۔۔ یعنی میکے کی گلیاں۔۔۔ ان راستوں پر اب وہ بھولے بسرے ہی سفر کیا کرتی تھی۔ جب بڑی مجبوری ہو اور جائے بنا گزارا نہ ہو۔ دوپہر کے دو بجے کا عمل تھا۔ وہ جس قدر فراٹے سے نکلی تھی۔ اب گاڑی کا رینگنا اعصاب شکن تھا۔ کتنی بار گھڑی دیکھی' پہلو بدلا' ڈرائیور پر چلائی اور ستم یہ تھا کہ اندر اٹھتا ابال کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جاتا تھا۔
اس کا اندازہ غلط ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جیسے جیسے سوچتی' پختہ ہوتی جاتی۔۔۔ یہ اور بات تھی کہ غیظ و غضب کے ساتھ ساتھ بے یقینی کا عنصر بھی غالب تھا۔ دل کی شدید خواہش تھی کہ جو وہ سوچ رہی ہے غلط ہو۔۔۔ مگر دل یہی کہتا تھا۔
"تم بالکل درست سمت میں سوچ رہی ہو حسن المآب۔۔۔"
سامنے کے منظر کو اس نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی گاڑی گھر کے دروازے پر جا کر

رکی۔ مخالف سمت سے آتی ایک گاڑی نے راستہ روک دیا۔ وہ اس گاڑی کو اس کے سوار کو آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتی تھی۔

ڈرائیور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ پھٹی آنکھوں سے سامنے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر احمد غفار تھا۔ اس کے ہارن دینے پر ذیلی دروازہ کھلا۔ یہ عبدالمبین تھا۔ اس نے گاڑی سے نکلتے ہی موسیٰ کا زبردست خیرمقدم کیا۔ سلام کے لیے بڑھے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر گرم جوشی سے گلے ملا اور اب کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اندر لے جا رہا تھا اور اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو جاتا، وہ بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سے نکلی۔

چوکیدار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ روکتے روکتے پہچان گیا تھا۔ دروازہ دھاڑ سے بجنے کی آواز پر اندر بڑھتے دونوں نفوس چونک کر مڑے تھے۔ دونوں نے شدید بے یقینی سے اسے۔۔۔ اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ہنی۔۔۔"

"حسنل۔۔۔" دونوں نے ایک ساتھ اسے پکارا تھا۔

اس نے موسیٰ کو صریحاً" نظر انداز کر دیا اور عبدالمبین کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے اور لہجے سے پھنکار سی نکلی۔

"تو اس سب کے پیچھے تم ہو۔"

عبدالمبین کا چہرا سوالیہ ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ اس نے آج پہلی بار موسیٰ کے ملاقات کے اصرار پر اسے بالآخر گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

اس کی اتنے دنوں کی غیر حاضری اور کسی بھی رابطے میں نہ ہونے کے باعث اسے انکار کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ (وہ شدید فلو کا شکار تھا۔)

دوسرا اہم پہلو موسیٰ کو اتنا آگے لا کر ایک پل کے لیے بھی تنہا چھوڑنا بہت نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وہ دلدل میں پھنسے انسان کی طرح تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہاتھ چھوٹتا تو اس نے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جانا تھا۔ موسیٰ اپنی زندگی کے سب سے نازک اور خطرناک دور سے گزر رہا تھا۔ نہ ادھر کا' نہ ادھر کا۔

موسیٰ کے سر پر شام آئی ہوئی تھی۔ اسے ایک جگنو کی اشد ضرورت تھی۔

حسنل کی خوں خوار نگاہیں عبدالمبین کے چہرے پر جمی تھیں۔ یوں لگتا تھا' وہ ابھی گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر طمانچے مارنا شروع کر دے گی۔

"کس سب کے پیچھے؟" عبدالمبین کا لہجہ و انداز بے حد پرسکون تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے انگشت شہادت بطور دھمکی اٹھائی۔ "کہانی وہاں تک تھی جب تک میں بے خبر تھی۔ مگر اب مجھے سب پتا لگ چکا ہے۔ اور مجھے اپنی مرضی کا انجام لکھنا آتا ہے' سمجھے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا' تم کیا کہہ رہی ہو۔"

حسنل دانت پیس کر جواب میں بہت سخت کہنا چاہتی تھی' مگر اسے موسیٰ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ جو اس کے نزدیک آکر اس کی کلائی تھام کر پوچھ رہا تھا۔

"وہ اچانک ادھر کیسے۔۔۔ اور وہ اتنا خفا کیوں ہو رہی ہے۔"

حسنل نے لمبا سانس بھر کے خود کو تحمل کی زبردست تلقین کی تھی۔

"چلیں' گھر چلتے ہیں۔" اس نے سر اٹھایا تو موسیٰ کے لیے مسکراہٹ تھی۔

"ابھی تو آئے ہیں۔" موسیٰ کا جواب تحیر آمیز تھا۔

"ابھی ہی جانا ہو گا۔" اس نے موسیٰ کا ہاتھ تھام کر رخ بھی موڑ لیا۔

"لیکن ایسے کیسے؟ میں عبدالمبین کے ساتھ بیٹھا ہوں' تم جب تک اندر جا کر سب سے مل لو۔"

"میں پھر آجاؤں گی موسیٰ۔۔۔ ابھی آپ چلیے۔"

پھر اس نے ایک نہ سنی' ایک لحاظ سے وہ موسیٰ کو دھکیل کر لے گئی تھی اور عبدالمبین کو یوں دیکھا تھا کہ

اس سے بعد میں نپٹے گی۔
گھر میں حیران کن اطلاع کو بجی۔ "حسن الماب آئی ہے۔"
سب کے باہر آنے تک خبر یہ تھی۔
"حسنل چلی گئی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"عبدالمبین سے آپ کا رابطہ کیسے ہوا؟" سارے سوال بھول کر وہ بس اسی ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی۔
"مجھے یاد نہیں۔" اس نے سچ کہا۔ "تم بار بار ایک ہی سوال کیوں کرتی ہو؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔
"اس لیے کہ بڑی مشکل سے آپ نارمل ہو رہے تھے۔ ایک بات بتائیں۔ آپ تو انسٹا پر لائیو تھے نا۔ پھر یک دم اس کے گھر کیسے پہنچ گئے۔ اس نے کال کر کے بلایا تھا؟ پہلے بھی گئے تھے؟ کتنی بار ملے؟" اس نے سوالوں کا طومار باندھ دیا۔
"ان سب فضول سوالات کا کیا مقصد ہے ہنی؟" بالآخر اسے غصہ آگیا۔ اس کی آنکھوں سے بھی شدید ناراضی ہویدا تھی۔
"مقصد ہے موسیٰ! مقصد ہے۔" اس نے ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کی پشت ماری۔ "اف۔۔۔" سر جھٹک کر ذہنی خلفشار سے چھٹکارے کی بے کار سی کوشش۔۔۔
"مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ آپ کے منہ میں کسی اور کی زبان ہے اور کسی کیوں۔۔۔ وہ سارے الفاظ عبدالمبین اور نانا جان کے تھے۔ میں کتنی بے وقوف ہوں۔"
"نانا جان۔۔۔" موسیٰ چونکا۔ "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"آپ کسی سے بھی نہیں ملیں گے موسیٰ۔۔۔ بلکہ اب آپ صرف اپنے ڈاکٹر سے ملیں گے، آپ اپنے ٹریک سے ہٹ گئے ہیں۔ یہ آپ کا راستہ نہیں ہے۔ میں کتنی بار اور کیسے سمجھاؤں۔" اس نے واقعی سر پکڑ لیا۔ اس کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

موسیٰ اکتا گیا۔ اس کی قوت برداشت بہت کم ہو چکی تھی۔ وہ چڑ جاتا تھا۔
"تم صاف بات کیوں نہیں کرتیں۔ کیا چاہتی ہو۔ کیا کروں میں؟"
"آپ۔۔۔" وہ تیزی سے جواب دینے لگی۔ مگر اگلے ہی پل زبان دانتوں تلے داب لی۔ کیا واقعی وہ کہہ دیتی جو چاہتی تھی کہ ختم کریں یہ تماشا۔۔۔ یہ سجیہ۔۔۔ یہ حلیہ۔۔۔ یہ گم صم کیفیت۔۔۔ اچھے خاصے گزشتہ تین، چار روز گزرے تھے۔ وہ پھر سے پہلے جیسی باتیں کرنے لگا تھا۔
اتنا بدل جانے کے بعد بھی یہ کہنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ دنیا چھوڑ کر کون پاگل دین کو اپناتا ہے۔ وہ بھی اس زمانے میں۔۔۔ وہ بھی ختم کرے یہ تماشا، بہت ہو گیا، تو معنی یہ رہیں، مگر الفاظ و انداز بدل لینے ہوں گے حسنل۔۔۔ پاسبان عقل چوکس کھڑا تھا۔
"موسیٰ۔۔۔" اس نے لہجے میں شیرینی سمو کر مخاطب کیا۔ "آپ کس گورکھ دھندے میں الجھنے لگے ہیں۔ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ ابھی انسٹا پر کیا آنسر کر رہے تھے کہ میوزک۔۔۔ ادھر آپ کے بینڈ کے لوگ وہ اس قدر ایکسائیٹڈ ہیں۔ جے کے ڈیٹ اناؤنس کرنے کی سوچ رہا ہے۔ سب کا کیریر داؤ پر لگا ہے اور چھوڑیں سب کو، آپ کے فینز ایک ایک پل گن رہے ہیں۔ اتنی بڑی بڑی کمپنیز۔۔۔ اسپانسر کریں گی اور آپ۔۔۔"
اس نے لہجے میں سنسنی بھر کے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑا۔ سینٹرل ٹیبل پر پڑے گلدستے پر نگاہیں جما کر سنتے موسیٰ نے خاموشی کا طویل وقفہ لیا۔ وہ ہنوز جواب کی منتظر تھی۔ اعصاب شکن خاموشی کا خاتمہ ہوا۔

موسیٰ نے نظریں اٹھائیں۔ ان میں خالی پن۔۔۔ بے زاری۔۔۔ اداسی کا عنصر نہیں تھا۔ پرسکون چہرا۔۔۔ قطعیت بھری آنکھیں اور دو ٹوک لہجہ۔۔۔
حسنل کے سر پر فانوس گر گیا ہو جیسے۔ موسیٰ بول رہا تھا۔

"لیکن میں تو اب میوزک نہیں کروں گا انی۔ میں نے میوزک چھوڑ دیا ہے۔ ان فیکٹ میرے گلے سے آواز ہی نہیں نکلتی۔" اس کی آواز میں پژمردگی گھل گئی۔

"آواز نہیں نکلتی۔" ششدر حسنل کے لبوں پر سرسراہٹ ہوئی۔ موسیٰ کا دھیان نہیں تھا۔ اس کے وجود سے وحشت ٹپکنے لگی۔ "بھجن گانے کے بعد سے میں کچھ نہیں گا پایا۔"

"بھجن۔۔۔" حسنل کو فوری طور پر یاد نہیں آسکا کہ یہ کیا لفظ ہے۔ "رام ناتھ نے کہا۔

اور عبدالمبین نے کہا۔ "تمہارے جسم کی طرح۔" وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔

ششدر بیٹھی حسنل' عبدالمبین کے نام پر بھڑک اٹھی۔

"تو کیا کریں گے آپ۔۔۔ ایسے گزاریں گے زندگی۔ ایسی عجیب عجیب باتیں کرکے۔"

"آں۔۔۔" وہ چونکا۔ "مجھے تو بس رام ناتھ کے سوالوں کے جواب دینے ہیں اور عبدالمبین کہتا ہے' ایک جواب سے دس اور جواب نکلیں گے۔"

"میں نہیں جانتی' کیا کہتا ہے عبدالمبین۔" اس نے دانت کچکچائے "اور کون ہے یہ رام۔۔۔ رام ناتھ۔۔۔ مگر یہ آپ کے کرنے کے کام نہیں ہیں موسیٰ۔ ان کاموں کے لیے مبلغ ہیں نا۔ آپ تو بس نماز ادا کریں۔ ارکان ادا کریں۔ اور اپنی روٹین لائف گزاریں۔"

اس نے ایک ہی سانس میں موسیٰ کے سارے مسائل کا حل پیش کر دیا۔ مگر موسیٰ کے جواب نے حسن المآب کے وجود کے پرخچے اڑا دیے۔ اسی چیز سے تو وہ بھاگی تھی۔ کیا کہہ رہا تھا موسیٰ۔

"ہاں تو میں مبلغ ہی تو بننا چاہتا ہوں۔ دین سیکھنا چاہتا ہوں۔ دین سکھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ پھر کوئی رام ناتھ۔۔۔"

اس سے آگے موسیٰ خود کلامی پر آگیا۔ غائب دماغ سا لگنے لگا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کے جواب نے حسن المآب کے ساتھ کیا کر دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

مولانا صاحب کے پاس ایک نومسلم خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے موسیٰ کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا۔ کتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ آیا تھا اور ان سارے دنوں میں مولانا صاحب پریشان رہے تھے۔ بالکل کنارے پر آکر وہ پلٹ نہ جائے کہیں۔۔۔ انہوں نے کتنے ہی لوگوں کو آدھے راستے سے پلٹتے دیکھا تھا۔ خود سے کال کرنے میں بڑی قباحتیں تھیں۔

سو اس وقت اسے آتا دیکھ کر ان کے رگ و پے میں اطمینان ہلکورے لینے لگا۔ ساتھ ہی وہ بری طرح چونکے بھی تھے اور وجہ موسیٰ کی چال ڈھال اور انداز تھا۔ پہلے وہ بہت خاموش۔۔۔ میلے میں بچھڑے بچے کی طرح سہما سہما سا گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے قدم اٹھاتا تھا اور کسی ملزم کی طرح ایسے بیٹھتا جیسے چھپنا چاہتا ہو۔

وہ بہت تیزی سے دروازے سے برآمدے تک کا فاصلہ طے کرتا ہوا ان تک آ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں کسی جھجک کا شائبہ نہ تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا تھا اور تلفظ کی درست ادائیگی سے سب کو السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا تھا۔

نومسلم خاندان جو مئودب ہو کر مولانا صاحب کو سن رہا تھا۔ سب بھول بھال کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ مولانا صاحب نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی ملا کر موسیٰ سے چند منٹ مانگے کہ وہ ذرا فارغ ہو لیں۔ نومسلم خاندان کے ہر فرد کے پاس جھجکتے لہجے میں سوالات تھے۔ وہ درست طور سے اپنا مطمح نظر بیان کرنے سے قاصر تھے۔

موسیٰ کو لگا گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ وہ بغور سن رہا تھا۔ مگر مولانا صاحب کی عدم دلچسپی عیاں ہونے لگی۔ وہ بار بار بس موسیٰ کو دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے نومسلم خاندان کو دوسرے مولانا کے پاس بھیج دیا اور خود جی جان سے موسیٰ کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"آپ نے انہیں کیوں بھیج دیا۔ وہ بہت اچھے سوال کر رہے تھے۔" اس نے قدرے جھجک کر کہا۔
"مجھے یقین ہے' آپ ان سے بھی اچھے سوال کر سکتے ہیں۔" وہ سینے پر بازو باندھ کر بھرپور مسکراہٹ سے بولے۔ "آپ بہت خاص ہیں سمیع الدین صاحب!"
"پتا نہیں۔۔۔ میں کیسے خاص ہو سکتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر بے بس و لاچار لگنے لگا۔
"آپ کی اتنے دنوں کی غیر حاضری سے ہم سب یہی سوچ بیٹھے تھے۔ آپ کہاں چلے گئے تھے سمیع الدین۔۔۔ میں سوچتا رہا' ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو خفا کر دیا۔"
اس دن کتنے خوشگوار انداز سے دھیرے دھیرے بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ بغور سن رہا تھا اور ننھی ننھی نیکیوں کے بارے میں جان کر حیران تھا۔ جو اس سے جانے انجانے میں ہو چکی تھیں۔ پھر اچانک پتا نہیں اسے کیا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بجھ گیا۔ پھر سیاہ ہونے لگا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔۔۔ اور آج آیا۔
"آپ ہی نے تو کہا تھا۔ اللہ کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں۔" اسے مولانا صاحب کی باتیں یاد رہنے لگی تھیں۔
"بالکل درست آپ اس لیے خاص ہیں کہ آپ دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ دنیا آپ کی اندھی تقلید کرتی ہے۔"
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بے تابی سے ٹوک دیا تھا۔
"آپ کو اب تک پتا نہیں چل سکا سمیع الدین کہ کیا فرق پڑتا ہے۔" مولانا صاحب کا لہجہ پسیج گیا۔

"ادنیٰ مثال یہ ہے کہ گھر کا سربراہ جس سیاسی جماعت سے وابستگی رکھتا ہو۔ تمام خاندان لامحالہ اسی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ چیز اس کی جین کے ذریعے منتقل ہو گئی ہو۔ اور شاید آپ کے علم میں ہو۔ دین اسلام کے آغاز میں کسی قبیلے کے سردار کے ایمان لانے سے پورا قبیلہ اس کی تقلید کرتے ہوئے مسلمان ہو جایا کرتا تھا۔
آپ ویسے ہی سربراہ ہیں۔۔۔ ویسے ہی سردار۔۔۔
آپ جو راہ اختیار کریں گے ناں۔۔۔ وہ بہت سوں کی منزل بن جائے گی۔ میرا یقین کریں۔ آپ کا راہ راست پر آنا بہت سوں کے لیے راہِ نجات بن جائے گا۔ اس لیے میری نظر میں آپ خاص ہیں۔"
بہت دن گزر گئے تھے۔ موسیٰ کو یہاں آتے ہوئے اور موسیٰ کی سنتے ہوئے۔ بس وہ جو کہتا تھا' سن لیتے جو پوچھتا اس کا جواب دے دیا جاتا۔ مگر اب وقت آ گیا تھا کہ اس پر باقاعدہ محنت شروع کی جائے۔

☆ ☆ ☆

دنیا سمٹ کر انگلی سے چھوئے جانے پر نگاہوں کے سامنے ۔۔۔ پھیلنے لگی تھی۔ جو چاہے دیکھو' جانو۔ دل سینے سے نکل کر انگشت شہادت میں آکر ٹھہر گیا تھا۔ اور دھڑکتا یوں تھا جیسے میلوں سے بھاگتا آیا ہو۔
جیک کی خبر جسے اس نے افواہ جیسی بھی اہمیت نہ دینے کا سوچا تھا۔ وہ صدفی صد درست ثابت ہوئی۔
سمیع الدین المعروف موسیٰ بلی۔۔۔ یہ موسیٰ بدر الدین کی تازہ ترین تصویر اور سرگرمیاں تھیں۔
سورج مغرب سے نکل آتا تو تب بھی اتنی حیرت نہ ہوتی جو اسے یہ سب دیکھ کر ہو رہی تھی۔ موسیٰ اور یہ سب۔۔۔ یہ کیسے ہو گیا۔ محرک۔۔۔ اسباب و جوہات۔۔۔ سے بڑھ کر اہم سوال یہ تھا یہ ہونے کیسے دیا گیا۔
اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ انہونے واقعات کا سنا تھا۔ پھر ان کے سروائیول کی کہانیاں مگر موسیٰ وہ!! تو ان سب الگ تھا۔ اس کی شخصیت' اس کا بیک گراؤنڈ۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر اف۔۔۔ اس نے سر تھام لیا۔ یہاں تک آتے ہی اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

موسیٰ کی نئی مصروفیات۔۔۔
مزے کی بات یہ تھی موسیٰ خود کچھ نہیں بول رہا تھا۔ اور ایک دنیا بول رہی تھی۔ اندازے قیافے۔۔۔ اور ان پر لگتے من پسند پھندنے۔۔۔ موبائل کیمروں نے راہ اور ہموار کردی تھی۔ اس کی نئی فوٹیجز کی بھرمار تھی۔

نماز پڑھتے ہوئے۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے۔ بغور سنتے ہوئے۔ اس کا چہرہ اور جسم صحت مندی کی جانب مائل تھا۔ رخساروں پر سرخی اور آنکھوں میں روشنی بڑھنے لگی تھی اس کا لباس بدل گیا تھا۔ اور اس کی بیوی جسے بڑھی شیو کہہ کر خود کو تسلی دیا کرتی تھی۔ وہ خوش گمانی اب باقاعدہ ریش کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پھر یہ سب ہوا۔۔۔ کیسے؟ اس کی نظریں موسیٰ کی تازہ تصویر پر جمی تھیں۔

باہر لندن کی ایک سرد رات اپنے جوبن پر تھی۔

✵ ✵ ✵

موسیٰ بستر پر نہیں تھا۔ حسنل نے ٹھنڈی سانس بھری۔ یہ تو جیسے اب ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ ٹیرس پر ہو گا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ تو پھر کہاں۔۔۔ وہ بنا دوپٹے کے ننگے پیر اسی تلاش میں کمرے سے باہر نکلی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے فکر ہونے لگی۔ غیر شعوری طور پر اس کے قدم اس کے اسٹوڈیو کی جانب اٹھ گئے۔ وہ بری طرح ٹھٹھکی۔۔۔ روشنی کی ایک لکیر نیم وا دروازے سے رہنمائی کر رہی تھی۔ موسیٰ اسٹوڈیو میں۔

وہ تو جیسے اپنے گھر کے اس سب سے اہم حصے کو بھول چکا تھا۔ وہ حصہ جہاں وہ سب سے زیادہ وقت گزارتا تھا۔

وہ خوش گمانیوں میں گھری گربہ پائی سے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں ان گنت بلب تھے۔ مگر اس وقت ایک کے سوا سب بند تھے۔ اور وہ ایک بھی وہ جو بالخصوص موسیٰ کے سر پر روشن تھا۔ اور موسیٰ۔۔۔

وہ کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا یا پتا نہیں لیٹا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے دونوں پیروں سے گھسیٹ کر گرنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ ٹانگوں کی قینچی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے پیٹ پر کھڑی کتاب کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ مطالعے میں ایسے مگن تھا کہ اسے حسنل کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔ کتاب کا سرورق اندھیرے میں تھا۔ مگر ذرا سی دقت کے بعد حسنل نے پڑھ لیا۔

اسٹوڈیو۔۔۔ جہاں چار جانب موسیقی کے آلات سجے تھے۔ وہاں بیٹھ کر حدیث کی کتاب کا مطالعہ۔۔۔؟

"موسیٰ۔۔۔" اس کے لب بلا ارادہ کھلے تھے۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر آئی۔

موسیٰ نے چونک کر سر اٹھایا۔ استعجاب نے حسنل کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔ موسیٰ نے کتاب سائیڈ پر رکھ دی اور انداز نشست تبدیل کیے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی سمت جھکانا چاہا۔ اس کا انداز بہت پرسکون تھا۔

اس کے لبوں پر مسکان تھی۔ مگر یہ کیا۔ حسنل الٹے قدموں پیچھے ہوئی۔ موسیٰ کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ موسیٰ نے شدید حیرت سے اپنے خالی ہاتھ کو اور پھر اسے دیکھا۔ جس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بنا نفی میں سرہلاتے ہوئے اندازے سے بازو لمبا کر کے کرسی گھسیٹ لی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ موسیٰ کو اب اپنا انداز نشست تبدیل کرنا پڑا۔

"اب وقت آگیا ہے موسیٰ کہ ہمیں صاف صاف بات کر لینی چاہیے۔" اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ موسیٰ چوکنا ہو گیا۔

"کون سی بات۔۔۔"

"یہی۔۔۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے موسیٰ کے سر سے پیر تک کا اشارہ کیا۔

"اور یہ سب۔۔۔" اس نے دیکھے بغیر حدیث کی کتاب کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ "کب تک چلے گا موسیٰ۔۔۔؟"

موسیٰ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اوہ تو وہ اس بارے میں بات کر رہی تھی۔

"چلنے کا مطلب ہنی۔۔۔ یہ سب تو ابھی شروع ہوا ہے۔"

حسنل بھونچکا رہ گئی۔ اس نے اپنے تئیں دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر موسیٰ کے جواب نے واقعی بات ختم کر دی۔ حسنل گنگ رہ گئی۔ پھر اس نے پینترا بدلا۔

"آپ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلیں موسیٰ!"

"میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے ہنی۔۔۔!" وہ اسے اپنا ہم خیال دیکھ کر بہت خوش ہو گیا۔

"اوکے۔۔۔ تو پھر آپ نے دنیا کو کیوں چھوڑ رکھا ہے۔" حسنل نے اسٹوڈیو کو دیکھا۔ موسیٰ نے اس کی تقلید کی۔

اس کا متبسم پر سکون چہرہ سیاہی مائل ہو گیا۔ "یہ دھوکا ہے ہنی۔۔۔ جو میں اب تک کھاتا رہا۔"

"دھوکا یہ نہیں' وہ ہے جو اب آپ کھانے لگے ہیں۔" وہ پل بھر کو لاجواب ہونے کے بعد چلائی تھی۔ "نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔۔۔ دنیا آپ کو جینے نہیں دے گی۔" وہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔

"زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے ہنی!" وہ پژمردہ ہو گیا۔

حسنل نے حلق تر کیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کے جملے پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی جس طرح اس نے انگشت شہادت چھت کی طرف بلند کر کے اللہ کہا تھا۔ ایسے تو دروازے پر آئے فقیر کرتے ہیں۔ بڈھے بابے کرتے ہیں (حسنل کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا شاید۔۔۔ ایسے توکل کا اظہار تو اللہ والے کرتے ہیں۔)

"تو اب آپ کیا کریں گے۔۔۔ ایسے گزاریں گے زندگی؟" اس نے ایک بار پھر اس کے سراپے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی خود کو پر سکون رہنے کی زبردست تلقین کی تھی۔

(آرام سے حسنل۔۔۔ بہت آرام سے۔۔۔ شتابی کام بگاڑ دیتی ہے۔ دھیرج دھیرج)

"صاف بات یہ ہے موسیٰ کہ آپ اعتدال کا راستہ اپنائیں۔ ایکسٹریم ازم کی طرف مت جائیں۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ سب چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں جا کر بیٹھ جائیں اور صحیح وہ بھی نہیں تھا کہ آپ کو دین کی کچھ خبر نہیں تھی۔ آپ کو چاہیے تھا۔۔۔"

"تو تم نے مجھے تب کیوں نہیں بتایا ہنی کہ میں غلط راستے پر ہوں۔ تم تو سب جانتی تھیں ناں۔۔۔ میں تو تمہاری ہر بات سنتا ہوں۔۔۔ مانتا بھی ہوں۔" وہ پھٹ پڑا۔

وہ اسے مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ حسنل کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وہ اسے جھنجھوڑ دینا چاہتا تھا۔ حسنل نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔ موسیٰ کی وحشت نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

"مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اپنے لیے آگ جمع کر رہا ہوں۔ تم نے بھی نہیں۔"

موسیٰ نے دونوں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اسے دھکا دیا۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے ٹکرایا۔ مگر اس کے پاس سسکاری بھرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ نہ حیران ہونے کی۔۔۔ کہ یہ دھکا موسیٰ نے اسے دیا تھا۔

"میں نے تم پر آنکھ بند کر کے یقین کیا۔ خود سے زیادہ تم پر بھروسا کیا اور تم خود کتنی نیک ہو۔۔۔ تم نے مجھے کبھی نیک بننے کا نہیں کہا کیوں؟ ہنی کیوں۔۔۔ تم کہتیں تو۔۔۔ میں تو تمہاری ہر بات مانتا تھا ناں۔" وہ پھٹ پڑا۔

وہ تو بس موسیٰ کو سن رہی تھی یا دیکھ رہی تھی۔ جو رو رہا تھا۔

"مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا۔ مام نے بھی نہیں۔ اور ڈیڈ نے ہمیشہ آدھی بات بتائی اور گرینڈ پا کہتے تھے۔ اچھی عورت ضروری ہے۔

اچھی عورت ہمیشہ تو ساتھ نہیں ہوتی۔ اچھی

عورت قبر میں بھی ساتھ نہیں جاتی۔ انسان کو خود اچھا ہونا ہوتا ہے۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

☆ ☆ ☆

تو یہ زندگی کا سب سے مشکل وقت تھا۔ جب کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ اس نے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

"چلو شکر ایک نقطے پر تو پہنچی۔ لیکن ایسا بھی کیا حسنل!" اس نے ناصحانہ انداز سے خود کو پکارا ہر مشکل کا ایک حل ہوتا ہے اور ہار ماننا تو تمہاری فطرت ہی نہیں۔ مگر مگر کس طرح۔؟

وہ جن دوستوں سے مشورہ مانگنے جاتی۔ وہ سب اسی پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔

"ایسا کرو ویکشنز پر چلے جاؤ تم لوگ۔ تھائی لینڈ، ماریشس۔" شہرزاد نے دل پر جبر کر کے مشورہ دیا۔

"ہنہ، موسیٰ کی مصروفیات اجازت نہیں دیتیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"کہنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے میری جان۔" شہرزاد نے آنکھ دبائی۔ حسنل کی بے زاری حد سے سوا ہو گئی۔ سب طریقے بے کار گئے تھے۔

"ڈاکٹر سے بات کرتیں، اس کے پاس ضرور کوئی حل ہوگا۔" شہرزاد آگے کو جھک آئی۔

"کیا بات کروں شہر!" وہ بھڑک گئی۔ "کیا کہوں ڈاکٹر سے کہ میرا میاں مسجد نہ جائے۔ وہ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دے گا۔ لوگ پتھر ماریں گے مجھے۔" اس نے اپنا سر تھام لیا۔ "صاف بات کہہ نہیں سکتی۔ گھما پھرا کر مطلب واضح نہیں ہوتا۔ مجھے انجام بہت خراب لگ رہا ہے۔"

"تم کہو تو میں بات کروں۔"

"میں کیوں کہوں شہر۔ آپ کو خود فکر نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ آپ اس کی دوست ہیں۔" اس نے شکوہ جڑ دیا۔

شہرزاد نے کمر کرسی کی پشت سے چپکالی، وہ گہری نگاہ سے حسنل کو تک رہی تھی۔ جیسے اسے اندر تک پڑھ لینا چاہتی ہو۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "میں بات کروں گی۔ بلکہ میں ہی کیوں۔ ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔ کم از کم اسے یہی سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ جو دل چاہے کرے مگر اپنے کام کو اگنور نہ کرے۔ ایک بار اس کا دھیان اس طرف ہو گیا ناں تو باقی کام یوں ہو گا یوں۔" شہرزاد نے دونوں انگلیوں سے چٹکیاں بجائیں۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" حسنل کی سرسراتی آواز ابھری۔

"شاید نہیں یقیناً "مائی ڈیئر۔!"

"ان شاء اللہ بولیں۔" وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ بہت یقین سے اصلاح کی شہرزاد نے بڑے جذب سے ان شاء اللہ کو دہرا دیا۔

"میں آج ہی سب سے ملتی ہوں۔" شہرزاد نے کمر کس لی۔

☆ ☆ ☆

سب ارادے ملیامیٹ ہو گئے۔ شہرزاد اور ہنی کی ہدایات گھول کر پی گئے۔ وہ سب اپنے طور پر بھی بہت سے جملے اور مثالیں سجا کر موسیٰ کے پاس تشریف لے آئے۔ ایک بار۔ بس ایک بار موسیٰ ٹریک پر چڑھ جاتا پھر اسے کیسے چلانا اور بھگانا تھا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"مگر۔ اف۔!" موسیٰ نے سب کی باتیں تحمل سے سنیں۔ اس نے ان سب۔ کے لیے بہترین ریفریشمنٹ کا انتظام کرنے کو بھی کہہ دیا، مگر یہ کیا۔ موسیٰ نے سب کچھ سننے کے بعد ایسی بات کر دی جو کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھی۔

اس نے سب کو برائی کی راہ سے ہٹنے کی تادیب کرتے ہوئے تبلیغ شروع کر دی تھی کہ اب تک کی زندگی میں جو کچھ ہوا۔ اسے معافی کے یقین پر چھوڑتے ہوئے وہ آئندہ کے لیے تائب ہو جائیں تو اسی میں فلاح ہے۔ اسی میں۔

سب بھونچکا رہ گئے۔ ایسا لگتا تھا، وہ اس زبان سے

نابلد ہیں جو موسیٰ بول رہا تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔۔ ان سب کے سر جھک گئے اور قدم زمین سے جکڑے گئے۔ موسیٰ کی سمت دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہی اور کہاں وہ موسیٰ کی اصلاح کی کوشش کرنے کا مصمم ارادہ باندھ کر آئے تھے اور اب ایک دوسرے کو بھی نہ دیکھ پاتے تھے۔ یہاں سے اٹھیں کیسے۔۔

تو اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ موسیٰ ان سب کے بیچ سے نکل گیا تھا۔ مذہبی معاملہ تھا۔ دنیا قیاس آرائی کرتے بھی ڈرتی۔ کھل کر رائے کا اظہار نجی محافل میں تو کیا مشکل لگتا۔ تنہا بیٹھ کر غور کرنے پر بھی رائے بنانے میں ڈر لگ جاتا۔

کوئی ایسی بات ہی سوچ نہ لی جائے۔ جو اللہ کو بری لگے۔

ہاں ایک بات بڑے وثوق سے کہی جاتی۔ شروع شروع میں وہ سب جو مائل ہوتے ہیں۔ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، مگر پھر دھیرے دھیرے وہ واپسی کی جانب آجاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی راستہ بچاتے ہیں۔

موسیٰ خود بھلے پیچھے ہٹ گیا تھا، مگر اس کا پروڈکشن ہاؤس ہنوز کام کر رہا تھا۔ نمبرون کی پوزیشن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس نے حسنل سے کہا کہ "وہ سب چیزوں کو دیکھے۔ بالکل ویسے جیسے وہ پہلے دیکھتی رہی ہے۔ وہ اسے تو منع نہیں کر رہا۔ وہ اپنی تمام سرگرمیاں جاری رکھے۔"

حسنل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی ذہنی کیفیت پراگندگی کا شکار تھی۔ یہ کیا اتنا آسان اور سرسری تھا جتنا کہ موسیٰ نے کہا تھا۔

ملا کی دوڑ مسجد تک۔۔ دکھڑے رونے کے لیے شہرزاد کے گھر پہنچ گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ڈیئر۔ اس نے تمہیں تو نہیں روکا۔"

شہرزاد اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔ خوب صورت مگ میں جھاگ دار کافی کی خوشبو۔ حسنل گہری سوچوں سے جھٹکا لے کر بیدار ہوئی، ایک بے بس سی سانس بھر کے مگ تھام لیا۔

"آپ کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ شہر۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ میرا تماشا بن جائے گا۔"

"تماشا!" شہرزاد نے گھونٹ بھرا۔ "کیسا تماشا؟" اسے سخت تجسس ہونے لگا۔

حسنل نے چند ساعت ٹھہر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنا موبائل اٹھالیا۔ وہ بہت عجلت سے کچھ نکال رہی تھی۔ شہرزاد اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پہلو سے آلگی۔

"یہ دیکھیے۔" اس نے سر اٹھا کر موبائل کو اس کے سامنے کر دیا۔ شہرزاد نے دیکھا پھر حسنل کی صورت۔۔ ان سب پکچرز میں دیکھنے کو کیا تھا بھلا۔۔

موسیٰ کی تازہ سرگرمیاں۔۔ شلوار کرتا۔۔ سر پر جالی دار ٹوپی۔۔ کھلے ٹخنے۔۔ ہاں اس کی شیو اب داڑھی لگنے لگی تھی۔ شہرزاد کو وہ اجنبی محسوس ہوا، مگر اگلے ہی پل اس نے دل سے تسلیم کیا۔ وہ بے پناہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کا گورا رنگ اور سنہری آنکھوں میں جیسے ستاروں کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ ساتھ ہی ایک سکون اور عزم۔۔ وہی مقابل کو بغور دیکھنا اور بغور سننا۔ شہرزاد کا دل ہمکنے لگا۔ اس حلیے نے اس کے سحر کو کم کرنے کے بجائے بڑھا دیا تھا۔ وہ حسنل کو فراموش کر گئی۔ جو منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

شہرزاد نے کسی معمول کے سے انداز میں کافی کا مگ رکھ دیا اور موبائل اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب اس کی انگلی سرک رہی تھی۔ پھر ٹھہر سی گئی۔ وہ بھول گئی۔ وہ تنہا نہیں ہے۔ اصل دعوے دار، حق دار بلکہ مالک۔۔ بھی سامنے ہے۔ بس اپنا دل یاد رہا تھا جو مچل رہا تھا۔ اپنی آنکھیں جو سیر نہ ہوتی تھیں تو اتنے سالوں میں صرف وقت گزرا۔ دل وہیں کا وہیں رہا شہرزاد!

شہرزاد جیسے حاضر نہیں تھی۔ بے خیالی میں انگلی چھو گئی۔ پیج دوبارہ سے اسٹارٹ ہو گیا۔ خواب اور خواہشیں دم توڑ گئیں۔ حقیقت سامنے تھی اور بہت

سخت پر سوچ تاثرات کے ساتھ کافی کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا ہنی۔!" شہرزاد کا انداز معذرت خواہانہ تھا اور شگفتگی کو چھپانے کی کوشش بہت مشکل لگ رہی تھی۔ "تمہارا تماشا کیونکر بن جائے گا۔"

حسنل نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسے حیرت اور افسوس نے آن گھیرا۔

"آپ کی سمجھ میں واقعی نہیں آیا۔ ادھر دیں مجھے۔" کچھ جارحانہ گرفت سے اس نے موبائل لیا تھا۔ وہ بہت تیز تیز انگلی چلا رہی تھی۔

پھر اس نے موبائل شہرزاد کے ہاتھ میں دے دیا۔ شہرزاد نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ تو ہنی کی اپنی پکچرز تھیں بلکہ یہ دو روز پہلے ہونے والے ایک ایوارڈ شو کی جھلکیاں تھیں۔ ایک تصویر میں تو شہرزاد بھی ہنی کے ہمراہ کھڑی تھی۔

شہرزاد بھی وہاں موجود تھی پھر دکھانے کا کیا مقصد۔؟ حسنل نے جیسے اس سوال کو بھانپ لیا۔ وہ آگے کو جھک آئی۔ وہ اب شہرزاد کے ہاتھ میں موجود موبائل پر تیزی سے انگلیاں سرکا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی ہر ایک تصویر پر انگلی رکھنی شروع کردی۔

"دیکھیں مجھے غور سے۔"

شہرزاد نے دیکھنا شروع کردیا۔ تمام تصاویر میں حسنل کا حسن بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا اس پر لباس و انداز۔ ایسے ہی تو اسے ایشیا کی دس خوب صورت خواتین میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بلا کی جامہ زیب نہیں کہا گیا تھا۔ ایک سے بڑھ ایک ماڈرن کٹ کے لباس، سر پر دوپٹے کے ہمراہ سلیولیس شارٹ [illegible] کرتی اور سگریٹ پینٹ اور کٹ ٹراؤزر اور بیل باٹم۔ جو کپی کی طرح نیچے سے پھیلے اور رانوں سے ایسے چپکے تھے جیسے گوند سے جوڑ دیے گئے ہوں۔

ہنی کی تصاویر چلتے چلتے موسیٰ کی نئی تصویر آگئی۔ شہرزاد چونکی۔

"بتایئے تماشا لگے گا یا نہیں۔ یہ میاں ہے۔" اس نے موسیٰ کی تصویر کو زوم کردیا۔

اور اپنی ایک تازہ تصویر۔ وہی ایوارڈ والی۔ کاسنی سلک میں سلور کی چمک تھی۔ اس نے فل سلیوز بلاؤز کے ساتھ ساڑھی زیب تن کررکھی تھی۔ آٹھ گز سے زائد کا کپڑا گردن سے ایڑی تک لپٹا ہوا تھا، مگر خدوخال کی ایسی وضاحت تھی کہ برہنگی بھی شرما جائے۔ اس کا کلچ اور راج ہنس جیسی گردن میں ٹکا نیکلس۔ اسے اس کے لباس و انداز کے سبب اس شام لیڈی آف ایوننگ قرار دیا گیا تھا۔

"بیوی یہ ہے۔" اس نے "یہ" پر زور دیا۔ "اور میاں یہ۔"

اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ شہرزاد کو ساری پریشانی سمجھ میں آگئی۔ ہاں یہ تو بالکل ٹھیک سوچ رہی تھی ہنی۔ دنیا تو باتیں بنا بنا کر جینا حرام کردے گی۔

وہ دونوں الگ راہوں کے مسافر لگ رہے تھے۔

ایک وہ تصویر تھی جس میں موسیٰ سیاہ سوٹ میں تھا اور ہنی نے سیاہ جالی کا ٹیل گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ موسیٰ کی کہنی میں پھنسا ہوا تھا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ بہت خوب صورت تصویر اور کہاں آج کی دونوں کی الگ الگ تصاویر۔ دو متضاد شخصیات۔ ایک دوسرے کا صریحا "الٹ۔" ہاں ہنی کی پریشانی شہرزاد کی سمجھ میں آنے لگی تھی اور یہ ایسا معاملہ تھا جو سلجھنے کے بجائے دن بدن الجھتا ہی جاتا۔

دنیا نے سوال اٹھانا تھا اور پھر وہ مذاق اڑتا اور مزید سوال اٹھتے جن کے جواب فی الوقت ہنی کے پاس نہیں تھے اور موسیٰ کو یقینا "پروا نہیں تھی۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئیں۔ حسنل نے صوفے کے اوپر پاؤں رکھ لیے تھے۔ وہ اپنی قمیص کے دامن پر لگے بالز کو گھما رہی تھی۔ ابھی تو آدھا مسئلہ ہی بتایا تھا۔ یہ بتانے کے لیے الفاظ نہ ملے کہ اسے لگتا ہے۔ اس کے کمرے میں اس کے ساتھ۔ اسے لگتا ہے موسیٰ نہیں کوئی اور نیا شخص رہنے لگا

ہے۔

اور۔۔۔ اور یہ کہ اسے اس چیز سے سخت گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔

اور وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی۔

کیا وہ خود بھی کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرے؟

بہت مشکل وقت تھا یہ حسن المآب کی زندگی میں۔۔۔ ایک طرف دنیا سے خوف آرہا تھا

اور ایک طرف۔۔۔ ایک طرف اپنے آپ سے۔

☆ ☆ ☆

"لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں نہیں کر سکوں گا۔ سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔" موسیٰ نے پوچھا۔

عبدالمبین مسکرایا۔ "ناکام ہو جانے والے لوگ ناکامی ہی کی پیشن گوئی کر سکتے ہیں۔ آپ توجہ مت دیا کریں۔"

"لوگ ناکام کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"تھک جاتے ہیں۔"

"تو اللہ نے اسے مشکل کیوں بنایا؟"

مشکل بنایا نہیں ہے' بس لگتا ایسے ہے۔ بنیادی طور پر تابعدار ہونا چاہیے۔ پھر فرماں برداری مشکل نہیں رہتی۔ ساری بات اللہ کو تسلیم کرنے کی ہے۔"

"میں تو کرتا ہوں۔" اس کے سوال بچے کے سے تھے۔ اس نے اسی انداز میں اپنی کار کردگی بتائی۔

"تو بس آگے کی منزل آسان ہے۔"

"میں لوگوں کی باتوں سے ڈس ہارٹ ہونے لگتا ہوں کبھی کبھی۔۔۔ میرے پاس دوست نہیں رہے۔" اس نے اصل بات اب بتائی۔۔۔ نہ جانے کیا ہوا تھا۔ جو وہ آج سر جھکائے ایسے باتیں کر رہا تھا۔ "وہ سب مجھے دیکھ کر راستہ بدلنے لگے ہیں۔ میری موجودگی سے خائف ہونے لگے ہیں۔ میرا کوئی دوست نہیں رہا۔ مجھے لگتا ہے میں اکیلا ہو گیا ہوں۔"

عبدالمبین کو اس پر ترس آیا۔ پھر پیار آیا۔

"اللہ سے بڑھ کر رفیق اور کوئی نہیں۔ وہ کبھی بندے سے منہ نہیں موڑتا۔ کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے سر اٹھایا۔ "وہ میرے ساتھ صحرا میں بھی تھا۔ لیکن میرے دوست۔۔۔ چند نے مجھے ٹوک دیا۔ خدا کے لیے اب وعظ نہ شروع کر دینا۔ حالانکہ میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔" اس کا حلق نمکین ہو گیا۔

"آپ وہ کتابیں نہیں پڑھ رہے۔ جو میں نے آپ کو دی تھیں؟"

"کون سی کتابیں؟" اسے فوراً" یاد نہ آسکا۔

"سب۔۔۔ خاص طور پر وہ دین کی راہ میں آنے والی صعوبتیں۔۔۔ ذہنی جسمانی اور روحانی تکالیف۔۔۔"

"اتنی ساری تکلیفیں؟"

"ہاں۔۔۔ حضرت بلال حبشی کا واقعہ۔۔۔ جب ان کے برہنہ جسم کو تپتی ریت پر ڈال دیتے تھے۔ اور ذہنی۔۔۔ جب کافر بڑھیا راستے میں کچرا ڈال دیتی ہے۔

اور روحانی۔۔۔ جب۔۔۔ آپ کو اپنا گھربار' شہر' دوست احباب یہاں تک کہ رشتوں کو فراموش کرنا پڑ جائے۔"

"رشتوں کو۔۔۔" اس نے عبدالمبین کو دیکھا۔

"ہاں رشتے۔ بھری پڑی ہے تاریخ مثالوں سے۔ باپ کافر رہا اور بیٹے نے دین اپنا لیا۔ رشتہ تو برقرار رہا' مگر ربط نہ رہا۔ بہن نے دین مان لیا بھائی نہ مانا۔"

"تو کیا مجھے بھی رشتوں کو چھوڑنا پڑے گا۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں تیزی سے سوال کیا تھا اور ایسے کہ وہ جواب میں صرف انکار سننا چاہتا ہے۔

عبدالمبین نے اپنا ہاتھ اس کے زانو پر رکھ دیا۔ یہ جیسے صبر کی تلقین تھی۔ باہمت رہنے کا اشارہ۔۔۔ پر موسیٰ کا دل لرز گیا۔ اس کے دھیان کی سوئی اٹک گئی تھی۔

"کس کو بھلا۔۔۔؟ اور کیوں۔۔۔ اللہ نہ کرے۔"

اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سوالات کیے تھے۔ بہت افسردہ تھا وہ۔

سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ موسیٰ کو رشتے بہت

پیارے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے بچپن سے اپنے کام سے کام رکھنے کی تربیت دی گئی اور تلقین کی گئی اور پھر یہ میری عادت بن گئی ہے! لیکن انسان کو اپنے گرد و پیش سے ایسا بھی بے بہرہ نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ نہ جانے کیا کہنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا۔ حسنل کی سوئی۔۔۔ گرد و پیش۔۔۔ بے بہرہ اور تلقین جیسے الفاظ پر اٹک گئی۔ موسیٰ کی اردو ہمیشہ سے بہت اچھی تھی۔ مگر اب جس سنگت میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس نے بہت سے نئے الفاظ سیکھ لیے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ انہیں درست آہنگ سے بولتا تھا۔ حلق سے ق۔۔۔ دانتوں میں دبا کر۔۔۔ ڈنڈے والے ک اور قلم والے کا فرق بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔

حسنل کو وحشت ہونے لگی۔ وہ ایسے لب و لہجے سے چڑتی تھی ہمیشہ سے۔

"اب کون سی غلطی پکڑلی آپ نے اپنی۔" اسے کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"پتا نہیں کب تک پکڑتا رہوں گا۔" وہ خود سے مایوس تھا۔

"اس وقت کیا کہنا ہے آپ کو؟" اسے بالکل بھی سننے کی چاہ نہیں تھی۔ مگر وہ سنائے بنا رہنے والا لگ نہیں رہا تھا۔ بلکہ آج تو زیادہ افسردہ دکھائی دیتا تھا۔

"اتنے سال کا ساتھ ہے ہمارا۔۔۔ میں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔ تم اپنے گھر والوں سے بہت کم ملتی ہو۔ تم بھی کم جاتی ہو اور وہ تو شاید دو چار بار آئے ہوں گے۔ شروع میں پھر بھی۔۔۔ گرینڈ ماں کی ڈیتھ پر یا گرینڈ پا کے فالج پر۔۔۔ وہ بھی صرف تمہاری بدر۔۔۔ حالانکہ تمہارے نانا اور میرے دادا تو بیسٹ فرینڈ تھے نا۔۔۔ ہاں عبدالمعین کی سزا آئی ہے۔۔۔ وہ بھی تمہاری فرینڈ ہونے کی وجہ سے، ہے نا؟"

حسنل کو اس سوال کی توقع کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"انہیں مجھ جیسے داماد سے ملتے ہوئے شرم آتی ہوگی نا۔ وہ سب اتنے اچھے نیک لوگ اور میں اتنا برا۔۔۔ گناہ گار۔۔۔ وہ کیا کہہ کر تعارف کرواتے کہ یہ ہے ہمارا داماد۔۔۔ تم بھی میری وجہ سے ان سے نظریں ملانے سے گئیں۔ تمہیں ان سب کو چھوڑنا پڑا۔۔۔ میری وجہ سے۔۔۔ میں ان سب لوگوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں تھا نا۔۔۔ تم نے سب سہا اور کبھی کہا نہیں۔"

موسیٰ نے جو مفروضہ قائم کیا تھا۔ اسی کے تناظر میں وہ بولتا چلا گیا۔

"میری وجہ سے تم اپنے خاندان سے کٹ گئیں۔"

ہاں موسیٰ کی اور بالخصوص اس کی سرگرمیاں ایسی ہی تھیں اور موسیٰ کے آدھے قیافے درست تھے۔

حسنل نے سر جھکا لیا۔ ہاں، وہ سب ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔ تو خود حسنل کون سا ان سے ملنے کی تڑپ میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔

نہیں تو نا سہی۔ اسے موسیٰ کے بعد کسی کی چاہ نہیں تھی۔ مگر اب یہ سب موسیٰ سے کیوں کہتی، جس کا صدمہ کم نہ ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب کی ستائش اور "واو پر" وہ بلش کر گئی۔

"کیا میں آپ کو جانتا ہوں لیڈی؟" جیک اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"نہیں۔۔۔" وہ کلچ سنبھالتی کرسی پر بیٹھ کر اجنبی ہو گئی۔

جیک تیزی سے گھوم کر سامنے آیا اور کرسی عین سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر میں آپ کو جاننا چاہوں گا۔"

"میں ضروری نہیں سمجھتی۔" اس نے بھاری دوپٹے کو کہنی پر ٹھہرانے کی کوشش جاری رکھی۔

"مگر میں سمجھتا ہوں۔" اس نے کہنی میز پر ٹکائی اور گال ہاتھ پر ٹکا کر آگے کو جھکا۔

وہ بے ساختہ پیچھے ہٹی۔ جیک نے قہقہہ لگایا۔

"تم واقعی مغل شہزادی لگ رہی ہو۔"
"لیکن میں تمہیں پرنس آف ویلز نہیں کہوں گی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔
وہ لاجواب ہوگیا۔ اسے گھورنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خائف ہونے لگی۔
"ویسے تمہیں اتنا اچھا لگنے کی کیا ضرورت تھی۔"
"منہ دھو آؤں۔" وہ اٹھنے لگی۔
"ارے رے۔" جیک نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔
"ویسے یہ جو تم نے پہنا ہے' اسے کیا کہتے ہیں؟" وہ اس کے سرخ و سنہری لباس کو بغور دیکھ رہا تھا۔
"اسے غرارہ کہتے ہیں۔"
"غر۔۔۔ را۔۔۔ راہ۔" اس نے اٹک کر کہا۔ اس نے تصحیح کا ارادہ فضول سمجھا اور ہنس پڑی۔ صرف وہی نہیں' سب ہی نے تیاریوں میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔
آفس کولیگ مسز جسونت کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں سارا آفس مدعو تھا۔
انہوں نے سب کو خصوصی ہدایت کی تھی۔
"خبردار' جو کوئی بھی پتلون شلوار پاکے آیا۔ میری کڑی کا ویاہ ہے۔ کوئی عام بات نہیں۔ سارے لوکاں نے اپنے اپنے ویاہ والے کپڑے پاکے آنا ہے۔"
اس نے اس ہدایت کو قطعاً" سیریس نہیں لیا اور ڈھولکی میں اپنے آفس روٹین کا ایک سوٹ چڑھا گئی۔ ہاں رنگ زرد تھا۔
مسز جسونت نے تو اسے دیکھتے ہی سخت ناراض منہ بنایا۔ ساتھ کٹی کا اشارہ کرتے رخ پھیر لیا۔ وہ انہیں منانے کا ارادہ چھوڑ کر ایسا کونا ڈھونڈ کر بیٹھ گئی جہاں اسے کوئی نہ دیکھے۔ کیونکہ سب نے مسز جسونت کی ہدایت یا فرمائش کو بہت سیریس لیا تھا۔
ڈھولکی نہ ہوئی' دنیا بھر کے روایتی ملبوسات کا میلہ لگ گیا تھا۔ وہ واقعی آکورڈ لگ رہی تھی۔ اس کا خود کا دل برا ہونے لگا۔
"تاہم تو موقع ڈھونڈتے ہیں۔ شلوار قمیص پہننے کا۔ تیرا دل نہیں کیا۔"
"میرے پاس نہیں تھے کپڑے۔" اس نے کسی قدر رنج کہا۔
"ہاہ! ہائے۔" انہوں نے منہ پھاڑ کر اسے دیکھا۔
"تو خرید لینے تھے۔۔۔ بلکہ۔۔۔" وہ رازدارانہ انداز سے اس کے کان میں گھسیں۔ "کسی سے مانگ لینے تھے۔ بھئی اپنے دیس سے دور بیٹھے ہیں۔ مجبوری ہے۔ سچ بتاؤں تو مسز جسونت نے جو شیروانی پہنی ہے' وہ بھی مانگے کی ہے۔ ہاہاہا۔"
"ہاں۔۔۔" اس کے منہ سے یہ ہی نکل سکا۔ سو مہندی کی تقریب کی شرمساری کو مٹانے اور کچھ اتنے عرصے بعد رونق والی شادی اٹینڈ کرنے کا جوش اسے بھی محسوس ہونے لگا۔
دو تقریبات ابھی باقی تھیں۔ مہندی اور شادی۔۔۔ وقت کم تھا۔ اس نے مسز جسونت والے آئیڈیے پر جیسے جیسے غور کیا' بڑا قابل عمل لگنے لگا۔ اپنی بھابھی کو کال ملائی۔ وہ ایسی فرمائش سن کر حیرت میں گھر گئیں۔ اپنا ولیمہ کا غرارہ بھیج دیا۔
"ہائے۔۔۔" وہ الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پہنے بنا چارہ نہ تھا۔ اس نے شادی کے لیے جو سوٹ تیار کروایا تھا' وہ کل ملنا تھا۔
"ٹھیک ہے پھر۔"
اور اب جیک۔۔۔ اس نے آنکھ سے باہر نکلتا آئی لائنر لگایا تھا۔ گھنی پلکوں کو مسکارے نے اور بوجھل کر دیا تھا۔ جیک کی نظر ہٹتی نہ تھی۔
ہر شخص نے اسے اس کی میز پر آکر سراہا تھا۔ ایک آدھ نے تو یہاں تک کہہ دیا' اسے ایسے ہی لباس پہننے چاہئیں۔
"اچھا۔۔۔" اس نے تھوک نگلا۔ "غرارہ پہن کر شو کرتی۔"
وہ کھانا نکال رہی تھی۔ جب جیک اس کے پیچھے چلا آیا۔ اس نے سائڈ پر ہو کر اسے راستہ دیا کہ وہ بھی کھانا نکال لے' مگر وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا۔۔۔ اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔
"میں بہت سنجیدگی سے تمہیں پروپوز کرنے کے

بارے میں سوچ رہا ہوں۔" "نہیں بہت سنجیدگی سے تمہاری جان لینے۔" اس نے چمچے کو خنجر کی طرح دکھایا۔ مگر پھر ٹھٹک گئی۔ مذاق' مذاق میں جیک کی طرف سے ایسے جملے ہو ہی جاتے تھے۔ مگر اس بار اس کے چہرے پر ٹکی اس کی نیلی آنکھوں میں کچھ اور ہی جذبے مچل رہے تھے۔ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

"بلکہ مجھے خود پر حیرت ہے' میں نے یہ کام اب تک کیوں نہیں کیا؟" وہ متاسف تھا۔

اس نے سر جھٹکا اور اپنا پیر اس کے پیر پر رکھ کر مسل سا دیا۔

"اور مجھے حیرت ہے میں نے تمہیں اب تک زندہ کیسے چھوڑا ہوا ہے۔"

جیک جواب دینے والا تھا۔ مگر ٹیبل کے گرد بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ بھی کھانا نکالنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی تقریب میں بھی جیک کی نظریں مسلسل اس کے تعاقب میں رہیں۔ وہ ذو معنی جملے بھی کہتا رہا۔ مگر کچھ کو وہ حسب معمول ہلکا لیتی رہی۔ کچھ پر اس نے سختی سے ممانعت بھی کر دی۔

روٹین شروع ہونے پر پھر وہی مصروفیت۔ پر اسے توقع نہیں تھی۔ سرخ غرارے میں گھنی پلکوں والی لمبی آنکھیں جیک کے دل میں گڑ گئی ہیں۔ اس نے دوسری بار باقاعدہ پرپوز کرتے ہوئے یہ ہی کہا۔

"نہیں جیک۔ ہم اچھے دوست ہیں۔"

"ہم اچھے لائف پارٹنر بھی ثابت ہوں گے۔" وہ کہاں تک سوچ چکا تھا۔

"یہ فیصلے ایسے اچانک نہیں کیے جاتے۔" وہ فی الوقت ٹو ٹلی۔

"تو پھر کیسے؟ میرے پیرنٹس کو تم جانتی ہو۔ اپنی اپنی لائف میں سیٹل ہیں۔ ممی اپنے ہسبینڈ کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں اور ڈیڈ مانچسٹر میں ہوتے ہیں۔ تم کہو گی تو میں انہیں لے آؤں گا تمہارے پیرنٹس کے پاس' جیسے مشرق میں ہوتا ہے۔" وہ تمام امکانات سوچ کر آیا تھا۔

"اور میں بہت نوبل فیملی سے بی لونگ کرتا ہوں۔" اسے واقعی مشرقی روایات سے خوب آگاہی تھی۔

"وہاں سب سے اہم چیز یہی مانی جاتی ہے نا۔"

"میرے فادر ڈاکٹر تھے اور گرینڈ فادر برٹش آرمی ہیں اور ان کے فادر۔"

"میں سب جانتی ہوں جیک۔ مگر مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"تم کسی اور میں انوالو نہیں ہو۔" وہ یقین سے بولا۔ "ہم اتنے سال سے ساتھ ہیں۔ کوئی ہوتا تو مجھے پتا چل جاتا۔"

"ہاں۔ کوئی نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا تھا یا سسکی بھری تھی۔

"تو پھر کیوں۔ تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟"

اس کی نظریں بے ساختہ اٹھیں۔ سرخ و سفید رنگت' نیلی آنکھیں۔ سنہرے گھنے بال۔ اس میں ناپسند کرنے کو کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے بھی جھلکنے لگا۔ جیک کی ہمت بڑھی۔ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بہت عام بات تھی۔ مگر جیک کے لیے۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر گود میں رکھ لیا اور چپ سادھ لی۔

"اچھا اوکے۔ تم مجھے انکار کی وجہ بتا دو' میں اصرار نہیں کروں گا۔"

اس نے اپنے تئیں مشکل کا حل پیش کیا تھا۔ جان چھوڑ دینے کی آفر گویا۔ مگر وہ تو اور مشکل میں پڑ گئی۔

پر اچھا سا جواب اگر دے دیتی ہے۔ تو کم از کم وہ پیچھے تو ہٹ جائے گا نا۔ اچھا جواب' اچھا جواب ہاں۔ اسے سوجھ ہی گیا۔

"ہمارا مذہب الگ ہے جیک۔" (وہ مارا۔)

"مذہب۔" جیک نے دہرا لیا۔ "تم کب سے ایسی باتیں کرنے لگیں۔ تم تو مذہب کے بجائے انسانیت پر زور دیتی ہو نا؟"

"ہاں وہ۔ تو۔ میں دیتی ہوں۔ مگر مذہب تو ہوتا ہے۔" وہ گڑبڑا گئی۔ جیک کی یادداشت غضب کی

تھی۔

"ہاں ہوتا ہے' مگر ان لوگوں کے لیے۔ جو مذہب پر چلتے ہیں۔ میں نے تمہیں کبھی اسلامک سینٹر جاتے نہیں دیکھا۔ مسجد۔ کہتے ہیں نا وہاں۔۔۔؟" جیک کا انداز الجھن آمیز استعجاب کا مظہر تھا۔

"صفیہ اور حمزہ جاتے ہیں ایوری فرائی ڈے۔" اس نے آفس میں کام کرنے والے دو مسلمانوں کا نام لیا۔

اس نے اسے چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا۔ اسے کوئی راہ بھائی نہ دی۔ وہ یک دم ٹیبل پر ہاتھ مارتی کھڑی ہو گئی۔

"کہہ دیا نا' نہیں کرنی شادی وادی۔ تم کیا میرے باپ لگتے ہو جو مجھے کہو گے۔ میری مرضی' میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ تم ہوتے کون ہو مجھ سے پوچھنے والے۔ چلے جاؤ میرے کمرے سے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر کے دروازہ دکھایا۔ جیک بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر پھر کمرے سے نکل گیا۔ اور وہ کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

✡ ✡ ✡

اس کی فیلڈ کے لوگوں نے کام کے حوالے سے خاموشی اختیار کرلی۔ ڈرمر اور گٹارسٹ ایک مشہور اسٹوڈیو کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ جے کے سالہا سال سے موسیٰ کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی وقت ضائع کیے بنا راستہ الگ کرلیا۔ یہ سب پروفیشنل دوستیاں اور وفاداریاں تھیں۔ کون ہاتھ پر ہاتھ دھر کر موسیٰ کی واپسی کا انتظار کرتا۔ وہ بھی مشکوک واپسی۔ گھر تو سب کو چلانا تھا نا۔ رہا "انقلاب" (البم کا نام) تو وہ ڈبے میں بند ہو گیا۔ یہ ہی "انقلاب" کی ریلیز کی ڈیٹس تھیں۔ "انقلاب" ہی مقررہ تاریخ پر وقوع پذیر ہو گیا تھا۔

موسیٰ گانوں اور دیگر اس طرح کی چیزوں سے دور ہوا تھا۔ تو اس حوالے سے گفتگو بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

پھر لوگوں نے اس کے نئے رجحان پر بھی بات کرکے ریکارڈ توڑ دیے۔ اور اب جب یہ بات کنفرم (مستند) ہو گئی کہ موسیٰ کسی اور راستے کا راہی ہو چکا ہے۔ لوگوں کو نیا موضوع مل گیا۔ پہلے گانوں کے حوالے سے دنیا اس کا پیچھا کرتی تھی۔ اب اس نئے حوالے سے بھی جیسے سب برسات کی چیونٹیاں ہو گئے۔ قطار در قطار۔ بے شمار۔

بہت مشکل راستہ۔ صبر آزما۔ ہر روز ایک نیا چیلنج۔

موسیٰ نے داڑھی میں انگلیاں چلائیں۔ وہ خود کو کس نام سے پکارے یا یہ کہ اپنی کوتاہ بینی کو کیا نام دے۔ وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ سامنے ایک تصویر تھی۔

موسیٰ کی اور ہنی کی۔ ایک جملہ اس کے لیے بھی۔ درج تھا۔ یہ ویسی ہی ایک تصویر تھی۔ جیسی کچھ عرصے پہلے حسن المآب نے شہرزاد کو دکھا کر سمجھایا تھا کہ ان دونوں کو دیکھو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بیوی ایسی اور شوہر ایسا۔ کسی نے اسی تصویر کو جوڑ کر سوال چھوڑ دیا تھا۔

"بیوی کو دیکھیں' کیا کر رہی ہے۔ اور شوہر کو دیکھیں۔"

موسیٰ ریلوے اسٹیشن پر تبلیغی اجتماع کے ساتھ سفر پر جانے کے لیے ریل کے انتظار میں بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس بیگ پڑا تھا۔ جس کی ڈوری کو اس نے سختی سے تھام رکھا تھا اور نظریں دور کہیں پر جمی تھیں۔

دوسری تصویر حسن المآب نہیں ہنی کہنا چاہیے۔ ہنی کی تھی۔ اس کے نام سے ڈیزائن ہونے والے ملبوسات کا ونٹر کلیکشن تھا۔ وہ تمام ماڈلز کے جلو میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اللہ جانے اس کلیکشن کو سرما کے ساتھ کیوں جوڑا گیا تھا۔ مجال ہے جو کسی ایک ماڈل کا بھی کندھا ڈھکا ہو۔ پنڈلیاں ایسے کھلی تھیں۔ جیسے سب تالاب میں اترنے والی ہوں اور سب سے الگ اور خوب صورت لباس میں تھی ہنی۔

وہ ان سب کی نسبت ڈھکی ہوئی تھی۔ مگر موسیٰ کی بیوی کو یہاں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لوگوں کے

کمنٹس کا ڈھیر تھا۔ تاسف' حیرت' استہزا اور جملے۔
یعنی ہنی کا خدشہ مجسم ہو گیا تھا کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔
اور موسیٰ سوچ رہا تھا اس کا اس طرف دھیان ہی نہ گیا۔

عین اسی لمحے حسنل نے بیڈ روم میں قدم رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور قطعیت تھی۔ وہ کرسی پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ جو کہنے آئی تھی' اس نے خود کو اس سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور خود کو یقین دلایا تھا۔ خواہش رکھی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی بھید بھری خاموشی خیالات کے جمع ہونے کی منتظر نہیں تھی۔ درحقیقت وہ یہ فیصلہ نہیں کرپا رہی تھی کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔

دوسری طرف موسیٰ خود کو کوس رہا تھا۔

اسے بتایا گیا تھا' پہلے اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ پھر دوسروں کی۔۔۔ اور ابتدا اپنے گھر سے 'اپنے دوستوں' رشتے داروں سے کی جاتی ہے۔ تب اس نے سوچا۔ وہ کہاں سے شروع کرے۔

بیوی سے۔۔۔ تو اس کے نزدیک بیوی کو تو اصلاح کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ تو پہلے ہی اتنی نیک' پاک باز' دین دار اور پنج وقتہ نمازی تھی اور بیٹی ابھی بہت چھوٹی تھی۔

تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اس کی بیوی ہی کو تو دراصل اصلاح کی ضرورت تھی۔ اسے بھی ابتدا گھر سے کرنی تھی۔ مگر اسے تو پتا ہی نہ تھا۔

اس کی دینی معلومات۔ ابھی ابتدائی مراحل میں تھیں۔ (مولانا صاحب نے کہا تھا۔ اس کا اجتماعات میں موجود ہونا ہی نوجوانوں کو مائل کرنے کا باعث ہو گا۔) لیکن اس نے پڑھا تھا اور سنا تھا۔ عورت کو کیسا ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ ہوا وہ جب خراب عورت کے بارے میں سنتا' اسے اسکارلٹ۔۔۔ اپنی ماں یاد آجاتی تھی۔ ہنی تو کبھی نہیں۔۔۔ ہنی تو اس کے نزدیک ایک مکمل بہترین بیوی' انسان اور مسلمان تھی' مگر یہ سب کیا تھا جو ان تصاویر سے عیاں تھا۔ اور لوگ کہہ رہے تھے۔

موسیٰ کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ بلکہ وہ ہنی سے کہے گا کیا؟

"میں آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں موسیٰ۔" بالآخر وہ بول پڑی۔

"میں بھی۔۔۔" موسیٰ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"پہلے آپ میری سن لیں گے۔" جملہ درخواست گزار سا اور انداز حکمیہ تھا۔

موسیٰ نے چونک کر دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے' میں کسی اجنبی کے ساتھ رہتی ہوں موسیٰ۔"

موسیٰ نے بھنویں سکیڑیں۔ وہ اس بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی جانب متوجہ ہونے کی شعوری کوشش کے باوجود لاشعوری طور پر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

اور پھر اس نے بولنا شروع کر دیا۔ موسیٰ کے ہمراہ زندگی میں اختلافی موضوع کبھی آیا ہی نہیں' وہ ایسے رہی تھی جیسے اٹھان سے ڈھلوان پر اترتا پانی' لگاتار اور بے آواز ہوتا ہے۔

مگر تھی تو وہ وہی حسن المآب نا۔ جو اپنی بات پر اڑ جانے کے بعد دوستوں کے لیے اجنبی ہو جاتی تھی۔ سارا لحاظ' مروت بالائے طاق رکھ دیتی تھی۔ منہ توڑ جواب دینے اور دل توڑ دینے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسے جو کہنا ہوتا تھا' وہ کہہ دیتی تھی۔ اسے الفاظ پر جھجک و مروت کی چادر چڑھانی نہیں آتی تھی۔

یاد ہے نا جب اس نے اپنی ماں' بہنوں سے عبدالمبین کے رشتے کا انکار کیا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ "باپ' بھائیوں کی حد تک تو ٹھیک ہے' مگر شوہر اسے اس کی مرضی کا چاہیے۔"

اور اس نے کہا تھا۔ "چھونے کے خیال سے اسے کراہیت آتی ہے۔"

اور تو اور اس نے صبغہ کو من پسند مرد کی بابت ایسے بتایا تھا جیسے لفظوں سے کھڑا کر دیا۔ بس روح پھونکنے کی دیر تھی اور ان ہی الفاظ کو سن کر مفتی

عبدالرحمٰن جیسے شخص نے فیصلہ کرلیا۔ تو وہی حسن المآب بول رہی تھی۔

اس نے اپنی اذیت کے بارے میں بتایا' جو وہ جھیل رہی تھی۔ اس نے اس موسیٰ سے شادی کے خواب تو نہیں دیکھے تھے۔ اس نے اس موسیٰ کو دعاؤں میں نہیں مانگا تھا۔ اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا اپنی زندگی میں۔۔۔ نہ صبر سے' نہ جبر سے' نہ دھوکے سے۔

موسیٰ ششدر اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ مجھ سے اس بارے میں رائے نہ ہی لیں تو بہتر ہوگا۔" عبدالمبین نے اچٹتی نظر سے موبائل اسکرین کو دیکھا۔ موسیٰ کے لیے یہ خبر نئی تھی۔ اس کے لیے نہیں۔

"تو یعنی آپ جانتے تھے کہ میرا مذاق بن رہا ہے اور آپ نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا۔" اس نے دکھ آمیز جتاتی نگاہ سے عبدالمبین کو دیکھا۔ "آپ سے یہ امید نہ تھی۔

میں کس راستے پر چل رہا ہوں۔ اور لوگ میرے پیٹھ پیچھے کیا' کیا باتیں کر رہے ہیں۔ آخر مجھے چیزوں کا پتا کیوں نہیں چلتا۔" وہ شدید دکھی ہوتے ہوتے خود پر غصہ ہونے لگا۔

عبدالمبین کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیتا۔۔۔ حسنل کی جگہ اور کوئی لڑکی اس کی بیوی ہوتی تو وہ سب سے پہلے اسے اس کی اصلاح کی تعلیم کرتا۔ مگر وہ حسنل کو جانتا تھا۔

"آپ نے صرف مجھے یہ کہنا تھا۔ ایک نظر اپنے گھر کو بھی دیکھ لو۔ بخدا میں نہیں جان سکا کہ میں اتنی بڑی غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا۔"

وہ عبدالمبین کو یقین دلا رہا تھا یا خود کو۔

"خود کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے آپ عملی قدم اٹھائیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" عبدالمبین نے محتاط انداز میں کہا۔

"میں کیا کہوں گا اس سے؟"

عبدالمبین نے پہلو بدلا۔ "آپ کو کیا کہنا چاہیے۔ یہ تو آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔"

"لیکن پھر بھی۔۔۔"

موسیٰ کی واقعی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عبدالمبین نے بہت نپے تلے الفاظ کا استعمال کیا کہ جو موسیٰ کو اپنی بیوی سے کہنے چاہئیں۔

موسیٰ بغور سنتا رہا۔

"اب تو آپ مطمئن ہیں نا اور حسنل بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ آپ کی بات سمجھ جائے گی۔" اتنے عرصے کی ملاقات اور ساتھ میں عبدالمبین نے پہلی بار حسنل کا نام لیا۔

موسیٰ کی آنکھوں میں تشکیک تھی۔

"کیا بات ہے۔ کوئی اور مسئلہ ہے؟" موسیٰ تولتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' پھر اس کے لب ہلے۔

"لیکن ہنی تو کہتی ہے کہ۔۔۔"

اور موسیٰ نے بغیر کسی قطع برید کے حسنل کے کل کے سارے جملے اور خیال دہرادیے' اٹک اٹک کر۔۔۔ جیسے کسی کا جرم بتانا۔۔۔ نتیجے کا خوف۔۔۔

عبدالمبین کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ موسیٰ نارمل حالات میں ہوتا تو یقیناً "یہ سب کسی سے نہ کہتا۔ یا پھر کچھ قطع برید کرلیتا۔ مگر وہ نہ جانے کتنے محاذوں پر نبرد آزما تھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں تھا کہ بیوی کی ایسی باتیں کسی اور سے نہیں کرنی چاہئیں۔

ادھر عبدالمبین کو اتنے سال بعد پتا چلا۔ مفتی عبدالرحمٰن نے حسن المآب کی شادی اس سے کرنے کے بجائے سمیع الدین یعنی موسیٰ سے کیوں کی۔

☆ ☆ ☆

اپنے آئیڈیل کی خصوصیات ماں' بہنوں کو بتاتے وقت عبدالمبین پر اعتراضات کی فہرست بناتے ہوئے بھی اس نے پاس ادب رکھ لیا تھا۔

دوستوں کی محفل میں بھی کھل کر رائے دیتے دیتے زبان دانتوں تلے داب لیتی تھی۔ مگر موسیٰ سے کہتے ہوئے اس نے سارے آداب و لحاظ بالائے طاق

رکھ دیے تھے۔ جیسے کہ بھڑاس نکالی ہو۔ آخر اور کتنے دن چلتا موسیٰ کا یہ تماشا' غضب خدا کا جنون' گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ اس نے پاگل پن کا لفظ استعمال کیا اور وف۔۔ وہ کہا جسے سوچنے سے بھی لاج آتی ہے۔

اس پر سب سے بڑی قیامت یہ ہوئی کہ موسیٰ نے حرف بہ حرف عبدالمبین سے کہہ ڈالا۔

اور عبدالمبین۔

حلیمہ بری طرح ٹھٹکی۔ وہ کتنی دیر بعد کمرے میں آئی تھی اور عبدالمبین ابھی تک سابقہ پوزیشن میں صوفے پر براجمان تھا اور ایسے کہ حلیمہ کی آمد بھی اسے متوجہ نہ کر سکی۔ جڑی بھنویں۔ چڑھی تیوری کے ساتھ ایک ملال آمیز بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ کسی مسئلے سے دوچار تھا۔ حلیمہ فیصلہ نہ کر سکی' وہ چپ چاپ پلٹ جائے یا۔۔۔

"یہاں آؤ حلیمہ۔۔۔" اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔" اس نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تم سے کچھ پوچھنا تھا۔"

"جی جی پوچھیے۔" اس سے بات کرتے حلیمہ کا لہجہ بہت مؤدب ہو جاتا تھا۔ عبدالمبین نے چند لمحے کا توقف کیا' خیالات کو الفاظ کا روپ دینے میں نہ جانے کیسی دقت تھی۔ حلیمہ کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ تولتی نگاہوں سے یک ٹک اسے دیکھنے لگا تھا۔ اور پھر بولنا شروع ہو گیا۔ اس نے موسیٰ کی گفتگو کو من و عن دہرانا شروع کر دیا تھا۔ حلیمہ کے استعجاب چہرے پر گھبراہٹ و بے یقینی کا ملا جلا تاثر گہرا ہونے لگا۔

"تم دونوں بہت اچھی دوستیں تھیں نا' بلکہ اب بھی ہو۔"

یعنی وہ اس سے صد فیصد سچ کی توقع کیے ہوئے تھا۔

حلیمہ نے لمبی سانس بھری۔

"ہاں۔۔۔ موسیٰ نے ٹھیک کہا ہے۔ وہ ایسی ہی تھی۔ حسنل نے خواہش کو دعا بنا ڈالا۔ اس نے لفظوں میں دعاؤں میں مسجدوں میں رو' رو کر موسیٰ کو مانگنا شروع کر دیا تھا۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اتنے سال کی رفاقت میں حسن المآب اس طرح تفصیل سے پہلی بار موضوع گفتگو بنی تھی۔

"اور یہ سب اس لیے بھی کہ۔۔۔ اسے مجھ جیسے کسی شخص سے شادی نہیں کرنی تھی۔"

عبدالمبین نے حلیمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

حلیمہ بری طرح گڑبڑاہٹ کا شکار ہوئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ جملہ نکلا۔ "اس نے یہ بھی بتا دیا موسیٰ کو۔"

عبدالمبین اپنی نشست پر پیچھے کو سرکا۔ بے خیالی میں۔۔۔ حلیمہ نے درست جواب دے دیا تھا۔ حلیمہ کو بھی تب ہی احساس ہوا۔ اس نے انگلیاں مسلنی اور ہونٹ کاٹنے شروع کر دیے۔

"اور اگر اس کی دعا قبول نہ ہوتی۔۔۔ اسے موسیٰ نہ ملتا' پھر۔۔۔؟" یہ فطری سوال تھا۔

حلیمہ نے سر جھٹکا' اسے اب سوچ سمجھ کر جواب دینے تھے۔ "تب وہ کہتی تھی کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گی۔"

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ۔۔۔ مسئلہ موسیٰ نہیں تھا۔ مسئلہ میں تھا یا مجھ جیسا کوئی اور۔۔۔"

حلیمہ کا سر جھک گیا۔

"حسنل کی امی اور بہنیں اس کے خیالات سے واقف تھیں۔" حلیمہ نے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑا۔ "اور نانا جان بھی واقف ہو گئے تھے' اسی لیے تو انہوں نے ایسا بروقت فیصلہ کیا۔ یہ ان کی طرف سے اپنے تئیں حسنل کو لگام ڈالنے کی کوشش تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اللہ نے راستہ ہموار کیا تھا۔ اس کی دعائیں پوری ہوئی تھیں۔"

حلیمہ کے خودکلامی آمیز جملوں نے عبدالمبین کو تحیر کے سمندر میں غرق کر دیا۔ (ہاں جب ہی تو۔۔۔ جب ہی تو۔۔۔) اتنا سب کچھ ہوا اور وہ بھی اس طرح۔۔۔

"تو یہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھے گا۔" اس کے ذہن میں سوچ ابھری تھی۔

ادھر حلیمہ کی نگاہیں عبدالمبین کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

وہ الگ خلفشار کا شکار تھی۔ اس کا دل چاہا وہ فی الفور حسنل سے ملے۔ اسے سمجھائے' مگر وہ جانتی تھی' وہ اسے چٹکیوں میں اڑا دے گی۔ کہہ دے گی اسے سب ٹھیک کرنا آتا ہے اور وہ بھی کر لیتی تھی۔ حلیمہ گواہ تھی۔ اس نے بارہا آزمایا تھا۔ حسنل جو چاہتی تھی وہ ہو جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جیسے کوئی خواب غفلت سے بیدار ہوتا ہے۔ جیسے کئی زمانوں کے بعد غار کے دہانے پر لگا پتھر سرک جائے اور روشنی کی لکیر پوٹوں کو چبھنے لگے۔ باہر نکل کر دیکھیں تو روشن چمکتا دن۔۔۔ اور ہر شے عیاں ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی موسیٰ جھرجھری لے کر بیدار ہوا تھا۔ وہ جو کسی تنویمی عمل کے زیر اثر چلتا ہوا لگتا تھا۔ اب کسی عقاب کی طرح چوکنا ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"تبدیلی کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے ہنی!"

وہ کمر کس کے میدان میں آگیا۔

"مجھے۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے بگڑے لہجے میں پوچھا۔

"جو کچھ بھی کیا ہے' آئندہ نہیں کرنا۔"

"کیا کیا ہے۔۔ اور کیا نہیں کرنا؟" وہ بھنا گئی۔

الفاظ کا چناؤ مشکل تھا۔ تمہیدی جملے طیش دلا رہے تھے دونوں کو۔

"موسیٰ بی۔۔۔ کی بیوی کی حیثیت سے تم اب تک جو بھی کر رہی تھیں۔ سمیع الدین کی بیوی کو اب وہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس کا جملہ اب بھی پیچ دار تھا۔ مگر اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ اتنی کم فہم بھی نہیں تھی۔

موسیٰ نے وہی کیا جو اس نے سمجھا۔

"موسیٰ بی۔۔۔ اور سمیع الدین میں کیا فرق ہے؟" اس نے نجانے لفظی معنی جانے تھے کہ لغوی۔۔۔ فیصلہ مشکل تھا۔ اس کا لہجہ زیادہ طنزیہ تھا یا تاثرات۔

"بہت فرق ہے ہنی۔۔ سمیع الدین۔۔۔ دین کی سننے والے کو کہتے ہیں اور دین کہتا ہے' میں اب تک غلط راہ پر تھا۔ تم اب تک غلط راہ پر ہو۔"

"کون سی غلط راہ؟" اس کی آواز بلند تھی۔

"یہی سب جو ہم کر رہے تھے' میں کرتا تھا اور تم کر رہی ہو۔"

"گرائمر کی کلاس نہیں ہو رہی موسیٰ۔۔۔ جو آپ تھا اور ہے میں بات کو الجھائیں گے۔ صاف بات کیوں نہیں کرتے۔" وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کی اداکاری کر رہی تھی۔

"صاف بات تو پھر یہ ہے کہ میں غلطی کر رہا تھا۔ خود ہر چیز سے دور ہو کر میں نے سوچا کہ میری دوری بات ختم کر دے گی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ تم کیوں اب تک منسلک ہو۔ میں یہ سب ختم کر رہا ہوں۔ ہمارا آج کے بعد ان سب چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا ہنی!"

"کن چیزوں سے؟" حسنل کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔

"میں شوبز کے حوالے سے اپنی تمام سرگرمیاں بند کر رہا ہوں اور اس کے بعد ہمارا کبھی بھی ان چیزوں سے واسطہ نہیں رہے گا۔"

چھت سر پر آگرنا۔۔۔ پیروں سے زمین سرک جانا۔ حسنل کو دونوں محاورے آگے پیچھے یاد آئے۔ ساتھ ہی ان کے معنی بھی پوری طرح آشکار ہو گئے۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ کس نے پڑھائی ہیں آپ کو یہ الٹی سیدھی پٹیاں؟"

موسیٰ کے ابرو سمٹے۔ اس سے زندگی میں کبھی کسی نے ایسے جملے اور ایسا لہجہ اپنا کر بات نہیں کی تھی۔ حسنل کو اس کے ماتھے کی شکن نظر نہ آئی۔ وہ اس کے قریب آگئی۔ بے تابانہ انداز سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر وہ جیسے اسے جھنجھوڑ دینا چاہتی تھی۔ مگر موسیٰ نے اپنے ہاتھ سمیٹ لیے۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟" وہ تحیر آمیز

ناراضی سے گویا ہوا تھا۔ آواز بھی بلند تھی۔ مگر حسنل ذرا نہ گھبرائی۔

"صحیح بات کر رہی ہوں۔ ہو کیا گیا ہے آپ کو موسیٰ؟"

اس نے پیشانی پر انگلیاں رکھ لیں۔ جیسے تاب نہ لا سکتی ہو۔

"ایسے کیسے سرگرمیاں بند کرنے کا اعلان کر دیا آپ نے۔" اس نے ایک ایک لفظ چبایا۔

بالخصوص 'سرگرمی' کو وہ پہلے اس کے لیے ایکٹیویٹی کا لفظ استعمال کرتا تھا۔

"صندوق کا ڈھکن ہے کہ جہاں چھوڑا وہاں بیٹھا رہ جائے گا۔ کیا یہ سب اتنا آسان سمجھ لیا۔ ایک بار بھی غور نہیں کیا۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اس بارے میں۔"

موسیٰ نے اس کے سرخ چہرے پر نمودار ہوتے پسینے کے قطرے دیکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا، وہ سخت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"آسان نہیں تو مشکل ہی سہی جب فیصلہ کر لیا تو بات ختم۔" اس نے ہاتھ یوں جھاڑے جیسے گرد جھاڑ رہا ہو۔

"کون کر رہا ہے آپ کی برین واشنگ...؟" خود کو تحمل کا درس دینا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

"برین واشنگ نہیں ہنی... ری سائیکلنگ کہو۔ میں ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ یہ دوبارہ جڑنے کا عمل ہے۔ دعا کرو اس بار اچھی شکل نکلے۔ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں۔"

وہ دو قدم پیچھے کو سرکی۔ "کس نے کہا آپ سے موسیٰ! آپ کس کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ بتائیے مجھے...؟" وہ بھڑک ہی تو گئی۔

"اللہ کو... میں اللہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہنی... زندگی ایسے تو نہیں گزارنی تھی جیسی میں نے گزاری۔"

اس سے بات کرتے کرتے وہ خود سے سوال کرنے لگا۔ حسنل نے اپنی ہتھیلیاں بند کیں، ایسے کے ناخن گوشت میں گڑ سے گئے۔ یہ ضبط کی انتہائی کوشش تھی۔ کچھ دیر پہلے کا پُرعزم قطعی پن کا مظاہرہ کرتا موسیٰ... پھر سے غائب دماغ لگنے لگا تھا۔

موسیٰ صحرا میں کھو گیا تھا۔ ایک دنیا میں ڈھنڈیا مچی تھی۔ سب کھوجی بنے کھرا نکالتے تھے۔ موسیٰ ایک بار پھر کھو گیا تھا۔

"ایسی باتیں نہ کریں موسیٰ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آپ کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے موسیٰ کا ہاتھ تھاما تھا اور درمیانی فاصلہ طے کر لیا۔

اس کی ٹھوڑی اس کے شانے پر ٹکی تھی۔ محبت بھری سرگوشی کی۔

"بہت محبت کرتی ہوں میں آپ سے... میں آپ کی سب باتیں ماننے کو تیار ہوں مگر آپ بھی تو نارمل ہی ہو کریں۔ کوشش تو کریں مگر آپ..."

موسیٰ نے اسے خود سے دور کر دیا... روبرو کھڑا کر لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ اس کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسے ہی ردعمل کا اظہار ہوتا۔ مگر جیسے جیسے فیصلے کی جزئیات اور قطعیت کھلتی گئی۔ گفتگو بحث... اور بحث جھگڑا نظر آنے لگی۔ حالانکہ موسیٰ خود ابھی اپنے اعلان کے مضمرات سے واقف نہیں تھا۔ اس نے گہرائی میں جا کر سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر اس کے منہ سے نکلے الفاظ کمان سے نکلے تیر کی طرح تھے، جو گڑ گیا تھا۔

بے یقینی سے منہ اور آنکھیں کھولے غیر محسوس انداز سے نفی میں سر ہلاتی وہ آخر میں ایسے اچھل رہی تھی۔ جیسے گرم توے پر کھڑی کر دی گئی ہو۔

اور اس کی حالت سے انجان موسیٰ اپنی کہہ لینے کے بعد ایسا ہلکا پھلکا تھا۔ جیسے جھیل پر کاغذ کی کشتی تیرتی ہو۔

☆ ☆ ☆

"بات منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی ہے۔
بات ہاتھ سے چھوٹی پتنگ ہوتی ہے۔
بات سرگوشی بھی ہو تو بازگشت بن جاتی ہے۔

بات خیال ہو تو یقین میں ڈھل جاتی ہے۔
بات راز ہو تب بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔
یہ تو پھر اعلان تھا۔ جسے زبان زد عام ہونے سے روکنا ناممکن ہو گیا۔
وہ جو کہتے ہیں ' منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔
زمانہ بدلا تو محاورے بھی بدل گئے۔ مائیک سے نکلی۔ اینکرز چڑھی۔
اس بار شہرزاد کی تشریف آوری ہوئی تھی۔
وہ سخت متوحش دکھائی دیتی تھی۔ ادھر حسنل کی حالت بھی تباہ تھی۔ اس کے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔
"موسیٰ شوبز چھوڑ رہا ہے۔ بڑی سے بھی بڑی خبر۔"
"کیا یہ سب سچ ہے؟" اس کے سوال میں تنقید کا عنصر اور نفی کی خواہش پوشیدہ تھی۔
"کسی نے افواہ اڑائی ہو گی۔ ہے ناں۔" اس نے اپنی خواہش کو کسی کے نام کر دیا۔
حسنل نے اپنی بجھی ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔
"میں ان کو ٹھیک کرنا چاہ رہی تھی اور وہ میری اصلاح پر تل گئے ہیں۔"
"تمہاری۔۔۔ اص۔۔۔ اصلاح۔۔۔" شہرزاد نے شاید زندگی میں پہلی بار یہ لفظ بولا تھا۔ "اور وہ کیسے۔۔۔؟"
حسنل نے فوری طور پر جواب نہ دیا۔ وہ اپنے خیالات مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ موسیٰ نے اسے اس کی روش ترک کر دینے کا کہا تھا۔
اس کے پاس اس حوالے سے الفاظ ' جملوں اور مثالوں کا فقدان تھا۔ مگر بات بہر حال یہ تھی کہ موسیٰ کی بیوی کو موسیٰ ہی جیسا لگنا چاہیے۔ اور اب موسیٰ ایسا تھا تو بیوی بھی ایسی۔۔۔ اسے ایسی ہی مکمل کر وضاحت نہ کرنی آئی۔ مگر حسنل کے لیے اب سمجھنا کیا مشکل تھا۔
اس نے مفتی عبیدالرحمٰن کی نواسی ہونے کے زمانے میں بھی چہرہ نہیں ڈھانپا تھا تو کیا اب برقعہ اوڑھ لیتی۔ اب جبکہ وہ پوری دنیا میں ہنی کے نام سے مشہور تھی۔ بہت دنوں سے پکتا لاوا بہہ نکلا۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔ شہرزاد نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔
"اور سب سے تکلیف دہ بات۔۔۔ کہتے ہیں اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو۔۔۔؟ ارے بابا ہے محبت۔۔۔ مگر محبت کا نام لے کر کچھ بھی کروالیں گے۔ یہ اچھی بلیک میلنگ ہے۔" وہ بول بول کر ہانپ گئی۔
شہرزاد کے لیے یہ سب باتیں بہت حیران کن تھیں۔ وہ حسنل کے تپتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اسے اس کی آنکھوں سے چھلکتی بغاوت کی جھلک نے چونکایا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔
وہ جانتی تھی ' وہ موسیٰ کو نہیں پا سکتی۔ مگر یہ چیز آج تک برداشت نہ کر سکی کہ وہ کسی اور کا ہو گیا اور ہوا بھی ایسے۔۔۔ جیسے خود کو رنگوالیا جائے۔ تو اس نے حسنل کو ایسے اپنایا تھا کہ اپنی آنکھیں پھوڑلی جائیں اور پوچھا جائے۔ بتاؤ اب دنیا کیسی دکھتی ہے۔
اس نے اتنے سال اسی کی آنکھ سے ہر چیز دیکھی تھی۔
شہرزاد نے بہت سال پہلے ان دونوں کو جدا کر دینے کی قسم کھائی تھی۔ مگر ان بہت سالوں سے اسے وہ درز نہ مل سکی جس میں انگلی ڈال کر شگاف بنایا جا سکتا۔
اور اب اچانک پورا کھلا راستہ۔۔۔
اس نے موسیٰ کے قریب رہنے کے لیے اس کی بیوی سے دوستی کرلی تھی۔ بہت عرصہ لگا ' یہ سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی۔ یہ اپنی آنکھوں میں مرچیں جھونکنے جیسا کام تھا۔
لیکن پھر موسیٰ پر نظر پڑتی لگتا جیسے کسی نے پھایا رکھ دیا ہو۔
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے آواز حسنل کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حسنل نے اپنی لہورنگ نظریں اٹھائیں۔

اگلے ہی پل وہ اس مہمان کے گلے لگ گئی تھی۔
"میرے ہنستے بستے گلشن کو کسی کی نظر لگ گئی۔"
اس نے دہائی دی۔
کسی نے اس کے سر کو تھپتھپایا۔
"آپ بتایئے۔ کیا میں غلط ہوں۔ ایسے کون بے وقوف جمی جمائی چیزوں کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے۔ جیتی ہوئی بساط کو کون الٹتا ہے۔ سب مجھے ہی غلط سمجھیں گے، ہر طرح کے حالات میں، میں نے موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اسے اسپیس دی کہ وہ جتنا وقت لینا چاہتا ہے لے۔۔۔ ٹھیک ہو جائے اور وہ۔۔۔"
"تم بالکل ٹھیک ہو میری جان۔۔۔!" شہر زاد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر وہ رازدارانہ انداز میں مدھم ہو گئی۔

"مذہب کی راہ پر آنے والے مرد کو سب سے پہلے جس عورت کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ناں۔ وہ بیوی ہی ہوتی ہے۔"
حسنل کی آنکھیں پھیلیں۔
"اسے اچانک دنیا بھر کے عیب اس میں نظر آتے ہیں۔" اس نے اس کے شانوں سے ہاتھ اٹھا لیے۔
"اسے تم سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں اسے یہ خیال کیوں آیا۔ تم تو پہلے ہی اتنی مکمل شخصیت کی مالک ہو۔ نماز روزے کی پابند۔۔۔ میں نے تمہیں کبھی کوئی نماز چھوڑتے نہیں دیکھا۔ شہلا نے خود مجھ سے کہا ہنی میم کو نماز ادا کرتے دیکھ کر اس نے بھی نماز پڑھنا شروع کر دی ہے (آفس ورکر شہلا) سب تمہاری اتنی تعریف کرتے ہیں تم ایک ماڈرن مسلم وومن ہو ہنی۔۔۔ جس نے ہر شعبے کو انسپائر کیا ہے۔ میں تو خود تمہیں اتنا پسند کرتی ہوں۔ رشک آتا ہے تم پر۔"
"پھر بھی موسیٰ نے۔۔" حسنل کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔
"تمہیں موسیٰ سے صاف بات کرنی چاہیے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم ڈٹ جاؤ۔۔۔ صاف صاف کہہ دینا۔ جمعہ جمعہ چار دن ہوئے نہیں ہیں سر پر ٹوپی رکھے اور تمہیں پوائنٹ آؤٹ کرنے لگا۔"
اس کے لہجے سے آنچ نکلنے لگی۔ حسنل کا دھیان نہیں تھا۔ اس کے اپنے اندر بھانبھڑ جو جل رہے تھے۔
"بات صرف مجھے پوائنٹ آؤٹ کرنے کی نہیں ہے۔ یہی حالات رہے ناں تو آپ دیکھ لیجیے گا وہ ایک چٹائی لے کر کسی جنگل میں جا کر رہنا شروع کر دیں گے۔ چھوڑ دیں گے دنیا۔۔۔"
"اچھا تو چھوڑ دے۔" شہر زاد نے بھنا کر کہا۔ "مگر تمہیں کیوں پریشرائز کرتا ہے۔"
حسنل کو ایسے ہی سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔ آنسو تھمنے لگے۔
"تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو ہنی۔"
"ہاں۔۔۔!" اس نے اپنے اندر ایک نئی ہمت پیدا ہوتی دیکھی۔ "آپ بھی میری ہیلپ کریں گی ناں؟"
"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
ہنی نے آنسو پونچھ لیے۔ وہ اب اپنے گال تھپتھپا رہی تھی۔
شہر زاد کی نظروں میں ایک فاتحانہ چمک تھی۔
"جو چیز ہمیں نہیں ملتی۔ اسے ہم کسی دوسرے کے پاس بھی برداشت نہیں کرتے۔" اسے ایک فلمی مکالمہ یاد آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نہیں۔۔۔" اس نے مسکرا کر علماء کی اس جماعت کو دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔ "اب مجھے دنیا بری نہیں لگتی۔" وہ کچھ جھینپ گیا تھا۔
سب نے تسلیم کیا۔ وہ بہت خوب صورت مرد تھا۔ جب کلین شیو ہو کر بال جھٹکتے ہوئے گٹار بجاتا تھا۔ تب بھی اور اب جب چہرے پر داڑھی اور بال ٹوپی کے اندر جمے ہوئے تھے۔ تب بھی حسن میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا تھا۔ ایسے کہ نظر ٹھہرنی مشکل ہو۔
وہ سب اس سے خصوصی ملاقات کے لیے آئے

تھے۔

"یعنی اب آپ کو دنیا اچھی لگنے لگی ہے۔" کسی نے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر جتنی بھی اچھی لگے' اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔" وہ اسے اندر تک ٹٹولنا چاہ رہے تھے۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں لیکن اب مجھے اس خیال سے ڈر نہیں لگتا۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

عبدالمبین اچھا سامع تھا۔ تمام علماء اس سے بہت سینئر تھے وہ قصداً" دائرے سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ ہونٹوں پر مٹھی جمائے اس کی ذہین آنکھیں موسیٰ پر جمی تھیں۔

"کیوں...؟" علماء کے حلق سے مشترکہ سیٹی سی آواز نکلی۔ موسیٰ نے موت سے نہ ڈرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ تاسف آمیز انداز سے مسکرایا۔

"اس لیے کہ مجھے توبہ اور اصلاح کا موقع مل گیا۔ بس دعا کیجیے "اللہ قبول فرمائے۔"

"ماشاء اللہ... سبحان اللہ... بہت خوب کیا کہنے۔"

سب جھوم ہی تو اٹھے۔ عبدالمبین کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

ٹرے بھر کے چائے کے کپ آگئے تھے۔ سب ٹولیوں کی صورت گفتگو میں لگ گئے۔ موسیٰ بھی مگن تھا۔ اس کے موبائل کی بیل مخل ہوئی۔

موسیٰ کی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر تناؤ سا آگیا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھا پھر اس نے لائن کاٹ دی۔ وہ دوبارہ گفتگو میں شریک ہو گیا۔ فون بھی دوبارہ بجنے لگا۔ موسیٰ کا اس بار ریسیو کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ مگر سب چونکنے لگے۔

"کس کا فون بج رہا ہے؟"

عبدالمبین نے دیکھا۔ موسیٰ نے سب کو چور نظروں سے دیکھا تھا اور فون پاور آف کر دیا۔ وہ دوبارہ باتوں میں لگ گیا تھا۔ مگر ایک بے دھیانی' ایک تفکر' ایک شکن واضح تھی۔

"کس کا فون تھا یہ اور موسیٰ نے ایسا کیوں کیا؟"

اسے ٹوہ کی عادت نہیں تھی۔ مگر دھیان اٹک سا گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد

حالم

تالیہ مراد ایک کرمنل' جھوٹی' چور اور دغاباز ہے جو اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ اسے صرف یہ یاد ہے کہ اسے ایک کشمیری خاندان نے اسے یتیم خانے سے لے کر اپنی لے پالک اولاد بنالیا تھا مگر اس کی حیثیت ملازمہ کی سی تھی۔ انہوں نے اس کی شادی اسکائپ پر ایک ملائشین آدمی سے کردی۔ مگر وہ آدمی فراڈ نکلتا ہے۔ اور تالیہ کو منی لانڈرنگ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

تالیہ صاحب کشف ہے اور اسے سچے خواب نظر آتے ہیں' اسے اس فراڈ کا پتا چل جاتا ہے ایرپورٹ پر تالیہ نہ جو خود بے سہارا ہے اس کی مدد کرتی ہے۔ دونوں اس فراڈی آدمی سے پیچھا چھڑالیتی ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ تالیہ چیزیں چرا کر پہلے لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرتی ہے پھر ان کو ہینڈز فون پر' مردانہ آواز میں حالم بن کر ان مسائل کو حل کرتی ہے۔ یہی اس کا روزگار ہے۔ سب حالم کو ایک اس کام انویسٹی گیٹر کے طور پر جانتے ہیں' مگر پہچانتے نہیں۔ تالیہ عارضی طور پر تنکو کامل کی ملازمہ ہے وہ بھولی بن کر اس کا اعتماد حاصل کرلیتی ہے۔ مولیا' حالم کا کلائنٹ اور تنکو کامل کے حریف کا ملازم ہے۔

تالیہ کو بار بار خواب میں ایک سکہ نظر آتا ہے جو مظفر شاہ کے زمانے کا ہے۔ تالیہ کو کئی بار اسے چرانے کا موقع ملتا ہے' مگر وہ اسے نہیں چراتی۔ داتن (لیانہ) چیزوں کی نقل بنانے کی ماہر ہے۔ سکے کی تاریخ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی ایک شخص کے

پاس نہیں ٹھہرتا کسی نہ کسی وجہ سے گردش میں رہتا ہے اور جس کے پاس بھی ہوتا ہے وہ کسی موذی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تالیہ ایک جھوٹی کہانی سنا کر یتیم خانے کی آیا سے اگلوا لیتی ہے کہ وہ پراسرار چمک دار سکہ جو جالی کا ایک حصہ ہے تالیہ کا ہی تھا۔ تالیہ کے قبضے سے نکلتے ہی وہ بجھ جاتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور تالیہ کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ اب وہ سکہ تنکو کامل کے پاس ہے۔

تالیہ اب اکثر پریشان کن خواب دیکھتی ہے۔ ایڈم، عبداللہ کی جگہ گیارہ دن کے لیے فاتح رامزل کا باڈی مین بنتا ہے۔ اشعر، عصرو رامزل کا بھائی خود وزیراعظم بننا چاہتا ہے اور اس لیے فاتح اور عصرو کے خلاف سازشیں بھی کرتا ہے اور ان کا دم بھی بھرتا ہے۔ فاتح اس کی ہر سازش سے باخبر ہے۔ ایڈم اپنے خدشات کا اظہار کرتا ہے تو فاتح کی ذہانت اسے اس کا گرویدہ کردیتی ہے۔ ایڈم فاتح کا بے لوث اور وفادار ملازم ہے۔

بریسلیٹ چرانے کا تالیہ اور داتن کا ہر منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ تالیہ سکہ چرانے کے لیے ایک امیر لڑکی کا روپ دھار کر عصرو کی آرٹ گیلری میں پہنچتی ہے۔ جہاں اشعر کو وہ پسند آجاتی ہے۔

تالیہ کا لمس پاتے ہی عصرو کے ہاتھ میں موجود بریسلیٹ چمکنے اور دہکنے لگتا ہے اور وہ اسے چرانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ تالیہ کی فاتح سے بھی ملاقات ہوتی ہے، جو اسے تاشہ کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ایڈم، تالیہ کو تنکو کامل کی ملازمہ کی حیثیت سے پہچان جاتا ہے۔ جس پر تالیہ ایک ہنگامہ کھڑا کردیتی ہے۔ بالآخر ایڈم کو اس سے معذرت کرنا پڑ جاتی ہے۔ تالیہ کو بار بار القا ہوتا ہے اور وہ خود کو ایڈم کے ساتھ کسی خزانے کو تلاش کرتا دیکھتی ہے، جس کا کسی تاشہ کی لکھی ہوئی نظم میں ذکر ہے۔

تالیہ ایک لمبا ہاتھ مار کر پرسکون زندگی گزارنا چاہتی ہے، مگر داتن کی باتیں اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آتی ہیں۔ عصرو فاتح کے رویے سے شاکی ہے۔ پارلیمنٹ میں فاتح کی تعلیمی بل کو پذیرائی نہیں ملتی، مگر وہ ناامید نہیں ہوتا۔ فاتح، ایڈم کو حضرت عبدالمطلب کے ایفائے عہد کے بارے میں بتاتا ہے۔ عصرو کے پاس جو پینٹنگ ہے، وہ نقلی ہے۔ تالیہ اسے باخبر کرنا چاہتی ہے، کیونکہ فاتح کی نظر میں تالیہ میں ذاتی کوئی خوبی نہیں، تو وہ اسے اپنی صلاحیت سے متاثر کرنا چاہتی ہے۔ عصرو ایک یتیم خانے میں جاتی ہے۔ جہاں ایک مخبوط الحواس بچہ اسے مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتا ہے، مگر وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک نظر آتی ہے۔ وہ تنکو کامل کے گھر اس کی حقیقت معلوم کرنے جاتا ہے۔ مولیا کے بلیک میل کرنے پر تنکو کامل اور اس کی بیوی تالیہ کو سرے سے پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں۔

ہدیٰ فاتح رامزل کا انٹرویو کرتی ہے، جہاں وہ ایک مگ کو دیکھ کر چونک جاتی ہے جو اشعر نے فاتح کو گفٹ کیا ہے۔ اس پر علامتی نشان ہیں۔

وان فاتح کے گھر کی تقریب میں تالیہ مدعو ہوتی ہے۔ تالیہ کو بینک سے فون آتا ہے وہ اٹھ کر جاتی ہے تو تالیہ، وان فاتح کے بچوں کو آپس میں لڑوا دیتی ہے پھر انہیں بہلانے کے بہانے کچھ ہاتھ کی صفائی کی ٹرکس دکھاتی ہے اور اسی بہانے عصرو کا بریسلیٹ اس سے مانگ لیتی ہے اور اس کے بجائے ویسا ہی دوسرا بریسلیٹ اسے واپس کرتی ہے۔ وان فاتح چوروں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے تو تالیہ کو احساس ندامت ہوتا ہے۔

تالیہ نقلی پینٹنگ کی اصلیت کھولنا چاہتی ہے، لیکن اشعر اس کوشش کو ناکام کردیتا ہے۔

تالیہ کا سابقہ شوہر آکر اس کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بریسلیٹ پہنتے ہی تالیہ کو پچھلی کچھ باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اس میں خزانے کا ذکر بھی ہوتا ہے اور اس کو اپنا باپ بھی یاد آتا ہے، جو شکار باز گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایڈم محمد بہت سادہ اور ایمان دار شخص ہے۔ وہ تالیہ کے بارے میں مشکوک ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ تالیہ دراصل وہی ملازمہ ہے جسے تنکو کامل کے گھر میں دیکھا تھا۔

ایڈم کو فوج سے بھی اس کی سچائی اور دیانت داری کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ وہ پریشان ہے کیونکہ اس کی منگیتر فاطمہ نے کہا

ہے کہ اگر اس نے گھر نہیں خریدا تو وہ اسے چھوڑ دے گی۔
وان فاتح الیکشن کے اخراجات کے لیے اپنے باپ کا گھر بیچنا چاہتا ہے۔
اشعر کو پتا چل جاتا ہے' صحافی خاتون کو وہ ٹکٹ' جس پر چائنیز کے خلاف کام کرنے والی ایک تنظیم کا علامتی نشان تھا دراصل وان فاتح نے دکھایا تھا۔ وہ وان فاتح پر برہم ہوتا ہے۔
تالیہ 'عصرو کی پورٹریٹ بنانے کے لیے جگہ تلاش کرنے کے بہانے چابی تلاش کرتی ہے کہ فاتح آجاتا ہے۔ اس کی تالیہ سے تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ اسے تالیہ کا گھر میں یوں آزادانہ پھرنا پسند نہیں۔
فاتح کا سیکریٹری عثمان' اشعر کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ بات ایڈم کو پتا چل جاتی ہے۔ تالیہ' ایڈم کے سامنے خود کو خفیہ پولیس آفیسر ظاہر کرتی ہے۔ وہ یقین کر لیتا ہے۔ اشعر اور فاتح ایک دوسرے کے خلاف چالیں چلتے ہیں۔ عصرو سن ہاؤ والے گھر کے کاغذات چرا کر اشعر کو دے دیتی ہے۔ یہ گھر تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور تاثر دیتی ہے کہ چوری تالیہ نے کی ہے۔ فاتح برہم ہو جاتا ہے۔
فاتح کو اپنی بیٹی یاد آتی ہے جو اسے تھیٹر دکھانے لے جاتی ہے' جہاں اس نے پہلی بار تالیہ کو تاشہ کا کردار ادا کرتے دیکھا تھا۔
اشعر کے گھر دعوت میں سب ایڈم اور اس کی ماں کی سادگی کا مذاق اڑاتے ہیں تو تالیہ ان سب کو ان کا کم حیثیت ماضی یاد دلاتی ہے۔ سب اس سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ داتن اس چابی کو منحوس سمجھتی ہے اور تالیہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے تاکہ وہ اس سے باز رہے۔ تالیہ کو یہ بات بری لگتی ہے۔ سمیع' اشعر کے دفتر میں ملازم ہے۔
تالیہ خواب میں خود کو اپنے والد کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہ خزانے کا مقام بھی دیکھ لیتی ہے۔

چھٹی قسط

تین خزینوں کا مدفن

اس نے خواب میں دیکھا....

وہ ایک دالان میں کھڑی ہے....سرخ اینٹوں والا کھلا سا صحن....سر اٹھا کے سامنے دیکھتی ہے، تین اطراف میں کمرے ہیں۔ ایک لکڑی کا دو منزلہ گھر....جیسے پرانے لاہور کے بازار میں بنی پرانی حویلیاں....
بالائی منزل کے کمروں کے آگے بالکونیاں کھلتی ہیں جن میں گملے رکھے ہیں....
صحن کے ایک کونے میں ایک گول چبوترہ بنا ہے جس پہ ایک مجسمہ نصب ہے....چغہ پہنے کھڑے آدمی کا مجسمہ، جس کی میان میں تلوار ہے....
وہ خواب کی کیفیت میں قدم اٹھاتی ہے۔ آگے چلتی جاتی ہے....
مجسمے کے پیچھے....اس قلعے اور حویلی نما گھر کی دیوار کے پاس وہ آرکتی ہے....دیوار کے ایک کونے میں الفاظ کھدے نظر آتے ہیں....
جیسے گیلے گارے اور سیمنٹ میں کسی نے کھود کھود کے لکھا ہو....
وہ الفاظ چمک رہے ہیں....
''تاشہ
جو شہزادیوں جیسی تھی....
اور جس نے ایک غلام سے شادی کی تھی....''
نیچے ایک طویل نظم لکھی ہے جو دھندلی سی ہے۔
وہ ان الفاظ پہ ہاتھ پھیرتی ہے....
پھر آوازیں سنائی دیتی ہیں....اس کی اپنی آواز۔ سکوں کی کھنک کے درمیان....
''ایک دن ایڈم....میں اور تم....اس گھر میں دفن خزانہ ڈھونڈنے آئیں گے۔''
وہ چونک کے گردن گھماتی ہے....گھر خالی ویران پڑا ہے....وہاں کوئی نہیں ہے' مگر یوں لگتا ہے گویا در و دیوار بول رہے ہیں....جیسے یادیں آواز کی صورت سنائی دے رہی ہیں....

"اس گھر میں خزانہ؟ سن باؤ کے گھر میں؟ مگر سچ تالیہ...."

"اونہوں.... اس کے اندر نہیں.... اس کے نیچے ہے خزانہ.... ہمیں نیچے جانا ہوگا۔"

ایک جھٹکے سے تالیہ کی آنکھ کھلی۔

وہ اپنے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں چت لیٹی تھی۔ چونک کے وہ اٹھ بیٹھی۔

"خزانہ ہے ...." اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے وجود میں خوش گوار سی بے یقینی پھیل گئی تھی۔ "خزانہ واقعی ہے اور صرف میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ سن باؤ کا گھر۔"

وہ نیچے اتری۔ ...سلیپرز پیروں میں اڑسے اور باہر بھاگی۔

نیچے آئی تو داتن کچن میں کام کر رہی تھی۔ پین کیک کی خوشبو.... تازہ مشروم کا آملیٹ.... خستہ کری پفز کی مہک.... وہ اہتمام سے ناشتہ بنا رہی تھی۔ یقیناً اپنے لئے کیونکہ جانتی تھی تالیہ یہ سب نہیں کھاتی۔

"داتن.... میری کالی موٹی برائلر مرغی...." وہ خوشی سے چیختی سیڑھیاں اترتی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کندھوں سے تھام کے اسے اپنی طرف گھمایا۔ داتن کے ہاتھ سے کفگیر گر گیا۔ وہ بوکھلا گئی۔

"کیا ہم پکڑے گئے تالیہ؟"

"داتن.... داتن...." وہ اتنی خوش تھی کہ موٹی کی بات سنی بھی نہیں۔ "داتن.... خزانہ ہے.... سن باؤ کے گھر میں.... میں نے خود دیکھا ہے...."

داتن نے پہلے الجھ کے اسے دیکھا پھر.... اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ سمجھ کے گہری سانس لی۔ "خواب میں نا؟"

"میرے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔ وہ سن باؤ کا گھر ہے۔ تین نگینوں کا گھر.... تین خزانوں کا گھر۔"

"اور کہاں ہے وہ گھر؟" وہ سنجیدگی سے تالیہ کا خوشی سے تمتمایا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ملاکہ میں ایک ہی تو گھر ہے۔ جس کو سن باؤ کا گھر کہتے ہیں۔ وانگ لی کا گھر۔ جو وان فاتح کی ملکیت ہے۔ اور میں نے کل سنا وہ اس کو بیچنا چاہ رہا ہے۔" وہ خوشی سے گلابی پڑتی بتا رہی تھی۔

"تالیہ.... مجھے تم سے بات کرنی ہے اور تمہارے خوابوں پہ پانی پھیرنا ہے۔" داتن نے آہستہ سے کہا۔

"چونکہ میں امیر ہونے والی ہوں اس لیے تمہاری کسی بدگوئی کا برا نہیں مناؤں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے کچن کے وسط میں اپنی ایڑیوں پہ گول گول گھومی۔ جیسے کوئی ان سنی دھن بج رہی ہو اور وہ اس پہ رقص کر رہی ہو۔

"لنکاوی... میں لنکاوی میں ایک پوووور ا جزیرہ خریدوں گی.... پھر میں اس پہ ایک اونچا قلعہ بناؤں گی...." وہ مہارت سے گول گول گھومتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے پہ جا رہی تھی جیسے برف کے اوپر اسکیٹنگ کر رہی ہو۔

"تالیہ.... کوئی خزانہ نہیں ہے۔" داتن نے اسے افسوس سے دیکھا۔

"ایک دفعہ پھر کہو یہ بات موٹی اور تمہیں میں اپنے محل کا سب سے چھوٹا کمرہ دوں گی۔" اس کے پیر برق رفتاری سے گھوم رہے تھے اور وہ لٹو کی طرح آگے سیڑھیوں تک جا رہی تھی۔

"تالیہ.... وہ چابی ملعون ہے۔"

"اب تمہیں سرونٹ کوارٹر ملے گا!" وہ گھومتے گھومتے رکی.... چہرے سے سنہری بال ہٹائے اور لاپروائی سے کہہ کے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ داتن بے بسی سے واپس چولہے کی طرف پلٹ گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو بال فرنچ چوٹی میں بندھے تھے۔ گھٹنوں تک آتے زرد فراک اور ٹراؤزر میں ملبوس اوپر سفید منی کوٹ پہنے وہ ہلکے میک اپ میں تیار لگ رہی تھی۔

داتن کچن کی گول میز پہ لوازمات چُنے بیٹھی تھی۔ وہ عجلت میں قریب آئی اور کرسی کھینچی۔ کری پاف کی خوشبو.... پین کیک کی تازگی.... ساری فضا معطر ہو چکی تھی۔
تالیہ نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر اتاری۔
''جانتی ہو میں یہ سب نہیں کھاتی' پھر کیوں بناتی ہو میرے لیے؟''
''کس نے کہا کہ تمہارے لیے بنایا ہے؟ ہونہہ!'' داتن نے برا مان کے ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی جس میں جوس کا ایک گلاس اور سیب رکھا تھا۔
تالیہ گہری سانس لے کے بیٹھی۔ ''ابھی بھی وقت ہے' داتن۔ اپنے وزن کی فکر کرو۔ عورتوں کو فٹ رہنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ موٹاپا موت ہے۔ فٹ رہنا صحت ہے۔''
''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' داتن نے پلیٹ بھر رکھی تھی مگر کچھ بھی چھوئے بغیر سنجیدگی سے تمہید باندھی۔
''جلدی کرو کیونکہ عصرہ کا میسج آیا ہے۔ انہوں نے آج جلدی بلوالیا ہے۔ پینٹنگ آج مکمل کرنی ہے۔'' وہ سیب میں دانت گاڑتے ہوئے بولی۔
''یہ کتاب۔'' داتن نے ایک کتاب اٹھا کے دکھائی تو سیب کا ٹکڑا چباتی ہوئی تالیہ نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑیں۔
''ہم شکار باز' یہ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ اور میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تمہارے بابا اور تمہارا سارا خاندان.... سب ختم ہو چکا ہے۔ نہ تمہارا گاؤں اب وہاں ہے۔ نہ کوئی خزانہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ آرام سے سنو تالیہ.... میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم کہاں سے آئی تھیں اور کیوں آئی تھیں۔'' داتن نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا جو بالکل ٹھہر گئی تھی....
گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی رہیں۔ داتن پدو کا بولتی رہی۔ تالیہ سنتی رہی۔ درمیان میں چند ایک سوال اس نے پوچھے۔
آخر میں داتن بولی۔ ''میں جانتی ہوں یہ سب

تمہارے لئے بہت انہونا ہے اور تم شاید اس پہ یقین نہ کرو لیکن....."

اور تالیہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

داتن کا منہ کھل گیا۔ تالیہ ہنوز گردن پیچھے پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ پھر سیدھی ہوئی اور محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"کیا دیومالائی کہانیاں پڑھتی رہتی ہو تم داتن۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا حقیقی دنیا میں۔ ہونہہ بھی۔"

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے تالیہ! جو قفل اس چابی سے کھلے گا اس کے پیچھے کوئی خزانہ نہیں ہوگا۔ بلکہ....."

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ عصرہ نے جلدی آنے کا کہا تھا۔" وہ بے پروائی سے سیب لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر اس بات پہ ماتھے پہ بل پڑے۔

"عصرہ نے ایسے جلدی میں کیوں بلوایا؟"

"پتہ نہیں۔ شاید کہیں جانا ہو۔"

"احتیاط کرنا عصرہ سے۔ کیونکہ سیاسی بیوی سیاستدان سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"کیونکہ وہ واحد انسان ہوتی ہے جو ایک سیاستدان کو بھی con کرسکتی ہے۔"

تالیہ ہنس پڑی اور آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کے اسے دیکھا۔

"سمیع کا بندوبست کر لینا۔ میں نہیں چاہتی وہ روز روز میرے گھر آئے۔ اور کوشش کرنا کہ جب میں گھر آؤں تو میرا مہینے بھر کا راشن ختم نہ ہو چکا ہو۔"

داتن کے سامنے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس بے دلی سے اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

محمود بن عزیزی کے خاندانی قلعے پہ صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ کھلے لان میں دو ہرن آگے پیچھے قلانچیں بھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے کار تیار کھڑی تھی۔ گویا مالک کا انتظار ہو رہا ہو۔ اندر آؤ تو اونچی چھت والے ڈائننگ ہال میں لمبی میز بچھی تھی۔ سربراہی کرسی پہ بیٹھا اشعر نیپکن سے ہاتھ پونچھتا، کافی کا آخری گھونٹ بھرتا اٹھ رہا تھا۔ سیاہ سوٹ اور بالوں کے اسپائکس.....وہ سنجیدہ اور مغرور لگ رہا تھا۔

"فائل کہاں ہے؟" ساتھ کھڑے رملی سے پوچھا۔

"کار میں ہے۔ آپ باہر آئیں تو دیتا ہوں۔ آپ حفاظت سے کہیں رکھوا دیجیے گا۔"

"اور نیلامی کی تمام تیاریاں مکمل ہیں؟"

"جی سر۔ اب تو تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں۔ وان فاتح کی بدنامی میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا۔" وہ تلخی سے مسکرایا اور موبائل اٹھا لیا۔ پھر پلٹا تو رملی کے چہرے پہ نظر پڑی۔ اشعر کے ابرو تشویش سے اکٹھے ہوئے۔

"تمہاری شکل کیوں اتری ہوئی ہے؟"

رملی نے بے چارگی سے کندھے اچکائے۔ "عثمان سے کیمرہ کھو گیا۔ بٹن کیمرہ جو میں نے اسے دیا تھا۔"

اشعر محمود کے ماتھے پہ بل پڑے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ "واٹ؟ کیسے کھو گیا؟ اتنی اہم ویڈیو تھی اس میں۔"

"وہ کہتا ہے کہ جب پارٹی ختم ہوئی تو اس نے دیکھا، بٹن اس کے کوٹ پہ نہیں تھا۔ وہ خود حیران پریشان ہے کہ....."

"جھوٹ بول رہا ہے وہ۔ کہاں جا سکتا ہے کیمرہ؟ اپنی قیمت بڑھا رہا ہے وہ بس۔ اس سے ویڈیو نکلواؤ جیسے بھی ہو۔" تلخی سے کہہ کے وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

قلعے کا دروازہ کھولتے ہی خوبصورت سبزہ زار اور اس پہ قلانچیں بھرتے بے فکر سے ہرن نظر آئے۔

سبز گھاس.... جا بجا پھولوں کی کیاریاں.... ایک طرف بیٹھا مور.... مگر اشعر کو کچھ بھی حسین نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

صبح جیسے جیسے باسی ہوتی گئی' کوالالمپور پہ آلودہ دھند سی چھائی گئی۔ دور سمندر پار انڈونیشیا کا ملک واقع تھا۔ وہاں آج پھر کوئی جنگل جلایا گیا تھا اور ملائیشیا تک کی فضا آلودہ ہو گئی تھی۔

وان فاتح کے لاؤنج کی کھڑکی سے دھند میں ڈوبا لان نظر آ رہا تھا۔ عصرہ کھڑکی کے سامنے اونچی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ مسکراتے ہوئے بت بنی۔ اور سامنے تالیہ ایزل پہ کینوس سجائے' گردن ترچھی کیے پینٹ کرتی نظر آ رہی تھی۔

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ ایسے میں مجسمہ بنی عصرہ نگاہ بار بار اٹھا کے وال کلاک کو دیکھتی تھی۔

''آپ کا ملاکہ والا گھر.... کیا آپ لوگ کبھی وہاں جاتے ہیں؟ دراصل مجھے تاریخ بہت فیسی نیٹ کرتی ہے۔'' وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

عصرہ مسکرائی۔ ''وہ عرصے سے بند پڑا ہے۔ کبھی کبھار چکر لگ جاتا ہے۔''

''اچھا میں نے کا تنگ ہو کو بھی آپ کی گیلری کی نیلامی پہ مدعو کیا ہے۔'' برش کینوس پہ پھیرتے ہوئے تالیہ نے بات پلٹ دی۔

''کا تنگ ہو؟ وہ چائنیز آرٹسٹ؟'' عصرہ نے ستائش اور تعجب سے ابرو اٹھائی۔

تالیہ جھینپ کے مسکرائی۔ ''چند برس پہلے میں نے پینٹنگ سیکھی تھی ایک آرٹ اسکول سے۔ وہ وہاں پڑھاتے تھے۔ اسی لیے میں ان کو جانتی ہوں۔ آرٹ بنانے اور اس کو محفوظ رکھنے والے ہی ہوتے ہیں میرے سوشل سرکل میں۔''

''اچھا لگا سن کر۔ تم تو کافی کام کی لڑکی ہو۔ کیا کا تنگ ہو آئیں گے؟''

''کا تنگ ہو نہ صرف آئیں گے بلکہ ان کو آپ کی گیلری سے تین نوادرات بھی خریدنے ہیں۔'' وہ مگن انداز میں برش کر رہی تھی۔

''اچھا.... کون سے نوادرات میں دلچسپی دکھائی انہوں نے؟''

''انہوں نے مجھے لسٹ دی تھی۔ ٹھہریں میں دکھاتی ہوں۔'' برش کا کونا دانتوں میں دبایا' اور ساتھ رکھا پرس اٹھایا۔ زپ کھولی۔ احتیاط سے تہ شدہ کاغذ نکالا اور عصرہ کو جا کر دے آئی۔ پھر واپس کھڑی بے نیازی سے پینٹ کرنے لگی۔

''عثمانی سلطنت کا خطاطی کا اجازہ۔'' عصرہ کاغذ کھول کے پڑھ رہی تھی۔ ''بالکل۔ یہ نیلامی پہ ہو گا۔ اور یہ دسویں صدی کا شمالی افریقہ کا قرآن کا نیلے رنگ کا نسخہ۔ یہ بھی میری کلیکشن میں ہے۔'' پھر وہ ٹھہر گئی۔ آنکھیں سکیڑ کے آخری تصویر دیکھی جو اس کاغذ پہ چھپی تھی۔ (برش کرتی تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔)

''سنو تالیہ.... میرے پاس مظفر شاہ کے زمانے کا تو کوئی سکہ نہیں ہے۔'' اچنبھے سے آنکھیں اٹھائیں تو تالیہ نے بظاہر چونک کے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں عصرہ.... انہوں نے کہا تھا کہ یہ مختلف سکہ ہے۔ اس کے دونوں طرف مظفر ال سلطان لکھا ہوا ہے اور یہ آپ کے ہی پاس ہے۔'' وہ جیسے یاد کر کے بتا رہی تھی۔

''نہیں میرے پاس تو....'' عصرہ رکی' پھر گہری سانس لی۔ ''اچھا وہ.... وہ تو نقلی تھا۔ ایک فیملی فرینڈ نے اینٹیک سمجھ کے دے دیا۔ مگر کا تنگ ہو کو کیسے معلوم کہ وہ میرے پاس ہو گا؟''

''جیسے مجھے معلوم ہے کہ ملاکہ سلطنت کی ایک ملکہ کی ہیئر پن آپ کے پاس ہے مگر آپ اس کو بیچتی نہیں ہیں۔ کہیں سنبھال کے رکھتی ہیں۔ آرٹ کلیکٹرز کو سب معلوم ہوتا ہے کہ کون سے نوادرات کس کے

پاس ہیں، مسز عصرہ۔"

اس کی بات پہ عصرہ کھلکھلا کے ہنس دی۔ "ہاں۔ یہ درست کہا تم نے۔ میں بھی پوری خبر رکھتی ہوں۔ مگر یہ سکہ میرے پاس نہیں ہے۔"

تالیہ نے بے فکری سے کندھے اچکا دیے۔ "اگر آپ نہیں بیچنا چاہتیں تو انکار کر دیجیے گا، اٹس اوکے۔"

"نہیں تالیہ.... یہ واقعی میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آگے دے دیا کیونکہ یہ سونے کا تھا مگر قدیم نہیں تھا۔ چند سال پرانا ہی ہوگا۔"

تالیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا مگر اس نے بدقت اپنے تاثرات کو نارمل رکھا۔ "تو اگر وہ مجھ سے نئے ____ مالک کا پوچھیں تو میں کیا کہوں؟"

"ان کو بتانا کہ وہ سکہ fake (جعلی) تھا۔ ایڈم نے تو اب تک اس کو تڑوا کے جیولری بھی بنوالی ہو گی۔" وہ رسان سے کہہ رہی تھی۔ نظریں گاہے بگاہے گھڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔ مگر تالیہ کے قدموں تلے زمین سرکنے لگی۔

"ایڈم؟ آپ کا ملازم؟ تو وہ آپ نے اسے دے دیا؟" ساری اداکاری بھول کے وہ تیزی سے بولی۔

"ہاں۔ میں ایک تولے سونے کا کیا کرتی؟"

"جی، یہ تو ہے!" وہ جلدی سے سنبھل کے مسکرائی اور دوبارہ پینٹ کرنے لگی۔ البتہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھینچ لی تھی۔ دماغ کی چولیں تک ہل گئی تھیں۔

"کتنی دیر ہے؟" عصرہ نے پوچھا، پھر مسکرا کے خود ہی وضاحت کی۔ "دراصل مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔"

"بس.... چند سیکنڈ مزید۔" وہ آخری ٹچ دے رہی تھی۔ ذہن میں آندھیاں الگ چل رہی تھیں۔ عجیب بھنور تھا جس میں وہ گھومتی جا رہی تھی۔ اب ایڈم سے کیسے نکلوائے سکہ؟ اُف!

پینٹنگ مکمل ہوئی اور عصرہ فارغ ہو کے باہر آئی تو پورچ میں ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب رکی۔

"فاتح دس منٹ تک جاگنگ سے آجائے گا۔ وہ جس وقت آئے، یہ لڑکی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوتا کہ اس کو سامنے نظر نہ آئے۔ وہ اوپر اسٹڈی میں چلا جائے تو اس کو تالیہ کی آمد کی اطلاع کر دینا۔" سنجیدگی سے کہہ کے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔ "اور میری پینٹنگ کو سنبھال رکھنا۔" پھر آگے بڑھ گئی جہاں ڈرائیور کار کا پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

کسی ملکہ کی سی بے نیازی سے عصرہ کار میں بیٹھی۔ لبوں پہ تلخ مسکراہٹ تھی۔ (بھری محفل میں کل یہ لڑکی بتا رہی تھی کہ میرا باپ چائے کی پتی کا کام کرتا تھا، ہونہہ۔)

تالیہ ہاتھ دھو کے باہر آئی تو ایزل سے پینٹنگ غائب تھی۔ ملازمہ اس کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

"میں نے پینٹنگ اوپر سوکھنے کے لیے رکھ دی ہے، آپ ناشتے کے لئے ادھر آجائیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اس کے بغیر میں آپ کو نہ جانے دوں۔"

تالیہ نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے اطراف پہ نگاہ دوڑائی۔ "ایڈم آگیا؟"

"وہ آنے والا ہوگا۔ آج دیر ہو گئی۔" ملازمہ نے اسے ڈائننگ ہال میں بٹھایا، پردے برابر کیے اور غائب ہو گئی۔ تالیہ اب جان گئی تھی کہ سکہ گھر میں نہیں اس لیے ادھر ادھر پھرنے کے بجائے وہیں بیٹھی رہی۔ چند منٹ گزرے کہ ملازمہ دوبارہ نمودار ہوئی۔

"فاتح صاحب آپ کو اوپر اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔"

وہ عام سی بات تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر تالیہ مراد کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ غلط تھا اس سب میں لگتا تھا جیسے تمام ملازم کسی اسکرپٹ کو پڑھ رہے ہوں۔

وہ اٹھ کے سیدھی اوپر چلی آئی۔ تیز، گہری نگاہیں گھما کے اطراف کو بھی دیکھتی تھی۔ جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اسٹڈی کا دروازہ دستک دے کر دھکیلا تو منظر سا کھلتا چلا گیا۔ دیوار سے لگے کتابوں کے ریک.... آبنوسی میز اور اس کے پیچھے ٹیک لگا کے بیٹھا وان فاتح رامزل۔ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ کہنی کرسی کے ہتھے پہ جمائے، دو انگلیاں گال تلے رکھے، فاتح اس کے اوپر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔

''آؤ!'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ قدم قدم چلتی قریب آئی۔ کچھ اس کی شخصیت کا سحر تھا۔ کچھ خاموش ماحول تھا.... ہر بڑھتے قدم پر وہ مرعوب ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ اب فاتح سامنے تھا اور اس کے پیچھے دھندلا شہر دکھاتی کھڑکی۔

''آپ نے مجھے بلایا' تو انکو۔'' وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ ہاتھ گود میں رکھ لیے اور پرس پیروں کے پاس۔

''تم نے کبھی Malay Annals پڑھے ہیں تالیہ؟ سارا جیوا ملایو؟'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا تو تالیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سارا جیو ملایو؟ ملائیشیا کی قدیم داستانوں کا مجموعہ جو کئی صدیاں پہلے لکھا گیا تھا، آج بھی ہر ملے بچے کو بڑے ہوتے وقت پڑھایا جاتا ہے۔ میں نے اسے پڑھا نہیں ہے مگر اس کے بارے میں سنا بہت ہے۔''

''اس میں ایک کہانی ہانگ توا کی ہے۔ وہ سلطان منصور شاہ کے پانچ جری سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ سورما۔ بہادر۔ نڈر۔ بے حد طاقتور۔'' وہ اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر بات جاری رکھے ہوئے تھا اور تالیہ پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھی۔

''ان پانچوں کو سلطان نے عظیم ہتھیاروں کی طرح تیار کیا تھا۔ ہانگ توا ان کا لیڈر تھا۔ سب سے طاقتور۔ مگر اس کی بڑھتی مقبولیت اس کے لیے مسائل پیدا کرنے لگی۔ لوگوں کو اس سے حسد ہونے لگا۔ یوں ایک دن سلطان کو غلط فہمی ہوئی کہ ہانگ توا نے حرم کا اصول توڑا ہے تو اس نے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ ہانگ توا کو قتل کر دیا جائے۔'' اتنا بول کے وہ خاموش ہو گیا۔

وہ ایب آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''وزیر دانا آدمی تھا۔ اس نے ہانگ توا کو قتل کرنے کے بجائے چھپا دیا۔'' فاتح نے نظریں تالیہ پہ جمائے بات جاری رکھی۔ ''مگر باقی چاروں کے اندر غصہ اور بغاوت جنم لینے لگی، یہاں تک کہ ایک دوسرے سورما نے ایک دن محل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ ہانگ توا کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ سلطان نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر کوئی سپاہی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں وزیر نے بادشاہ سے ہانگ توا کے لیے امان طلب کی اور بتایا کہ اس نے ہانگ توا کو مارا نہیں تھا، اور صرف وہی اپنے ساتھی سورما کو پچھاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ وزیر ہانگ توا کو لے آیا اور بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دونوں سورماؤں میں مقابلہ ہوا اور ہانگ توا نے باغی سورما کو، جو ہانگ توا کی موت کا ہی بدلہ لینے آیا تھا، مار دیا اور ایک دفعہ پھر سے سلطان کا پسندیدہ بن گیا۔''

اسٹڈی میں سناٹا چھا گیا۔ فاتح کے عقب میں کھڑکی کے شیشے پہ اتنی دھند جمع تھی کہ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔

''تمہارا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے، تاشہ؟''

''یہی کہ یہ ایک بے کار کہانی ہے جس میں ہانگ توا نے اس سلطان سے وفا کی جو اسے ناحق قتل کی سزا سنا چکا تھا اور اس دوست کی جان لے لی جو اس کے لیے ہی لڑ رہا تھا۔ میں نے یہ کہانی سن رکھی ہے اور میں کبھی سمجھ نہیں سکی کہ ہانگ توا کے دوست نے ہانگ توا کو زندہ دیکھ کے ہتھیار کیوں نہیں ڈالے

یا شاید وہ اپنی انا کے پیچھے لڑتا رہا؟ آپ کا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے' تو انکو؟"

"یہی کہ اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ طاقت کی جنگ۔ جیسے ہی ہانگ توا نے طاقتور سلطان کی طرف جاتا دروازہ کھلتا دیکھا' اس نے اپنے دوست کو مارنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ کچھ لوگ انسانوں سے وفادار ہوتے ہیں' کچھ طاقت سے۔ اور میں یہی تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں تاشہ!" وہ آگے کو ہوا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے بات جاری رکھی۔

"تم نے وان فاتح کے گھر سے ایک شے چرائی ہے۔ (وہ چونکی۔) اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہ مجھے واپس لادو تاکہ میں تمہارے خلاف پولیس میں شکایت نہ کروں۔"

تالیہ بالکل سن ہوگئی۔ میز سے نیچے رکھے پرس کو چھوا جس میں وہ بریسلیٹ ابھی بھی موجود تھا۔ (یا اللہ...ان کو کیسے علم ہوا؟)

"میں نے...آپ کے ہاں....چوری کی ہے؟" بے یقینی سے دہرایا۔

"اور تم نے وہ فائل اشعر کو دی ہے' میں جانتا ہوں۔"

تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ وہ ٹھٹکی۔ "کون سی فائل؟"

"میں جانتا ہوں تم یہ ایش کے لیے کر رہی ہو۔ اس کے ساتھ پرتعیش زندگی گزارنا تمہارا خواب ہوگا۔ میرا خیال ہے تم اتنی امیر نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو کیونکہ ایک زمانے میں تم ایکسٹرا کردار کی طرح تھیٹر میں کام کرتی تھیں۔

تاشہ آگاپوا۔ یاد ہے؟

اس کے علاوہ بھی تمہارے بارے میں کچھ بہت مشکوک سا ہے جو مجھے کھٹکتا ہے' لیکن مجھے اس سب سے کوئی غرض نہیں کیونکہ آج کے بعد تم ہمارے گھر نہیں آؤ گی۔"

تالیہ کی رنگت سرخ پڑ چکی تھی۔ لب کپکپانے لگے تھے۔ وہ اٹھی اور ہتھیلیاں میز پہ رکھے جھکی۔

"آپ نے مجھے ایک ہی سانس میں جھوٹی' چور' فراڈ اور گولڈ ڈگر کہہ دیا ہے' فاتح صاحب!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے وہ غرائی۔

"جیسا کہ میں نے کہا' مجھے اس سے کوئی فرق نہیں کہ پڑتا تم اپنی زندگی میں کیا کرتی ہو۔ مجھے صرف اپنی فائل واپس چاہیے۔" وہ ہلکے سے کندھے اچکا کے رسان سے بولا۔ بالکل ٹھنڈا۔ کوئی غصہ' طیش کچھ بھی نہیں۔

"میں نے آپ کی کوئی فائل نہیں چرائی۔" اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں اور گلا رندھ رہا تھا۔

"دیکھو تالیہ...تاشہ...واٹ ایور...کل تک اگر مجھے میری فائل نہیں ملی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں پڑے گا۔ تمہاری اپنی کریڈیبلیٹی خراب ہوگی۔ ویسے بھی اشعر کو جیسے ہی طاقت میری طرف نظر آئے گی' وہ اپنی پرانی صفوں میں واپس آنے کے لیے تمہارے ساتھ وہی کرے گا جو ہانگ توا نے اپنے دوست کے ساتھ کیا تھا۔"

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی کہ کمرے میں بھی بھرنے لگی تھی۔ تالیہ اسی طرح ہتھیلیاں میز پہ رکھے' زخمی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"تم ایک آزاد انسان ہو۔ میری فائل تو مجھے مل جائے گی لیکن تمہیں اپنی نظروں میں معتبر ہونے کے لیے کوئی اخلاقی قدم اٹھانا ہوگا۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

وہ میز سے ہاتھ ہٹا کے سیدھی ہوئی....چند لمحے سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"آپ کو واقعی انسانوں کی پہچان نہیں ہے' توانکو!"

وہ اب سیل فون اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو رہا تھا۔ سنجیدہ اور بے نیاز۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

تالیہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ اس کی کمرے

دروازہ لگا تو وہ مڑی اور باہر نکل آئی۔ دھند سی جیسے چھٹی۔ سانس بحال ہوئی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے۔

وان فاتح کا اونچا محل خاموش تھا۔ ملازم کونوں میں دبک گئے تھے۔ سارا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

''عصرہ محمود.... تم نے مجھے con کیا۔ تم نے حالم کو con کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ حالم کون ہے!''

وہ تیزی سے زینے پھلانگ رہی تھی۔

☆☆☆

گدلی دھند نے قلعے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ دھند میں اشعر کی کار تیار کھڑی تھی اور اشعر ناشتے کے بعد رملی سے بات کر کے برے موڈ کے ساتھ ابھی باہر نکلا تھا کہ ٹھٹک کے رکا۔ ایک کار تیزی سے اندر آئی۔ اس کی فوگ لائٹس آن تھیں۔ وہ سیدھی برآمدے کے سامنے آ رکی۔ چند لمحے بعد عصرہ اس میں نکل کے برآمدے کے زینے چڑھتی ہوئی اوپر آئی۔ سرمئی کوٹ اور اسکرٹ میں ملبوس' بالوں کا جوڑا بنائے' وہ برے موڈ میں لگ رہی تھی۔

''کا کا.... اتنی صبح؟'' وہ مسکرایا مگر عصرہ نہیں مسکرائی۔

''میں پریشان ہوں' ایش۔ فاتح بہت غصے میں ہے۔''

''ان کو شک تو نہیں ہوا؟'' اس نے نرمی سے عصرہ کو دونوں شانوں سے تھاما۔

''شک؟ اسے یقین ہے کہ یہ تمہارا کام ہے۔''

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے' آپ کا پوچھ رہا ہوں۔ آپ پہ تو شک نہیں ہوا۔'' وہ پر اعتماد تھا۔ عصرہ نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''مجھے خود پر سے شک ہٹانے کے لئے تالیہ کا نام لینا پڑا۔ وہ ابھی گھر پہ آئی ہے' اور فاتح جس طرح اس کی بے عزتی کرے گا' اس کے بعد تمہاری یہ پسندیدہ لڑکی ہمارے خاندان کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔''

''یہ لڑکیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں' اس کی پرواہ نہ کریں۔'' اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''آپ کو بس اپنی شادی کو متاثر نہیں ہونے دینا۔ اچھا کیا جو تالیہ کا نام لے لیا۔''

''اسی کے لیے تو سب کچھ کیا مگر اب میں ــــ گھبرا رہی ہوں۔'' وہ پریشان تھی۔ بار بار پیشانی چھوتی۔ کبھی گردن کی پشت پہ ہاتھ رکھتی۔ ''مجھے ڈر ہے فاتح کو معلوم نہ ہو جائے۔''

''کون بتا سکتا ہے؟ رات کو تو دو گارڈز ہی ہوتے ہیں صرف۔''

''ان کا بندوبست تو کر لیا ہے۔ وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ مگر وہ نیا لڑکا ایڈم۔ وہ باڈی مین۔ وہ گڑبڑ کر سکتا ہے۔''

وہ دونوں اونچے ستونوں والے برآمدے میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ صبح کی گدلی دھند ارد گرد پھیلی تھی اور ملازم باادب فاصلے پہ جا کھڑے ہوئے تھے۔

''میں رملی سے کہتا ہوں کہ عبداللہ سے کہے' ایڈم اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھنا' عبداللہ دو روز کل ہی بھاگا بھاگا واپس آئے گا۔ اب بتائیں' کوئی اور مسئلہ؟''

عصرہ اداسی سے مسکرائی۔ ''ایش.... کیا میں اپنے شوہر کو دھوکا دے رہی ہوں؟''

''اگر یہ دھوکا پہلے دیا ہوتا تو آج آریانہ ہمارے پاس ہوتی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو عصرہ کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

''وہ کسی اچھے خاندان میں تربیت پا رہی ہوگی' ایش' مجھے یقین ہے۔ وہ ایک دن ہم سے ضرور آ ملے گی۔''

''ان شاء اللہ' کا کا۔'' اس نے کہتے ہوئے شفقت سے عصرہ کو گلے سے لگا لیا۔

عصرہ نے اس کے کندھے پہ سر رکھ کر آنکھیں

بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کے چہرے پہ لڑھکے۔
''بیمار آدمی کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے' کا کا۔ اس کو کھانا اور دوا زبردستی کھلانی پڑتی ہے۔ آبنگ جنون کے ہاتھوں بیمار ہیں' آپ کی دوا ان کو ناگوار گزر رہی ہے مگر یہی ان کا علاج ہے۔'' وہ نرمی سے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
چند لمحے وہ خاموشی سے دھند میں کھڑے رہے' پھر عصرہ اس سے علیحدہ ہوئی اور آنکھ کا کونا صاف کرتی ہوئی مسکرائی۔
''اب میں مطمئن ہوں۔ تم عبداللہ کو بلواؤ۔ صبح تو ایڈم کو میں نے کام سے مارکیٹ بھیج دیا تھا' اب آتا ہے تو اس کا بندوبست کرتی ہوں۔'' پھر اس نے گردن گھما کے دیکھا۔
''دھند چھٹ رہی ہے۔ شکر۔''
سبزہ زار تھوڑا تھوڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ دھند ہلکی ہو رہی تھی۔ سورج چمکنے لگا تھا۔
اسے واپس گھر جانا تھا۔ یقیناً تالیہ اب تک جا چکی ہو گی چلو جان چھوٹی۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ سورج اب مکمل طور پہ طلوع ہو چکا تھا۔ دھند قریباً چھٹ چکی تھی۔ ایڈم ہاتھ میں شاپنگ بیگ لیے لاؤنج میں داخل ہوا تو عصرہ سامنے بڑے صوفے پہ براجمان تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' مسکراتی ہوئی، وہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔
''میم' کیا مجھے دیر ہو گئی؟ سر آفس چلے گئے؟'' وہ باہر فاتح کی کار غائب دیکھ کے پریشان ہو گیا تھا۔
''عثمان ہے ان کے ساتھ' بے فکر رہو۔ سامان آسانی سے مل گیا تھا؟'' وہ نرمی سے گردن اٹھا کے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
''جی میم.... سب کچھ مل گیا۔ میں پھر اب آفس جاؤں؟''
''ایڈم.... ریلیکس۔ تم آج چھٹی لو اور گھر جاؤ''

ایڈم جو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا' چونکا۔ ''مگر آج باس کی پارلیمنٹ میں تقریر ہے' ان کو کافی کے دو مگ چاہیے ہوتے ہیں اور....''
''عبداللہ واپس آ گیا ہے۔'' اس نے نرمی سے بم پھوڑا تو ایڈم کی متفکرانہ انداز میں چلتی زبان کو بریک لگ گئی۔ لب ''اوہ'' میں سکڑے۔ پھر نگاہیں جھکا لیں۔
''یعنی میری جاب ختم' میم؟'' آسمان سے آہستہ آہستہ وہ زمین پہ آ گرا۔ اتنے دھیرے سے کہ چوٹ لگنے کی آواز بھی نہیں آئی۔
''ہاں مگر ایش تمہارے اور تمہاری ماں کے لیے نوکری کا بندوبست کر رہا ہے۔ عبداللہ تمہارے ہی محلے کا ہے نا؟ کوئی نوکری ملی تو عبداللہ تمہیں بتا دے گا۔ یہ پیسے رکھ لو۔ یہ تنخواہ کے علاوہ ہیں۔ تم نے اپنی منگیتر کے لیے تحفہ لینا تھا نا۔'' عصرہ نے ایک پھولا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
''میم! تنخواہ تو بینک میں آئے گی' وہی کافی ہے' میں یہ نہیں رکھ سکتا' اور تحفے کے لیے وہ سکہ بہت تھا۔'' وہ اداسی سے بولا۔
''رکھ لو۔ جیولرز میکنگ کے الگ پیسے لیتے ہیں۔ لے لو ایڈم۔'' ایڈم نے نظریں جھکائے ہاتھ بڑھایا اور لفافہ تھام لیا۔
''اب پریشان نہ ہو۔ جاؤ اور اپنی منگیتر کے لیے تحفہ لو۔ کبھی کوئی کام ہو تو آ جانا۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔'' مسکرا مسکرا کے اب عصرہ محمود کے جبڑے دکھنے لگے تھے۔ اس سے زیادہ اداکاری وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب جلد وہ اکتانے والی تھی۔ ایڈم نے اس کا صبر نہیں آزمایا۔
''میں باس سے آخری دفعہ مل آؤں آفس جا کر۔''
وہ جیسے اس نو دن کی کہانی کا اختتام چاہتا تھا۔
''آج اس کا موڈ اچھا نہیں۔ اس کو تقریر بھی کرنی ہے۔ وہ ڈسٹرب ہو گا' ایڈم۔''

"نہیں نہیں، میں ان کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ کوئی بات نہیں۔" وہ فوراً سنبھل گیا۔ اپنا مقام یاد آ گیا۔ پھر اسے خدا حافظ کہہ کے لفافہ تھامے باہر نکل آیا۔ عصرہ نے گہری سانس لی اور ریموٹ اٹھا کے ٹی وی لگالیا۔ سارے مسئلے ختم ہوئے۔

ایڈم باہر آ کے خالی نظروں سے اطراف میں دیکھنے لگا۔ کہاں وہ بھاگ بھاگ کے سامان لے کر فاتح کے گھر پہنچا، اور کہاں سارے دن کی مصروفیت چٹکی میں ختم ہو گئی تھی۔ فراغت ہی فراغت.... نو دن کی تیز، مصروف زندگی.... وہ ان طاقتور لوگوں کے درمیان بیٹھنا.... سب راکھ ہو گیا تھا۔

اور اس نے کتنے ہی مواقع گنوا دیے۔ نہ تالیہ مراد کے بارے میں فاتح سے پوچھ سکا کہ وہ واقعی پولیس آفیسر ہے یا نہیں۔ نہ ہی عثمان کے بارے میں فاتح کو آگاہ کر سکا کہ وہ جھوٹ بول کے اشعر سے ملنے جاتا رہتا ہے۔ ایڈم کی زندگی تو سوائے ناکامی کے کچھ نہیں ہے۔ (اس نے سوچا۔) اب وہ تاشہ یا تالیہ جو بھی تھی، اس کو کیا جواب دے گا؟ اب وہ فاتح کی حفاظت کیسے کرے گا؟

سوال بہت سے تھے اور جواب ندارد۔ وہ سر جھٹکتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ان لوگوں کو اس کی ضرورت کہاں تھی بھلا؟ وہ اس کے بغیر بھی ٹھیک تھے۔ اسے فاطمہ کے لیے تحفہ لینا تھا۔ سارے کام ایک طرف، وہ اس سکے کو تڑوا کے فاطمہ کے لیے انگوٹھی بنوانے جائے گا آج۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ اسے اب اپنی چھوٹی، بے رونق، معمولی زندگی میں واپس جانا ہی تھا۔

☆☆☆

گدلی دھند کا غبار دھیرے دھیرے چھٹتا جا رہا تھا۔ اس پارک میں بڑی سی جھیل بنی تھی۔ کنارے پہ جاگنگ ٹریک تھا جو دور درختوں میں گم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ واک کر رہے تھے، کچھ بیٹھے ستا رہے تھے۔ ایسے میں بھاری بھرکم داتن، متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ دفعتاً ایک بینچ کے سامنے وہ رکی۔

اس پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ سفید منی کوٹ پہنے۔ سر ہاتھوں میں گرائے۔

"یعنی تمہیں شکار بازوں کی داستان پہ یقین آ ہی گیا اور اب تم پوری کہانی دوبارہ میرے منہ سے سننا...."

"عصرہ نے میرے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔" اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ دیکھ کے داتن چونکی۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ پڑ رہے تھے۔ وہ بے حد دل شکستہ لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" داتن پریشانی سے ساتھ بیٹھی اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"عصرہ نے مجھے جلدی بلوایا تاکہ میں پینٹنگ مکمل کر لوں اور پھر وہ غائب ہو گئی تاکہ وان فاتح مجھے ڈانٹیں.... اور انہوں نے داتن.... انہوں نے مجھے چور کہا.... بددیانت، جھوٹی اور فراڈ کہا۔"

"یہ سب تو ہم ہیں تالیہ۔"

تالیہ نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "مگر انہوں نے مجھ پہ کسی فائل کی چوری کا الزام لگایا جو میں نے نہیں چرائی۔ یہ زیادتی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سامنے وسیع جھیل تھی اور ساتھ ٹریک۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، خفا خفا سی جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ داتن نے اس کا پرس اٹھایا اور پیچھے لپکی۔

"یعنی اب وہ تمہیں اپنے گھر نہیں آنے دیں گے؟ چلو اچھا ہوا، اس سکے سے جان چھوٹی۔"

"اس سکے کے لیے ان کے گھر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ایڈم کے پاس ہے اور اسے میں سنبھال لوں گی، مگر داتن.... انہوں نے مجھ پہ غلط الزام لگایا۔" وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، اور داتن اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں ہانپنے لگی تھی۔

تالیہ کے اس طرف جھیل تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ داتن تالیہ کو دیکھنا چاہتی تو تیز آتی روشنی آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے پھولے سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔

"تم نے کون سا دوبارہ ان سے ملنا ہے جو ان کی باتوں کو اہمیت دے رہی ہو؟"

"عصرہ نے مجھے پھنسایا ہے۔ وہ جانتی ہے کس نے فائل چرائی ہے' یقیناً اس کے بھائی نے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو اپنے شوہر کی فائل چرانے والی لڑکی سے پینٹنگ مکمل نہ کرواتی۔ اس نے اصل چور کو بچانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ مجھے وہ فائل فاتح کو واپس لا کے دینی ہے۔" وہ جھیل کے سرے پہ چل رہی تھی۔ سنہری چوٹی کندھے پہ آگے ڈال رکھی تھی' جس سے ناراض لٹیں نکل کے گردن کو چھو رہی تھیں۔

"پہلے گھائل غزال اور اب یہ فائل.... فاتح کے مسائل تمہارے مسائل نہیں ہیں' تالیہ۔" داتن کا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔

"گھائل غزال کو بھی میں دیکھ لوں گی مگر وہ جو بھی فائل ہے وہ اس کے لیے ضروری ہے۔" وہ رکی اور داتن کی طرف گھومی۔

اب دھوپ میں چمکتی جھیل اس کے پیچھے تھی جس کے باعث وہ اندھیرے میں نظر آ رہی تھی۔

داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے اسے دیکھا۔

"تمہیں ابھی سکہ بھی ڈھونڈنا ہے اور سمیع کو بھی سنبھالنا ہے' ایسے میں تم سب چھوڑ کے اشعر کے ہاں سے وہ فائل چرانا چاہتی ہو؟"

"کس نے کہا کہ میں اسے چراؤں گی؟" وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔ وہ ایسے صرف تب مسکراتی تھی جب اس کے پاس پلان ہوتا تھا اور تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔

"پھر کون؟"

"حالم!" اندھیرے میں کھڑی تالیہ مسکرائی۔ کرنیں اس کے اطراف سے نکل کے سامنے پڑ رہی تھیں۔ "حالم واپس لائے گا وہ فائل!"

داتن بدوکا کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ چھجا بنا ہاتھ نیچے گر گیا۔ "تم حالم کو اس معاملے میں لانا چاہتی ہو؟"

"ہم نے پچھلے سال ایک ممبر پارلیمنٹ فارض ڈینئل کی بیوی کا لاکٹ چرایا تھا اور حالم نے بھاری رقم لے کر لاکٹ واپس لا دیا تھا۔ آگے تمہیں معلوم ہے کہ فارض صاحب کو کیسے استعمال کرنا ہے۔"

داتن نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "وان فاتح نے تمہاری توہین کی۔ تم پھر بھی اس کے ساتھ اچھائی کیوں کرنا چاہتی ہو' تالیہ؟"

تالیہ کے اطراف اتنی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ تاریک لگ رہا تھا۔ داتن اس کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر اس کی آواز.... اس میں عجیب جادوئی پن تھا۔

"کیونکہ ایک دن آئے گا جب وہ مجھے کہیں گے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ ان کو میری ضرورت ہے۔ میں اس دن کے انتظار میں وہ وعدہ نبھا رہی ہوں جو ابھی انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی اور عقب میں سورج کی کرنیں جھیل کے پانی پہ رقص کر رہی تھیں.... گویا سونے کا چمکتا ہوا ڈھیر ہو جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہو......

دو دن سے چھائی گدلی دھند اب چھٹ رہی تھی اور دن طلوع ہو رہا تھا......

☆☆☆

ملائیشین پارلیمنٹ کی عمارت میں ایک اونچا ٹاور تھا جو ایک زمانے میں شہر کا بلند ترین ٹاور ہوا کرتا تھا۔ یہ ملے کرنسی کے سکے پہ بھی نقش ہے' مگر کم لوگ جانتے ہیں کہ اونچے ٹاور میں صرف ورکرز کے آفس وغیرہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ جو بظاہر چھوٹی' ٹینٹ نما عمارت بنی ہے' پارلیمنٹ اور سینیٹ کے ایوان دراصل اس میں موجود ہیں۔

اس وقت وان فاتح پارکنگ میں رکی کار سے باہر نکل رہا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس' بالوں کو دائیں طرف جمائے' وہ ازلی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے ہوئے تھا۔

''میری کافی کا دوسرا مگ کہاں ہے؟'' عثمان سے چھوٹتے ہی پوچھا تو عثمان گڑبڑا گیا۔

''سوری سر' یہ عبداللہ کی ڈیوٹی ہے اور وہ پہنچا نہیں ہے ابھی تک۔''

''تو ایڈم کہاں ہے؟'' فاتح نے صرف ابرو اٹھایا۔ نہ غصہ' نہ اکتاہٹ۔

''سر وہ بھی شاید چھٹی پہ.....''

''ویری پور مینجمنٹ۔'' بغیر غصے کے تبصرہ سا کیا اور آگے بڑھ گیا۔

سامنے ہی سوٹ اور روایتی لباس اور ٹوپیوں میں موجود افراد عمارت میں داخل ہوتے نظر آرہے تھے۔ فاتح کو دیکھتے ہی بہت سے افراد اس کی طرف بڑھے۔ وہ بھی مسکراتا ہوا ان کے قریب آیا۔ سر کے خم سے سلام کا جواب دیا۔ اکثریت ممبرز پارلیمنٹ کی تھی۔

''وان فاتح... آپ کے گھر سنا ہے چوری ہوگئی؟''

''کوئی کاغذات وغیرہ تھے؟ پولیس میں رپورٹ کی؟''

''اللہ کرے زیادہ نقصان نہ ہوا ہو۔''

فاتح کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر کے خم کے ساتھ ''شکریہ.....زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔'' کہہ کے آگے بڑھتا گیا۔ جیسے ہی عمارت کے اندر لفٹ تک پہنچا' اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور قدرے برہمی سے وہ عثمان کی طرف پلٹا۔

''یہ بات ساری دنیا کو کیسے معلوم ہوئی؟''

''پتا کرتا ہوں' سر۔'' وہ فوراً واپس دوڑا اور فاتح نے سر جھٹکتے ہوئے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

ملے پارلیمنٹ کے ساتھ بنے اونچے ٹاور میں اپوزیشن پارٹیز کو جو فلور ملے تھے وہ تیرہویں اور چودہویں منزل پہ تھے جس بات کا اکثر مذاق بنایا جاتا تھا کیونکہ یہ بدقسمت نمبرز سمجھے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک بدقسمت فلور پہ وہ اپنے آفس میں داخل ہوا ہی تھا کہ عثمان واپس آیا۔

''ابھی آدھا گھنٹہ قبل ...'' وہ ہانپ رہا تھا۔ ''...سب ممبرز پارلیمنٹ کو ان کے ورک ای میل پہ میلز ملی ہیں جس پہ ایک جعلی خبر بنا کے لکھا گیا ہے کہ آپ کے گھر چوری ہوئی ہے۔''

''اشعر۔'' اس نے دل میں سوچا اور عثمان کو جانے کا اشارہ کر دیا اور اپنی ڈائری کھول لی۔

اب وہ آفس میں اکیلا تھا۔ نفیس سا آفس جو لیڈر آف دی اپوزیشن کو ملا کرتا تھا۔ پچھلے سال اپوزیشن کے لیڈر نے (جو کہ فی الوقت پارلیمنٹ نیشنل کا چیئر مین بھی تھا) اس منصب سے استعفیٰ دے دیا تھا' جس کے بعد اپوزیشن نے وان فاتح کو اپوزیشن لیڈر چنا تھا۔ پچھلے ایک سال سے یہ اس کا آفس تھا۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو اس نے نوٹس سے نظر اٹھائی۔ عبداللطیف صاحب چوکھٹ میں کھڑے تھے۔ سفید بالوں اور جناح کیپ والے عبداللطیف روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ فاتح نے عینک اتاری' نوٹس رکھے اور مسکرا کے ان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''یہ چوری کا کیا قصہ ہے؟'' وہ کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''ملاکہ والے گھر کے ڈاکومنٹس غائب ہوگئے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ اشعر نے یہ کیا ہے۔ مگر خیر....'' اس نے شانے اچکائے۔ ''مل جائیں گے۔''

''مگر اشعر نے یہ کیا کیسے؟'' وہ حیران ہوئے تھے۔ کھڑکی کے بلائنڈز بند ہونے کے باعث آفس میں نیم تاریکی تھی' مگر فاتح کا چہرہ پھر بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔

''1849ء میں ایک آدمی ہوتا تھا امریکہ

میں ولیم تھامسن نام کا۔" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "بظاہر بڑا قیمتی لباس پہنے متاثر کن سا لگتا تھا۔ ایک دن وہ سڑک پہ آیا اور ایک ایک شخص کو روک کے پوچھنے لگا' کیا آپ کو مجھ پہ اتنا کانفیڈنس ہے کہ آپ کل تک کے لئے اپنی گھڑی میرے پاس رکھوا دیں؟ یہ اتنا ڈائریکٹ سوال تھا جس کا تعلق ایک انسان کی عزت نفس سے تھا، بہت سے لوگوں نے لحاظ میں اس کو اپنی گھڑی دے بھی دی۔ وہیں سے اس کھیل کا نام کانفیڈنس گیم یا con گیم پڑا اور ایسے آدمی کو کانفیڈنس مین یا con مین کہا جانے لگا۔

کون آرٹسٹ (بہروپیا) وہ آدمی ہوتا ہے جو اس چیز کو استعمال کرتا ہے جس پہ ان کے شکار کو مکمل بھروسہ ہوتا ہے..... اور..... (گہری سانس لی)..... عصرہ ہر دوسرے آرٹ کلیکٹر یا آرٹسٹ سے بہت جلدی متاثر ہوجاتی ہے' اس لئے اشعر نے ہماری زندگیوں میں ایک اسی شعبے سے تعلق رکھنے والے شخص کو داخل کیا جس نے یہ چوری کی۔"

"مرد ہے یا عورت؟" انہوں نے حیرت بھری دلچسپی سے پوچھا۔

"میں اس کے پیچھے اس کے بارے میں یوں بات نہیں کرنا چاہتا۔ جو بھی ہے' اپنے کیے کی سزا اس کو مل جائے گی۔" وہ بے نیاز لگتا تھا۔

"اور اگر کاغذات نہ ملے؟" ان کو تشویش ہوئی۔

"اللہ مالک ہے۔ میں کوئی اور حل نکال لوں گا۔ اور پھر میں کہاں ان چیزوں سے ہار مانتا ہوں' عبداللطیف۔" وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ دروازہ ذرا سی دستک سے کھلا۔ دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا' پھر دونوں کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"فارض صاحب..... آیئے۔" فاتح نے گرمجوشی سے مسکرا کے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

جو صاحب اندر آئے وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ پستہ قد اور چینی نقوش کے حامل' عینک لگائے خوش مزاج سے لگتے تھے۔ سلام کیا اور کرسی سنبھالی۔

"میں نے آپ کے گھر میں چوری کا سنا' فاتح!" وہ تشویش سے بیٹھتے کے ساتھ ہی بولے۔ "پولیس کارروائی کر رہی ہے کیا؟"

"زیادہ فکر کی بات نہیں۔" اس نے نرمی سے مسکرا کے ان کو تسلی دی۔

"آپ مطمئن لگ رہے ہیں' لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اندر سے پریشان ہیں' لیکن آپ ٹھہرے لیڈر..... کبھی کمزوری ظاہر نہیں کریں گے — بہرحال..... آپ نے کسی انویسٹی گیٹر کو ہائر کرنے کا سوچا ہے؟ یقیناً آپ اپنے گھر پولیس والوں کا داخلہ پسند نہیں کریں گے۔"

"میں ہینڈل کرلوں گا۔" وہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا فارض صاحب کی بہت عزت کرتا ہے۔

"پچھلے سال میری بیوی کا ایک قیمتی لاکٹ چوری ہوا تھا۔ اس کی نانی کی نشانی۔ وہ بھی بھری پارٹی میں سے۔ مجھے کسی نے اس اسکام' اور فراڈ انویسٹی گیٹر کا بتایا تو میں نے اس سے رابطہ کیا۔ اس نے چند گھنٹوں میں برآمد کر دیا۔ چوری کے پہلے چند گھنٹے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس کا نمبر دیتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی پرائیوٹ انویسٹی گیٹرز پہ مجھے اتنا اعتماد نہیں ہے۔"

"مجھ پہ تو ہے نا؟ میں نے اس آدمی سے کام لیا ہوا ہے۔ انتہائی ذہین اور شاطر ہے۔ تھوڑا گھمنڈی اور مغرور بھی ہے' پیسے بھی کافی لے گا لیکن اس کی مہارت کے اتنے پیسے تو بنتے ہیں' فاتح صاحب۔" وہ مصر ہوئے۔

"اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔" اس نے رسان سے بات کو ٹال دیا۔

فارض ڈینئل باہر آئے اور فون پہ ایک نمبر ملا

کے کان سے لگایا۔ ”حالم.... میں نے تمہاری طرف ریفر کیا ہے وان فاتح کو۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ رابطہ کرتے ہیں تم سے یا نہیں۔ اب تک چوری کی خبر اتنی پھیل چکی ہے کہ بہت سے انویسٹی گیٹرز ان سے رابطہ کر کے ان کو اپنا کلائنٹ بنانے کی کوشش کریں گے۔ تمہارا احسان تھا مجھ پہ' میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔“ پیشانی کو مسلتے ہوئے وہ مایوسی سے کہہ رہے تھے۔

”خیر.... مجھے کون سی کلائنٹس کی کمی ہے....“

جواب میں حالم کا اکھڑ لہجہ سنائی دیا تھا۔ ”میں تو آپ کے لیے کہہ رہا تھا.... جب وان فاتح کا مسروقہ مال برآمد کر کے دوں گا تو وہ آپ کے ہی مقروض ہوں گے۔ ورنہ مجھے کیا۔ ہونہہ۔“ کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔

فارض صاحب نے گہری سانس لے کر فون کان سے ہٹایا۔ مغرور اور گھمنڈی حالم.... وہ کبھی نہیں بدل سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ کوالالمپور کا ایک معروف بازار تھا۔ درمیان میں پتھریلی روش تھی جس پہ خریدار چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں ایک دکان کے آگے چھتری تلے میز کرسیاں لگی تھیں جن میں سے ایک پہ تالیہ بیٹھی تھی اور ابھی ابھی اس نے ہونہہ کہہ کے فون بند کیا تھا۔ داتن نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”اگر حالم اپنے سابقہ کلائنٹ کو تھوڑی خوش اخلاقی دکھا دے تو حالم کا کیا جاتا ہے؟“

”کس خوشی میں؟ حالم کا مارکیٹ میں کوئی امیج ہے' کوئی رعب ہے' اسے ختم تھوڑی کرنا ہے؟“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

وہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔ سفید کوٹ اتار دیا تھا اور زرد فراک نما قمیص دکھائی دے رہی تھی۔ سنہری چوٹی آگے کو ڈال رکھی تھی۔

”خیر... میں نے ای میلو کر کے دس منٹ میں ساری پارلیمان میں چوری کی خبر پھیلا دی تھی۔ فارض سمجھا ہوگا کہ حالم کو بھی اسی طرح اڑتے اڑتے خبر ملی ہے اور وہ کلائنٹ بنانا چاہ رہا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ فاتح پھنس گیا؟“

”دیکھتے ہیں۔“ وہ پرامید تھی۔ پھر گھڑی دیکھی۔

”ایڈم آنے والا ہوگا۔ تم اب جاؤ' اور کام شروع کرو۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ کس نے فائل چرائی ہے۔“

”ابھی تو فاتح نے ہمیں ہائر ہی نہیں کیا۔“

”کہانا' مجھے وہ وعدہ نبھانا ہے جو اس نے مجھ سے کبھی مستقبل میں لینا ہے۔ جاؤ موٹی! کام شروع کرو۔“

داتن ناک سکیڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی اور بیگ اٹھا لیا۔ ”یہ وہ پہلا کیس ہوگا جو حالم ایمانداری سے حل کرے گا' کیونکہ پچھلے ہر کیس میں حالم خود ہی چور ہوتا تھا۔“ وہ چڑانے کو بولی مگر تالیہ نے اثر نہیں لیا۔

میز پہ رکھا سفید ہیٹ اٹھا کے سنہری بالوں پہ رکھ دیا اور چہرے کے سامنے اخبار پھیلا لیا۔ گویا اب وہ چند منٹ یہاں سستانا چاہتی تھی۔

”چے تالیہ!“ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایڈم کی آواز پہ اس نے اخبار ہٹا کے دیکھا۔ وہ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں شاپنگ بیگ اٹھائے سامنے والی کرسی کھینچ رہا تھا۔ کنپٹی پہ پسینے کے قطرے تھے گویا دھوپ میں چل کے آ رہا ہو۔

”تم نے اس بازار میں ملنے کے لیے کیوں کہا؟“ تالیہ نے ایک نظر شاپنگ بیگ پہ ڈالی جو اس نے میز پہ رکھ دیا تھا۔

”دراصل میں یہاں آیا ہوا تھا' اگر کہیں دور ملنا پڑتا تو بس کا کرایہ بہت لگ جاتا۔“ وہ سادگی سے کہہ کے بیٹھ گیا۔ چہرے پہ شفاف سی مسکراہٹ تھی۔

”میری جاب ختم ہو گئی آج' چے تالیہ۔“

”آج کیوں؟“ وہ چونکی۔ ”ابھی تو دو دن رہتے تھے۔“

”کیونکہ عبداللہ واپس آ گیا ہے۔“

”خیر.... میرے نزدیک تمہارے گیارہ دن

ابھی ختم نہیں ہوئے۔ تمہاری جاب جاری ہے۔" وہ ٹیک لگائے' سر پہ ترچھا ہیٹ رکھے مسکرا کے بولی۔

"اوکے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟" وہ پر جوش اور متجسس تھا۔ تابعدار سیا تابعدار۔

"ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ وان فاتح کے دشمن صرف وان فاتح کے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس گھر میں موجود ایک قدیم artefact کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں.... تم نے جب فاتح صاحب سے میرا ذکر کیا ہوگا تو انہوں نے بتایا تو ہوگا نا؟" گہری آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ان سے مل بھی نہیں سکا' اور پوچھنا عجیب سا لگتا تھا۔"

(شکر!)

"خیر.... تم ان کے لئے اجنبی ہو' ظاہر ہے وہ تمہیں نہیں بتائیں گے۔" تالیہ نے سکون کا سانس لیا۔ "یہ اینٹیک پیس فی الوقت ان کے پاس موجود نہیں ہے' اور وان فاتح نہیں جانتے کہ وہ کہاں گیا۔ یہ دیکھو.... کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟" اس نے ایک کاغذ کھول کے ایڈم کے سامنے رکھا۔

وہ پولیس رپورٹ لگتی تھی۔ نیشنل ٹریژر۔ (قومی ورثہ) اور ساتھ اس کی تاریخی اہمیت۔ مگر ایڈم کی نظر پرنٹڈ تصویر پہ جم گئی۔ سنہرے رنگ کا سکہ۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"یہ؟ یہ تو...." اس نے بوکھلا کے تالیہ کو دیکھا۔

"یہ تو مسز عصرہ نے مجھے دے دیا تھا۔"

"اوہ!" تالیہ نے لب سکیڑے۔ "شاید عصرہ فاتح صاحب کو بتانا بھول گئیں۔ خیر' ایڈم۔ تمہیں وہ سرکار کو واپس کرنا ہوگا کیونکہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔" وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ایڈم بلکہ سرکاری خزانہ واپس لوٹانے پہ سرکار تمہیں بونس دے گی اور...." وہ رسان سے اس کو تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر....

"میں نے اس کو تڑوا کے اپنی منگیتر کے لئے ابھی ابھی انگوٹھی بنوائی ہے' چے تالیہ۔"

تالیہ کا سارا سکون اور اعتماد غارت ہوا۔ دماغ بھک سے اڑا۔

"واٹ؟" وہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تم ....بے وقوف....بے عقل جلد باز انسان.... یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ کدھر.... کدھر ہے وہ انگوٹھی...." پھر اس نے خود ہی شاپر میز سے جھپٹا اور کھولا۔ ڈبے کے اندر سے انگوٹھی نکالی۔ انگلیوں میں ٹٹول کے اسے دیکھا۔

"اس نے تمہارے سامنے سکے کو پگھلایا؟ بتاؤ میں جو پوچھ رہی ہوں۔"

"نہیں۔ وہ سکہ اندر لے گیا اور انگوٹھی کے ساتھ واپس آیا۔ ڈیزائن میں نے اسے بتا دیا تھا۔ فاطمہ کو اس کے والد نے بچپن میں...."

مگر تالیہ کو اس کی لو اسٹوری میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ "کہاں ہے وہ شاپ؟"

"یہیں قریب میں ہے.... مگر اب کیا ہوگا چے تالیہ۔" وہ پریشانی سے کھڑا ہوا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" ایک ہاتھ میں پرس اٹھایا' دوسرے میں انگوٹھی دبوچی اور جارحانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ بازار میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دونوں بھیڑ میں آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔

آگے چلتی تالیہ کی چوٹی کندھے پہ سامنے کو پڑی تھی۔ پیچھے چلتے ایڈم کو اس کی گردن کی پشت پہ گول سا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ایوان میں نشستیں انگریزی کے حرف U کی

صورت لگی تھیں۔ مرکزی مقام پہ اسپیکر کا اونچا چبوترہ تھا جہاں وہ اپنی بلند کرسی پہ بیٹھا' کاغذات کو عینک لگا کے پڑھ رہا تھا۔ اوّلین نشستوں پہ وزیراعظم بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ گردن اکڑائے' سر پہ اسٹول لیے' وہ بت کی طرح بیٹھا کرتی تھی۔ اوپر ہال میں U کی ہی صورت میں گیلری بنی تھی جہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ رپورٹرز اور حاضرین وہاں بیٹھے ایوان کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔

پارلیمنٹ کسی بھی جمہوری ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا ہے۔ جمہور کا مطلب ہے ''عوام''۔ جمہوری ملک وہ ہوتا ہے جہاں عوام ووٹ دے کر اپنا صدر یا وزیراعظم چنتے ہیں۔ بادشاہت جن ملکوں میں ہوتی ہے وہاں بادشاہ اپنا وارث خود چنتا ہے جو عموماً اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

ملائیشیا چونکہ جمہوری ملک ہے' اس لیے اس کا پارلیمان ملک کا سب سے بڑا اور مقدس ادارہ ہے۔ یہاں جو لوگ اپنے اپنے علاقوں سے ووٹ لے کر جیت کے آتے ہیں' جمع ہوتے ہیں اور ملک کے لیے قانون بناتے ہیں۔ سیاستدانوں کا صرف ایک کام ہوتا ہے۔ مل بیٹھ کے قانون بنانا۔ ملک کے اداروں کو مضبوط کرنا۔

آج بھی یہاں یہی ہو رہا تھا۔ صوفیہ رحمٰن بل لائی تھی' یعنی ایک نیا قانون اس نے تمام ممبرز پارلیمنٹ کے سامنے رکھا تھا اور اس کے لئے ووٹنگ ہو رہی تھی۔ صوفیہ کی جماعت کے قریباً دو سو سے زائد لوگ پارلیمان میں تھے اور وان فاتح کی باریسن نیشنل کے ساٹھ لوگ۔ رپورٹرز جمائیاں روکتے ہوئے پہلے سے لکھ رہے تھے کہ بل پاس ہو جائے گا۔ کہاں دو ڈھائی سو اور کہاں ساٹھ۔

وہ عبداللطیف کے قریب کرسی پہ ٹیک لگائے' انگلیاں بائیں گال تلے رکھے کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دوسری طرف اشعر آ کے بیٹھا۔

''میں نے پارلیمان میں آتے ہی سنا کہ آپ کے گھر چوری ہو گئی ہے؟ کاکا نے بھی نہیں بتایا۔'' تشویش سے اس کی طرف جھکے وہ بولا تو فاتح نے صرف ایک گہری نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"Who Cares?"

(پروا کسے ہے) اور سامنے دیکھنے لگا۔

اشعر البتہ ابھی تک تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''امید ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا ہو گا۔''

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مائیک درست کیا۔ اس کی تقریر کا وقت ہو چکا تھا۔ اشعر زیرِ لب مسکرا دیا۔

''جنابِ اسپیکر' مجھے کچھ کہنا ہے۔'' سوٹ میں ملبوس' مدھم مسکراہٹ لیے' وہ دراز قد اور اسمارٹ سا آدمی کہنے لگا۔ ''حکومتی اراکین کو چاہیے کہ وہ تحمل رکھیں۔ میں ان کو بور نہیں ہونے دوں گا۔''

ہال میں قہقہہ گونجا۔ دلچسپی بڑھی۔ توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی۔

''کل مجھ سے کسی نے کہا کہ آج اس بل کو ڈھائی سو ووٹ مل جانے ہیں' تو ہم ساٹھ اپوزیشن اراکین کے ''ناں'' میں ووٹ دینے کا کیا فائدہ؟'' وہ گردن گھما کے پورے ہال کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں ملائیشیا کے لوگوں کو آج ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میرے لوگ جب بھی ایک بڑے عدد کے مقابلے میں چھوٹے عدد کی مخالفت دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ان چند لوگوں کی ہاں یا ناں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ غلط سوچ ہے۔ کیونکہ مخالفت عددی نہیں' اصولی ہوتی ہے۔

ہم لوگ صوفیہ رحمٰن کے اس قانون کے خلاف ووٹ اس کو ہرانے کے لیے نہیں ڈال رہے۔ ہم اپنا اختلاف' اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے آئے ہیں۔ ہم تھوڑے ہیں مگر ہم ناں میں ووٹ دے کر سارے ملک کو پیغام دینے آئے ہیں کہ یہ جو ہو رہا ہے' یہ غلط

ہے.....ہمارے دین نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ اپنی کم تعداد سے گھبرائے بغیر ہم نے غلط کو غلط کہنا ہے..... اور اگر ہم یہ کہنا سیکھ لیں تو ہم میں سے ہر ایک' مخالف کے دس پہ بھاری ہوگا۔ کیونکہ صوفیہ رحمٰن صاحبہ صرف اپنی اور اپنے والد کی کرپشن کو چھپانے کے لیے....."

ہال میں شور گونجنے لگا.....تالیاں فقرے.....نعرے.....وان فاتح بھی مزید اونچا بولنے لگا.....

"اور اپنی چوری کو چھپانے کے لیے....." (حکومتی ارکان جگہوں سے کھڑے ہو گئے) "روز نت نئے بل لے آتی ہیں.....تا کہ لوگوں کو بے وقوف بنا سکیں....."

(لوگ کھڑے کھڑے ڈیسک بجانے لگے جس کا مطلب احتجاج تھا۔ فاتح کی آواز مزید بلند ہو گئی اور گردن پہلے سے زیادہ اونچی)

"مگر پردھان منتری صاحبہ.....یاد رکھیے گا.....جب تک وان فاتح رامزل زندہ ہے.....وہ آپ سے آپ کی چوری کا حساب مانگتا رہے گا.....اور ایک دن آپ کو اس ملک میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔"

کسی نے بل کی کاپیاں ہوا میں اڑائیں.....کسی نے فائلیں نیچے گرائیں.....اپوزیشن کے ساتھ اراکین کاغذ اچھالتے ہوئے نعرے بھی لگا رہے تھے۔

"اور اسی کے ساتھ ہم اس بل کی مخالفت میں ایوان سے واک آؤٹ کرتے ہیں۔" کہہ کے وہ مائیک پہ جھکا اور ڈیسک پہ دو دفعہ زور سے ہاتھ مارا' پھر سیدھا ہوا اور نشست کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

باریسن نیشنل کے اراکین کاغذوں کے پرزے اچھالتے اس کی معیت میں دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حکومتی اراکین شور کر رہے تھے اور اسپیکر مسلسل "بیٹھ جایئے' ایسے نہ کیجیے۔" کہہ کر معاملہ سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپوزیشن اراکین باہر نکلے تو وہاں کھڑے رپورٹرز دھڑا دھڑ تصاویر کھینچنے لگے۔ فاتح جو سب سے آگے تھا' مسکرا کے ہاتھ فضا میں ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"مسز عصرہ کا فون ہے سر!" وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب عثمان نے اپنا فون اسے لا دیا۔

فاتح نے فون کان سے لگایا۔ "کیا ہوا؟"

"تمہیں کال کر رہی تھی' تم اٹھا نہیں رہے تھے۔ فائل کا کچھ پتہ چلا۔" وہ فکر مند لگ رہی تھی۔

"تمہارے بھائی کو زیادہ پتا ہوگا۔" وہ لفٹ میں داخل ہوا۔

"وہ تالیہ..بلکہ ساتھ ہی اشعر کو بتائے گی اور اشعر بہت برا منائے گا کہ ہم نے تالیہ پہ شک کیا۔"

"شک کیا؟ مجھے یقین ہے یہ اسی کا کام ہے۔" وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔

لفٹ نیچے جا رہی تھی۔ عثمان خاموشی سے ساتھ کھڑا تھا۔

"کیا ہم اوریجنل فائل دوبارہ نہیں نکلوا سکتے؟ جب گھر تمہارے نام رجسٹرڈ ہے تو مسئلہ کیا ہے؟ وہ فائل اگر ایش نے چوری بھی کروائی ہے تو اب وہ تو ہمیں ملنے سے رہی۔"

"بہت وقت لگ جائے گا اس میں۔ خیر میں معروف ہوں۔ گھر آ کے بات کرتا ہوں۔" اس نے فون عثمان کی طرف بڑھا دیا۔ اب وہ اکتایا ہوا لگنے لگا تھا۔

"فارض کو ڈھونڈو۔ اس سے کہو مجھ سے پارکنگ میں ملے۔ ہرنوں کے پاس۔" کچھ سوچ کے بولا تو عثمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لفٹ کے دروازے کھلنے کو تھے۔ فاتح نے چہرے پہ وہی مسکراہٹ طاری کر لی۔

سیاستدان کا بزنس فیس.....

☆☆☆

بازار میں سرخ اینٹوں کی روش بنی تھی جس پہ

بھیڑ کے درمیان وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ سفید ہیٹ پہنے' سنہری چوٹی آگے کو ڈالے' تالیہ آگے تھی اور ایڈم پیچھے۔ وہ جس جارحانہ انداز میں جا رہی تھی' ایڈم بار بار اس کا غصیلا چہرہ دیکھ کے سوچتا کہ یہ تو جاتے کے ساتھ ہی جیولر کی گردن دبوچ لے گی.....

جیولری اسٹور پہنچتے ہی تالیہ سیدھی اندر گھس گئی۔ ایڈم پیچھے لپکا۔ شوکیس کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ تالیہ کو دیکھ کے وہ خوش اخلاقی سے مسکرا کے اٹھا۔

''السلام علیکم میڈم!'' کہیں پیچھے تیز پنکھے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام انکل۔ یہ میرا بھائی ابھی آپ سے انگوٹھی لے کر گیا تھا۔ بہت ہی جلد باز ہے یہ۔ مجھے بتائیے میں اس کا کیا کروں؟ آخر یہ کب بدلے گا؟'' وہ کرسی پہ بیٹھتے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ دوستانہ لہجہ' قدرے بچگانہ آواز۔ ایڈم محمد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ بالکل بھی غصے میں نہیں لگ رہی تھی۔

''اب دیکھیں نا..... ہماری ماں کا سکہ ہی بیچ دیا' وہ بھی اپنی بیوی کے لیے۔ جس دن سے اس کی شادی ہوئی ہے' ہم بہن بھائی تو مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ اب بتائیں' میں ماں کو کیا جواب دوں گی؟'' معصومیت سے پوچھتے ہوئے پلکیں جھپکیں۔

''وہ سکہ تو ہم نے پگھلا دیا میم۔'' سیلز مین متانت سے اس کے مقابل کھڑے ہو کر بولا۔

''ان چے (مسٹر).....'' وہ آگے کو ہوئی اور بے بسی بھری معصومیت سے بولی۔ ''وہ سکہ ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے اکلوتے ماں باپ ہیں۔ وہ شدید ناراض ہوں گے۔''

ایڈم بس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ منہ کھولے۔

''میم..... یہ صحیح کہہ رہا ہے' سکہ ہم نے پگھلا دیا ہے۔ ہم آپ کی رقم واپس کر سکتے ہیں' مگر سکہ نہیں۔'' ایک ادھیڑ عمر صاحب کونے سے اٹھ کے اس طرف آئے تو تالیہ نے مسکرا کے گردن موڑی اور دلچسپی سے ان کو دیکھا۔ پھر ہیٹ اتار کے شوکیس پہ رکھا۔

''آپ نے ناشتے میں انڈا کھایا تھا کیا؟''

ان صاحب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ''جی؟''

''آپ کی شرٹ پہ ادھر انڈے کا داغ لگا ہے۔ شاید آپ ناشتے کے بیچ میں تھے جب آپ کے اس ملازم نے آپ کو کال کر کے بتایا کہ ایک بے وقوف (ایڈم کی طرف اشارہ کیا) ایک اینٹیک سکہ لے کر آیا ہے اور آپ بھاگے بھاگے چلے آئے۔ جیولر اور اتنے آرام سے اینٹیک پگھلا دیں' میں کیسے مان لوں' ہوں؟'' پھر سے پلکیں جھپکیں۔

''بیٹے' مجھے واقعی سکے کی تاریخی اہمیت کا علم نہیں۔ ہم فوراً سونا پگھلا دیتے ہیں اور وہ اس نے میرے سامنے پگھلا دیا ہے۔'' وہ ڈٹے رہے۔

تالیہ نے کہنی شوکیس پہ رکھی اور ہتھیلی پہ گال جمایا۔

''میں پولیس کو بلا لوں' انکل؟''

''ہم نے قانونی طریقے سے انگوٹھی بنائی ہے' بل وغیرہ سب ہمارے پاس ہے۔ پولیس کیا کرے گی بیٹا؟''

''نہیں انکل' انگوٹھی کے لئے نہیں۔ ان پنکھوں کے لئے۔'' اس نے مسکرا کے ابرو سے اشارہ کیا۔ سب کی گردنیں مڑیں۔ کونے میں ایک دروازہ تھا جو دکان کے اندر کھلتا تھا۔ ادھیڑ عمر سیلز مین کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ''کیا مطلب؟''

''یہ دکان بالکل کونے میں ہے۔ الگ تھلگ سی اور اس کے بیسمنٹ سے پنکھوں کی آواز آ رہی ہے۔ آپ نے بیسمنٹ میں پنکھے کیوں چلا رکھے ہیں؟ ہوں۔ مجھے سوچنے دیں۔'' ہتھیلی پہ گال رکھے آنکھیں بند کر کے سوچا پھر کھول کے مسکرائی۔

''نیچے تہ خانے میں..... جڑی بوٹیاں اگاتے ہیں آپ' ہے نا..... نشہ آور بوٹیاں..... ڈرگز..... ان کی بو یہاں تک آ رہی ہے مجھے۔ تمہیں آ رہی ہے نا' بھائی؟''

ایڈم نے محض سر اثبات میں ہلایا۔ وہ بالکل چپ ہوگیا تھا۔ دونوں دکانداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''اب بازار کے لوگ تو آپ سے ڈرتے ہیں' کسی کو بتاتے نہیں' لیکن میں تو نہیں ڈرتی ' میں تو پولیس کو بلا سکتی ہوں۔ ہاں لیکن میں اتنی بری نہیں ہوں ۔ کیوں آپ کے رزق پہ پیر ماروں۔ اس لئے....'' دوسری ہتھیلی سیدھی پھیلائی ۔''میرا سکہ میرے ہاتھ پہ رکھ دیں اور سمجھیں کہ ہم نے آپ سے کبھی کچھ لیا ہی نہیں۔''

ادھیڑ عمر دکان کا مالک چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو تھیلی ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے تالیہ کے ہاتھ پہ رکھتا' ایڈم نے ''شکریہ'' کہہ کے وہ اس سے لے لی۔

''یہ واپس لے لیجیے۔'' سنجیدگی سے اس نے انگوٹھی والا بیگ پرے دھکیلا۔

''ارے میں اس کی پیمنٹ کر رہی ہوں۔'' تالیہ نے پرس کھولا مگر وہ باہر جا رہا تھا۔

''ضرورت نہیں۔'' وہ خشک لہجے میں کہہ کے نکل گیا تو تالیہ سنبھل کے مسکرائی اور ''تھینک یو انکل'' کہتی اس کے پیچھے لپکی۔

وہ باہر روش پہ چلتا جا رہا تھا۔ سنجیدہ' خاموش۔

''تمہارے موڈ کو کیا ہوا ہے؟'' ایڈم نے ایک خفا نظر اس پہ ڈالی۔ ''آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے جھوٹ بول دیے۔''

''کیا تم نے نور سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ میں نے تمہیں تحفے دے کر بھیجا ہے؟'' وہ سنجیدگی سے بولی تو ایڈم نے مڑ کے اسے دیکھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے' سر پہ ترچھا ہیٹ رکھے' وہ اندر والی بچگانہ سادہ لڑکی سے مختلف نظر آرہی تھی۔

''جی' آپ کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا تھا مجھے۔ لیکن آپ نے ایک ڈرگز کے چلتے کاروبار کو نظر انداز کر دیا اس سکے کے پیچھے۔''

''تو میں کیا کر سکتی تھی؟''

''آپ پولیس آفیسر ہیں' ان کو گرفتار کرتیں اور سکہ برآمد کر لیتیں۔''

''یہ میرا ڈپارٹمنٹ نہیں ہے۔ جو کام ضروری ہوتا ہے' اس پہ فوکس کیا جاتا ہے۔'' وہ روش کے درمیان میں کھڑے تھے۔ لوگ ان کے اطراف میں آ جا رہے تھے۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔

''مگر آپ....آپ اتنی آسانی سے جھوٹ کیسے بول لیتی ہیں؟''

''زندگی میں بولنا پڑتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے اس کے زچ چہرے پہ نظریں جمائے بولی۔ ''اب مجھے یہ سکہ دو تاکہ میں اس کو سرکار کو لوٹاؤں اور تمہارا بونس تمہیں دلواؤں۔'' ہتھیلی پھیلائی۔

''کیا آپ واقعی پولیس آفیسر ہیں؟ یونو' میں فورسز میں تھا۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں ان چیزوں کے بارے میں۔''

''اوہ۔'' تالیہ کے ابرو بھنچے۔ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ''تم مجھ پہ شک کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے' کرو شک' بلکہ ایسا کرو' یہ سکہ بھی تم ہی رکھ لو۔ میں رپورٹ لکھ دوں گی اور اس کیس سے الگ ہو جاؤں گی۔ آگے ڈپارٹمنٹ جانے اور تم جانو۔'' کہہ کے وہ غصے سے آگے بڑھ گئی۔

وہ کچھ خفا' کچھ الجھا ہوا مڑا۔ ''ہے تالیہ!''

تالیہ تیورا کے گھومی اور ان ہی برہم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں بھی جیولر کی طرح سکے کا لالچ آ گیا ہے' تم اپنے لیے رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو۔ اگر مجھ پہ اعتبار نہیں تو جو چاہے کرو۔ ہاں اگر اعتبار آ جائے تو مجھے فون کر لینا۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔'' پھر وہ رکی نہیں۔ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔

ایڈم نے اسے نہیں پکارا۔ وہ شش و پنج میں کھڑا رہا۔
بازار سے باہر نکلتے ہوئے اس نے داتن کا نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگائے' کار کی طرف آئی۔ اب وہ قدرے پریشان لگ رہی تھی۔

"سکہ مل گیا ہے' مگر وہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم کو مجھ پہ شک ہو رہا ہے۔ نہیں' میں اسے وہ چرا نہیں سکتی۔ اس کو چرایا نہیں جا سکتا۔ فی الحال ایڈم اس کا مالک ہے اور اسے وہ مجھے اپنی مرضی سے دینا ہوگا۔ اس کا شک کم ہوا تو وہ مجھے کال کرلے گا' نہیں تو کوئی اور حل سوچتی ہوں......" وہ کار میں بیٹھتے ہوئے کہہ ہی رہی تھی کہ مانوس سی رنگ ٹون سنائی دی۔

وہ چونکی۔ پھر جلدی سے پرس کھولا اور سیاہ سیل فون نکالا۔ حالم کا فون جس کی اسکرین پہ فارض کا نمبر چمک رہا تھا۔ تالیہ نے گہری سانس لی۔ اور داتن کا فون کاٹ دیا۔

"سنہرے بالوں والی ساری لڑکیاں خالی دماغ کی نہیں ہوتیں' تو انکو! اب وہ وقت آگیا ہے کہ آپ یہ بات سمجھ لیں۔"

تلخی سے مسکرا کے بڑبڑائی اور فون کان سے لگا لیا۔ "بولو فارض۔"

☆☆☆

پارلیمان کے اونچے ٹاور کے عقب میں ایک سبزہ زار بنا تھا جس کے گرد باڑ لگی تھی۔ اس کو ہرنوں کی پارکنگ کہا جاتا تھا۔ بہت سے کن چیل اور ہرن وہاں ٹہل رہے تھے۔ ایک زمانے میں چینی پارلیمنٹ کے اسپیکر ملائیشیا کے دورے پہ آئے اور ہرنوں کا تحفہ لائے تھے۔ یہ سارے ہرن ان ہی کی اولاد تھے اور یہیں رکھے جاتے تھے۔

فارض صاحب باڑ سے ٹیک لگائے منتظر کھڑے تھے جب انہوں نے وان فاتح کو سامنے سے آتے دیکھا۔ وہ تنہا آرہا تھا۔ مسکراتے ہوئے۔ عثمان یا گارڈز کے بغیر۔

"کیا آپ نے اپنا ذہن بدل دیا؟"

"میں تمہارے انویسٹی گیٹر کو ہائر کرنا چاہتا ہوں' لیکن catch (معاملے کا منفی رخ) کیا ہے؟"
مسکرا کے پوچھتے ہوئے وہ باڑ کے قریب آیا۔

دھوپ سارے ماحول کو جھلسا رہی تھی' ایسے میں ایک درخت تلے مادہ ہرن تین ننھے غزالوں کو لیے ستانے بیٹھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے وہ چاروں پارلیمنٹ کے دونوں ممبرز کو آمنے سامنے کھڑے گفتگو کرتے دیکھ رہے تھے۔

"کیچ؟" فارض نے اچنبھے سے پوچھا۔

"کم آن فارض۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ بلیک مارکیٹ کے کسی انویسٹی گیٹر کو ہائر کیا جائے اور کوئی کیچ نہ ہو۔"

"وہ قانونی طریقے سے کام کرتا ہے لیکن وہ رجسٹرڈ نہیں ہے' اپنا چہرہ نہیں دکھاتا' اور پیسے Bitcoin کے ذریعے لیتا ہے۔ Bitcoin لیگل ہوتا ہے۔" (یہ ایک ڈیجیٹل کرنسی ہوتی ہے جو ٹریس نہیں کی جا سکتی)

فاتح گردن موڑ کے دور سڑک کو دیکھنے لگا۔ اونچی عمارتیں....سڑک....دور تک پھیلا سبزہ ہرن ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر چہرہ واپس موڑا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے کال ملاؤ۔"

فارض نے فوراً فون نکالا اور نمبر ملایا۔ "وان فاتح تم سے بات کرنا چاہتے ہیں' حالم۔" اور پھر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"السلام علیکم!" اپنی بھاری آواز میں فاتح بولا تو دوسری جانب لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر مردانہ آواز ابھری۔

"سوچ رہا ہوں سیاستدان پہ سلامتی واپس بھیجوں یا نہیں' کیونکہ آپ لوگ پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن خیر....آپ مختلف دکھائی دیتے ہیں اس لئے وعلیکم السلام' وان فاتح رامزل۔"

بتائیے۔ حالم آپ کے لئے کیا کرسکتا ہے۔"
فاتح نے گہری سانس لی۔ "کم از کم سیاستدان یہ لوگوں کو فیس کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے حالم، وہ لاؤڈ فون سے مشینی آواز میں بات نہیں کرتے۔"
"مجبوری ہے جناب' آپ کی حکومتیں میرے جیسے لوگوں کی کمائی سے ٹیکس کاٹنے کے درپے ہوتی ہیں۔ اپنی اصل آواز کا رسک نہیں لے سکتا۔"
"ہوں۔ خیر تم بتاؤ.... تم کیا کر سکتے ہو میرے لیے؟" وہ اب آنکھیں چھوٹی کر کے دور سڑک پہ جمائے ہوئے تھا۔
مادہ ہرن ابھی تک بڑی بڑی آنکھوں سے اس کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے بچے البتہ گھاس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
"یہ تو منحصر ہے اس پہ کہ آپ مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہیں!"
"میرے گھر سے کل رات ایک فائل چوری ہو گئی ہے۔"
"ڈیپا پارک سٹی والے گھر سے؟" اس نے پروفیشنل انداز میں پوچھا۔ گویا معلومات نوٹ کر رہا ہو۔
فاتح نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ "ہاں۔ میرے کمرے کے لاکر سے۔"
"سیف کون سا ہے آپ کا؟"
"فائر سیف۔"
"وہ تو ریئر ارتھ میگنیٹ سے پانچ سیکنڈ میں کھل جاتا ہے' پاس ورڈ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ خیر۔ چوری کیا ہوا ہے؟"
"ایک فولڈر جس میں ڈاکومنٹس تھے۔"
"اس کی پہچان؟"
"نیلے رنگ کا ہے۔ میرے ملاکہ والے گھر کے کاغذات تھے۔ مجھے وہ ہر صورت چاہئیں۔" لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

جیسے حالم چونکا۔ "سن ہاؤ کا گھر؟" تیزی سے پوچھا۔
"ہاں.... وہی گھر۔"
"آخری دفعہ کاغذات کب دیکھے تھے آپ نے؟" حالم سنبھل گیا تھا۔
"کل صبح۔"
"اور چوری کا علم کب ہوا؟"
"آج صبح جب میں نے اپنا لاکر کھولا۔"
"یعنی چوبیس گھنٹے کی ونڈو ہے جس میں کسی نے آپ کا لاکر کھول کے پیپرز نکالے۔ کوئی نشان' کوئی زور زبردستی کے آثار؟ ملازموں کو زدوکوب کیا گیا ہو؟"
اس کے سوالات فاتح کو مزید مطمئن کر رہے تھے۔ "اونہوں۔ صفائی سے کام کیا گیا ہے۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوا۔"
"اور یہ ڈاکومنٹس کب تک واپس چاہئیں آپ کو؟"
"کل صبح تک۔"
"مل جائیں گے۔" وہ اتنے آرام سے بولا تو فاتح ہلکا سا حیران ہوا۔
"اتنی جلدی کیسے ڈھونڈو گے تم؟"
اس کی حیرت پہ ساتھ کھڑے فارض صاحب تفاخر سے مسکرائے جیسے اپنے انتخاب پہ فخر ہوا ہو۔
"وان فاتح.... کبھی کوئی میجک شو دیکھنے گئے ہیں آپ؟"
"شاید۔" اس نے شانے اچکائے۔
"لوگ جادوگروں کے تماشے دیکھنے کیوں جاتے ہیں؟ حیران ہونے کے لئے.... دھوکہ کھانے کے لیے... amazed ہونے کے لیے۔ اگر جادوگر آپ کو amaze (حیران) نہیں کر رہا' اگر وہ آپ کو دھوکا نہیں دے پا رہا' اگر آپ کو اس کی ٹرک پہلے سے معلوم ہو گئی ہو' تو وہ اچھا جادوگر نہیں ہوتا۔

آپ بور ہوتے ہیں۔ آپ کو مزا نہیں آتا۔ اس لیے آپ کو میرا طریقہ کار معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میرے پاس دھوکا کھانے آئے ہیں' حیران ہونے' فرکڈ ہو جانے.... اگر آپ کی تشفی نہ ہوئی تو میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔"

"چلو.... دیکھتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "تمہارے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔"

"آخری سوال' آپ کو کسی پہ شک ہے؟ کون یہ کام کر سکتا ہے۔"

"تم جادوگر ہو' تم اپنے جادو سے خود معلوم کرو کہ کون یہ کر سکتا ہے۔" وہ جیسے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"پھر جادو دیکھنے اور حیران ہونے کے لیے تیار ہو جائیے' وان فاتح!" حالم کا جواب اسی کے انداز میں آیا۔ "اور ہاں... اگلی دفعہ مجھے اپنے نمبر سے فون کیجیے گا۔ مجھے درمیانی لوگ پسند نہیں۔"

"اور تمہاری فیس!"

"وہ کام کے بعد ہو گی اور.... میری مہارت اور آپ کی شخصیت کے مطابق ہو گی۔ خدا حافظ!" کال کٹ گئی۔

فاتح کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ ستائشی انداز میں ابرو اچکا کے فون فارس کی طرف بڑھایا۔

"کون ہے یہ آدمی؟ آئی لائیک ہم!"

"جو بھی ہے کمال ہے!" وہ بھی خوش دلی سے مسکرا کے بولے اور اس کے ہمراہ آگے کو چل دیے۔

واپس جاتے ہوئے فاتح کی مسکراہٹ قدرتی تھی۔ جیسے وہ خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا ہو۔ جیسے عرصے بعد کسی سے بات کر کے اتنا لطف آیا ہو۔

مادہ ہرن ابھی تک آنکھیں کھولے سپاٹ سی ان دو افراد کو دیکھ رہی تھی جو دور ہوتے جا رہے تھے۔

دور بازار کے پارکنگ میں کار میں بیٹھی تالیہ نے سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون بند کیا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"عصرہ کو ایک واضح پیغام دینے کا وقت آ گیا ہے۔" اس نے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے اور کار سڑک پہ ڈال دی۔

☆☆☆

وہ دو رویہ سرمئی سڑک تھی۔ دونوں اطراف لکڑی کی اونچی دکانیں اور ریستوران بنے تھے۔ یہ کسی زمانے میں دو منزلہ گھر ہوتے تھے' اب جدید تراش خراش کے بعد ان کو دکانوں میں بدل دیا گیا تھا۔ عصرہ کی گیلری بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

گیلری کے اندر کھلا سا ہال بنا تھا۔ کسی شاپنگ مال کی طرح بالائی دونوں منزلوں کی بالکونیاں یہاں سے نظر آتی تھیں۔ چھت بہت اونچی تھی۔ سیاح آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے نوادرات دیکھ رہے تھے۔

عصرہ کا آفس دوسری منزل پہ تھا مگر اس وقت وہ آفس میں نہیں تھی۔ وہ اسٹور یج روم میں اپنی نگرانی میں سامان کو پیک کروا رہی تھی۔ ارد گرد اسٹاف کام میں لگا دکھائی دیتا تھا۔

"سیکیورٹی ٹیگو کو ڈبل چیک کریں۔ ان چے وکرم...." اس نے مڑ کے ایک انڈین شخص کو پکارا۔ (جیسے چے سے مراد "مس" ہے ویسے ہی "ان چے" سے مراد مسٹر ہے۔) "آپ سے میں یہ توقع کرتی ہوں کہ میرے کسی آرٹ پیس کو نیلامی کی جگہ پہنچنے سے قبل آنچ بھی نہیں آئے گی۔"

"میم! تالیہ بنتِ مراد آئی ہے۔" سیکرٹری نے اندر جھانکا تو عصرہ بری طرح چونکی۔ پھر گہری سانس لی۔

"اسے آنا ہی تھا۔ اسے میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ مجھ پہ چیخے چلائے تو باہر کے لوگ اس کی آوازیں سنیں۔"

"آفس میں ہی بٹھایا ہے' لیکن وہ چیخے گی کیوں؟ وہ تو گیلری کے بڑے ڈونرز میں سے ہے۔" سیکرٹری الجھی۔

"فاتح نے صبح اس کی بے عزتی کی ہے۔ مجھے

لجاجت سے اس سے معذرت کر کے یہ معاملہ ختم کرنا ہوگا۔" عصرہ نے پرس سے ننھا آئینہ نکالا' اسٹائل سے ناک اور گال پہ میک اپ درست کیا۔ کوٹ کو نیچے کھینچ کے شکنیں درست کیں' پھر چہرے پہ فکر مندی کے تاثرات سجائے اور باہر نکل آئی۔

ہال عبور کر کے وہ اوپر آئی تو اچھی خاصی فکر مند لگ رہی تھی۔ تالیہ کو دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے دیکھا تو اندر قدم رکھتے ہی شروع ہوئی۔

"آئی ایم سو سوری تالیہ.... مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے پیچھے یہ سب ہو جائے گا۔" وہ اپنی سیٹ کی طرف آتے ہوئے بے حد دکھی انداز میں کہہ رہی تھی....

"السلام علیکم مسز عصرہ.... میں اچھی خبر لائی ہوں۔" تالیہ مراد خوشگوار چہرے کے ساتھ چہکی تو عصرہ کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ٹھہر کے تالیہ کا چہرہ تکنے لگی۔

وہ صبح والا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی' سنہری چوٹی آگے کو ڈالے' سر پہ ہیٹ ترچھا رکھے' گلابی گالوں والی پیاری سی لڑکی مسکراتے ہوئے بہت پُرجوش لگ رہی تھی۔

"میری کانگ ہو سے بات ہوئی ہے' وہ سکوں کی شرط رکھے بغیر بھی آنے کو تیار ہیں اور آپ جانتی ہیں' کانگ ہو کے آنے کا مطلب ہے وہ دو تین بڑے ڈونرز کو ساتھ میں لائیں گے۔ میں سوچ رہی تھی کہ.... آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیں۔"

آخر میں ذرا حیرت سے بولی تو ششدر کھڑی عصرہ سنبھلی' پھیکا سا مسکرائی اور اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھی۔ آنکھیں ابھی تک حیران اور الجھی ہوئی تھیں۔

"اچھا صبح میں نے پینٹنگ کو فائنل ٹچ دے دیا تھا۔ یہ ایک کارپینٹنگ شاپ کا ایڈریس ہے۔" ایک کارڈ میز پہ رکھا۔ "ہے تو پرانی چھوٹی سی شاپ مگر آپ کے پورٹریٹ کی اس آدمی سے لاجواب فریمنگ کوئی نہیں کر سکتا۔ چونکہ نیلامی سر پہ آن پہنچی ہے' آپ اس کو آج ہی بلوا بھیجیے گا۔"

"شیور!" عصرہ زبردستی مسکرائی۔ تشویش بھری آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ "صبح میں گھر واپس آئی تو پورٹریٹ دیکھ لیا تھا... مگر تم جا چکی تھیں۔ ملازم بتا رہے تھے کہ فاتح نے شاید تم سے بات وغیرہ کرنی تھی؛ میرے آنے تک وہ بھی جا چکا تھا' ملاقات نہیں ہو سکی۔" وہ غور سے اسے دیکھتے سرسری سا بولی گویا پانی کی گہرائی ناپنا چاہی۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔ "جی' انہوں نے مجھے اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے' وان فاتح کا کیرزما اور سحر ہی اتنا ہے کہ میں تو سارے الفاظ ہی بھول جاتی ہوں۔ کہاں سوچا تھا میں نے کہ میں وان فاتح کے سامنے بیٹھ بھی سکوں گی۔"

عصرہ نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا۔ اچنبھے بھری آنکھیں تالیہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ "خیریت سے بلایا تھا اس نے؟"

"جی... کچھ زیادہ بات نہیں کی انہوں نے۔" اس نے گویا لاعلمی سے شانے اچکائے۔ "وہ مجھے ہانگ تواکی کہانی سنا رہے تھے۔ سارا جیوا ملایو کی ایک داستان۔ میں تو ہر دفعہ اتنی سٹار اسٹرک ہو جاتی ہوں کہ ان کی آدھی بات سن ہی نہیں پاتی۔ اور ہاں..." اس نے پیشانی کو چھو کے جیسے یاد کیا۔ "انہوں نے مجھ سے کہا کہ اشعر صاحب کے پاس ان کی کوئی فائل ہے جو میں اشعر صاحب سے واپس لا دوں۔ میں تو بس لیس سر کرتی رہی' ورنہ سب میرے سر سے گزر گیا۔ اب اشعر صاحب سے میری اتنی فرینک نیس کہاں۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے۔ بہر حال ان سے ملنا اور بات کرنا ہی اتنا آنر ہوتا ہے کہ بس۔" آنکھیں میچ کے مسکراتے ہوئے کھولیں' جیسے بچے کسی بات کا مزا لیتے ہیں۔

"خیر' مجھے کہیں جانا ہے تو آپ اس کارپینٹر کو

بلوا لیجیے گا۔ میں نے ایک فرنچ کرنٹک سے بات بھی کی ہے' اگر وہ اگلے ہفتے ملائیشیا میں ہوئی تو وہ بھی اٹینڈ کرلے گی نیلامی۔ وہ اکثر یہیں ہوتی ہے۔" مسکراتے ہوئے بیگ اٹھایا اور کھڑی ہوگئی۔"ان شاءاللہ نیلامی پہ ملاقات ہوگی۔"

عصرہ نے بدقت سر اثبات میں ہلایا۔ جگہ سے نہیں اٹھی۔ "فاتح ذرا مختلف طبیعت کا ہے تو.... آئی ایم شیور اس کی بات کا کوئی غلط مطلب نہیں ہوگا۔"

"کس بات کا؟" وہ انجانے پن سے بولی تو آنکھوں میں سادگی تھی۔

عصرہ جبراً مسکرائی اور کارڈ اٹھا لیا۔ "کچھ نہیں۔ میں ابھی.... اس کو.... بلوا لیتی ہوں' رائٹ۔"

"صحیح!" تالیہ مسکرا دی اور پھر باہر چلی آئی۔ نکلنے کے ساتھ ہی چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہوگئے۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پہ چڑھا لیا' اور گزرتے گزرتے راہداری میں رکھے فلور لیمپ کو پیر سے ٹھوکر ماری۔ لیمپ اوندھا زمین پہ آگرا۔ دو ورکرز لیمپ کی طرف دوڑے تھے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔

اندر عصرہ اپنے آفس میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ چپ۔ بالکل چپ۔ تب ہی کسی افتاد کی طرح سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔

"مس تالیہ تو آپ سے اتنی اچھی باتیں کررہی تھیں' مگر جاتے جاتے انہوں نے کارنر لیمپ کو گرا دیا۔"

"اچھی باتیں؟" عصرہ نے سلگتی کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ "وہ صرف مجھے ایک پیغام دینے آئی تھی۔"

سیکرٹری کے لب حیرت سے کھل گئے۔ "وہ کیا؟"

"وہ یہ کہنے آئی تھی کہ وہ ان گیمز میں مجھ سے زیادہ اچھی ہے' اور یہ کہ وہ ایک بہت خطرناک لڑکی ہے' مجھے اس سے ڈرنا چاہیے۔" اس نے بے اختیار کنپٹی چھوئی۔ "یہ لڑکی کسی چیز کے پیچھے ہے۔ اسے کچھ چاہیے۔ یہ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں اسے روک نہیں سکتی۔" وہ بے بسی بھرے غصے سے ہتھیلیاں آپس میں ملتی شدید ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔

نیچے تالیہ مراد ہال عبور کرتی نظر آرہی تھی۔ ہیل کی ٹک ٹک سارے میں گونج رہی تھی۔

گیلری سے نکلتے ہی تالیہ نے پرس سے ایک ننھا ایئر پیڈ نکالا اور کان میں ڈالا۔ پھر سیدھی کار کی طرف چلتی گئی۔

"تم کہاں تھیں' تالیہ؟" آلے سے داتن کی آواز گونجی۔

"میں عصرہ کو وارن کرنے گئی تھی۔ اور اب میں اس کے بھائی کے پاس جارہی ہوں۔ تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟" وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نے الارم کمپنی کی طرف سے جاکر وان فاتح کے گھر سے ملحقہ اسٹریٹس کے کیمرے چیک کیے ہیں.... اور بوجھو مجھے کیا ملا؟" داتن مزے سے کہہ رہی تھی۔ "رات کو عصرہ چند منٹ کے لئے واک کرنے نکلی تھی اور اس نے جوگرز کی جگہ سینڈل پہن رکھے تھے۔ وہ کسی اسٹریٹ میں غائب ہوئی جہاں کیمرہ نہیں تھا' اور دو منٹ میں ہی واپس آگئی۔ اس کی شال میں مجھے لگتا ہے کہ اس نے فائل چھپا رکھی تھی۔"

"یعنی اس اندھیرے کارنر میں اس نے فائل کسی کو ڈراپ کی؟"

"یقیناً اشعر کا کوئی آدمی ہوگا۔"

"کوئی ویڈیو.... کوئی تصویر جس میں وہ فائل دیتے دکھائی سے رہی ہو؟"

"نہیں تالیہ' لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اشعر کے خاص بندوں کا فون ٹریس کروالوں کہ وہ رات کو اس جگہ آئے تھے یا نہیں' اور...."

"داتن ریلیکس.... ہم انویسٹی گیٹر نہیں ہیں۔ اس لئے کسی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی تو واتن لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔

"تو پھر ہمیں کرنا کیا ہے؟"

"وہی جو ہمیں آتا ہے۔ یعنی چوری۔" اس نے کار سڑک پہ ڈال دی۔ لمبی سرمئی سڑک اطراف میں درختوں کی لمبی قطار کے باعث چھایا میں تھی۔

"لیکن ہمیں یہ کون بتائے گا کہ فائل کہاں ہے؟"

"اشعر بتائے گا۔" اس نے گلاسز اتارے اور مسکرا کے اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے موڑ کاٹا۔

چند لمحوں بعد وہ سیاہ موبائل اسٹینڈ پہ لگائے' اسپیکر آن کیے ہوئے تھی۔ فاتح کا نمبر ملا رکھا تھا اور گھنٹی جا رہی تھی۔

"ہیلو؟" اس کی بھاری آواز کار میں گونجی تو تالیہ کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"غالباً فارض نے آپ کو میرا نمبر دے دیا تھا تب ہی آپ نے کال اٹھالی ورنہ میں نے سنا تھا آپ غیروں کی کیا' اپنوں کی کال بھی نہیں اٹھاتے۔"

دوسری جانب سے گہری سانس لی گئی۔ "سنی سنائی سے زیادہ فرسٹ ہینڈ انفارمیشن پہ بھروسہ کیا کرو حالم!"

(اور آپ نے عصرہ کی سن کے جو مجھ پہ الزام لگا دیا وہ؟) مگر بولی نہیں' صبر کر گئی۔

"تو جادوگر کے شو کے لئے تیار ہیں آپ؟"

"ابھی تک تمہارا شو شروع نہیں ہوا کیا؟ تم نے تو صبح تک فائل واپس کرنی تھی۔"

"کوئی بھی جادوگر اپنے اسسٹنٹ کے بغیر کرتب نہیں دکھاتا لیکن اسسٹنٹ کے علاوہ بھی ایک کام وہ کرتا ہے۔ حاضرین میں سے وہ کسی ایک کو بلاتا ہے اور اس کو کوئی کام کرنے کے لیے کہتا ہے۔ کیا آپ کرتب کا حصہ بننا چاہیں گے؟"

"میں کسی سے احکامات نہیں لیتا' حالم!" وہ بے نیاز تھا۔

"مگر اپنی فائل کے لیے آپ کو میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی' جیسے حاضرین میں سے آیا شخص اسٹیج پہ آتے ہی جادوگر کے تابع ہو جاتا ہے۔"

"حالم....اگر تمہیں یقین ہے کہ تم میرا وقت ضائع نہیں کر رہے' تو میں یہ کروں گا' ورنہ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"آپ نے مجھے ایک بہت چھوٹا دورانیہ دیا ہے کام کا۔ اس لئے آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔ کچھ دیر بعد میں آپ کو ٹیکسٹ کروں گا' عین اسی وقت آپ ایک کام کریں گے۔"

وہ ساری تفصیل بتاتی گئی۔ حالم کا روایتی گھمنڈی انداز سمجھانے والے انداز میں بدلتا گیا۔ یہ پہلا کلائنٹ تھا۔ جس کے لیے لہجہ نرم ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے سامنے سر اور دل دونوں جھک جاتے تھے۔ وہ تو انکو تھے۔

"شیور۔ میں کر دوں گا۔ لیکن ٹیکسٹ مت کرنا' میرے فون پہ رنگ کرنا۔ میں میٹنگ میں ہوں تو فون نہیں دیکھتا۔" وہاں ازلی بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

"رائٹ' سر!" وہ ضبط سے بولی اور اسٹینڈ پہ لگے فون کی اسکرین پہ انگلی پھیری۔ کال ختم ہو گئی۔ منہ میں کچھ بڑبڑا کے سر جھٹکا اور نظریں سڑک پہ جما دیں۔

☆☆☆

ایڈم محمد اس سکے کو جیب میں لیے جانے کتنی دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا تھا۔ گھر آیا تو ننھا باغیچہ گرمی میں جھلس رہا تھا۔ مرغی ڈربے میں کسی کونے میں چھپی بیٹھی تھی۔ پھول مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ تھکا ماندہ اندر داخل ہوا تو ماں راہداری میں کچن کے دروازے پہ کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کے آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"تم جلدی آ گئے۔ خیریت؟"

"بداللہ خلاف توقع آج واپس آ گیا ہے' اس

لئے میری چھٹی ہوگئی۔"

"مگر ایڈم... میری تو ابھی دس منٹ پہلے عبداللہ کی والدہ سے بات ہوئی ہے۔ عصرہ نے اس کو بلوایا تھا' مگر بس نہ ملنے کی وجہ سے وہ کل صبح تک ہی آپائے گا۔"

ایڈم وہیں ٹھٹک کے رک گیا۔ "نہیں' مسز عصرہ نے کہا کہ وہ آچکا ہے۔ اسی لئے تو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی اور وجہ سے نہیں بھیجا؟" ایبو تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ایڈم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کیسی دنیا تھی یہ؟ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا؟ وہ گم صم سا ہو گیا۔ پھر الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

برآمدہ دھوپ سے محفوظ تھا۔ وہاں چھایا تھی۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور ننھے باغیچے کو دیکھنے لگا۔ پیر بھینچی صورت میز پہ رکھ لیے۔ چہرہ سوچ میں ڈوبا لگتا تھا۔

پھر اس نے فون نکال کے ڈرائیور کا نمبر ملایا۔ ڈرائیور ساری سیاستوں اور اندر کی سازشوں سے بے خبر ہوتا تھا۔ نہ اس کا اتنا عہدہ تھا' نہ مقام کہ اسے کوئی شریک کرتا۔

"ایڈم' تم آج آئے کیوں نہیں؟" وہ اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گیا۔ "فاتح صاحب پارلیمنٹ جاتے وقت ہمیشہ دو کپ کافی کے پیتے ہیں۔ عثمان بھول گیا تھا' اس نے صرف ایک دیا۔ یہ کیا طریقہ ہے۔" اپنی طرف سے ڈرائیور نے رعب جھاڑا۔

"وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟"

"ابھی میں ان کو گھر لایا ہوں' پھر یہاں سے ہم نے آگے جانا ہے۔ باڈی مین کا فرض بھی عثمان ادا کر رہا ہے۔ تمہارا پوچھا بھی تھا فاتح صاحب نے۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن سنو۔" وہ احتیاطاً سے پوچھنے لگا۔ "آج گھر میں کچھ ہوا ہے کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"کوئی غیر معمولی واقعہ؟ کوئی ایشو؟ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے....."

"صبح فاتح صاحب کی اہم فائل چوری ہو گئی۔ ملازمہ بتا رہی تھی کہ صاحب نے وہ جو پینٹر لڑکی آتی ہے' اس سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ صاحب بہت غصے میں تھے صبح۔ ادھر پارلیمان میں سب کو پتہ تھا۔ دو تین ڈرائیورز نے تو مجھ سے بھی آکے پوچھا۔"

"چے تالیہ سے؟" اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "صاحب نے چے تالیہ سے پوچھ گچھ کی؟"

"ملازم کہہ رہے ہیں کہ صاحب کو شک ہے چے تالیہ نے ہی چوری کی ہے۔"

وہ اتنا ہی باخبر تھا جتنا ہر ڈرائیور ہوتا ہے۔ ایڈم کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"میں آتا ہوں" کہہ کے فون رکھا اور باہر کو بھاگا۔

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ گھنٹی بجاتے ہی گارڈ باہر نکل آیا۔ "تمہارا کام ختم ہو چکا ہے' ایڈم' تم کیوں آئے ہو؟" گارڈ کو شاید ایڈم کو اندر نہ آنے دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔

"مجھے فاتح صاحب سے ملنا ہے۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"ایسے تو صاحب نہیں ملتے۔ وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔"

"صرف پانچ منٹ کے لئے ملنے دو' میں چلا جاؤں گا۔" ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ آٹو میٹک گیٹ کھلتا چلا گیا۔ ایڈم نے چونک کے دیکھا۔

فاتح کی کار باہر نکل رہی تھی۔ فاتح پچھلی سیٹ پہ سر جھکائے' عینک لگائے' موبائل دیکھ رہا تھا۔ البتہ ڈرائیور نے ایڈم کو دیکھ کے کار آہستہ کر دی۔ ایڈم بھاگ کے فاتح کی کھڑکی تک گیا۔ بے چینی سے دستک دی۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا' پھر بٹن پہ

لٹکی رکھی۔

شیشہ نیچے ہوتا گیا۔

"تم کہاں تھے صبح سے ایڈم؟" اس نے سادگی سے پوچھا تو اگلی سیٹ پہ بیٹھا عثمان پورا گھوم کے تیزی سے بولا۔

"سر! عبداللہ نے پہنچ جانا تھا تو اس کو فارغ کر دیا۔"

"کیا میں نے تم سے پوچھا ہے' عثمان؟" وہ اسی سنجیدگی سے عثمان کو دیکھ کے بولا تو وہ چپ ہو گیا۔

فاتح نے گردن اس کی طرف موڑی۔ "اور تم ٹھیک ہو' ایڈم؟"

"جی سر!" وہ جلدی سے بولا۔ "سر عبداللہ ابھی تک نہیں آیا' کیا میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔" وہ کار کی کھڑکی کو پکڑے کھڑا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے' ایڈم۔ آئم فائن۔ تھینکس۔ خیال رکھو اپنا۔" نرمی سے کہہ کے فاتح نے ہینک اٹھائی تو ایڈم کو پیچھے ہونا پڑا۔

شیشہ اوپر ہوتا گیا۔ کار آگے بڑھ گئی اور وہ وہیں خالی ہاتھ کھڑا رہ گیا۔

"اب تم جاؤ۔" گارڈ اس کے سر پہ آ پہنچا۔ جیسے اسے نکالنے کی جلدی ہو۔

لیڈر جا چکا تھا۔ وہ رکتا بھی تو کس کے لیے۔ گرمی کی حدت بڑھ گئی تھی۔ وہ باہر سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ ذرا سی دیر میں پسینے سے پورا بھیگ گیا تو ایک جگہ درخت تلے فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے سکہ نکال کے دیکھنے لگا۔

وہ گول سنہری سکہ تھا جس کے دونوں طرف مظفر ال سلطان لکھا تھا۔ اس نے سکہ مزید اونچا کیا۔ اس کے گول دائرے کے ساتھ ننھے ننھے حروف تھے جو مٹ مٹ کے ابھر رہے تھے.... ایڈم کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دھوپ میں لمحے بھر کو وہ نظر آئے تھے۔ 1437۔ پھر وہ غائب ہوتے گئے۔

ایڈم بالکل سناٹے میں رہ گیا۔

یہ نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ یہ کوئی عجیب چیز تھی۔ اس نے جلدی سے سکہ ڈبے میں رکھ کے جیب میں ڈال دیا۔ پھر پریشانی سے سر پکڑ لیا۔

چے تالیہ سے وہ پہلی دفعہ کب ملا؟ جب وہ اس سکے کو تنگو کامل کے گھر میں اپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔ چے تالیہ نے دو ماہ وہاں کیوں نوکری کی؟ دو ماہ پہلے تو اسے نہیں معلوم ہو گا کہ وان فاتح نے اس گھر مہمان بن کے آنا ہے۔ کیا وہ اس سکے کے پیچھے تھی؟

ایک نئے خیال نے اسے چونکا دیا۔

کیا اس کا بار بار عصرہ کے گھر آنا.... یہ سب سکے کے لیے تھا؟ لیکن نہیں۔ وہ تو فاتح کی حفاظت پہ مامور ایک پولیس آفیسر تھی جس کو فاتح پہلے سے جانتا تھا بھی اس کو تاشہ کہتا تھا۔ لیکن ایک منٹ... اگر وہ پہلے سے اس کو جانتا ہوتا تو چوری کے بارے میں تالیہ سے پوچھ کچھ کیوں کرتا؟ اتنی کڑی پوچھ گچھ کی ہوتی تو ملازم گواہ ہیں نا اس کے!

اس کا ذہن شک اور یقین کے درمیان ڈول رہا تھا۔ بالآخر اس نے موبائل نکالا اور تالیہ کے نمبر پہ ایک پیغام لکھا۔ "ہم کب مل سکتے ہیں؟" اور بھیج دیا۔

اب اسے جواب کا انتظار تھا۔

☆☆☆

دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی۔ البتہ گرمی اور حبس ویسا ہی تھا۔ ایسے میں وہ نیلے شیشوں والا بزنس ٹاور سر اٹھائے کھڑا تھا جس کے انیسویں فلور پہ اشعر محمود کا آفس واقع تھا۔ انیسویں فلور پہ کشادہ سی لابی بنی تھی جس کے سامنے لفٹ کے دروازے اس وقت کھل رہے تھے اور تالیہ مراد باہر نکل رہی تھی۔

لباس بدل لیا تھا۔ گلابی قمیص پہ سیاہ منی کوٹ پہنے' کہنی پہ بیگ ڈالے' سنہری چوٹی کندھے پہ آگے گرائے اور سر پہ ترچھا سفید ہیٹ جمائے' وہ باہر آئی

اور ریسیپشن ڈیسک کے قریب رکی۔
"تالیہ بنت مراد.... مجھے اشعر محمود سے ملنا ہے۔"
"جی' ان کا آفس بالکل کارنر میں ہے۔" لڑکی نے ادب سے گائیڈ کیا تو وہ "ہوں" کہہ کے نخریلی امیر زادیوں کی طرح آگے بڑھ گئی۔ کن اکھیوں سے لابی کے صوفے پہ اخبار پھیلائے مطالعے میں منہمک داتن کو دیکھا مگر رکی نہیں۔
"فاتح وہ کردے گا نا جو تم نے کہا ہے؟" داتن اخبار سامنے رکھے آہستہ سے بولی۔ کان میں لگا آلہ دور جاتی تالیہ کو آواز پہنچا گیا۔
"حالم کی بات کون ٹال سکتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ اب وہ راہداری کے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔
اشعر کے آفس کے باہر بیٹھی سیکرٹری فوراً اٹھی۔
"چے تالیہ.... اشعر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
سیاہ منی کوٹ والی لڑکی نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سیاہ موبائل سے نمبر ملایا۔ دو گھنٹیاں اور کال کاٹ دی۔ اب وہ اشعر سے ملنے کے لیے تیار تھی۔
وہاں سے چند میل دور.... ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے کے اسٹوڈیو روم میں وان فاتح موجود تھا۔ سیٹ لگا تھا' کیمرے سیٹ ہو رہے تھے۔ اینکر اپنے کاغذات پڑھ رہا تھا' اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا کافی پیتے ہوئے سارا منظر نامہ دیکھ رہا تھا۔
تب ہی جیب میں رکھا فون تھرتھرایا تو اس نے نکال کے دیکھا۔ حالم کا نمبر دیکھ کے مسکرایا اور موبائل واپس رکھ دیا۔ پھر قریب کھڑے عثمان کو بلایا۔
"یہ کافی لے جاؤ۔ میں فریش ہو چکا ہوں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
"خیریت' سر؟" عثمان نے مسکرا کے اس کا تازہ دم چہرہ دیکھا۔
"ہاں۔ صبح ایک انویسٹی گیٹر کو ہائر کیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ فائل مل گئی ہے۔ اللہ کا شکر۔"
عثمان کا منہ کھل گیا۔ "واقعی؟ اصلی فائل؟ کہاں سے ملی؟"
"جس نے چرائی تھی اسی کے سیف سے۔"
مگ اس کی طرف بڑھا دیا اور سامنے دیکھنے لگا جہاں اینکر اپنی نشست پہ بیٹھ رہا تھا۔
عثمان پھیکا سا مسکرایا۔ "مبارک ہو' سر!" اور مگ لیے آگے بڑھ گیا۔
واپس اشعر کی آفس کی بلڈنگ میں آؤ تو لابی کے صوفے پہ بیٹھی' بظاہر اخبار پڑھتی داتن دبی آواز میں ہونٹ کم سے کم ہلائے کہہ رہی تھی۔
"اب تک وان فاتح نے اپنے سیکرٹری کے سامنے فائل مل جانے کا ذکر کر دیا ہوگا۔ وہ فوراً اپنے اصل خداؤں کو بتائے گا' اور وہ پریشان ہو کے اس جگہ جائیں گے جہاں فائل رکھی ہے۔ میں اس کا پیچھا کروں گی اور یوں وہ خود ہمیں فائل تک لے جائیں گے اور ہم اس کو چرا لیں گے۔"
تالیہ نے جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اندر اشعر کے آفس میں بیٹھی تھی۔
آفس بہت روشن تھا۔ دو متصل دیواریں شیشے کی تھیں۔ وہ بلڈنگ کا کارنر آفس تھا (اونچی عمارتوں میں بنے آفسز کا بہترین آفس کارنر آفس ہوتا ہے جہاں ایک کے بجائے دو دیواریں شیشے کی ہوتی ہیں اور وہاں سے سارے شہر کا نظارہ کرنا بہت دلفریب لگتا ہے۔)
اشعر ٹیک لگائے اپنی کرسی پہ براجمان مسکرا رہا تھا اور سامنے تالیہ مراد سنجیدہ سی بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ ہیٹ سر پہ ترچھا رکھا تھا۔
"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی' ان چے اشعر!" وہ ناخوشی سے کہہ رہی تھی۔ (ان چے یعنی مسٹر....)
"آپ کہیے چے تالیہ' میں آپ کے لیے کیا کر

سکتا ہوں۔" وہ مسکرا کے بولا۔ گہری چھوٹی آنکھیں تالیہ کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپ ایک معزز انسان ہیں' اور میں ایک سوشلائیٹ اور آرٹ لور ہوں۔ کوالالمپور کے آرٹ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں میرا ایک نام ہے' پہچان ہے۔ میرے کسی بھی قسم کے سیاسی عزائم نہیں ہیں' نہ مجھے سیاست میں دلچسپی ہے۔ اس لئے کل جو تصویر آپ نے ٹویٹ کی' اس کے بعد سے مجھے موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے جو میرے لئے تکلیف کا باعث ہے۔" وہ ڈسٹرب نظر آ رہی تھی۔

اشعر کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ "جی مجھے بھی وہ سب بالکل اچھا نہیں لگا۔ اب تصویر اتارنا برا لگتا ہے' لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میڈیا کی تو عادت ہے بات کا بتنگڑ بنانا۔"

"آپ کوشش کیجیے کہ اس کی سختی سے تردید کر دیں تاکہ میرے عزیز و اقارب کو اس سب سے تکلیف نہ ہو۔ میرا آپ کی فیملی کا حصہ بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"تردید بات کو مزید اچھالتی ہے۔ آپ سیاست نہیں سمجھتیں' چے تالیہ۔ خاموش رہنا اور نظر انداز کرنا بہتر ہے۔" وہ اب آگے ہو کے بیٹھا تھا اور سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں اس سیاست کو سمجھنا بھی نہیں چاہتی' ان چے اشعر۔ صبح وان فاتح نے بھی مجھ سے آپ کے حوالے سے باتیں کہیں جو مجھے اچھی نہیں لگیں۔ وہ کسی فائل کا ذکر کر رہے تھے پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ براہ مہربانی آپ لوگ اپنی سیاست میں مجھے نہ دھکیلیں۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میں آبنگ کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ وہ paranoid (احتیاط پسند) ہیں۔" وہ نرمی سے کہنے لگا تو تالیہ نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"مجھے سچ میں آپ کے باہمی مسائل میں دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف آرٹ آپ کی فیملی کے قریب لایا ہے۔"

"تو آپ کو آرٹ پسند ہے؟" وہ بات کو طول دیتے ہوئے مسکرا کے پوچھنے لگا۔ تالیہ ذرا سا مسکرائی۔ "ہر قسم کا آرٹ۔ چاہے وہ کینوس پہ بکھیرا جائے..... یا سٹیج پہ پرفارم کیا جائے یا کتاب میں کہانی کی صورت لکھا جائے۔ آرٹ حیران کرنے کا نام ہے۔ لوگ آرٹ دیکھنے پتا ہے کیوں آتے ہیں' ان چے اشعر؟ تاکہ وہ حیران ہوں۔ amazed ہوں۔ دھوکا کھائیں اور جب ان پہ دھوکا کھلے تو وہ ششدر رہ جائیں۔

لوگ عام زندگی میں ہر چیز پہلے سے جان لینا چاہتے ہیں تاکہ دھوکا نہ کھائیں' مگر آرٹ پہ وہ صرف حیران ہونے اور اپنا دماغ بھک سے اڑا دینے کے لئے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے نا؟"

"تو آپ کو لوگوں کو حیران کرنا اچھا لگتا ہے؟" وہ محظوظ ہوا۔

"جی! مجھے وہاں سے آنا اچھا لگتا ہے جہاں سے انہوں نے توقع بھی نہیں کی ہوتی۔" اس کی مسکراتی' چمک دار آنکھیں اشعر پہ جمی تھیں۔ "آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟"

اشعر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلندیوں پہ کھڑے ہو کے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔"

تالیہ نے دیکھا' اس کے عقب میں شیشے کی دیوار سے دور تک پھیلی اونچی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

دروازہ دستک کے ساتھ کھلا اور رلی نے اندر جھانکا۔ "سر.....سوری مگر ضروری بات ہے۔" ادھر داتن کان میں بولی۔ "رلی ابھی اٹھ کے گیا ہے۔ عثمان نے اسے بتادیا ہے شاید کہ فائل مل گئی ہے۔"

اشعر اس مداخلت پہ بدمزہ ہوا' ابھی خفگی سے رلی کو ٹوکنے والا تھا کہ تالیہ بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی

ہوئی۔"
آپ کام کیجیے۔ میں چلتی ہوں۔" انداز سنجیدہ اور لیا دیا سا تھا۔
اشعر نے گہری سانس لی' مسکرایا اور کھڑا ہو گیا۔
"اوکے۔ نیلامی پہ ملاقات ہوگی' چے تالیہ۔"
"سی یو۔" باہر آکر وہ سیل فون پہ بٹن دباتی چلتی آئی جیسے کوئی ضروری میل کر رہی ہو۔ اشعر کے آفس کے سامنے لاؤنج سا بنا تھا۔ وہ ٹائپ کرتے کرتے وہیں بیٹھ گئی۔
"میں تیار ہوں۔ جیسے ہی رلمی نکلے گا' میں اس کا پیچھا کروں گی۔" داتن کی آواز کان میں گونجی تو تالیہ جھٹکے سر کے ساتھ بولی۔ "اسے جلد ہی پریشان ہو کے نکلنا چاہیے۔"
ایک منٹ گزرا۔ دو منٹ۔ پانچ منٹ۔ بالآخر رلمی باہر آیا اور سیدھا اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا جو سامنے ہی تھا۔ کرسی سنبھالی اور کام کرنے لگا۔ تالیہ پریشان ہوئی۔ چند منٹ مزید گزرے۔ نہ اشعر آفس سے نکلا' نہ رلمی اپنی جگہ سے اٹھا۔ داتن بھی گڑبڑا گئی۔ اس کے کان میں بولی۔
"تالیہ.... یہ لوگ فائل چیک کرنے باہر کیوں نہیں نکلے؟ کسی بینک کی طرف' یا گھر کی طرف؟ کہیں تو رکھی ہوگی انہوں نے فائل۔"
تالیہ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ہرن جیسی آنکھیں جو اطراف کا ایکس رے کر لیتی تھیں۔ پتلیاں سکیڑ کے اس نے اشعر کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔
"یا شاید وہ فائل چیک کر چکے ہیں۔" اس کی سمجھ میں ساری بات آرہی تھی۔ "داتن.... فائل اس کے آفس میں ہی موجود ہے۔"
"اوہ!" داتن کی فکرمند آواز آئی۔ "آفس میں واردات کرنے کے لئے ہفتے بھر کی تیاری چاہیے۔ کوئی لمبا con کھیلنا پڑے گا۔"
"ہمارے پاس ہفتہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس چند منٹ ہیں۔ مجھے وہ فائل ابھی چرانی ہے۔"
"مگر تالیہ...."
"ساری زندگی میں نے لالچ میں چوریاں کی ہیں داتن۔ ساری زندگی میں نے پیسے کے لئے جھوٹ بولے ہیں۔ میں چور ہوں' جھوٹی ہوں' مگر مجھے پہلی دفعہ کسی سے وعدہ نبھانا ہے۔ تو انکو کے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ان کو کل صبح سے پہلے فائل دینی ہے تو دینی ہے۔ سروس باتھ رومز میں آؤ' ہمارے پاس پلاننگ کے لئے دس منٹ ہیں۔" وہ دبی آواز میں بولتی آگے بڑھ گئی۔ بجائے لفٹ کی طرف جانے کے' وہ ایک دوسری راہداری میں مڑ گئی۔ داتن نے گہری سانس لی۔ "وہ ایک بے نیاز سیاستدان ہے جو پرسوں تک تمہیں یاد بھی نہیں رکھے گا۔ شکریہ کہہ کے آگے بڑھ جائے گا۔ طاقتور سیاستدانوں سے محبت کرنے والی لڑکیاں ہمیشہ پچھتاتی ہیں' تالیہ۔" افسوس سے داتن بولی مگر تالیہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن نیا پلان سوچ رہا تھا۔
لابی کی گھڑی کی سوئیاں ٹِک ٹِک کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اسٹوڈیو میں کیمرے آن تھے۔ تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ تین اطراف میں سبز رنگ کے کارڈ بورڈ کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ انٹرویو ریکارڈ ہوتے وقت سبز کارڈ بورڈ لگایا جاتا تھا' اور بعد میں جب ٹی وی پہ دکھایا جاتا' تو سبز رنگ پہ مختلف مناظر ایڈٹ کر دیے جاتے۔
اینکر سنجیدگی سے بیٹھا' فاتح کو دیکھ کے سوال پوچھ رہا تھا.... "جب آپ وژن کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں بیس سال بعد کا ملائیشیا کیسا آتا ہے؟"
وان فاتح پراعتماد سا بیٹھا تھا۔ اس سوال پہ ہلکا

سا مسکرایا اور گویا ہوا۔ ''ملاکہ سلطنت جیسا۔ تمہیں معلوم ہے' جیفری' ملکہ میں ملائیشیاء کے لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ چھ سو سال پہلے کا ملاکہ کیسا تھا؟'' ......

اشعر کے آفس فلور کے سروس باتھ روم میں وہ دونوں کھڑی تھیں۔ تالیہ نے بیگ سنک کے سامنے اٹھا رکھا تھا' اور اندر سے کچھ چیزیں نکالتے ہوئے داتن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کے جواب میں اس کی تائید کر رہی تھی.......

''جیفری' چھ سو سال پہلے ملاکہ میں مسلمان سلاطین کی حکومت تھی۔ وہ سلطنت خطے میں ایک مضبوط اور طاقتور حیثیت رکھتی تھی۔

اس دور کے لوگ ہمارے جیسے نہیں تھے۔ کہتے ہیں وہ عظیم لوگ تھے مگر آج میرے ملک کے لوگوں کو ان سے زیادہ بہادر بننے کی ضرورت ہے۔'' .....

داتن باتھ روم کے کونے میں رکھے ڈسٹ بن میں اخبار پھاڑ پھاڑ کے ڈال رہی تھی۔ جب ڈسٹ بن بھر گیا تو اس نے لائٹر سے کاغذ کو سلگایا۔ جلد ہی اخبار نے آگ پکڑ لی۔ شعلے بلند ہونے لگے.....

''آج میرے ملک کے لوگ عجیب منفی رویوں میں ڈوبے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف ان کے مظلوم بننے سے ہوتی ہے۔ یہ کس نے ہم انسانوں کو ہر وقت مظلومیت کی چادر اوڑھے رکھنا اور ہمدردی تلاش کرنا سکھایا ہے.......؟''

باتھ روم ایریا میں داتن ڈسٹ بن کو آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی اور تالیہ اپنا لباس بیگ میں اڑس رہی تھی۔ اس وقت اس نے سیاہ ٹائٹس شرٹ' اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چست اور تیار۔ تیزی سے ہاتھ بیگ کی زپ بند کر رہے تھے پھر بیگ کندھے پہ ڈالا اور کونے والے ٹوائلٹ میں گھسی جس کے اوپر روشن دان کی جالی لگی تھی۔ وہ اوپر چڑھی اور وینٹ کا ڈھکن اتارا.......

''آپ صرف سوشل میڈیا کو ہی دیکھ لیں' جیفری۔ مجھے اکثر لوگ وہاں اپنے دکھوں کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کے پاس اگر تین چیزیں ہوں' رزق' عزت اور صحت اور وہ پھر بھی وہ غمزدہ ہو اور ہمدردی طلب کرتا نظر آ رہا ہو تو وہ ناشکرا ہوتا ہے......''

تالیہ نے روشن دان کی جالی اتار کے نیچے پھینکی اور بلی کی طرح اندر گھس گئی۔ اندر لمبی سرنگ سی تھی۔ یہ وینٹ تھے اور ہوا کے لئے ساری عمارت میں پھیلے تھے۔ اتنے چوڑے کہ وہ اس میں پیٹ کے بل لیٹ کے' رینگ رینگ کے آگے بڑھ سکتی تھی....

نیچے داتن ابھی تک آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی...

''میں جس ملک کا خواب دیکھتا ہوں وہاں مجھے لوگوں کو یہ سکھانا ہے کہ مظلومیت اور کمزوری کو خود پہ طاری کرنا چھوڑ دیں۔ نکل آئیں اس مائنڈ سیٹ سے کہ دنیا نے ہم پہ ظلم ڈھا دیا۔ خاندان والوں نے ہمارے ساتھ برا کر دیا۔ دوستوں نے یوں دھوکا دیا۔ ہم دکھی' ہم اداس۔ ہر وقت دوسروں سے ہمدردی مانگنا۔ یہ منفی رویے ہیں۔ ہمیں ان سے نکلنا ہوگا۔ مجھے ایسے لوگ بالکل اٹریکٹ نہیں کرتے جو چاہتے ہیں کہ لوگ ہر وقت ان کے غموں کی داستان سنتے رہیں۔''

داتن نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو دھواں باہر نکلا۔ وہ آگے آئی اور راہداری میں لگا فائر الارم کھینچ دیا۔ ساری عمارت الارم سے گونج اٹھی۔ موٹی عورت تیز تیز آگے چلتی گئی۔ ہر ڈسٹ بن کے ساتھ رکتی...لائٹر سے آگ جلاتی اور آگے بڑھ جاتی....سی سی ٹی وی وہ پہلے ہی جام کر چکی تھی...

''انسان بہت عظیم مخلوق ہے۔ اس میں بہت طاقت ہے۔ اسے تو ساری دنیا کو سنبھالنا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہی نہیں سنبھال پائے' کتنے دکھ کی بات

ہے! ہمیں اگر زندگی میں "خوشی اور کامیابی" حاصل کرنی ہے تو ہمیں ایک مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔"

"اور مثبت رویہ کیسے اپنایا جاتا ہے آپ کی نظر میں؟"

وینٹ کی اندھیری سرنگ میں وہ کہنیاں گھسیٹ گھسیٹ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ کندھے پہ چھوٹا بیگ بھی لاد رکھا تھا جس میں ضروری سامان تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد راستے میں کوئی جالی آتی اور وہ اس سے جھانکتی۔ نیچے آفسز کے کمرے نظر آتے جہاں ہڑبونگ مچی تھی۔ لوگ فائر الارم سن کے چیزیں سمیٹ رہے تھے' باہر بھاگ رہے تھے۔

"مثبت رویہ ماضی کے دکھوں اور پچھتاووں سے نکلنے کا نام ہے۔ اگر آپ سے کچھ غلط کام سرزد ہوا ہے ماضی میں' اور سب سے ہی ہوتا ہے' تو اس پہ معافی مانگ کے اس سے سبق سیکھیں اور اس پہ ہر وقت کڑھنا چھوڑ دیں۔ آپ انسان ہیں' آپ سے ہر وقت سیدھا نہیں چلا جا سکتا۔ چند ایک بار اگر گر بھی گئے تھے آپ تو اس کو بھول جائیں اور آگے کا راستہ دیکھیں۔"

اشعر کے آفس کے عین اوپر وہ وینٹ میں رینگتے رینگتے پہنچ چکی تھی۔ اب اس کی کہنیوں تلے چوکور جالی تھی جس سے آفس نظر آرہا تھا۔ اشعر چیزیں سمیٹتا اٹھ رہا تھا۔ باہر سے اس کو سیکرٹری بلا رہی تھی۔ فائر الارم مسلسل چنگھاڑ رہا تھا.....

"اور اگر آپ کو ماضی میں بڑے بڑے غم ملے ہیں تو ان کے پچھتاوے سے نکل آئیں۔ غلط فیصلوں پہ دکھی ہونا چھوڑ دیں۔ زندگی میں کوئی بھی چیز برا تجربہ نہیں ہوتی اگر آپ اس سے سبق سیکھ لیں۔ یہ ہوتی ہے مثبت اپروچ۔ جو برا ہوا ہے آپ کے ساتھ یا جو برا آپ نے کیا ہے..... دونوں سے سیکھنے کے پہلو نکالیں' سبق حاصل کریں اور ریلیکس ہو جائیں۔ پھر وہ تجربہ آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔"

اشعر موبائل اور والٹ لیے باہر بھاگ گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ آفس خالی ہو گیا۔ تالیہ نے وینٹ میں لیٹے لیٹے بیگ سے ایک آلہ نکالا اور بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر لگی اور آفس کے دونوں سی سی ٹی وی کیمرے بجھ گئے۔ اس نے جالی اتاری اور نیچے کود گئی۔ عین اشعر کی میز پہ۔ چہرے کو وہ سیاہ ski ماسک سے ڈھانک چکی تھی۔

"میں چاہتا ہوں میرے ملک کے لوگ دوسروں کو ہر وقت الزام دینا اور مظلوم بننا چھوڑ دیں۔ یہود و نصاریٰ نے ہمارے ملک کی ترقی روک رکھی ہے' کفار ہمارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں' ان بے کار باتوں سے نکل آئیں۔ اگر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی تو یہ اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ لوگ تو ہر قوم کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ تو پھر دوسری قوموں نے ترقی کیوں کر لی؟ یہ آئینہ دیکھنے کا وقت ہے۔ اپنی غلطیاں بحیثیت قوم مان لینے کا وقت ہے۔"

تالیہ مراد اب اشعر کے آفس کی میز کا ایک ایک دراز کھول کے چیک کر رہی تھی۔ ہاتھوں پہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔

اللہ نے انسان میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ کامیاب آدمی کون ہوتا ہے بھلا؟ وہ جو ماضی کے غم سے نکل آتا ہے اور مستقبل کے بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے۔ ہمارے خواب اتنے بڑے اور انوکھے ہونے چاہئیں' جنیفر ی یکہ وہ ہمیں ڈرائیں۔ پہلی دفعہ ان کو سوچ کے بھی خوف آئے۔ انسان صرف چھوٹے موٹے خوابوں کے لیے نہیں پیدا ہوا۔"

وہ اب دیواروں کی پینٹنگز ہٹا ہٹا کے دیکھ رہی تھی۔ نوے فیصد لوگ آفسز میں سیف کی پینٹنگ کے پیچھے بناتے تھے۔ مگر پینٹنگز کے پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ سارے آفس میں کوئی سیف نہ تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی اور آنکھیں بند کیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کرسکتے

کلام روح کا مرہم ہے
اور سماعت کی عمدگی سے تعلق رکھتا ہے
اور شہد اور اسم صرف ان کے دلوں پر اثر
کرتے ہیں
جو دکھ اور درد سے آشنائی رکھتے ہوں
کان رکھنے والے تمام جاندار عمدہ سماعت بھی
رکھتے ہوں
یہ ضروری نہیں ... !
بھیڑیے کان رکھتے ہیں
مگر کسی کو سننا پسند نہیں کرتے
انہیں صرف بھونکنے اور کاٹ کھانے سے
غرض ہوتی ہے
اگر آپ بھیڑیے کے کسی جھنڈ سے مکالمہ کرنے
کا ارادہ رکھتے ہیں
تو جان لیجیے اکر اپنے تمام تر دلائل اور
نرم گفتاری کے باوجود
آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کرسکتے
کیونکہ انہیں گفتگو میں نہیں
بلکہ آپ کے تازہ خون اور گرم گوشت میں
زیادہ دلچسپی ہے

سید کامی شاہ

اپنا احوال سُنا کرلے جائے
جب مجھے چاہے منا کرلے جائے

وہ مجھے بھول گیا ہے شاید
یاد آ جاؤں تو آ کرلے جائے

پھر سے آجائے کوئی چپکے سے
کہیں باتوں میں لگا کرلے جائے

کوئی قاتل نہیں گزرا ایسا
جس کو تاریخ بچا کرلے جائے

ایسی دیوانگی و حیرانی
آئینہ کوئی دکھا کرلے جائے

سامنے سب کے پڑی ہے دُنیا
ذات میں جو بھی سما کرلے جائے

عبیداللہ علیم

اُس عمر سے میں اب دُور نکل آیا ہوں کہ
جس میں
لہجے اپنی طرف کھینچتے محسوس ہوتے ہیں
کسی کی خوبصورت آنکھیں
تصور میں آ آ کر
پھر دل بے چین رکھتی ہیں
کسی کے نظر بھر کے دیکھ لینے پر
دل دھڑکنا بھول جاتا ہے
اُس عمر سے میں اب دُور نکل آیا ہوں کہ
جس میں
کسی کو اک نظر دیکھنے کے لیے
کیسے کیسے جتن ہوتے ہیں
اور اگر وہ نظر نہ آئے کبھی
تو اپنی ہی کیفیت اپنے ہی بس میں نہیں رہتی
اک ذرا سی بات پہ جھنجلا کے رو پڑنا
صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا
اک قیامت ہو جائے
میں اُس عمر سے اب دُور نکل آیا ہوں
اور اُس عمر میں آ پہنچا ہوں کہ جس میں
یہ ساری باتیں اک بچپنا سا لگتا ہے
عمر کے بدلنے سے سوچ بھی بدلتی ہے
مگر نہیں بدلی تو اس کی محبت نہیں بدلی
جو کسک بن کے آج بھی میرے آس پاس
رہتی ہے
جو اذیت بن کے ہمیشہ
میرے ساتھ ساتھ رہتی ہے

طاہرہ ظفر

ریت کی دلدل ملی مجھ کو سمندر پار بھی
میں اُترا وہاں جہاں ساحل کبھی ساحل نہ تھا

وہ تو اک سازش تھی میرے خون کی میرے خلاف
جس کے سر الزام آیا، وہ میرا قاتل نہ تھا

سر پہ آ گرتا ہے تکمیلِ محبت کا پہاڑ
ورنہ اظہارِ تمنا تو کوئی مشکل نہ تھا

پر لگا کر اُڑ گئے آخر میری نیندوں کے ساتھ
پیار کے وہ خواب جن کا کوئی مستقبل نہ تھا

ان سے مل کر یہ بھی دیکھی شعبدہ بازی قتیلؔ
دھڑکنیں موجود تھیں سینے میں لیکن دل نہ تھا

قتیلؔ شفائی

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدہ میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک لونڈی آزاد کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم اسے اپنے ماموں کو دے دیتیں تو بڑا ثواب ہوتا۔"

محبت،

اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گود میں لیے ہوئے فرما رہے تھے۔

"اے اللہ! یہ دونوں میرے بیٹے اور نواسے ہیں، میں انہیں محبوب رکھتا ہوں تو بھی انہیں محبوب رکھ۔ اور ان سے جو محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ۔"

(ترمذی)

عوام سے اجازت،

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ طبیب نے شہد تجویز کیا۔ تو وہ منبر پر تشریف لائے اور کہا۔

"بیت المال میں شہد کا پیالہ ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو کہ میں اس میں سے کچھ شہد لوں تو میں کچھ مقدار حاصل کروں گا ورنہ یہ مجھ پر حرام ہے۔"

فرمان حضرت علی رضی اللہ عنہ،

جو بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے۔ اس کی عقل میں روشنی اور نور پیدا ہو جاتا ہے۔

نوال افضل گھمن۔ کراچی

مجاہد کا گھوڑا،

حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ اپنے مجاہدین کا لشکر لے کر ایک سفر میں ایک لق و دق صحرا سے گزر رہے تھے، سفر بہت طویل تھا۔ اور راستہ بھی اجنبی۔ پھرتے پھرتے ایک مقام پر پہنچے جہاں لشکر کا پانی ختم ہو گیا، دور دور تک پانی کا نام و نشان تک نہ تھا!

اس پریشانی کی حالت میں حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ نے دو رکعت نماز پڑھ کر طویل دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ اسی وقت عقبہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے نے اپنے سم سے زمین کو کریدنا شروع کیا۔ جب تھوڑی دیر گزر دی تو ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ مجاہدین نے اس پتھر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے ایک خوشگوار اور ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا۔

سب لوگ بہت خوش ہوئے اور خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے مشکیزے بھی پانی سے بھر لیے۔ پھر اس جگہ کا نام ماء الفرس (یعنی گھوڑے کا پانی کا چشمہ) ہو گیا اور لوگ اس جگہ کو اسی نام سے یاد کرنے لگے۔

(ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات ص 101)

ثمرہ عاقب۔ گرین سٹی

دنیا میں بے نیاز قوم،

علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایرانی آتش پرستوں سے جہاد کرنے کے لیے قادسیہ پہنچے تو انہوں نے اپنے لشکر کے ایک افسر حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو کسی کام سے "میسان" کے

مقام پر پہنچا۔ یہ دشمن کے ملک میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ حضرت عاصمؓ یہاں پہنچے تو رسد کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا اور ساتھیوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ انہوں نے آس پاس تلاش شروع کر دی کہ شاید کوئی گائے بکری مل جائے۔ مگر کافی جستجو کے باوجود کوئی جانور ہاتھ نہ آیا۔ اچانک انہیں بانس کے ایک چھپّر کے پاس ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ انہوں نے اس سے جا کر پوچھا۔

"کیا یہاں آس پاس کوئی گائے بکری مل سکتی ہے؟"

اس شخص نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

حضرت عاصمؓ ابھی واپس نہیں لوٹے تھے کہ چھپّر کے اندر سے آواز سنائی دی۔

"یہ خدا کا دشمن جھوٹ بولتا ہے۔ ہم یہاں موجود ہیں۔"

حضرت عاصمؓ چھپّر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کئی گائے بیل کھڑے ہیں مگر وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ اور یہ آواز ایک بیل کی تھی۔ حضرت عاصمؓ وہاں سے گائے بیل لے کر آئے اور انہیں لشکر میں تقسیم کیا۔

یہ واقعہ کسی نے حجاج بن یوسف کو سنایا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے جنگ قادسیہ کے شرکاء کے پاس پیغام بھیج کر اس کی تصدیق کرنی چاہی تو بہت سے حضرات نے گواہی دی کہ اس واقعے کے وقت ہم وہاں موجود تھے۔

کیا کھویا، کیا پایا،

ایک آدمی نے ایک باباجی سے پوچھا۔

"باباجی زندگی میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟"

باباجی نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

"بیٹا! جو گاجر کے حلوے میں ڈالتے ہیں، وہ 'کھویا' ہے اور جو ناشتے میں نان کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ 'پایا' ہے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

فلسفی کا کہنا ہے،

☆ پلوٹینس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مجھے اس بات پر بہت ندامت ہے کہ میں جسم میں ہو کر پایا جاتا ہوں۔

☆ روٹاگورس سے کسی نے سوال کیا تھا کہ "خدا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور عمر بہت کم۔"

نادیہ یاسر۔ گوجرہ

دلچسپ و عجیب،

چار بھائی ایسے ہیں کہ ان کے درمیان دس سال کا فاصلہ ہے اور یہ چاروں حضرت ابو طالب کی اولاد ہیں۔ یہ حضرات ہیں حضرت طالبؓ، حضرت عقیلؓ حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ۔ حضرت طالبؓ، حضرت عقیلؓ سے دس سال بڑے تھے اور حضرت عقیلؓ، حضرت جعفرؓ سے دس سال بڑے تھے اور حضرت جعفرؓ حضرت علیؓ سے دس سال بڑے تھے۔ یہ قدرتی اتفاق ہے، جو بہت کم ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ اور عدل و انصاف،

حضرت کلیبؓ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس اصبہان سے مال آیا۔ آپؓ نے اسے سات حصّوں میں تقسیم کیا۔ اس میں آپؓ کو ایک روٹی زائد ملی۔ آپؓ نے اس کے سات ٹکڑے کیے اور ہر حصّے پر ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ پھر لشکر کے ساتوں حصّوں کے امیروں کو بلایا اور ان میں قرعہ اندازی کی۔ تاکہ پتا چلے کہ ان میں سے پہلے کس کو دیا جائے۔

حضرت عبداللہ ہاشمی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس دو عورتیں مانگنے کے لیے آئیں۔ ان میں سے ایک عربی تھی اور دوسری ان کی آزاد کردہ باندی تھی۔ آپؓ نے حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک کو (تقریباً تریسٹھ من) غلّہ اور چالیس درہم دیے جائیں۔ اس آزاد شدہ باندی کو تو جو ملا وہ اسے لے کر چلی گئیں۔

لیکن عربی عورت نے کہا۔
"اے امیر المومنین! آپ رضی نے اس کو جتنا دیا، مجھے بھی اتنا ہی دیا۔ حالانکہ میں عربی ہوں اور یہ آزاد کردہ باندی ہے۔"
حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بہت غور سے دیکھا تو اس میں مجھے اولاد اسماعیل کی اولاد اسحاق پر کوئی فضیلت نظر نہیں آئی۔"

ایک شعر،

تم ثبوتِ وفا تو دے ہی چکے
اب ٹھہر جاؤ میری باری ہے

صدف عمران ۔ آفیسرز سوسائٹی

دلیل،

ایک سیاست دان کو اس کے دوست نے مشورہ دیا۔
"لوگوں سے گفتگو یا تقریر کے دوران تم صرف اپنی بات کیا کرو۔ اس کے حق میں دلیل مت دیا کرو۔"
سیاست دان نے حیرت سے پوچھا۔
"کیوں؟"
دوست بولا۔ "دراصل تمہاری بات تو سب خاموشی سے سن لیتے ہیں اور برداشت بھی کر لیتے ہیں مگر دلیل سن کر بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔"

آمنہ سعد، کراچی

انجام،

ایک بیوہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ اپنے دوسرے شوہر کے سامنے پہلے شوہر کی تعریف کر رہی تھی۔
"تمہیں میرے پکائے ہوئے کھانے پسند نہیں آتے اور ایک مرحوم تھے، جو پکا کر رکھ دیتی تھی، نہ صرف وہ کھا لیتے تھے بلکہ تعریف بھی کیا کرتے تھے۔"
دوسرا شوہر بولا۔ "تمہاری بات درست ہے مگر سوچو کہ اب وہ کہاں پہنچ چکے ہیں۔"

فضہ، ندا طارق ۔ فیصل آباد

فراخدلی،

اسکاٹ لینڈ کے لوگ کنجوسی کے لیے مشہور ہیں۔
ایک اسکاٹ کا بیٹا امتحان میں فرسٹ آیا۔ باپ نے اس کا نتیجہ دیکھ کر اس کی ہمت افزائی کے لیے کہا۔
"بیٹا! مجھ سے صرف ایک چیز مانگو تاکہ میں تمہیں انعام کے طور پر دے سکوں۔"

اس کے ننھے بیٹے نے کہا۔ "بہت اچھا بابا! لیکن مجھے اجازت دیں کہ میں کچھ سوچ لوں۔"
باپ نے کہا۔ "بہت اچھا تم سوچ سکتے ہو۔"
تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بیٹے نے کہا۔ "ہاں ابا جان! اگر ممکن ہو تو مجھے ایک بائیسکل خرید دیں۔"
باپ نے کہا۔ "نہیں بیٹے! اب یہ ممکن نہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک چیز مانگو، تم نے مجھ سے سوچنے کی اجازت مانگی، جو میں نے تمہیں دے دی۔"

اقراء، عائشہ ۔ محراب پور

فیصلہ،

دیکھو فیصلے ہم میں شروع میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ چوری چوری ہماری مرضی پوچھے بنا۔ ہر انسان کے اندر ایک خمیر ہوتا ہے۔ جیسے سرسوں کے بیج کے اندر ایک فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کا رنگ زرد ہوگا۔ تربوز کا ٹو تو اس کے ہر بیج کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس سے جنم لینے والا تربوز اندر سے سرخ ہوگا۔ دیکھو قیوم نہ تربوز اپنی خوشی سے سرخ ہوتا ہے نہ ہی چنبیلی اپنی مرضی سے خوشبودار۔

(بانو قدسیہ ۔ راجہ گدھ)
آسیہ جاوید ۔ علی پور چٹھہ

حمدہ واجد کی ڈائری سے

انسان جب کسی عہدے یا منصب پر ہوتا ہے تو اپنے زعم میں عزت داروں کو بے توقیر کرتا ہے فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عدل و انصاف، قانون کو پامال کرتا ہے۔ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے پاس یہ منصب ہمیشہ نہیں رہنے والا ہے۔ افتخار عارف اس غزل میں یہی یاد دلا رہے ہیں۔

جاہ و جلال، دام و درم اور کتنی دیر
ریگِ رواں پہ نقشِ قدم اور کتنی دیر

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبارِ عہدِ ستم اور کتنی دیر

حلقہ بگوشوں، عرض گزاروں کے درمیان
یہ تمکنت، یہ زعمِ کرم اور کتنی دیر

دامن کے سارے چاک، گریباں کے سارے چاک
ہو بھی گئے بہم تو بہم اور کتنی دیر

شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

سحر سہیل کی ڈائری سے

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
کا مصرعہ ثاقب لکھنوی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ ان کی یہ غزل قارئین کے لیے۔

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

آیئے حالِ دلِ مجروح سنیے، دیکھیے
کیا کہا زخموں نے، کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

سننے والے رو دیے سن کر مریضِ غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا، صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقبؔ گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

انسان بڑی عجیب مخلوق ہے۔ اپنی مرضی کے مطلب نکالنا، بے معنی باتوں کے فسانے اور تہمتیں لگانا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ مگر نوشی گیلانی کہتی ہیں کہ "تہمتوں سے کیا ڈرنا!"

تہمتوں سے کیا ڈرنا
روشنی کی خواہش میں
گھر سے باہر آنے کی کچھ سزا تو ملتی ہے

لوگ، لوگ ہوتے ہیں
ان کو کیا خبر جاناں!
آپ کے ارادے کی خوبصورت آنکھوں میں
بننے والے خوابوں کے رنگ کیسے ہوتے ہیں
دل کی گود آنگن میں پلنے والی باتوں کے
زخم کیسے ہوتے ہیں؟
کتنے گہرے ہوتے ہیں؟
کب یہ سوچ سکتے ہیں
ایسی بے گناہ آنکھیں
گھر کے کونے کھدروں میں چھپ کے کتنا روتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
تہمتوں کے لگنے سے
دل سے دوست کو جاناں
اب سنبھال کیا کرنا
تہمتوں سے کیا ڈرنا

دانیہ عقیل کی ڈائری سے

موجودہ حالات کی عکاسی کرتی یہ غزل مجھے ایک دوست نے بھیجی۔ قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

دل تجھے ناز ہے جس شخص کی دلداری پر
دیکھ اب وہ بھی اتر آیا اداکاری پر

میں نے دشمن کو جگایا تو بہت تھا لیکن
احتجاجاً نہیں جاگا مری بیداری پر

آدمی آدمی کو کھائے چلا جاتا ہے
کچھ تو تحقیق کرو اس نئی بیماری پر

کبھی اس جرم پہ سر کاٹ دیے جاتے تھے
اب تو انعام دیا جاتا ہے غداری پر

مجھ میں یوں تازہ ملاقات کے موسم جاگے
آئینہ ہنسنے لگا ہے مری تیاری پر

کوئی دیکھے بھرے بازار کی ویرانی کو
کچھ نہ کچھ مفت ہے ہر شے کی خریداری پر

بس یہی وقت ہے سچ منہ سے نکل جانے دو
لوگ اتر آئے ہیں ظالم کی طرف داری پر

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر نوشی گیلانی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے نام۔

نشانی کوئی اب کے سفر کی گھر لانا
تکان پاؤں کی اور تتلیوں کے پر لانا

میں لکھ رہی ہوں کہانی تیری رفاقت کی
جو ہو سکے تو کوئی حرفِ معتبر لانا

یہ نہ ہو کہ مسلسل وفا تھکا ڈالے
محبتوں میں نیا پن تلاش کر لانا

سفر کے شوق میں چل تو پڑے ہو تم گھر سے
دکھوں کی گرد سے دامن نہ اپنا بھر لانا

جو کوہ قاف چلے ہو تو چاند چہروں کا
مجسمہ کوئی اچھا تلاش کر لانا

خالدہ جیلانی

ملائکہ کوثر ——— بسم اللہ پور

میرے آنگن میں دھوپ اُتری ہوئی ہے
شجر بننے میں عجلت کر رہا ہوں
حسن میں بانٹتا پھرتا ہوں خوشیاں
یہاں اشکوں کی قلت کر رہا ہوں

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

اپنی عزت کا انا کا بھی ہمیں پاس رہا
ہم محبت میں نہیں حد سے گزرنے والے
چارہ گر تو نے بہت کام کیا ہے لیکن
عشق میں زخم لگے ہم کو نہ بھرنے والے

اقرا جٹ ——— مخن آباد

ہمیں وہ راستوں کے اندھیروں میں تنہا چھوڑ گیا
جسے ہم نے اندھیروں کے راستے پر بچایا تھا

شہنیلا اسلم ——— قائم پور

سوچ کو فکر کی قسم، ہم بھی محبت کے ولی
خاک کے ڈھیر پر نہ الجھتے تو سمندر ہوتے
آنکھ نے خواب کے لالچ میں خیانت کر لی
ورنہ ہم بھی جاگتی راتوں کے سکندر ہوتے

حرا ملک ——— وہاڑی

اب میں جیت بھی جاؤں تو دل خوش نہیں ہوتا
جس شخص کو ہارا ہے، وہ انمول بہت تھا

کبریٰ مہتاب رانا ——— بوسال سکھا

کچھ منافق میرے حلقۂ احباب میں شامل تھے
میں نے بھی پھر اُن سے محبت کی اداکاری کی

صائمہ عبدالحمید ——— خیر پور ٹامیوالی

ہیں غنیمت یہ چار لمحے بھی
پھر نہ ہم ہیں نہ یہ تماشا ہے
زندگی اک دکان کھلونوں کی
وقت بگڑا ہوا سا بچہ ہے

سونیا یسین ——— خیر پور ٹامیوالی

اُس کے عروج کی تھی بہت آرزو ہمیں
جس کے عروج میں ہی ہمارا زوال تھا

نبیلہ ناز ٹیٹنگ ——— مؤڑالہ باد

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے

حنا اسلم ——— قائم پور

عنوان زندگی پہ بس اتنا ہی لکھ پائی
بہت کمزور رشتے تھے بہت مضبوط لوگوں سے

مدیحہ ناصر، اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

جو آنا چاہو ہزار رستے، نہ آنا چاہو تو عذر ہزاروں
مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم

نوبا مریہ خالد ——— لاہور

زندگی کا یہ ہنر بھی آزمانا چاہیے
جنگ اگر کسی اپنے سے ہو تو ہار جانا چاہیے

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

محسن ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے، ہمارا زمانہ گزر گیا

ہاروت قیصرانی ——— کوٹ قیصرانی

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نہیں

ڈاکٹر انعم علی ——— کراچی

اُس کی وفا کے باوجود اُس کو نہ پا کے بدگماں
کتنے یقین بکھر گئے، کتنے گماں گزر گئے

بتانی سسٹرز ——— پیر عادل، ڈی آئی خان

نہ میرے قلم سے لکھی گئی، نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول کھلتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے، زندگی تجھے بتائے گی

ام ہانی خان ـــــــ ارمڑ میانہ پشاور

کس طرح عمر کٹے گی جو یہی حال رہا
ہم سے روٹھا ہے وہی جس کے لیے جیتے ہیں

لیلیٰ رب نواز ـــــــ گاؤں ودھیوالی بھکر

ہر شام چراغوں کی طرح جلتی ہیں آنکھیں
کیا کوئی چلا جائے تو یوں ہوتا ہے محسن

ثریا بلوچ ـــــــ کراچی

جلنے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد

افرا عزیز ـــــــ گاؤں ویلتان

تہمتوں کی راہ گزر پر
تمہارا پتھر کمال ٹھہرا

آمنہ محمد نوید ـــــــ پھپھو کی ملیاں

بہت سادگی سے گم ہو رہے ہیں
تمہارے رابطے، راستے اور تم

کرن بینش ـــــــ کراچی

انمول پتھروں کی قیمت لگائی ہے سب نے
دیلطر جو نہ بنتے، بازار بن کر بیٹھے
نہ شاہ بن سکے ہم، نہ شاہ سے ڈرتے ہم
کچھ عجیب کر نہ سکے، شاہکار بن کر بیٹھے

رضوانہ شکیل راؤ ـــــــ لودھراں

لک دھکا بہت ضروری تھا
اپنی حد سے نکل گیا تھا میں

آسیہ فرید ـــــــ ملتان

نہ بیاں ہوئی تم سے نہ بیاں ہوئی ہم سے
بس سلجھی ہوئی آنکھوں میں الجھی رہی محبت

ملاوسی ـــــــ کراچی

بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے
شاید کوئی منزل نہیں اس راہ میں پڑتی
واپس نہیں آتا کوئی یادوں کے سفر سے

طوبیٰ، نادیہ ـــــــ گجرات

آوارگی اڑا لے پھری مثل بوئے گل
کوئی پکارتا ہی رہا عمر بھر مجھے
منزل پہ آ کے شاد عجب حادثہ ہوا
میں ہمسفر کو بھول گیا، ہمسفر مجھے

سیدہ نسبت زہرا ـــــــ کہروڑ پکا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب، ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روز جزا ایسے نہیں ہوتا

آمنہ میاں محمد نوید ـــــــ پھپھو کی ملیاں

محبت ہار کے جینا بہت دشوار ہوتا ہے
اسے بس اتنا کہہ دینا بھرم توڑا نہیں کرتے

مینو علوی ـــــــ لاہور

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ
خیال ان کا بھی آیا کبھی تجھے جاناں
جو تجھ سے دور بہت دور ہو رہے تھے الگ

لیجنڈ فنکار

سہیل اصغر سے ملاقات

شاہین رشید

چاند گرہن سے شہرت پانے والے "سہیل اصغر" اب ایک سینئر فنکار بن چکے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آپ ایک اکیڈمی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ نوجوان نسل اگر ان سے سیکھنا چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ آج کل ان کا سوپ "سویرا" آن ایئر ہے۔

"جی سہیل صاحب! کیسے ہیں آپ؟"

"الحمدللہ۔"

"ماشاءاللہ اس دشت کی سیاحی میں کافی سال آپ کو ہو گئے ہیں ۔۔۔ کیا بات ہے کہ نہ آپ کا کوئی پروڈکشن ہاؤس ہے اور نہ ہی آپ ڈائریکشن کی فیلڈ میں آئے؟"

"ایک تو میرے پاس اس کام کے لیے وسائل نہیں ہیں' پھر یہ کہ میں بڑے سکون کی زندگی گزار رہا ہوں۔ بے سکون نہیں ہونا چاہتا ۔۔۔ مطلب یہ کہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہر وقت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ کرس کو کیسے لے کر چلنا ہے' کوئی وقت پر نہ آیا تو کیا کرنا ہے۔ کل کے دن کتنا کام مکمل کرنا ہے۔ وہ رات کو خواب بھی اپنے سیریل یا اپنی پروڈکشن کے ہی دیکھتا ہے۔ جبکہ میں آرام سے کام کر کے گھر آتا ہوں فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہوں اور سکون و آرام کی نیند سوتا ہوں۔"

"اف ۔۔۔ کتنا سوچتے ہیں آپ ۔۔۔ اور؟"

"اور ہاں ۔۔۔ اب اس انڈسٹری میں ماشاءاللہ کافی امیر کبیر لوگ آگئے ہیں ۔۔۔ اگر میں 45 سے 50 لاکھ لگا کر ایک سیریل تیار کروں اور مجھے اس کا اچھا ریٹرن نہ ملے تو میرے پیسے تو ڈوب گئے نا تو بس اسی لیے میں اس فیلڈ میں یعنی پروڈکشن اور ڈائریکشن میں نہیں آتا۔"

"آپ اس فیلڈ میں نہیں آنا چاہتے لیکن اس فیلڈ کے ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز جو باہر سے پڑھ کر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ کیا وہ اچھا کام کر رہے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس فیلڈ میں جو بھی آتا ہے اپنی بساط کے مطابق اچھا کام کر رہا ہے۔ لیکن جہاں تک ڈگری لے کر آنے والوں کی بات ہے تو انہیں چاہیے کہ پہلے اپنے معاشرے کے مسائل سے واقف ہوں۔ پھر اچھی کہانیاں لیں اور اچھے فنکار پھر اس فیلڈ میں کام کریں۔ وہی اچھا ڈائریکٹر ثابت ہوتا ہے جو باریک بینی سے سب کچھ دیکھ کر سیریل تیار کرتا ہے ۔۔۔ پھر وہ کامیاب بھی ہوتا ہے۔"

"نوجوان نسل میں آپ کے خیال میں کون اچھا کام -

کر رہا ہے؟"

"میں نے کہا ناکہ سب ہی اچھا کام کر رہے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک دو نام ضرور لوں گا جیسے "انجم شہزاد" ہے۔ اسامہ ہے جس کا پورا نام علی رضا اسامہ ہے۔ اولیس خان ہے اور دیگر نوجوان بچے اچھا کام کر رہے ہیں۔"

"آپ پی ٹی وی کے دور کے آرٹسٹ ہیں۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے بتائیں کہ کچھ ترقی ہوتی ہے یا کتنی ترقی ہوئی ہے؟"

"بہت ترقی ہوئی ہے اور یہ ترقی کئی معنوں میں اچھی بھی ہے۔ مثلاً" پی ٹی وی کے دور میں بڑے بڑے کیمرے ہوتے تھے اور اب ہاتھ کی مٹھی میں یا یوں کہیں کہ جیب میں آجانے والے کیمرے آگئے ہیں۔ مگر جو رزلٹ بڑے کیمروں سے آتا تھا وہ ان کیمروں سے نہیں آتا۔ کچھ چیزیں ہمارے دور کی بہترین تھیں تو کچھ چیزیں اس دور کی بہترین ہیں۔"

"وہ رائٹرز جن کے نام سے کہ ان کا سیریل آن ایئر آنے والا ہے لوگ کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جایا کرتے ہیں اب وہ نظر کیوں نہیں آتے؟"

"وہ نظر اس لیے نہیں آتے کہ کچھ اچھے لوگ دنیا سے گزر گئے جیسے "بجیا" "اشفاق احمد' بانو قدسیہ وغیرہ۔ جو حیات ہیں ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے، جو آج کل کے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کو شاید متاثر نہیں کرتا۔ اب اس فیلڈ کے لوگوں کا ذہن اور دماغ کاروباری ہو گیا ہے اور وہ اپنے ہی اسٹائل سے سوچتے ہیں۔"

"پیسہ بھی تو اب پہلے سے زیادہ ملنے لگا ہے۔ فنکار بھی تو خوش حال ہو گئے ہیں؟"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ کہ اب معاوضہ اچھا ملتا ہے

اب کام بھی تو پرائیویٹ ہو گیا ہے۔ اب پہلے مارکیٹنگ ہوتی ہے پھر کام ہوتا ہے۔ پہلے سارا انحصار پی ٹی وی پہ تھا جو کہ سرکاری ادارہ تھا۔ سرکاری ادارے سے اب بھی معاوضہ کم ہی ملتا ہو گا بلکہ ملتا ہے۔ اب ڈراما کمرشلائز ہو گیا ہے۔"

' جو چیز کمرشلائز ہو جائے۔ پھر وہ معیاری بھی نہیں رہتی آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں بھی یہی کہوں گا کہ اب وہ معیار نہیں رہا جو کہ کسی زمانے میں تھا۔ چونکہ ڈرامے کا content خراب ہو گیا ہے اس لیے ڈرامے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ خراب تو خیر نہیں کہہ سکتے لیکن وہ بات بھی نہیں رہی جو کسی زمانے میں تھی۔ معاشرتی مسائل کو منظر عام پر نہیں لایا جارہا بلکہ ڈراما کسی اور ہی طرف جارہا ہے۔"

' مطلب کون سے مسائل؟"

"ہمارے معاشرے کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو بے روز گاری ہے' سفارش ہے۔ ہنر مندوں اور ڈگری یافتہ لوگوں کو جاب نہیں ملتی اور وہ ملک سے باہر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر غربت اتنی ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اسکول جانے کے بجائے محنت مزدوری کر رہے ہوتے ہیں اور بھوک و افلاس سے تنگ آکر کچرے میں سے اپنی خوراک ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر ڈرامے بننے چاہئیں۔ ناقص غذائیں' علاج کی سہولت نہ ہونا۔ نوجوان کیوں بھٹک رہے ہیں' ان کے لیے کیا کرنا چاہیے' جیسے بہت سے مسائل ہیں جن پر قلم چلنا چاہیے۔ شادی بیاہ' عشق' طلاق' عورت کا رونا دھونا اب ان مسائل سے یا ان موضوعات سے باہر آنا چاہیے ہمیں۔ ریٹنگ کے چکر میں اپنا ڈرامانہ خراب کریں پلیز۔"

"آج کل کا کام دیکھ کر پی ٹی وی کے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز تو بہت یاد آتے ہوں گے؟"

"جی' جی۔ بالکل' بہت یاد آتے ہیں۔ اور اتنے اچھے اور محنتی ڈائریکٹر تھے کہ سچ مانیے میں تو آنکھیں بند کر کے یس کر دیتا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اسکرپٹ بہترین ہو گا اور ڈائریکٹر تو بہترین ہے ہی۔ نصرت ٹھاکر 'یاور حیات' کاظم پاشا جیسے ڈائریکٹر اور حیدر امام رضوی ان جیسے لوگ اب کہاں۔ بہت مزہ آتا تھا ان کے

ساتھ کام کر کے۔"

"آپ اب ایک اکیڈمی کا درجہ رکھتے ہیں۔۔۔ جونیئرز آپ سے سیکھتے ہیں۔ آپ کی عزت کرتے ہیں اور کیسا رویہ ہوتا ہے ان کا آپ کے ساتھ؟"

"الحمدللہ جونیئرز کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ بہت عزت کرتے ہیں۔ مجھ سے سیکھتے بھی ہیں۔۔۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کے زیادہ تر بچے عزت کرنا اور کروانا جانتے ہیں۔"

"یہ سب کچھ بہت محنت سے ملا۔۔۔ یا بہت آسانی سے؟"

"نہیں۔۔۔ مقام بنانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔۔۔ اور اگر آپ جوانی میں محنت کرلیں تو آپ کا بڑھاپا بہت آرام سے گزرتا ہے۔۔۔ جیسا کہ میں ہوں۔"

"کیا کھویا، کیا پایا؟"

"کچھ بھی نہیں کھویا۔۔۔ میں نے اس فیلڈ میں آکر بہت کچھ پایا ہے' سب سے زیادہ عزت اور شہرت اور پیسے سے بھی ہاتھ کھلا رہا میرا۔ میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے الحمدللہ۔"

"آپ کافی ینگ ایج میں آئے۔ ریڈیو سے آغاز کیا۔ والدین کے خواب کچھ اور ہوتے ہیں۔۔۔ کیا تاثرات تھے آپ کے والدین کے؟"

"میرے والدین بہت کھلے دل و دماغ کے مالک تھے مجھے یاد ہے کہ جب ریڈیو سے میرا پہلا پروگرام آن ایئر ہوا تھا تو میرے والد کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے تھے اور انہوں نے مجھے بہت دعائیں دی تھیں اور آج اگر وہ حیات ہوتے تو میری عزت و شہرت دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔"

"آپ کے بچپن کے کیا خواب تھے' کیا پڑھیں گے' کیا کریں گے؟"

"بچپن میں بچے کم اور والدین زیادہ خواب دیکھتے ہیں۔ میرے والدین تو چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں مگر مجھے یہ فیلڈ بہت بڑی مشکل لگتی تھی۔۔۔ چنانچہ میں نے ایم اے انگریزی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر یہ بھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ کیونکہ میں نے دوران تعلیم ریڈیو جوائن کرلیا تھا۔ اور اچھے خاصے پیسے ملنے لگے تھے اور جب پیسے ملنے لگیں تو پھر زندگی کچھ اور ہی خواب دیکھنے لگتی ہے۔ ویسے اگر میرا ایم اے مکمل ہو جاتا تو پھر میں کسی کالج یا یونیورسٹی میں لیکچرار ہوتا۔"

"آپ اپنے بچوں کے لیے کیا خواب دیکھتے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کو ہمیشہ فری ہینڈ دینا چاہیے۔ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے جو کہ میوزیشن ہے اور پروڈکشن بھی کرتا ہے۔ اس فیلڈ کے لوگ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ عمیر جسوال کے لیے نہ صرف اس نے گیت لکھا ہے بلکہ اس کے ہر شو میں گٹار بھی بجاتا ہے۔"

"کراچی میں کب سے ہیں۔۔۔ اور کراچی شفٹ ہونے کی کیا وجہ تھی؟"

"میں 2002ء کے بعد کراچی شفٹ ہوا۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد۔۔۔ اور ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ کراچی میں پرائیویٹ چینل کھلنا شروع ہوگئے تھے اور کافی کام ہو رہا تھا۔ میں جب بھی آتا تھا' کبھی ہوٹل میں اور کبھی ادھر کبھی ادھر' تو سوچا کہ ہر وقت ادھر ادھر رہنے سے بہتر ہے کہ مستقل کراچی ہی آجاؤں۔ چنانچہ پھر فیملی کو لے کر میں کراچی آگیا مستقل طور پر۔"

"کتنے سال ہوگئے اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے؟"

"میں نے 1976ء میں ریڈیو جوائن کیا۔۔۔ اور ساتھ ہی ساتھ تھیٹر بھی کرتا تھا۔۔۔ 79ء میں میری آواز کی وجہ سے اور میری کارکردگی کی وجہ سے مجھے ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنا بزنس بھی شروع کیا اپنے کزنز کے ساتھ۔۔۔ پھر جب ڈراموں کے لیے آفرز آئیں تو ٹی وی ہی ذریعہ روزگار بن گیا۔"

"ٹی وی کی طرف کون لے کر آیا آپ کو؟"

"مجھے اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ آپ لاہور جائیں اور ڈراموں میں کام کریں مگر میری ہمت نہیں ہوتی

تھی کہ وہاں تو بڑے بڑے نامور فنکار ہیں' اپنی دال کہاں گلے گی۔ مگر ایک دن ہمت کر کے لاہور گیا۔ وہاں بڑے بڑے پروڈیوسرز سے ملاقات ہوئی اور اللہ کا کرم ہوا کہ کام ملنا شروع ہو گیا۔ وہیں نصرت ٹھاکر صاحب ریڈیو پہ ڈراما کیا کرتے تھے' ان کے ساتھ ایک دو ڈرامے کیے تو وہ مجھے پی ٹی وی لے گئے اور آڈیشن کے بغیر مجھے ڈرامے میں بک کر لیا اور یوں۔ راستے کھلتے چلے گئے۔"

"فلمیں بھی کیں آپ نے؟ اور کس ڈرامے کے بعد آپ کو پیشکش ہوئی؟"

"میرا ڈراما سیریل "پیاس" بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ اور میری فلم "جنگجو گوریلے" تھی۔ اس کے بعد مزید فلموں میں بھی کام کیا۔ مگر مجھے کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا کیونکہ حقیقت سے ہٹ کر فلمیں بننا شروع ہو گئی تھیں اور یوں سمجھیے۔ کہ فلموں کا زوال شروع ہو چکا تھا اور فلم کے لوگوں کا رجحان ٹی وی ڈراموں کی طرف ہو گیا۔ اور ہم تو پہلے ہی ریڈیو' ٹی وی کے لوگ تھے۔"

"اپنے ڈراموں میں "اچھا" کسے کہیں گے؟"

"میرے سب ہی ڈرامے مقبول ہوئے اس لیے سب ہی اچھے تھے کیونکہ ہمیشہ اچھی چیز ہی شہرت پاتی ہے اور پھر میرا نظریہ تو یہ ہے کہ جو ڈراما جو فلم ناظرین کو پسند آجائے' وہی اچھی ہے۔"

"آج محنت زیادہ ہے یا گزرے دور میں زیادہ تھی؟"

"محنت تو ہر دور میں ہوتی ہے۔ کوئی کام محنت کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ ہر چیز محنت مانگتی ہے اور آپ دیکھیں کہ جو کام جانفشانی کے ساتھ کیا گیا ہو اس کا رزلٹ ہمیشہ اچھا ہی آتا ہے۔"

"پی ٹی وی کی طرف سے آپ کو تین یا شاید چار ایوارڈ ملے۔ مگر حکومت کی طرف سے نہیں۔ کیوں؟"

"جی۔ پی ٹی وی کی طرف سے مجھے تین ایوارڈ ملے جو کہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ 1992ء میں میرا سیریل "چاند گرہن" بہت زیادہ مقبول ہوا تھا اور امید تھی کہ مجھے تمغۂ حسن کارکردگی ملے گا' مگر نہیں ملا۔ پھر زرداری صاحب کے دور میں مجھے تمغۂ امتیاز کے لیے نامزد کیا گیا۔ مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اب میرے لیے میرے لوگوں کا پیار ہی کسی تمغے سے کم نہیں ہے۔"

"آج کل کیا آن ایئر ہے۔ کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"آج کل جیو سے "سویرا" آن ایئر ہے "گھر اور رحی لیتے" آنے والوں میں "چاندنی بیگم" ہے۔ "خواب سب دور ہوئے" حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ اب ماشاء اللہ کام زیادہ ہے اور فنکار بھی خوشحال ہو گیا ہے۔ نئے فنکار بھی ناظرین کو مایوس نہیں کر رہے۔"

"بیٹیوں کو شوق نہیں اس فیلڈ کا؟"

"نہیں۔ ان کی شادی ہو گئی ہے اور اپنے گھر میں بہت خوش ہیں وہ۔"

"بیٹا کام پہ' آپ بھی کام پہ۔ بیگم تو بور ہو جاتی ہوں گی؟"

"ارے نہیں۔ ان کے پاس گھر کے بہت کام ہیں' بہت مصروف رہتی ہیں اور گھر کے کام اس لیے بہت ہیں کہ میں گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ کیونکہ میرے پاس ان کاموں کے لیے ٹائم نہیں ہے۔"

"اور کبھی آپ فارغ ہوں تو کیا کرتے ہیں؟"

"مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ فارغ وقت مطالعہ میں ہی گزرتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سہیل اصغر صاحب سے اجازت چاہی۔

☆

خبریں گپ شپ

واصفہ سہیل

بچاؤ

الزائمر دماغی مرض ہے جس کا اب تک علاج دریافت نہیں ہو سکا۔ اس مرض کی علامات واضح نہیں۔ لیکن چند احتیاطی تدابیر اختیار کرکے اس سے بچا جا سکتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کا خیال رکھیں۔ نیند کی کمی بھی الزائمر کا سبب بن سکتی ہے۔ سردیوں میں ہونٹوں کا پھٹنا' ڈائٹنگ کی بہت زیادہ عادت بھی الزائمر جیسے دماغی مرض میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اسی طرح بہت زیادہ میٹھی اشیاء کا استعمال بھی دماغی تنزلی کا باعث بنتے بنتے الزائمر کے مرض کو دعوت دیتا ہے۔

الزائمر ایک ایسا مرض ہے جو ایک سے دوسرے فرد میں منتقل ہو سکتا ہے۔ خون کی منتقلی' آپریشنز اور دانتوں کی تکالیف کا علاج کے دوران استعمال ہونے والے ڈاکٹری اوزار اس کے پھیلاؤ کا ذریعہ ہیں۔

الزائمر سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ نیند کم سے کم سات سے آٹھ گھنٹے لی جائے۔ وٹامن بی اور فولک ایسڈ کے استعمال کے ذریعے اس سے بچا جا سکتا ہے۔ چہل قدمی یا پیدل چلنا اور ورزش بہت ضروری ہے۔ مچھلی' تازہ پھل' سبزیاں' زیتون کے تیل کے استعمال کے ساتھ ساتھ اگر روزانہ کافی کا ایک کپ بھی پی لیا جائے تو الزائمر جیسے دماغی مرض سے بچا جا سکتا ہے۔

التجا

سید نور پاکستان فلم انڈسٹری کا جانا پہچانا نام ہے۔ پچھلے دنوں سید نور کی فلم ”چین آئے نا“ ریلیز ہوئی اور ”چلی نا۔“ سید نور کا کہنا ہے کہ ”ایک سوچی سمجھی سازش (ہائیں! فلم فلاپ ہونے میں سازش۔؟) کے تحت ایک مخصوص گروپ نے سوشل میڈیا پر ان کی فلم کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ جس کے باعث فلم وہ بزنس نہ کر سکی جس کی امید کی جا رہی تھی۔ (کاش آپ فلم خود بھی دیکھ لیتے تو سازش کا پتا چل جاتا۔) انہوں نے مزید کہا کہ وہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کر رہے ہیں (آہم آہم! فلم سے زیادہ نقصان ہو گا۔) انہوں نے مزید کہا کہ پاکستانی فلموں کو ناکام کروانے والی لابی کے عزائم بھارتی سوچ سے ہم آہنگ لگتے ہیں۔ سید نور نے کہا کہ صحافی برادری تبصرہ کرنے سے پہلے فلم کم از کم ایک ہفتہ تو سینما میں لگی رہنے دیا کریں۔ (یہ رحم کی اپیل زیادہ لگتی ہے)

خواہش

مومنہ مستحسن اور دانیال ظفر نے ایک گانا کیا ساتھ گالیا۔ لوگوں نے تو کہانیاں ہی بنالیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ (اکثر لوگ پسند کرتے ہیں) لیکن دانیال ظفر نے ان تمام باتوں کی تردید کر دی ہے (اور مومنہ نے۔؟) اور کہا ہے کہ ان کا اور مومنہ کا رشتہ موسیقی سے جڑا ہے۔ اس میں کوئی رومانس

نہیں۔ (موسیقی اور رومانس ...؟) دانیال ظفر نے اپنے پہلے گانے کو پسند کیے جانے پر اپنے چاہنے والوں (اور والیاں ...؟) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ "میں آپ سب کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بہت محبت دی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا سبق (ہیں سبق؟! ابھی تو آپ نے دانیال ابھی کہاں... بھئی سبق) جس کے مطابق انسان کی خوشی ہی اس کے لیے سب کچھ ہوتی ہے۔ (بڑا عجیب سبق ہے...؟) میں اپنے جذبات کا اظہار موسیقی کے ذریعے کرتا ہوں۔ (سامعین کے جذبات کو بھی سامنے رکھیں۔ زیادہ بہتر ہوگا) میں مستقبل میں بھی آپ سب کے پیار کا جواب موسیقی سے دیتا رہوں۔

ہر فن مولا

دیپک پروانی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ مشہور فیشن ڈیزائنر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اداکار بھی ہیں۔ دیپک پروانی اس بارے میں کہتے ہیں کہ "اداکاری سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ میری بے قراری کو قرار آجاتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی اداکاری بھی کر لیتا ہوں۔ اداکاری بھی میں عشق اور جنون کے ساتھ کرتا ہوں۔ اچھا اسکرپٹ پڑھ کر مجھے بہت لطف آتا ہے۔ (اچھا اسکرپٹ...؟) موسیقی سے بھی مجھے عشق ہے۔ (آپ کو ہر کام سے ہی عشق ہے) شاید کبھی بہت سے اور دوسرے لوگوں کی طرح میں گانا گانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس کے علاوہ مجھے امید ہے کہ میں کسی نہ کسی دن کوئی فلم بھی ڈائریکٹ کروں گا۔ (فیشن ڈیزائننگ پر یا رومانس پر...؟)

☆ ☆ ☆

ادھر اُدھر سے

☆ جس طرح سپریم کورٹ نے پانامہ کیس ہینڈل کیا ہے اس طرح کی نظیر عدلیہ کی ستر سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ (بابر ستار... صحافی)

☆ تہمینہ درانی جیسی سرگرم اور زمانہ شناس خاتون شریف خاندان کو مصائب سے نکالنے کے لیے سیاسی میدان عمل میں نہیں آئیں۔ وہ محض کبھی کبھار ٹویٹ کرتی ہیں وہ بھی اپنی ذات کے حوالے سے۔ یہی فرق ہوتا ہے شریک حیات اور لائف پارٹنر میں۔ کلثوم نواز اپنے شوہر کی شریک حیات ہیں اور تہمینہ درانی لائف پارٹنر۔ (فاروق اقدس۔ سیاست پارے)

☆ ایک بھارتی جریدے نے دعوا کیا ہے کہ ماہرہ خان "نئے شوہر" کا انتخاب بھارت سے کریں گی اور غالباً" اس کا فیصلہ بھی انہوں نے کر لیا ہے تاہم اس بات کو انتہائی خفیہ رکھا جا رہا ہے۔

☆ جمہوریت کا حسن ہے کہ جس و ناشر جو منہ میں آئے سیاست دانوں کو بول دیتا ہے۔ کوئی اس کو اٹھا کر نہیں لے جاتا اس کے گھر پر حملہ نہیں کرتا۔ (مشہور صحافی... امتیاز عالم)

آپ کا باورچی خانہ

سمیرا کاجل صدیقی

ہم فلک کے لوگ تھے ساکنان کوچۂ مہتاب تھے
تمہارے ہاتھ کیسے آگئے ' ہم تو بڑے نایاب تھے

"آپ کا باورچی خانہ" میں کچھ دوستوں نے ہمیں بھی انٹری دینے پر مجبور کر دیا خصوصاً" حنا گل کی شرکت نے۔ ہم نے بھی سب کے گلے شکوے دور کرنے کی ٹھان لی۔

کاغذ قلم لیا اور بیٹھ گئے لکھنے (آخر کار ہم بھی سگھڑ اور سلیقہ شعار بیٹیوں میں سے ہیں) چلیے چلتے ہیں سوالوں کی جانب۔

(1) کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟"

ج : "کیا واقعی حنا گل غذا اور غذائیت دونوں جڑواں ہیں (ہمارے ذہن میں فوراً" ہی حنا گل کے پہلے سوال کا جواب ذہن میں گھوم گیا)

بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ (کیا بتادوں) کہ۔۔۔ کہ ہم کوکنگ سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ (مگر اوپر وہ کیا تھا؟ سگھڑ' سلیقہ شعار)

ارے بھئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کھانے پکانے میں بالکل ہی اناڑی ہیں' ایسا ہرگز نہیں پیاری بہنوں ہم جب بھی کوکنگ کرتے ہیں گھر والے انگلیاں چاٹ لیتے ہیں (بعض دفعہ تو کاٹ بھی لیں) یقین مانیے ایسا لذیذ کھانا شاید ہی کوئی بناتا ہو (مذاق بالکل نہیں) یہی وجہ ہے کہ میں ریگولر کھانا نہیں پکاتی کیونکہ لذیذ ہی اتنا ہوتا ہے' روز روز فرمائش ہوتی ہے "بھئی سمیرا آج بھی کھانا تم ہی پکانا۔ (کھانا پکاؤں گی تو روز روز۔۔۔' فرمائشیں ہوں گی تو۔۔۔ چولہے کے پاس بیٹھنا پڑے گا۔ مجھے چولہے کے پاس بیٹھنا زہر لگتا ہے)

عموماً" گھر میں کھانا غذائیت ہی کی بنیاد پر بنتا ہے اس کھانے سے پرہیز کیا جاتا ہے جو صحت کے لیے مضر ہو۔ گھر کے تمام افراد صحت افزا غذا ہی کو ترجیح دیتے ہیں (سوائے ہم تتلیوں کے' ہم لڑکیوں کی زندگی تو جیسے

پکوڑے' سموسے' دہی بھلے' گول گپے' پیزا' سینڈوچز پہ ہی شروع اور ان ہی پہ ہی ختم ہے) حمیرا جی! گھر میں کوئی جیسا کھانا بھی پکائے تم جیسا ذائقہ کبھی نہیں آ سکتا۔

(2) "کھانے کا وقت ہے گھر میں اچانک مہمان آ گئے ہیں' کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار ہو سکے؟"

ج : حمیرا شمائلہ یار! کہاں ہو۔ کوئی آسان سی ریسیپی بتاؤ پلیز (نجانے کہاں گئیں دونوں۔ خود ہی کچھ کرنا پڑے گا) میرے خیال میں پلاؤ اور چکن سے کم وقت میں پکنے والی کوئی ڈش نہیں ہو سکتی (آپ سب کا کیا خیال ہے۔)

پتا نہیں کوکنگ کرنے کا میرا دل کیوں نہیں کرتا۔ بچپن میں گڑیے گڑیا کے ولیمے کے لیے تو میں بہت کچھ بنا لیتی تھی۔ اب پتا نہیں کیوں ہاتھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔

(3) "کچن خاتون خانہ کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟"

ج : اف کیا سوال ہے' گھر اور کچن کی صفائی کے معاملے میں میں بہت پوزیسو ہوں' بے ترتیبی مجھ سے

برداشت ہی نہیں ہوتی ہے چاہے کمرے کی ہو یا کچن کی میں جب بھی کوکنگ کرتی ہوں استعمال کے بعد ایک ایک چیز اچھی طرح صاف کرکے اس کی جگہ پہ واپس رکھ دیتی ہوں' چونکہ ہمارے شہر میں گیس نہیں ہے ناں تو کچن میں ککنگ کے دوران پھیلاوا بہت ہو جاتا ہے' ایمرجنسی میں کھانا پکانے کے لیے گیس کے سلنڈر میں گیس ہروقت موجود ہوتی ہے) اسی لیے میں کھانا پکانے کے بعد کچن فوراً" صاف کردیتی ہوں اور روزانہ صبح ناشتے کے بعد کچن سمیت سارا گھر دھو دیتی ہوں۔

ویسے کہتے ہیں ناکہ لڑکی کی سلیقہ مندی کا اندازہ اس کے گھر کے کچن کی صفائی سے لگایا جا سکتا ہے (تو آپ لگالیں اندازہ میں کتنی سلیقہ مند ہوں جی۔۔۔)

(4) صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں۔ ایسی خصوصی ڈش جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

ج : ناشتہ۔۔۔ ناشتہ بنانے میں تو میرا کوئی ثانی نہیں (بی سمیرا! بہت ہو گیا) رئیلی جہاں تک میرا خیال ہے نیو جنریشن میں مجھ سے بہترین ناشتہ کوئی بنا ہی نہیں سکتا' کوئی ایک بار میرے ہاتھ کا بنا ناشتہ کرلے ساری زندگی ذائقہ نہیں بھول پاتا (یقین نہیں تو ٹرائی کرلیجئے گا۔)

مجھے ہر قسم کے پراٹھے بنانے آتے ہیں' چاہے وہ تکون ہوں گول ہوں ڈبل ہوں۔ بل والے ہوں یا سادہ ۔ پراٹھے پرفیکٹ بناتی ہوں عام روٹین میں میں ناشتہ نہیں بناتی مگر جب کسی مہمان نے ناشتہ کرنا ہو تو اس کے لیے اسپیشل ناشتہ عموماً" میں ہی بناتی ہوں میں ناشتے میں مہمانوں کے لیے کسٹرڈ بہت مزے کا بناتی ہوں وہ میں رات کو ہی بنا کر رکھ دیتی ہوں بناتے وقت میں اس میں ڈھیر سارا کھوپرا اور بادام گرینڈ کرکے ڈال دیتی ہوں اور خوب بناتی ہوں بہت مزے کا ٹیسٹ آتا ہے (ٹرائی کرنا کبھی۔۔۔)

(5) مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج : نہیں جی۔۔۔ باہر کھانا کبھی نہیں کھایا۔ کھانا ہمیشہ گھر میں کھانا ہی اچھا لگتا ہے۔ ہاں' البتہ جب مارکیٹ جانا ہو' شاپنگ کے لیے یا کزن یا فرینڈز کے ساتھ گھومنے جانا ہو تو دہی بھلے' سموسے اور آئس کریم ضرور کھالیتے ہیں۔

جب حمیرا آتی ہے تو سب رات میں باہر جاتے ہیں بھائی ماجد کے ساتھ' خوب مزہ آتا ہے آؤٹنگ کرنے کا۔

(6) پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدِنظر رکھتی ہیں؟

ج : موسم کی مناسبت سے عموماً" گھر میں پکوڑے' آلو کے' پراٹھے' گلگلے اور میٹھی روٹی (جو کہ امی بہت مزے کی پکاتی ہیں) بنتی ہے بھائی ریحان برسات میں ضرور کسی میٹھے کی فرمائش کرتے ہیں۔"

(7) کوئی ٹپ؟

جواب : "اگر سردرد ہو جائے میں ایک ٹکڑا لہار چینی ڈال کر پکائیں' یقین جانیے فریش فیل کریں گی اور اگر کچن میں چھپکلیاں آتی ہوں تو انڈے کا خول دیوار پہ کسی کیل پر اٹکا دیں۔

آخر میں سموسہ رول کی ریسپی جو کہ ملبد ولت بڑے مزے کی بناتے ہیں۔

سموسہ رول

میدہ۔۔۔ آدھا کلو
نمک۔۔۔ ایک چائے کا چمچہ
گھی۔۔۔ دو چائے کے چمچے

گھی ڈال کر سموسے کے آٹے کی طرح گوندھ لیں اور دوسری طرف آلو چنے اچھی طرح ابال کر سموسے والی چٹنی بنائیں۔ میدے کی بڑی بڑی روٹیاں بیل لیں اور چٹنی روٹی پر پھیلا دیں اور روٹی کا رول بناتے جائیں۔ رول بنانے کے بعد تل لیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

خشخاش اور انڈے

اجزا :

انڈے	چھ عدد (ابال لیں)
خشخاش	آدھا پاؤ
(صاف کر کے پیس لیں)	
پیاز	دو عدد
ادرک ، لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)	دو عدد
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	تھوڑا سا
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

ایک دیگچی میں تیل گرم کر کے باریک کٹی ہوئی پیاز ہلکی سنہری کر لیں ' اب اس میں لہسن ادرک اور تمام مسالے ڈال کر اچھی طرح بھون لیں ' اب اس میں خشخاش ڈال دیں اور کچھ دیر پکنے دیں ' جب خوشبو اٹھنے لگے اس میں آدھی پیالی پانی ڈال دیں اور ساتھ ابلے ہوئے انڈے بھی ڈال دیں۔ اب ہرا دھنیا اور ہری مرچ چھڑک کر ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو چولہا بند کر دیں۔ یہ انڈے گرم گرم چپاتی کے ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔

کوفتہ میکرونی

ضروری اشیاء :

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
ہری مرچیں	چار عدد
لہسن ، ادرک پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
میکرونی (ابلی ہوئی)	دو کپ
لال لوبیا (ابلا ہوا)	آدھا کپ
مکئی کے دانے (ابلے ہوئے)	آدھا کپ
پیاز (چوپ کر لیں)	ایک عدد
ٹماٹر (چوپ کر لیں)	ایک عدد

ترکیب :

چوپر میں قیمہ ' پیاز ' لہسن ' ادرک پیسٹ ' ہری مرچیں ' نمک ' لال مرچ پاؤڈر ' زیرہ اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر باریک پیس لیں۔ اس میں کارن فلور اور انڈا شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں اور ایک گھنٹہ فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ قیمے کے کوفتے بنا کر فرائی پین میں تیل گرم کر کے قیمے کے کوفتے تل لیں۔ ایک ڈش میں ابلی میکرونی ' لال لوبیا ' مکئی ' پیاز ' ٹماٹر ' سیاہ مرچ پاؤڈر ' لیموں کا رس اور نمک ڈال کر مکس کر لیں اور پلیٹ میں نکال کر قیمے کے کوفتے کیچپ اور مایونیز کے ساتھ پیش کریں۔

بیف حلیم

ضروری اشیاء :

مکس دالیں	ایک کپ
(مونگ ' مسور ' ماش / صاف کر کے بھگو دیں)	

دال چنا (بھگودیں)	آدھا کلو
گندم (بھگودیں)	آدھا کلو
گوشت	دو کلو (بغیر ہڈی)
ثابت گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
لہسن کے جوے	پندرہ عدد (چوپ کرلیں)
ادرک (چوپ کرلیں)	ایک انچ کا ٹکڑا
کری پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
جو	آدھا کپ
(صاف کرکے بھگودیں)	
ہلدی پاؤڈر	حسب ضرورت
لال مرچ پاؤڈر	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
گھی، تیل	ڈیڑھ کپ
پیاز	پانچ یا چھ عدد
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لیموں، چاٹ مسالا	حسب پسند

ترکیب :

دال چنا اور مکس دالوں کو الگ الگ برتن میں نمک، آدھا چمچہ ہلدی پاؤڈر اور ایک چمچہ لال مرچ پاؤڈر ڈال کر ابال لیں۔ جو اور گیہوں کو بھی علیحدہ علیحدہ برتن میں پانی اور نمک ڈال کر خوب اچھی طرح گل جانے تک ابال لیں۔ ایک دوسرے بڑے پتیلے میں آدھا کپ گھی گرم کریں۔ اس میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑکڑائیں۔ دو عدد پیاز کاٹ کر ڈالیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت چوپ کیا ہوا لہسن، ادرک، نمک، دہی اور کری پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں اس کے بعد دہی ڈال کر بھونیں۔ گوشت خوب اچھی طرح بھن جائے تو تین کپ پانی ڈال کر گوشت گلنے تک درمیانی آنچ پر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں جو، گیہوں اور ساری دالیں ڈال کر گھوٹا لگاتے ہوئے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ گوشت، دالوں، جو اور گیہوں کا آمیزہ جب خوب اچھی طرح یکجان ہو جائے تو اس میں گرم مسالا پاؤڈر ڈالیں اور دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ ایک فرائنگ پین میں بقیہ گھی درمیانی آنچ پر گرم کریں۔ باقی بچی ہوئی پیاز کے باریک چھلے کاٹ کر گرم گھی میں سنہری ہونے تک تلیں۔ اس کے بعد گھی اور پیاز کا بگھار گھوٹے ہوئے حلیم پہ لگا دیں۔ مزیدار بیف حلیم تیار ہے۔ ڈش میں نکال کر ہرے مسالے اور چاٹ مسالے کے ساتھ پیش کریں۔

کوکونٹ ملک سوجی کا حلوہ

ضروری اجزا :

سوجی	ایک کپ
کوکونٹ ملک پاؤڈر	ایک کپ
کھویا	ایک کپ
چینی	ایک کپ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
بادام	سو گرام
پستے	سو گرام
گھی	آدھا کپ

ترکیب :

ساس پین میں گھی گرم کرکے اس میں سوجی فرائی کریں، ہلکی سنہری ہو جائے تو اس میں ایک کپ پانی ڈال کر پکائیں، پانی خشک ہو جائے تو اس میں کوکونٹ ملک پاؤڈر، کھویا، چینی، الائچی پاؤڈر، بادام، پستے ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ اس کے بعد چولہے پر توا رکھ کر ہلکی آنچ پہ پندرہ منٹ دم پر رکھ دیں، سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

شاہدہ نورین۔ سیالکوٹ

عدنان بھائی! میں نے اس کالم میں ہمیشہ عورت کی مظلومیت کے قصے پڑھے ہیں۔ مرد کو ظالم سمجھا جاتا ہے' لیکن ہر جگہ اور ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ میں اپنے بھائی کا مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ آپ بتائیں کون مظلوم ہے۔

ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ ایک بہن جو مجھ سے بڑی ہیں' ان کی شادی ہو چکی ہے۔ بڑے بھائی بھی شادی شدہ ہیں۔ ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بڑے بھائی نے گریجویشن کے بعد کمپیوٹر کورس کیا اور ایک کمپنی میں ملازمت کرلی۔ ان کی تنخواہ پینتیس ہزار روپے ہے۔ دوسرے بھائی ڈپلوما ہولڈر ہیں' ان کی تنخواہ تیس ہزار ہے۔ ہم لوگ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ والد صاحب کا بہت بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے محنت مزدوری کر کے بھائیوں کو پڑھایا۔ ان کی نوکری ہوئی تو پھوپھی نے اپنے بیٹے کا رشتہ بہن کے لیے دیا' ساتھ ہی انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے بھی بھائی سے رشتے کے لیے کہا۔ امی کو کیا اعتراض ہوتا۔ پھوپھی نے ہمیشہ اچھے برے وقت میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ان کے بچوں سے بھی ہماری دوستی تھی۔ اس طرح بہت آسانی سے رشتے ہو گئے۔ شادی میں بھائی کچھ مقروض بھی ہو گئے کیونکہ نئی نئی نوکری لگی تھی' لیکن آہستہ آہستہ دونوں بھائیوں نے مل کر قرضہ اتار دیا۔

امی چاہتی تھیں' میری شادی ہو جائے تو چھوٹے بھائی کی شادی کی بات چلائیں۔ میرا رشتہ بچپن سے ہی خالہ کے ہاں طے تھا لیکن خالہ کا کہنا تھا کہ جب تک ان کا بیٹا برسرروزگار نہ ہو جائے' وہ شادی نہیں کریں گی۔ ان کی بات بھی ٹھیک تھی۔ امی نے بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کی کیونکہ خاندان میں کوئی لڑکی نہ تھی۔ رشتہ کرانے والی نے ایک لڑکی کا بتایا۔ ہم لڑکی والوں کے گھر لڑکی دیکھنے گئے۔ ان لوگوں کا اخلاق' گھر کی صفائی ستھرائی اور سلیقہ دیکھ کر امی بہت متاثر ہوئیں۔ لڑکی بھی قبول صورت تھی۔ سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے آئی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ہم لوگوں نے ایک دو سوال کیے تو اس نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اس کی بھابھی نے کہا' یہ بہت شرمیلی ہے۔ واقعی اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ آج کے دور میں ایسی لڑکی دیکھ کر امی تو نہال ہو گئیں۔ فوراً" ہی رشتہ دے دیا۔ دوسری بار گئے تو بھائی کو بھی ساتھ لے گئے۔ بھائی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا' لیکن ان کے چہرے کے اطمینان اور مسکراہٹ نے بتا دیا کہ انہیں بھی لڑکی پسند آئی ہے۔

شادی سے پہلے جہیز' بری' مہر وغیرہ کی بات ہوئی۔ بڑے بھائی کا مہر پانچ ہزار تھا۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم جاوید بھائی کا مہر بھی پانچ ہزار ہی رکھیں گے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم نے بھی جہیز کے سلسلے میں کوئی ڈیمانڈ نہیں رکھی تھی۔

ہم نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خوشی خوشی بارات لے کر گئے۔ جب نکاح کا وقت آیا تو لڑکی کے بہنوئی نے نکاح خواں کو روک کر کہا۔ "مہر پانچ لاکھ ہو گا کیونکہ لڑکی کی بڑی بہن یعنی اس کی بیوی کا مہر پانچ لاکھ روپے رکھا گیا تھا اس لیے اب اس کی سالی کا مہر بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔" بھائی ہکا بکا رہ گئے۔ پھوپھی نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ خواہ مخواہ کی بلیک میلنگ ہے۔ بارات واپس چلے' لیکن بھابھی کے والد صاحب نے بڑے بھائی کے قدموں میں اپنی ٹوپی رکھ دی۔ کہنے لگے۔ "مہر تو صرف کاغذوں میں لکھا جاتا ہے۔ شادی ہم طلاق کے لیے تھوڑی کر رہے ہیں۔ ورنہ مہر کون مانگتا ہے' کون دیتا ہے۔ میرا بڑا داماد بہت بد دماغ ہے۔ اگر میں نے مہر کم رکھوایا تو یہ میری بیٹی کو

طلاق دے دے گا۔" بھائی پسیج گئے۔ اگرچہ پھوپھی اور امی کی بالکل مرضی نہ تھی' لیکن بڑے بھائی نے رضامندی دے دی تو وہ بھی خاموش ہو گئیں۔

رخصتی ہوئی' ہم بھابھی کو لے کر گھر آ گئے۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ پھر جو بدمزگی ہوئی تھی' اس سے بھی طبیعت بہت زیادہ مکدر تھی۔ اس لیے رسمیں وغیرہ نہ ہوئیں۔ ہم نے بھابھی کو خاموشی سے بھائی کے کمرے میں پہنچا دیا۔

دوسرے دن بھائی بہت چپ چپ اور پریشان نظر آئے۔ ان کے چہرے پر ناخن کی کھرونچوں کے نشان بھی تھے۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے تو پھیکی سی ہنسی ہنس کر چپ ہو گئے۔ بھابھی دوسرے دن صبح اٹھ کر میکے چلی گئی تھیں۔ ایک دن بعد ولیمہ تھا۔ ولیمہ کی تقریب میں وہ میکے سے ہی تیار ہو کر اپنے گھر والوں کے ساتھ آئیں اور ان کے ساتھ ہی واپس چلی گئیں۔ ہمیں کچھ عجیب سا تو لگا لیکن کچھ کہا نہیں۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا' مہمان رخصت ہوئے تو بھابھی کے بھائی انہیں خود ہمارے گھر لے کر آئے۔ بھابھی تو سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم نے ان کے بھائی سے چائے شربت کا پوچھا' لیکن انہوں نے معذرت کی اور فوراً ہی چلے گئے۔ کچھ دیر بعد بھابھی کے کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب بھاگے تو منظر ہی عجیب تھا۔ کمرے کی ہر چیز بکھری ہوئی' شیشے کا جگ اور گلاس ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مارا تھا۔ اس کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بھائی پریشانی کے عالم میں کھڑے ان کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ امی نے کچھ بات کرنے کی کوشش کی تو وہ امی کو مارنے دوڑیں۔ امی گھبرا کر باہر نکل گئیں۔

ان کے گھر والوں سے بات کی گئی تو پہلے تو بہانے بناتے رہے کہ جنات آتے ہیں۔ شادی نہیں ہونے دینا چاہتے تھے' اس لیے ایسا کر رہے ہیں۔ کسی عامل سے علاج کرا رہے ہیں۔ جلد ٹھیک ہو جائے گی' لیکن پھر بتا ہی دیا کہ یہ بیمار ہے۔ بھائی نے دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کو دکھایا تو پتا چلا کہ بھابھی ذہنی مریضہ ہیں۔ بچپن سے دورے پڑتے ہیں۔ دوائی باقاعدگی سے لینا پڑتی ہے اگر دوا نہ لیں تو حالت بگڑ جاتی ہے۔ ہماری سمجھ میں اب آیا کہ مہر پر اتنا اصرار کیوں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بھائی اگر اب طلاق دیتے تو پانچ لاکھ مہر کہاں سے لاتے۔ پچیس تیس ہزار ماہانہ کمانے والا جبکہ گھر بھی کرائے کا ہو' اتنا پیسہ کہاں سے دے گا۔

بھائی بھابھی کو ان کے گھر چھوڑ آئے' لیکن وہ بھابھی کو رکھنے کو تیار نہیں' ان کا کہنا ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم رکھو' اگر طلاق دینا چاہتے ہو تو مہر دے دو۔ یہیں آکر بھائی کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ بھابھی کو گھر میں رکھنا بہت مشکل ہے۔ کئی بار وہ امی کو مار چکی ہیں۔ دورے کی حالت میں انہیں اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ ایک بار بڑے بھائی کے بچے کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ بڑی بھابھی تو اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ گھر چھوڑ کر میکے چلی گئیں۔ اب وہ میکے میں ہی ہیں۔

ایک بار انہوں نے امی کے منہ پر اپنا سینڈل اٹھا کر مارا' امی کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ بھائی کو یہ دیکھ کر غصہ آ گیا انہوں نے تھپڑ دے مارا' بھابھی اسی وقت گھر سے نکل کر اپنے گھر چلی گئیں۔ ان کے بھائیوں نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ پولیس آکر ہمارے دونوں بھائیوں کو لے گئی' رات بھر دونوں لاک اپ میں رہے۔ پولیس کو پیسے دے کر جان چھڑائی۔ اس دن کے بعد سے بھائی نے توبہ کر لی۔ کچھ بولنا بھی چھوڑ دیا۔ اب حال یہ ہے کہ دورہ پڑتا ہے تو پورے گھر والوں کو چیخ چیخ کر گالیاں دیتی ہیں چیزیں اٹھا کر مارتی ہیں۔ جو سارا محلہ سنتا ہے۔ کچھ کہو تو باپ بھائی لڑنے آ جاتے ہیں۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کا واسطہ جن لوگوں سے پڑا ہے۔ وہ انتہائی چالاک لوگ ہیں۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنی بلا آپ کے سر ڈال دی ہے۔ بھابھی اس حال میں گھر میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ گھر کے دوسرے افراد کی زندگی کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ آپ ان کو مینٹل اسپتال میں داخل کرا دیں۔ اگر آپ کی بھابھی کے گھر والے اس پر احتجاج کریں تو ان سے کہیں کہ وہ بھابھی کو اپنے گھر رکھیں۔ آپ لوگ بھابھی کا خرچ دیں گے۔ شاید وہ خرچ کا سن کر مان جائیں۔

مدثرہ اقبال.... کھوڑ لکا

س :۔ میری عمر 25 سال ہے۔ صحت بھی اچھی ہے، پھر بھی بال سفید ہوگئے ہیں میں بال رنگنے کے لیے مہندی استعمال کرتی ہوں لیکن مہندی سے میرے بال خشک ہوجاتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے بال سیاہ ہوجائیں۔

ج :۔ سفید بالوں کو سیاہ کرنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ تھوڑی سی محنت سے آپ کے بال سیاہ ہوسکتے ہیں۔

مٹھی بھر آملے رات کو بھگودیں۔ صبح اس کی گٹھلیاں نکال کر پیس لیں۔ اسے بالوں میں لگائیں۔ بیس منٹ تک سر پر لگا رہنے دیں پھر صاف پانی سے بال دھولیں ——— کچھ عرصہ استعمال کے بعد بال سیاہ ہوجائیں گے۔ اگر آملے میں ریٹھے اور سیکاکائی ملالیا جائے تو پھر شیمپو کی ضرورت نہیں رہتی۔ آملے کا تیل بھی بنایا جاسکتا ہے۔

250 گرام آنولے کا پاؤڈر ایک لوہے کے برتن میں ڈالیں۔ اس میں ایک لیٹر ناریل کا تیل شامل کرکے بیس منٹ تک پکائیں۔ پھر ٹھنڈا کرکے بالوں میں تیل کی طرح استعمال کریں۔

مہندی میں اگر ایک انڈا اور ایک چائے کا چمچہ سرسوں کا تیل ملا کر لگائیں گی تو بال خشک نظر نہیں آئیں گے۔ بالوں میں اسے دو گھنٹے لگا رہنے دیں۔ دو گھنٹے بعد بال دھولیں۔ بالوں میں رنگ کے ساتھ ساتھ چمک بھی آجائے گی۔

عظمیٰ.... عبدالحکیم

س :۔ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد میرے چہرے پر جھائیاں پڑ گئی ہیں۔ میں نے بہت سی کریمیں استعمال کی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ آپ کوئی ترکیب بتائیں کہ جھائیاں ٹھیک ہوجائیں۔

ج :۔ ایک بار چہرے پر جھائیاں پڑ جائیں تو ان کا جانا دیر طلب ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جھائیوں پر مختلف مہنگی کریموں کا استعمال زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا، اس کے لیے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اپنی غذا پر توجہ دی جائے۔

اس کی ایک بڑی وجہ وٹامن ڈی، وٹامن سی اور آئرن کی کمی ہے۔ صبح نہار منہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک عدد لیموں کا رس ملا کر پی لیں۔ اس سے رنگت بھی نکھرے گی اور لیموں چونکہ وٹامن سی کا خزانہ ہے تو وٹامن سی کی کمی بھی دور ہوگی۔

کینو کا موسم آنے والا ہے۔ روزانہ ایک کینو کھائیں۔ کینو کے چھلکے پیس لیں۔ اس میں عرق گلاب ملا کر پیسٹ بنالیں۔ ابٹن کی طرح چہرے پر لگائیں۔ اس سے جھائیاں دور ہوجائیں گی۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن ٹیبلٹ بھی استعمال کرسکتی ہیں۔

عابدہ کوثر.... کراچی

س :۔ قد کے لحاظ سے میرا وزن ٹھیک ہے، میں موٹی بھی نہیں ہوں۔ اس کے باوجود میری "ڈبل چن" ہے۔ دہری ٹھوڑی کی وجہ سے میں موٹی لگتی ہوں۔ کہتے ہیں اس کا علاج سرجری ہے، لیکن میں سرجری نہیں کراسکتی۔ آپ کوئی آسان ترکیب بتائیں۔

ج :۔ دہری ٹھوڑی سے نہ صرف خوب صورتی میں فرق آتا ہے بلکہ اس سے عمر بھی زیادہ نظر آتی ہے۔

اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک آسان سی ورزش ہے۔ آپ جس حد تک اپنا منہ کھول سکتی ہیں کھولیں اور اپنی زبان پوری طرح باہر نکالیں۔ دس سیکنڈ تک اسی حالت میں رہیں اور پھر زبان اندر کرلیں۔ اس عمل کو دس بار دہرائیں۔ دن میں دوبار یہ عمل کریں۔